مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی

بعنوان

# بیسویں صدی میں احیائے اسلام کی اہم تحریکیں

## "ایک تحقیقی وعلمی مطالعہ"

محققہ

عابدہ سلطانہ

زیرِ نگرانی

پروفیسر ڈاکٹر ریحانہ فردوس

شعبۂ اُصول الدین

کلیہ معارف اسلامیہ، جامعہ کراچی

ماہِ ربیع الاوّل بمطابق اپریل ۲۰۰۷ء

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

IN THE NAME OF ALLAH, THE BENEFICENT THE MERCIFUL

DEPARTMENT OF ISLAMIC LEARNING

*Dr. Rehana F. Jamal*
Assistant Professor

University of Karachi.
Karachi-75270, Pakistan

# تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ ''عابدہ سلطانہ بنتِ عزیز احمد'' نے مقالہ بعنوان ''**بیسویں صدی میں احیائے اسلام کی اہم تحریکیں** (ایک تحقیقی و علمی مطالعہ)'' بورڈ آف ایڈوانس اسٹڈیز اور ریسرچ کی اجازت سے میری نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ مقالہ ہٰذا پی ایچ ڈی کی شرائط کو پورا کرتا ہے۔ لہٰذا اسے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے ایوارڈ کے لیے جمع کرانے کی اجازت دی جاتی ہے۔

نگرانِ مقالہ

R. F.

DR. REHANA FIRDOUS
Asst. Professor
Deptt. Islamic Learning
University Of Karachi

ڈاکٹر ریحانہ فردوس

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

# انتساب

میں اپنی اس انتہائی حقیر کاوش کو ہزاروں دُرودوسلام کے ساتھ سیّد خیرالانام پیغمبر انقلاب، آقائے نامدار، نبیِ معظّم ، رسولِ محترم، سلطانِ ذی حشم، سراپا جودوکرم، حبیبِ مکرّم، محبوبِ ربِّ اکرم عزوجل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے نام معنون ومنسوب کرتی ہوں کہ آپ ہی کی ذاتِ والاصفات ہے کہ جس نے ایسے زمانے میں مبعوث ہوکر جب کہ دنیا جہالت وگمراہی کے انتہائی حدود پر پہنچ چکی تھی، اس کو انسانیت کے سیدھے راستے پر کھڑا کردیا۔

سلام اُس پر، شکستیں جس نے دیں باطل کی فوجوں کو
سلام اُس پر کہ ساکن کر دیا طوفاں کی موجوں کو
سلام اُس پر کہ جس نے زندگی کا راز سمجھایا
سلام اُس پر کہ جو خود بدر کے میدان میں آیا
سلام اُس پر کہ جس کا نام لے کر اس کے شیدائی
اُلٹ دیتے ہیں تختِ قیصریت، اَوجِ دارائی
سلام اُس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا، سرفروشی کے فسانے میں
سلام اُس ذات پر جس کے پریشاں حال دیوانے
سنا سکتے ہیں اب بھی خالد و حیدر کے افسانے

# اظہارِ تشکر

الحمد للّٰہ . تمام تعریفیں اور شکر اللہ رب العالمین کیلیے جس نے اپنی رحمت اور مدد سے مجھے اتنی صلاحیت اور موقع عطا فرمایا کہ جس کی بدولت یہ علمی اور تحقیقی کام انجام پا سکا۔ اس سعی میں میرے مقالے کی نگران پروفیسر ڈاکٹر ریحانہ فردوس صاحبہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ میں ان کی بے حد مشکور ہوں۔ اگر مجھے ان کی علمی توجہ اور، رائے اور مدد حاصل نہ ہوتی تو میں اس تحقیق کے کٹھن راستے کو کبھی بھی نہ طے کر پاتی۔

میں ڈاکٹر جلال الدین نوری، ڈین فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز اور ڈاکٹر عبدالرشید (سابق ڈین فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز) کی بھی مشکور ہوں جن کی توجہ اور سرپرستی اس مقالے کی تکمیل کا باعث بنی۔

میں اپنے رفیق حیات ڈاکٹر حسام الدین چیرمین شعبہ اصول الدین کے تعاون اور کاوشوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کروں گی کہ جنہوں نے نہ صرف میرے مطالعہ کے لئے راہیں ہموار کیں، اپنی گوناگوں مصروفیات سے مجھے وقت دیا بلکہ مجھے میری گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد رکھ کر مقالہ لکھنے کا موقع عنایت کیا۔

میں بورڈ آف ایڈوانس اسٹڈیز اینڈ ریسرچ (B.A.S.R) کے تعاون کی بھی مشکور ہوں۔

میں نے اس مقالے کی تیاری میں متعدد کتب خانوں سے استفادہ کیا جن میں جامعہ کراچی کی ڈاکٹر محمود حسین لائبریری، لیاقت نیشنل لائبریری، مجلس علمی لائبریری، اسٹیٹ بینک لائبریری کے منتظمین کی تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔ اس سلسلے میں ادارہ معارف اسلامی کراچی کی لائبریری کے منتظمین بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔

آخر میں میں اپنے تینوں بچوں کے تعاون کی بھی مشکور ہوں اور خاص طور پر اپنے بیٹے محمد بلال کی جس کی بھرپور معاونت سے مقالے کی تصحیح کا کام مکمل ہوا۔ جزاھم اللہ خیراً کثیراً کثیرا۔

عابدہ سلطانہ

# تلخیص مقالہ

بیسویں صدی میں امت مسلمہ پوری دنیا میں جد و جہد کے ایک طویل دور سے گذری ہے اور آج تک گذر رہی ہے۔ اس مقالے کو تحریر کرنے کی غرض و غایت یہی تھی کہ ان تحریکوں کا جائزہ ان کے حالات اور مسائل کی روشنی میں لیا جائے جو ہر دور میں میدان عمل میں موجود ہیں اور دنیا میں رو بہ زوال اسلامی تشخص کو اپنے لہو کے نذرانے دے کر بحال کرتی رہیں۔ بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہ راست دکھانے والے رہنماؤں، مجاہدین اسلام اور ائمہ کرام کی اس جد و جہد کیلیئے یہ راستہ کبھی بھی پھولوں کی سیج نہ رہا۔ اور اللہ کی راہ میں انہوں نے سر کٹوا تو دیئے مگر سرنگوں نہ ہونے دیئے۔

دنیا کو گمراہی، بے راہروی سے نکالنا انبیاء علیہم السلام کا مقصد نبوت رہا ہے۔ اور یہی اصلاح احوال، صلحائے امت اور مجدّ دین ملت کا نصب العین رہی۔ ان اعلیٰ مقاصد کی تحقیق اور جائزے کیلیئے ہم نے جو ابواب اور فصول باندھے، وہ ایشیا، یورپ، عرب دنیا اور افریقی ممالک میں اٹھنے والی اسلامی تحاریک سے متعلق ہیں۔ جن کے تانے بانے ہمیں کبھی نبی آخر الزماں ؐ کی پیش گوئیوں سے اور کبھی صحابہ کرامؓ کے زمانوں سے متصل ملتے ہیں۔

اس میں امت مسلمہ کے عروج کی روشن داستان بھی شامل ہے اور اغیار کے ظلم و بربریت کی خون آشام سیاہ رات بھی۔ اس کے علاوہ ان تحاریک کے قائدین کے حالات زندگی بھی تحقیق و جائزے میں شامل کیے ہیں، جن کے ولولہ انگیز کارناموں نے دنیا میں اخلاقی، معاشی اور معاشرتی اثرات مرتب کیے۔ اور تاریخ کے دھاروں کا رخ یکسر اسلامی انقلاب کی طرف موڑ دیا۔

آج انقلاب ایران، جہاد افغانستان اور روس میں سیکولرازم کا زوال، وسط ایشیا کی اسلامی ریاستوں کا

قیام، اسی خاموش انقلاب کے دلائل ہیں۔ یہ اسلامی تحریکیں مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ دیگر معاشروں کی اصلاح کیلئے بھی کوششوں میں مصروف رہیں۔ آج دنیا پر ان انقلابی تحریکوں کے جو گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ دنیا کے نقشے پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

ان تحریکوں کے تحقیقی مطالعے کے بعد ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی اسلام کے احیاء کی صدی تھی۔ جس کے اثرات بعد کی صدیوں تک مرتب ہوتے رہیں گے۔ مختصراً یہ کہ:

۱۔ تحاریک اسلامی ہر دور میں وقت کے تقاضوں اور اصلاح احوال کے لئے برپا ہوئیں۔

۲۔ ان تحاریک نے قوموں کے اندر احساس ذمہ داری، جذبہ ایمانی اور جذبہ قومیت بیدار کیا اور اس کے ساتھ ساتھ انسانیت کے اصول دنیا کے سامنے پیش کیے۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ

عابدہ سلطانہ

اُمیدوار برائے

پی ایچ ڈی

# Abstract of the Thesis

In the 20th century, Islmaic Ummah has been passing through an era of struggle and hardships all over the globe and still facing the same situation. The reason to write this thesis was to analyze those movements, under their circumstances and problems, which have been active throughout the Islamic history and have been restoring the true image of Islam which was being spoiled, by sacrificing all.

This way of life which guides the humanity to reach its destination, was never easy for those religious clerics, holy warriors and Islamic leaders who tried to adopt it. They sacrificed their lives but did not surrender. The sole purpose of prophet hood has always been to guide those who had lost the required pathway of life and this objective has also been of those reformers who came after the prophet hood ended at Muhammad (p.b.u.h).

The chapters which were established and arranged are related to the Islamic movements which emerged in Asia, Europe, Arab and Africa.

These movements were found to be connected with the forecasts of Muhammad (P.b.u.h) and the eras of his companions. It contains the shining Islamic era as well as the dark ages when Islam and its followers were in the cross hairs of anti muslims.

In addition, the biographies of the leaders of the afore mentioned movements are also included.Whose tremendous achievements caused immense moral, economical and social impacts on the world and they made history by attempting silent Islamic revolution in their societies.

Today, Persian revolution, Afghanistan war, down fall of secularism in Russia, establishment of Islamic states in ex Soviet Union is the expression of this silent Islamic revolution. These Islamic movements were not just to improve the Islamic societies but they, influenced and improved the non Islamic societies as well.

The impacts of these movements can be felt on the globe today. They have changed geographical borders through out the world.

After analytical study of these movements, we can positively conclude that the 20th century was the century of Islamic renaissance. Which will keep affecting the oncoming centuries. Shortly we can say:

1. The Islamic movements were initiated throughout the history to make peace in the world and to respond to the challenges of their times.
2. These movements stimulated sense of responsibility, faithfulness towards their religion and patriotism in all the nations. Beside this, they presented the principles of humanity before the world.

Abida Sultana
Candidate for
M.Phill / Ph.D

# فہرستِ مضامین


❁...... انتساب

❁...... اظہارِ تشکر

❁...... تلخیصِ مقالہ

❁...... مقدمہ ۱

باب اوّل اُمّتِ مسلمہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ۱۶-۳۰

فصل اوّل : اُمّتِ مسلمہ کا تعارف ۱۶

فصل دوم : اُمّتِ مسلمہ کا عروج وزوال ۲۵

فصل سوم : مسلمانوں کے زوال کے اسباب ۳۰

باب دوم اسلامی دنیا کی بیداری ۳۵-۴۷

فصل اوّل : شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ ۳۵

فصل دوم : سنوسی تحریک ۴۲

فصل سوم : اخوان المسلمون ۴۷

باب سوم — **ایشیاء میں اقامتِ دین کی جدوجہد** — ۶۱-۱۷۴

فصل اوّل : شاہ ولی اللہؒ — ۶۱

فصل دوم : سیّد احمد شہیدؒ — ۷۷

فصل سوم : سیّد جمال الدین افغانیؒ کی تحریک — ۱۰۴

فصل چہارم : جماعتِ اسلامی کی تحریک — ۱۴۶

فصل پنجم : ایران کی اسلامی تحریک اور امام خمینیؒ کا کردار — ۱۷۴

باب چہارم — **دیگر ممالک میں اسلامی تحریکیں** (یورپ، افریقہ اور مشرق وسطیٰ) — ۱۹۵-۲۷۶

فصل اوّل : سوڈان — ۱۹۵

فصل دوم : ترکی — ۲۰۳

فصل سوم : الجزائر — ۲۱۸

فصل چہارم : بوسنیا — ۲۳۸

فصل پنجم : کوسووا — ۲۵۵

فصل ششم : فلسطین — ۲۶۱

فصل ہفتم : چیچنیا کے مسلمانوں کی جدوجہد — ۲۷۶

باب پنجم نامور قائدین اور ان کی داعیانہ جدوجہد کے اثرات ۲۹۳-۴۱۸

فصل اوّل : ڈاکٹر حسن ترابی ۲۹۳

فصل دوم : شیخ حسن البناءؒ ۳۰۴

فصل سوم : ڈاکٹر اسمٰعیل راجی فاروقی ۳۲۸

فصل چہارم : عبدالقادر عودہ شہیدؒ ۳۳۸

فصل پنجم : مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۳۴۷

فصل ششم : سیّد قطب شہیدؒ ۳۸۰

فصل ہفتم : شیخ احمد یاسین شہیدؒ ۳۹۷

فصل ہشتم : ڈاکٹر نجم الدین اربکان ۴۰۸

فصل نہم : عالیجاہ عزت بیگووچ ۴۱۸

ضمیمہ - تحریکات دیوبند و بریلوی اور انکے نامور قائدین۔ I-XXIV

۞...... خلاصہ بحث

۞...... کتابیات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# مُقدّمۃ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الۡاَنۡبِیَآءِ
وَالۡمُرۡسَلِیۡنَ وَالۡعَاقِبَۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ

میری انتہائے نگارش یہی ہے
ترے نام سے ابتداء کر رہی ہوں

اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے جس نے علم و فضل اور ہدایت سے انسانیت کو بہرہ مند کیا، زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھایا اور محمد رسول اللہ ﷺ کو ہمارا آقا اور رہنما بنایا۔ بے شمار دُرود و سلام ان پر جن کو دو جہاں کے لئے بے بہا رحمت بنا کر بھیجا۔ جن کے ذریعے دنیا کو اللہ کی کتاب اور سنّتِ نبوی ﷺ کی دولت عطا کی۔ یہی قرآن و حدیث اس دنیا کا نظام بنانے کے لئے راہنما یعنی شاہِ کلید ہے۔ جن کی سب سے بڑی خوبی اور گواہی یہ ہے کہ زمان و مکان کی دست برد سے محفوظ آج بھی اور قیامت تک انسانیت کو روشن راستہ دکھاتے رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہی آقا اور مالک ہے اور اسی کا نظام اس دنیا کی خیر و فلاح کا موجب ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ قرآنِ کریم میں فرماتا ہے کہ:

تَبَارَکَ الَّذِیۡ بِیَدِہِ الۡمُلۡکُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ o (۱)

ترجمہ: ''بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اقتدارِ اعلیٰ کے لئے طاقتور ہونا ضروری ہے ایسی طاقت جو عدل کر سکے اور ظلم کا تدارک کر سکے۔ انسانوں میں طاقت کا توازن نہیں رہ سکتا چنانچہ قومیں ظلم و جبر کی حکومتوں کے آگے جھکتی رہی ہیں۔ جو کسی بھی وجہ سے قوموں سے ان کی آزادی چھینتے رہے۔ اقتدار مطلق ایسی ہستی کی گرفت میں رکھا جائے جو لوگوں کے معاملات سے بھی واقف ہو اور خواہشات سے بھی تو انسانیت کی معراج پر انسان پہنچ سکتا ہے۔ اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِنْ رَّبِّکُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖ اَوْلِیَآءَ۝ (۲)

ترجمہ: ”جو ہماری طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔“ اس اتباع شریعت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَآءَ ھُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَ کَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ۝

ترجمہ: ”اگر اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے تم نے ان کی خواہش نفس کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لئے نہیں ہے۔ (۳)

یعنی رسول بھی قائدِ اُمت کی حیثیت سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد کا مستحق اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ علم الٰہی کا اتباع کرے۔ جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے پاس سے آیا ہے چاہے اطاعتِ الٰہی کے نتیجے میں انسانوں کی دشمنی مول لینی پڑے جو اپنی خواہشات نفس کی پیروی ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اُمّت کی قیادت کا اعلیٰ ترین معیار رسول اللہ ﷺ نے پیش کیا۔ آپ کے بعد خلفائے راشدین ؓ نے بھی یہی فریضہ انجام دیا۔ تابعین بھی رشد و ہدایت پر عامل رہے۔ جن میں سرِفہرست عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ہر زمانے میں مسلمانوں کی ذمّہ داریوں میں سمایا رہا۔ اللہ کے بندوں یعنی مخلوق کی ہدایت و رہنمائی اُمّتِ مسلمہ کی ذمّہ داری قرار دی گئی۔ ماحول کا مقابلہ کرنے زمان و مکان

کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے، ان تغیرات و انقلاب میں ثبت قدم رہنے اور کشمکش کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُمّتِ مسلمہ پر دو طرح کے فرائض عائد فرمائے۔ ان کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ كَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًاؕ (۴)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو ایسی کامل ترین تعلیمات عطا فرمائی ہیں جو ہر کشمکش اور تبدیلی کا بآسانی مقابلہ کر سکتی ہیں اور ان میں ہر زمانے کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ آپ کا اُسوۂ حسنہ ہر فرد اور ہر دور کے لئے ہے، کسی نازک وقت پر جب اُمّتِ مسلمہ کسی مشکل کا شکار ہوئی اسی سیرتِ طیبہ سے مستفیض جانثاران اسلام آگے بڑھے اور قوموں کو مسائل اور مشکلات سے نکالا۔ دوسرے یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کا بھی بندوبست کیا کہ ہر دور میں ایسے افراد عطا فرماتا رہا ہے اور عطا کرتا رہے گا جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے اور انفرادی یا اجتماعی سطح پر اس دین کو تازہ اور اس اُمّت کو سرگرم عمل رکھیں گے۔

چنانچہ دینِ اسلام میں ایسے مردان حق اور مجددین پیدا ہوئے کہ دنیا کی قوموں اور اُمتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ تحریفات، تاویلات، بدعات، عجمی اثرات، مشرکانہ اعمال، رسوم، مادیت پرستی، نفس پرستی، تعیّشات، الحاد و لادینیت اور عقلیت پرستی کا اسلام پر بار بار حملہ ہوا مگر اُمّتِ مسلمہ کے ضمیر نے صلح کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ہر دور میں ایسے علماء و صلحاء پیدا ہوئے جنہوں نے حقیقتِ اسلام اور دین خالص کو اُجاگر کیا۔ عقائد باطلہ کی بے باکانہ تردید کی اور مشرکانہ اعمال اور رسوم کے خلاف اعلانیہ جہاد کیا۔

یہ افراد فکری، علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانے کے ممتاز ترین افراد تھے۔ جاہلیت اور ضلالت کی ہر ظلمت کے لئے ان کے پاس کوئی نہ کوئی ید بیضاء تھا جس سے انہوں نے تاریکی کا پردہ چاک کر دیا

اور حق روشن ہو گیا۔ ان افراد کا ہر زمانہ میں یہی مشن رہا۔ میں اپنے اس مقالے میں ۲۰ ویں صدی میں اُٹھنے والی احیائے دین کی تحریکیں اور ان کے نمایاں افراد کا ذکر کروں گی اور ان نمایاں کاموں پر تحقیق کروں گی جو انہوں نے اپنے زمانے میں انجام دیئے۔

بیسویں صدی میں مسلم دنیا کی ایک اہم قوت احیائے اسلام کی وہ تحریکیں رہیں جنہوں نے اپنے مزاج، ساخت اور روایتی دین داری میں اجتماعیت اور حرکت پیدا کرنے اور ایمان و عدل کی طاقت کو بدلتے ہوئے حالات میں شعوری طور پر منتقل کرنے کی بڑی کوشش کی، نئی نسل میں مغرب کے بڑھتے ہوئے منفی اثرات، تشکیک، مذہب سے بیزاری کو روکنے کی جدوجہد کی، سماجی اور سیاسی پیچیدگیوں کی تہ میں دبے ہوئے اسلام کے انقلابی کردار کو از سرِ نو متحرک کرنے اور اسلام کو انسانی زندگی کی قوت کا سرچشمہ ثابت کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

ان تحریکات کا ہمیشہ یہی مقصد رہا کہ دین اور حکومت کے اس تضاد کو مٹا کر اسلام کا شورائی اور جمہوری نظام لایا جائے۔ فکری سطح پر اسلامی تحریکوں نے اسلام کو مکمل نظامِ حیات کی شکل میں پیش کیا کہ اسلام فقط مذہب نہیں جو صرف روحانیت اور عبادات پر مشتمل ہو بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبے خواہ اس کا تعلق قانون سے ہو، معاشرت سے ہو یا روحانیت اور اخلاق سے۔ ہر ایک کے بارے میں مکمل تعلیمات اسلام کے نظام میں موجود ہیں۔

عصرِ حاضر کی یعنی بیسویں صدی کی اسلامی تحریکوں نے یہی تصوّر بڑے زور وشور سے متعارف کرایا اور اپنے تربیتی نظام میں اس پر عملی اطلاق کر کے بھی دکھایا۔ انہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج کا مسلمان نوجوان مغربی طرز کے ماحول میں رہ کر بھی جاہلیت سے متنفر اور اسلامی تہذیب کا فدائی ہے۔ اسی تناظر میں میں نے اپنے مقالے کا موضوع ''بیسویں صدی کی اہم اسلامی تحریکیں'' منتخب کیا۔ اس مقالہ میں بارھویں اور اٹھارویں صدی کا بھی کہیں کہیں تذکرہ موجود ہے کیونکہ بیسویں صدی میں اُٹھنے والی تحریکوں کی بنیادیں سابقہ صدیوں میں نظر آتی ہیں۔ جن کے رہنما یا واقعات کا سلسلہ سابقہ زمانہ میں موجود ہے۔

میرا یہ مقالہ مقدمہ کے علاوہ پانچ ابواب اور اختتامیہ (خلاصۂ بحث) پر مشتمل ہے۔

باب اوّل ، اُمّتِ مسلمہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ۔ اُمّتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود ہے جس کے تحت قرآن واحادیث کی روشنی میں اُمّتِ مسلمہ کے مقصدِ وجود کو واضح کیا ہے جس کے تحت تین فصول قائم کی ہیں:

فصل اوّل : اُمّتِ مسلمہ کا تعارف

فصل دوم : اُمّتِ مسلمہ کا عروج وزوال

فصل سوم : مسلمانوں کے زوال کے اسباب

ان تینوں فصول میں لفظ اُمّت کی تشریح اس کی اہمیت، ضرورت اور مقاصد قرآن وحدیث کی وضاحت کے ساتھ تحقیق کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ تاریخی حقائق جمع کئے گئے ہیں جن سے اُمّتِ مسلمہ کے عروج کا زمانہ اور پھر اس کے ایک عرصہ کے بعد زوال کا زمانہ شروع ہوتا ہے جس کے بعد ان اسبابِ زوال پر تحقیق کی ہے۔ اُمّتِ مسلمہ ایک مقصد کے تحت دنیا کی قوموں کے درمیان سے نکالی گئی۔ انسان کا دنیا میں خلیفۃ اللہ فی الارض کی ذمّہ داریاں سنبھال کر کرۂ ارض کو اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن کرنا ہی اس کا مشن ٹھہرا۔ مسلمانوں کے لئے یہ لازم قرار دیا گیا اور فرمایا گیا:

وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ o(۵)

ترجمہ: ''اور تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہونے چاہئیں جو لوگوں کو بھلائی کی دعوت دیں، جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیں اور بدی سے روکیں۔''

اور اس کام میں جو بھی وقت کے ظالم اور جابر آڑے آئیں مسلمانوں کو ان سے مجاہدہ کرتے ہوئے اس فریضے کو ادا کرنا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب تک مسلمان اپنی ذمّہ داریاں پوری کرتے رہے زمانہ سیدھی

راہ پر گامزن رہا اور جب وہ عیش کوشی میں پڑ گئے تو زوال کا عمل شروع ہو گیا۔ ان تینوں فصلوں میں ہم تاریخ کے ان ادوار کو اُمتِ مسلمہ کی ذمہ داریوں کے حوالے سے دیکھیں گے کہ کس طرح ہر دور کی فرعونیت سے ان تحریکوں نے پنجہ کشی کی اور مخالفتوں کے طوفان میں حق کے پیغام کو اور دین کی روشنی کو پھیلاتے رہے۔

باب دوم، اسلامی دنیا کی بیداری کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ اس باب میں تین فصلیں قائم کی گئی ہیں:

فصل اوّل : شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کی تحریک

جن کا زمانہ سترہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک محیط ہے۔ یہی زمانہ ہے جب ہندوستان میں شاہ ولی اللہؒ پیدا ہوئے۔ اس دور میں اسلامی دنیا تمام غیر شرعی اعمال میں مبتلا ہو چکی تھی۔ قبروں پر جا کر دعائیں مانگنا اور دین میں طرح طرح کی بدعتیں پیدا کرنا ان کا شغف بن گیا تھا۔ توحید اور سنّت سے مسلمان بہت دور جا چکے تھے۔ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ سب سے پہلے ان خرابیوں کے خلاف اُٹھے اور معاشرے کی اصلاح اور تبلیغ کا کام کیا جس کے اثرات آج تک عرب کی تاریخ پر موجود ہیں۔

فصل دوم : سنوسی تحریک

سنوسی تحریک کے متعلق ہے۔ یہ عرب کا وہ دور ہے جب آلِ سعود کو عروج حاصل ہو رہا تھا اور شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک پھیل رہی تھی۔ اس وقت شمالی اور مغربی افریقہ میں ایک اصلاحی تحریک شروع ہوئی۔ یہ سنوسی تحریک تھی۔ اس کے بانی ایک بزرگ محمد بن علی سنوسی تھے۔ اس تحریک کا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کو رہنے، اخلاق و آداب میں بالکل قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح بنا دیا جائے۔

فصل سوم : اخوان المسلمون کی تحریک

اس باب میں عرب اور مصر سے اُٹھنے والی تحریکوں کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بات بھی حقیقت ہے کہ اسلامی دنیا کی بیداری کے ابتدائی مراکز عرب، مصر اور ہندوستان تھے۔ جن میں مصر کی اخوان المسلمون کی

تحریک نمایاں نظر آتی ہے۔ تاریخ میں مصر کے حالات مغربی استعمار کے حربے اسلام کے خلاف سازشیں اس باب میں بیان ہوئی ہیں۔

اسلامی بیداری کے عنوان سے اسلامی تحاریک کی علیحدہ علیحدہ تحقیق کی گئی ہے۔ تاکہ تاریخ عرب اور مصر اور اسی دور کی دوسری تحاریک یکجا ہو کر سامنے آئیں اس طرح اس تاریخی دور کو مقابلتاً دیکھا جائے۔ ان تین فصلوں میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے اسلامی تحاریک کو اپنے اپنے حالات کے مطابق پیش کیا جاسکے۔

باب سوم، ایشیا میں اقامتِ دین کی جدوجہد ہندوستان میں تحریکِ احیائے دین۔ اس باب میں پانچ فصول ہیں جن میں ایشیا میں برپا ہونے والی اہم تحاریک کا ذکر کیا گیا ہے۔

فصل اوّل : **شاہ ولی اللہؒ کی تحریک**

اصلاح عقائد و دعوت الی القرآن، تجدید دین اور اصلاح اُمّت کے لئے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی علمی اور عملی جدوجہد ہندوستان کی تاریخ میں ہی نہیں ہر مقام پر اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے بغیر احیائے دین کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی وہ بے اساس ہوگی۔ انہوں نے کتاب وسنّت کے مقام کو واضح کیا اور اس کے فہم و تعلیم کی طرف دعوت دی اور ہندوستان کے علماء کو ان کی غلط کاریوں پر متنبہ کیا۔ انہوں نے اپنی تحریک کے ذریعے اُمّت کو دعوت اصلاح و انقلاب دی اور تجدیدی کارنامے انجام دیے۔

فصل دوم : **حضرت سیّد احمد شہیدؒ**

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فکری رہنمائی کا جو جامع پروگرام مرتب کیا تھا اس کی روشنی میں ان کے روحانی فرزند ارجمند سیّد احمد نے اپنے تلامذہ اور جگر گوشوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جس نے درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور وعظ و تبلیغ کے ذریعے اس انقلابی فکر کو عوام کے سامنے پیش کیا اور اس کے بعد اقامتِ دین کے لئے عملی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ اس فکری اور عملی جدوجہد نے آگے چل کر برِّصغیر کی تاریخ میں ایک اسلامی مملکت کے قیام اور اس کے لئے مسلمانوں کی جدوجہد کو تشکیل دیا۔ سیّد احمد شہیدؒ اپنے رفقاء کے ہمراہ اس

تحریک کے ایک مرحلے میں شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے لیکن بظاہر تحریک کی ناکامی کے ایک سوا سو سال بعد ایک عظیم الشان تحریک اسی سرزمین پر برپا ہوئی۔

## فصل سوم : سیّد جمال الدین افغانی کی تحریک

سیّد جمال الدین افغانی افغانستان میں پیدا ہوئے مگر سیاست میں حصہ لینے کے باعث کابل چھوڑ دیا اور ہندوستان، ترکی اور مصر میں تحریک بیداری میں حصہ لیا۔ اپنے کردار اور قلم کے ذریعے عالم اسلام کی بیداری اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ اس تحریک کا تعلق کسی ایک ملک و وطن سے نہ تھا اس کے اثرات ایران سے لے کر شمالی افریقہ کی تحریکوں پر بھی نظر آتے ہیں۔ یہ تحریک پوری اسلامی دنیا کی رہنمائی کے لئے تھی انہوں نے قدیم و جدید فکر کو ملا کر ایک جامع اور ہمہ گیر اسلامی اندازِ فکر کی بنیاد ڈالی۔

## فصل چہارم : جماعتِ اسلامی کی تحریک

جماعتِ اسلامی کی تحریک پاکستان بننے سے قبل ہندوستان میں ۱۹۴۱ء میں شروع ہوئی۔ یہ تحریک نظام میں تبدیلی کا ایک جامع پروگرام لے کر اُٹھی اور تمام طبقہ ہائے فکر میں کام کیا جس کے نتیجے میں پڑھے لکھے طبقے میں اسے پسند کیا گیا۔ پاکستان کے قیام کے بعد سے جماعتِ اسلامی زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی انقلاب کے لئے کوشاں رہی ہے۔ بیسویں صدی کی احیائے دین کی تحریکوں میں یہ وہ تحریک ہے جو مسلم اُمّہ کی بیداری کے لئے تمام دنیا میں مختلف عنوانات سے متحرک ہے۔

## فصل پنجم : ایران کی اسلامی تحریک اور امام خمینی کا کردار

ایران میں صفوی دور سے علماء کا اثر رہا ہے۔ ایران کے آخری بادشاہ محمد رضا شاہ نے مغرب کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی تو انہیں علماء اور عوام کی زبردست تحریک کا سامنا کرنا پڑا۔ ایران میں مطالبے عام ہوئے۔ ۱۹۷۸ء کے آغاز سے شاہ کے خلاف تحریک اُٹھی۔ حتیٰ کہ فوج بھی بے بس ہوگئی تو شاہ ملک ایران چھوڑ کر مصر چلے گئے۔ یکم جنوری کو آیت اللہ خمینی جو اسلامی انقلاب کے حقیقی رہنما تھے پیرس سے تہران پہنچ گئے۔ ۳۰ مارچ کو ۹۷ فیصد عوام کی رائے سے ایران اسلامی جمہوریہ بن گیا۔ اس طرح مغرب پرستی کی تحاریک

سے مقابلے میں اسلامی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

باب چہارم، یورپ میں اسلام کی تحریکیں۔اس باب میں سات فصول قائم کی گئی ہیں جن میں یورپ کے مخصوص حالات میں اسلامی تحریکوں کے مقاصد، محرکات اور نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پوری صدی میں مسلم اُمّہ کے اتحاد، یکجہتی اور ایمان کی جلاء کے لئے علماء، فضلاء اور مفکرین نے فکری اور عملی جدوجہد میں بھی حصہ لیا ہے۔

## فصل اوّل : سوڈان میں اسلامی تحریک

مہدی سوڈانی تاریخ اسلام کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ایک مصلح کی حیثیت سے اُبھرے، نہایت متقی انسان تھے۔انگریزوں کے خلاف لڑتے رہے اور سوڈان پر فتح حاصل کی۔مہدی سوڈانی نے کتاب وسنّت کے مطابق حکومت قائم کی۔اپنے پیروؤں کے لئے حلف کا نظام قائم کیا۔غرض اس تحریک اور حکومت نے سوڈان میں مسلمانوں کو حوصلہ اور قوت دی۔یہ تحریک بیداری کی پہلی تحریک تھی۔انگریزوں کے خلاف جدوجہد اس کا بنیادی حصہ ہے۔

## فصل دوم : الجزائر میں اسلامی تحریک

شمالی افریقہ میں مسلمانوں کی جدوجہد کی ایک لامتناہی تاریخ رقم ہے۔الجزائر ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر فرانس کے قبضے میں چلا گیا۔الجزائر کو فرانس کے تسلّط سے بچانے کیلئے عبدالقادر الجزائری کی تحریکِ آزادی نے نمایاں کارنامے انجام دیے۔امیر عبدالقادر نے فرانس کے خلاف جہاد کیا۔یہاں تک کہ وہ ایک تہائی حصے پر قابض ہو گئے۔انہوں نے نظام اسلامی نافذ کیا۔آج بھی مسلمان جدوجہد آزادی میں مصروف ہیں۔

## فصل سوم : بوسنیا میں مسلمانوں کی جدوجہد

بوسنیا ہرزیگوینا پر جب ہنگری نے قبضہ کیا تو وہاں کے باشندوں کی اکثر تعداد مسلمان تھی۔لیکن عرصۂ دراز تک انہیں یوگوسلاویہ کی قومیت نہیں مانا گیا۔یہ وہ حالات تھے جنہوں نے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے

بنیادی حق کے لئے جدوجہد کریں۔انہی حالات میں جنگِ عظیم پیش آئی اور بوسنیا کو جمہوریہ کا درجہ ملا۔سربیا اسّی فیصد علاقے پر قابض ہوگیا اور مسلمانوں کو مٹانے کے لئے پورے انتظامات کئے گئے۔

۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۱ء تک حالات اسی طرح مسلمانوں کے خلاف رہے۔سربوں کا ظلم جاری رہا اور جاری ہے۔

## فصل چہارم : کوسووا میں مسلمانوں کی جدوجہد

کوسووا سربیا کا ایسا علاقہ تھا جسے خودمختاری حاصل تھی۔۱۹۹۰ء میں سربیا نے اس کی یہ حیثیت ختم کردی۔البانیوں کو دبانے کے لئے ان پر پابندی لگائی گئی،لاکھوں البانوی افسران معزول کردیے گئے،ان پر تمام بنیادی سہولتیں بند ہوگئیں۔یوگوسلاویہ میں دو بڑے اسلامی گروپ ہیں۔کوسووا میں البانی اور بوسنیا میں بوسنیائی۔جن کی پارٹیاں جمہوری رابطہ پارٹی اور بوسنیا میں ڈیموکریٹک ایکشن پارٹی کی قیادت میں منظم ہیں۔ بوسنیا کے مسلمان اپنے اسلامی تشخص پر زور دیتے ہیں۔حالیہ کشمکش پچھلے چند سالوں میں مسلمانوں کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔یورپ اور امریکہ سربوں کی پشت پناہی کا کردار ادا کرتے ہیں۔کہ یورپ میں مسلمانوں کو اسلام پر عمل درآمد کے لئے راستہ نہیں مل سکے۔کیونکہ اس طرح اسلام کا راستہ مزید ہموار ہوجائے گا۔بوسنیا اور کوسووا کے مسلمان اس وقت تحریکِ اسلامی کا اہم کردار ادا کررہے ہیں۔بیسویں صدی یورپ میں مسائل کی آماجگاہ بن چکی ہے۔

## فصل پنجم : ترکی میں مسلمانوں کی جدوجہد

ترکی میں اسلامی تہذیب وثقافت کے اثرات پہلی صدی ہجری میں پھیلنا شروع ہوگئے تھے۔ ترکوں نے اسلام بغیر کسی جبر کے قبول کیا تھا اور اسلام کی دین واشاعت کو بھی فرضِ عین سمجھا۔سلطنتِ عثمانیہ کا قیام ۱۲۹۹ء ترکوں کی تاریخ کا ایک شاندار کارنامہ ہے۔یہ سلطنت ایسے دور میں قائم ہوئی جب مسلمان ہر جگہ پسپا ہورہے تھے اور پھر صدیوں تک یورپ کے جارحانہ حملوں کے مقابلے میں اسلامی دنیا کے لئے یہ سلطنت سپر کا کام دیتی رہی۔وہ یورپ کی سرزمین پر اسلام کی سب سے بڑی قوت اور اس کے

علمبردار بن گئے تھے۔ عثمانی ترکوں کا بڑا کارنامہ قسطنطنیہ کی فتح ہے۔ جنگِ عظیم اوّل کے بعد خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد غیر ملکی فوجوں نے قبضہ کرلیا اور پھر ترکی مصطفیٰ کمال جیسے حکمران کے ہاتھوں اسلامی شناخت سے بھی محروم ہوگیا۔ اسے ایک مغربی معاشرہ بنادیا گیا۔ ان حالات میں اسلامی تحریک مختلف شکلوں میں ترکی کے اسلامی تشخص کو بحال کرنے میں کامیاب ہوئی۔ حالیہ کشمکش میں نجم الدین اربکان اور رفاہ پارٹی نے اہم کردار ادا کیا اور سیکولر طاقتوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ رفاہ پارٹی پر پابندی کے بعد فضیلت پارٹی نے اسلام کو توانائی دی۔

## فصل ششم : فلسطین کے مسلمانوں کی جدوجہد

مشرقی بحیرۂ روم کا خطہ فلسطین ہے۔ جن پر اسرائیلی ریاست قائم کی گئی ہے۔ فلسطین عثمانی سلطنت کا حصہ رہا ہے لیکن جب ترکی کمزور ہوا تو یورپ کے مفاد پرستوں نے یہاں یہودیوں کی بستی لا بسائی اور عظیم اسرائیل کا ناپاک منصوبہ بنایا۔ عرب اس جنگ کو نہ لڑ سکے اور نہ فلسطین کو آزاد کرا سکے۔ اسرائیل کے جبر کا مقابلہ کرنے کے لئے پہلے پی ایل او اور اس کی بدنامی کے بعد ۱۹۸۷ء سے حماس گروپ سرگرمِ عمل ہوا۔ فلسطینیوں نے آج تک اسرائیل کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے اور نہ کسی ایسے الفاظ سے گریز کرنا حق تسلیم کیا اخوان المسلمون کی اسلامی تحریک نے ہی ایک ایسی نسل تیار کی جو سیکولر عناصر کے لئے آج چیلنج بن کر اُبھری ہے۔

## فصل ہفتم : چیچنیا کے مسلمانوں کی جدوجہد

روس کے جبری قبضہ نے چیچنیا کی آبادی پر ظلم وستم کا بازار گرم کیا۔ لاکھوں باشندوں کو جلاوطن کردیا۔ بے شمار افراد سردی، بھوک اور بیماری سے دم توڑ گئے اس ظلم وستم کے بعد ۱۹۵۷ء میں جلاوطن باشندوں کو وطن آنے کی اجازت دی گئی۔ ۱۹۹۱ء کو چیچنیا نے آزادی کا اعلان کیا عوام کے عزم کے آگے روس کی فوج کشی کی کوشش بھی ناکام ہوگئی اور چیچنیا نے ایک طویل جدوجہد کے بعد اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔

باب پنجم، نامور قائدین اوران کی داعیانہ جدوجہد کے اثرات۔اس باب کی نوفصول قائم کی گئی ہیں جن میں بیسویں صدی کے احیائے دین کی جدوجہد کرنے والے اہم قائدین کی زندگی، ان کے کارناموں اور بلند مقاصد کا جائزہ لیا گیا ہے۔ان کوششوں پر تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے جوانہوں نے اپنے دور میں بھرپور طریقے پر کیں۔

فصل اوّل : ڈاکٹرحسن ترابی

فصل دوم : شیخ حسن البناء شہید

فصل سوم : شیخ احمد یاسین

فصل چہارم : ڈاکٹر اسمٰعیل راجی فاروقی

فصل پنجم : عبدالقادر عودہ شہیدؒ

فصل ششم : سیّد قطب شہیدؒ

فصل ہفتم : سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

فصل ہشتم : ڈاکٹر نجم الدین اربکان

فصل نہم : عالیجاہ علی عزت بیگوچ

## تحقیق کا طریقہ کار

تحقیق کے لیے انگریزی میں لفظ Research استعمال ہوتا ہے۔Search کے معنی تلاش کرنا اور Research کے معنی دوبارہ تلاش کرنا یا معاملات کے ساتھ جانچ پڑتال کرنا، جبکہ اصطلاحی لحاظ سے اس کے معنی نئی معلومات کے متعلق جستجو کرنا ہے۔(۶)

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ Research یا تحقیق کی کئی اقسام ہیں لیکن ان میں سے مشہور اقسام یہ ہیں:

ا۔ فلسفیانہ طریقہ تحقیق 1- Philosophical Research

۲۔ سائنسی = = 2- Scientific Research

۳۔ تاریخی = = 3- Historical Research

۴۔ شماریاتی = = 4- Stistical Research (7)

میرا یہ مقالہ ''بیسویں صدی کی اہم اسلامی تحریکیں'' تاریخی تحقیق سے متعلق ہے۔ ہر قسم کی تحقیق کے لئے الگ الگ طریقۂ کار رہوا کرتے ہیں۔ معاشرتی تحقیق کے طریقوں کے مندرجہ ذیل اُصول ہوتے ہیں:

۱۔ مسئلہ تحقیق۔

۲۔ مآخذ اور حوالہ جات کا جمع کرنا۔

۳۔ حوالوں کی جانچ پڑتال۔

۴۔ واقعات اور حالات کی وضاحت۔

۵۔ حقائق کی وضاحت اور نتائج کا بیان۔ (۸)

میں نے انہی ترتیب وار مرحلوں سے گزرتے ہوئے یہ تحقیقی مقالہ مرتب کیا ہے۔ اس تحقیق کے دوران جن باتوں کی ضرورت تھی یا جن وسائل کی ضرورت تھی ان تمام وسائل کو جمع کیا اور تحقیقی طریقۂ کار کے مطابق ترتیب دیا۔

مآخذ اور حوالے جمع کرنے کے سلسلے میں تحقیقی طریقۂ کار کے اُصولوں کے مطابق ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مآخذ اور حوالے بھی دو قسم کے ہوتے ہیں:

۱-بنیادی مآخذ 1- Primary sources

۲-ثانوی مآخذ 2- Secondary sources

۱۔ بنیادی مآخذ سے مراد دستاویزی کتاب، رسالہ یا دوسرا مواد جن میں مقالے کے موضوع کے متعلق ابتدائی معلومات ہوتی ہیں۔

۲۔ ثانوی مآخذ سے مراد مخطوطات، کتاب یا اسی دور کے انسانوں کے آنکھوں دیکھے احوال۔

میں نے اس مقالے میں دونوں قسم کے مآخذ کو استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ بیسویں صدی تک مفکرین اور علماء کرام کے متعلق لکھے گئے تذکرے کے حوالے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری جانب زبانی روایتیں اور مخطوطات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے کیونکہ ثانوی مآخذ میں قولی روایتوں کو بھی ایک قسم کی حیثیت حاصل ہے۔(۹)

ثانوی تحقیق کے دوران مصنّفین کی تصنیفات جاننے کے لئے کتب خانوں اور لائبریریوں کے مخطوطات کی فہرستوں کا مطالعہ نہایت ضروری ہوتا ہے۔(۱۰)

اس مقالے کو ترتیب دیتے ہوئے تصنیفات کے سلسلے میں مذکورہ اُصولوں سے غافل نہیں رہی ہوں میں نے مقالے کی تحقیق کے دوران حوالہ جات کی باقاعدہ جانچ پڑتال کی ہے۔

# حواشی وحوالہ جات (مقدمہ)

(۱) القرآن (۱:۶۷)

(۲) ایضاً (۳:۷)

(۳) ایضاً (۲:۱۲۰)

(۴) ایضاً (۲۸:۴۸)

(۵) ایضاً (۳:۱۰۴)

(۶) ڈاکٹر غلام حسین: ''تحقیق کا فن'' پاکستان اسٹڈی سینٹر سندھ یونیورسٹی جامشورو، ۱۹۸۳ء، ص:۱۴

(۷) محولہ بالا، ص:۴

(۸) رضوی جمیل احمد سیّد: ''لائبریری سائنس اور اُصول تحقیق''، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۴ء ص:۲۲، ج:۲

(۹) در شہوار، سیّدہ ڈاکٹر: ''تحقیق کا طریقۂ کار'' شاہ عبداللطیف بھٹائی چیئر، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۵ء، ص:۹۲

(۱۰) ڈاکٹر انیس خورشید: ''تحقیقی مقالہ لکھنے کے دستاویزی ثبوت'' ۱۹۹۵ء، جامعہ کراچی، ص:۱۴۳

# باب اوّل

# اُمّتِ مسلمہ

## قرآن وحدیث کی روشنی میں

فصل اوّل : اُمّتِ مسلمہ کا تعارف

فصل دوم : اُمّتِ مسلمہ کا عروج وزوال

فصل سوم : مسلمانوں کے زوال کے اسباب

باب اوّل

# اُمّتِ مسلمہ، قرآن وحدیث کی روشنی میں

فصل اوّل

## اُمّتِ مسلمہ کا تعارف

اُمّت سے مراد گروہِ انسانی ہے، جماعت ہے، عربی لغت میں اس کا ماخذ الامۃ ہے جس کے معنی عربی لغت کے مطابق:

"جماعة الناس الذين يكونون وحدة سياسة و تجمع بينهم وحدة الوطن و اللغة و التراث و المثاء و جمل الجامع الخصال الخير و فى القرآن الكريم: "اِنَّ اِبْرَاهِيمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ حَنِيفًاo"(۱)

لفظ اُمّت اُردو میں اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی جماعت، گروہ، کسی خاص مقصد کے لئے ایک نظریات پر جمع افراد کو اُمّت کہا جاتا ہے۔

ہر نبی کے ماننے والے ان کی اُمّت کہلاتے ہیں اور نبی اس اُمّت کا سردار ہوتا ہے، اب اس کی پیروی کرنے والے اس گروہ میں شریک ہوتے جاتے ہیں یعنی لوگوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں جب بھی شامل ہوا جائے جز کل کا حصہ بن جاتا ہے۔

### اُمّتِ مسلمہ قرآن کی نظر میں

ایک خاص مقصدِ زندگی جو قرآن کے پیشِ نظر ہے وہ دنیا میں متعارف کرنا اور دنیا کو راہِ ہدایت کی طرف متوجہ کرنا اس اُمّت کی ذمہ داری ہے۔

سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۱۰ میں اس کی ذمّہ داری اس طرح بیان فرمائی گئی:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ٥ (۲)

ترجمہ: "اور تم ہی وہ بہترین اُمّت ہو جو تمام انسانوں کے لئے نکالی گئی ہے تم نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور بُرائیوں سے روکتے ہو اور تم ایمان لاتے ہو اللہ پر۔"

اور اس کی بہترین اُمّت کے بارے میں قرآن مزید وضاحت کرتا ہے۔ سورۃ البقرہ۔ آیت: ۱۴۳

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا٥ (۳)

ترجمہ: "اور اسی طرح ہم نے تم کو اُمّت معتدل بنایا ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر تم پر گواہ بنیں۔"

مزید ذمّہ داری کی وضاحت آیت مذکورہ میں کردی کہ اُمّتِ مسلمہ کا مقصد وجود حق کا گواہ بننا ہے۔

اگر چہ اس آیت میں بھی صراحت نہیں بیان کی گئی ہے کہ کس چیز کی گواہی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے لیکن یہ بات از خود طے ہے کہ اُمّتِ مسلمہ جس دینِ حق کے ساتھ دنیا میں لائی گئی ہے اور نبی علیہ السلام اور ان کے پیروکار جس دین کو انسانوں میں متعارف کرا رہے ہیں اس دینِ حق کو واضح کرنا اس کی گواہی ہے جو آئندہ مسلم اُمّۃ تک پہنچے گی اور اس طرح سلسلہ ہدایت جاری و ساری رہے گا۔

اہلِ دنیا کے سامنے شہادت دینا ایمان والوں کی ہی ذمّہ داری اور ایمان والوں پر اس بات کی گواہی رسول دیں گے کہ اللہ کا دین پوری دیانت و امانت و صداقت کے ساتھ انسانوں تک انہوں نے پہنچایا۔

دنیا کے دوسرے گروہوں کے اور اس کے درمیان ایک بنیادی فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ انہی میں سے ایک نہیں ہے بلکہ اس سب سے الگ اور ممتاز ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں بھی اس اُمّت کو صریح لفظوں میں مبعوث یعنی بھیجی اور مامور کی ہوئی اُمّت قرار دیا گیا ہے۔

حدیثِ رسول ﷺ:

فَاِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُیَسِّرِیْنَ وَ لَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِیْنَ (۴)

ترجمہ: ''تم نرمی سے کام لینے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، تنگیوں میں ڈالنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔''

اور پھر اس پوری جماعت اور اس پورے گروہ انسانی کو جو اسلام کا امین ہو اس کی مخصوص ذمہ داری اس طرح تفویض کی گئی تاکہ معاشرے میں اصلاح کا کام ہمہ وقت جاری رہے اور اُمّتِ مسلمہ کے چھوٹے یا بڑے گروہ لوگوں کو نیکی کی طرف ہمیشہ بلاتے رہیں اور عمل کی تلقین کرتے رہیں۔

سورۂ آلِ عمران آیت ۱۰۴ میں فرمانِ الٰہی ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ اُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَo(۵)

ترجمہ: ''اور تم میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں۔''

ان آیاتِ قرآنی میں اُمّتِ مسلمہ کی ذمہ داریوں کی بہت اچھی طرح وضاحت کی گئی۔

سورۂ شوریٰ آیت ۱۳ میں قرآن کا فرمان ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖ اِبْرَاهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَo(۶)

ترجمہ: ''مسلمانو! اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر فرمایا ہے جس کا حکم اس نے حضرت نوح علیہ السلام کو دیا تھا اور جس کی (اے نبی ﷺ) ہم نے آپ پر وحی کی ہے اور جس کا حکم ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا کہ اس دین کو قائم کرو۔"

قرآن وحدیث کے ان تینوں بیانات کی بناء پر اُمّتِ مسلمہ کا مقصد ہم کئی طرح بیان کر سکتے ہیں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس اُمّت کا مقصد وجود امر بالمعروف نہی عن المنکر ہے، یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ شہادتِ حق ہے اور یہ بھی کہ اقامتِ دین ہے کیونکہ یہ تینوں ایک ہی مدعیٰ کی تین تعبیریں ہیں اور ان میں سے جس کو بھی آپ استعمال کریں گے مقصود ہر حال میں ایک ہی ہوگا۔

اور اس اُمّت کے پاس دینِ الٰہی کی ذمّہ داری ہے کہ یہ ہر حال میں اللہ کی اطاعت وفرماں برداری کے مطابق زندگی گذارے اور دنیا میں سکون وامن برقرار اسی صورت رہ سکتا ہے کہ اللہ کا دین نافذ ہو جس میں ساری انسانیت کے لئے فلاح کا پیغام ہے۔

## اُمّتِ مسلمہ کی ذمّہ داری (دین کی اقامت)

دین کے لغوی معنیٰ اطاعت کے ہیں اس کا مطلب ہے کہ اللہ کی بندگی کا وہ طریقہ اور زندگی گذارنے کا وہ نظام جو اللہ ربّ العالمین نے اپنے پیارے رسول محمد الرسول ﷺ کے ذریعے اس کے بندوں کو عمل کے لئے دیا ہے۔

دنیا اپنی مرضی اور فکر کے مطابق جب زندگی گذارنے کے طور طریقے اپناتی ہے تو معاشرے کا ہر فرد اس ظلم واستحصال کا شکار ہوتا ہے جو انسانی خیالات کے باعث پیدا ہوتے ہیں، دینِ حق نے انسانیت کی بہتری کے لئے اس کی ذاتی اور اجتماعی زندگی کے ہر مسئلے کی رہنمائی دی اور ہر شعبہ زندگی اس دائرہ میں محفوظ کر دیا۔

"یہ دین انسانی عقل وفہم اور اس کے دل کی گہرائیوں سے شروع ہو کر اس کی عبادت گاہوں، اس کے گھر کی چاردیواریوں، اس کے خاندانی حلقوں، اس کے تمدّنی اداروں سے ہوتا ہوا اس کے تمام اجتماعی اور بین الاقوامی مسئلوں کے آخری کنارے تک پہنچتا ہے اور ہر مسئلے، ہر معاملے اور ہر شعبے کے متعلق اپنی مستقل ہدایات دیتا ہے۔ وہ انسان کی کسی ایسی نجی اور پرائیویٹ زندگی کا بلکل قائل نہیں جس میں وہ اپنی سی کرنے میں آزاد ہو۔" (۷)

## اقامتِ دین

اُمّتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود یہی اقامتِ دین جس کی اقامت کی ذمہ داری اُمّت کے ہر فرد کی ہے جس نے ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کا دعویٰ کیا۔ اقامتِ دین کے بارے میں قرآن کا ارشاد جو اس سے پہلے بھی مذکور ہوا:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ o (۸)

ترجمہ: ''مسلمانو! اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر فرمایا ہے جس کا حکم اس نے حضرت نوح علیہ السلام کو دیا تھا اور جس کی (اے نبی ﷺ) ہم نے آپ پر وحی کی ہے اور جس کا حکم ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا کہ اس دین کو قائم کرو۔''

اسلام کے عادلانہ نظام پر ہر زمانے حالات وتغیرات، تاویلات، بدعات، عجمی اثرات، مشرکانہ اعمال، مادیت پرستی، نفس پرستی، تعصّبات، الحاد و لادینیت اور عقلیت پرستی کا بار بار حملہ ہوا مگر اُمّتِ مسلمہ کے ضمیر نے صلح کرنے سے انکار کر دیا اور اسلام کے رُوح نے شکست نہیں کھائی۔ ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوئے جنہوں نے باطل کا پردہ چاک کیا اور حقیقتِ اسلام اور دین خالص کو اُجاگر کیا۔ اپنے زمانے کے مترفین کی مذمت کی اور سلاطین کے سامنے کلمۂ حق بیان کیا۔ عقلیت پرستی کا طلسم توڑا اور اسلام میں نئی قوت و حرکت اور مسلمانوں میں نیا ایمان اور نئی زندگی پیدا کر دی۔ یہ افراد دماغی، علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانے کے ممتاز ترین افراد تھے اور طاقتور اور دل آویز شخصیتوں کے مالک۔ جاہلیت اور ضلالت کی ہر نئی ظلمت کے لئے کوئی نہ کوئی ید بیضاء تھا، جس سے انہوں نے تاریکی کا پردہ چاک کیا اور حق روشن ہو گیا۔

دراصل اللہ تعالیٰ کو اس دین کا کام اسی اُمّت سے لینا ہے اور جو کام پہلے وہ نبوت اور انبیاء سے لیتا رہا

اب وہ اپنے نائبین اور اُمّت کے مجددین و معلّمین سے لے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان اللّٰہ عزوجل یبعث لھذہ الامة علی راس کل مأة سنة من یجددد لھا دینھا(۹)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ اس اُمّت کے لئے ہر سو سال کے سرے پر ایسے بندے پیدا کرے گا جو اس کے لئے اس کے دین کو تازہ کرتے رہیں گے۔''

حضرت شاہ ولی اللہؒ اس حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ اس علم یعنی دین کی امانت کو ہر زمانے کے اچھے اور نیک لوگ سنبھالیں گے اور اس کی خدمت اور حفاظت کا حق ادا کریں گے۔ وہ افراط وتفریط والوں کی تحریکوں سے اور کھوٹے سکے چلانے والوں کی طمع کاریوں سے اور جاہلوں کی فاسد تاویلوں سے اس دین کی حفاظت کریں گے۔''(۱۰)

پھر ان تعلیمات اور ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبوت سے انسانیت کو سرفراز کیا اور رسول اللہ ﷺ کو ایسی کامل، مکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں جو یہ کشمکش اور تبدیلی کا آسانی سے مقابلہ کر سکتی ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف میں مجددین و مصلحین کی فکر اور عملی کوششوں کے سبب ملتِ اسلامیہ کے اندر اپنی بیداری کا شعور پیدا ہوا اور آہستہ آہستہ مغرب تسلّط کے خلاف تحریکیں اُٹھیں ان تحریکات کے اصل بانی اسلامی فکر کے حامل مصلحین اور مجاہدین تھے۔ مغربی تسلّط کے غلبہ اور اقتدار کے خلاف ان کی صلح کی کوششیں رنگ لائیں اور مسلمانوں کو آزادی نصیب ہوئی۔

''آزادی کے باوجود فکری طور پر ان ممالک میں جو نظام جاری وساری رہا وہ مغرب کا پروردہ اور تیار شدہ ہے چنانچہ اسلامی نظام کے قیام اور شریعت اسلامیہ کی تنفیذ کے لئے اور اسلام کو مکمل نظامِ حیات کی شکل میں پیش کرتے ہوئے اسلامی تحریکات نے کوششیں شروع کیں۔''

چنانچہ بیسویں صدی کی یہ اسلامی تحریکیں مجددین و مصلحین کی فکر و فلسفہ کی امین ہیں اور انہی ملی اور قومی ضرورتوں اور تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنے اپنے علاقوں میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے عملی طور پر کوشاں ہیں۔

سوڈان، الجزائر، انڈونیشیا، ملائشیا، افغانستان، پاکستان، مصر و شام، ایران، وسط ایشیا میں اسلامی بیداری اور ملتِ اسلامیہ کی سیاسی احیاء کی جو لہر اُٹھی ہے ان میں اسلامی تحریکات کا بڑا کردار ہے۔ مغرب کے فلسفۂ حیات اور اشتراکیت کی خام خیالیوں کا ابطال نوجوانوں کو تہذیب حاضر کی مضر رسانی سے آگاہی اور تہذیب و تمدّن کی فوقیت و برتری ان کے مقاصد اور ہدایات ہیں۔

> ''آج پورے کرۂ ارض پر مغربی افکار و نظریات اور انسان اور کائنات کے بارے میں وہ تصوّرات پوری طرح چھائے ہوئے ہیں جن کی ابتداء یورپ میں ۲ صدی پہلے ہوئی تھی اور جو اس کے بعد مسلسل مستحکم ہوئے اور پروان چڑھتے چلے گئے۔''

آج کی دنیا سیاسی اعتبار سے خواہ کتنے ہی حصوں میں منقسم ہو، ایک طرزِ فکر اور نقطۂ نظر پوری دنیا پر حکمران ہے اور ایک ہی تہذیب اور تمدّن کا سکہ پوری دنیا میں رائج ہے۔(۱۱)

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں خلافتِ عثمانیہ کی قبا مغربی فکر و فلسفہ، تہذیب، تمدّن کے دلدادہ، مصطفیٰ اتاترک نے چاک کر دی اور مغرب کے پھیلائے ہوئے قومیت، وطنیت، الحاد و دہریت کے جال میں اُمّتِ مسلمہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور یہ اُمّت مختلف ممالک میں بٹ کر مغرب کی استعماری طاقتوں کے لئے لقمۂ تر بن گئی۔

چنانچہ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ کے ساتھ ہی احیاءِ اُمّت اور اسلامی بیداری کی تحریکات کا آغاز ہو گیا تھا اور مغربی تسلّط کے خلاف آزادی کی تحریکات شروع ہو گئی تھیں البتہ بیسویں صدی کے نصف میں ان میں تیزی آئی، آزادی کی ان تحریکات کا اصل مقصد اسلام کی نشاط ثانیہ، خلافتِ عثمانیہ کا احیاء اور اور اقامتِ دین کا قیام تھا۔ چنانچہ ان تحریکات نے پہلے تو مغربی استعماریت سے نجات حاصل کی اور اب یہ تحریکات اپنے اپنے ملک میں اسلامی فکر کے احیاء اور شریعت کے نفاذ کے لیے عملی طور پر کوشاں ہیں۔

## تحریکِ احیاءِ دین کا مفہوم

''اسلام ایک نظریہ نہیں پیش کرتا بلکہ اس کو قائم کرنے، چلانے اور زمین پر نافذ کرنے کے لیے ایک تحریک بھی برپا کرتا ہے۔''

حرکتِ اسلامی یا تحریکِ احیاء، وسیع معنیٰ اور مفہوم رکھتی ہے اس سے مراد وہ اجتماعی سرگرمیاں ہیں جن کا مقصد اسلام کی عظمتِ رفتہ کو بحال کرنا ہے تاکہ اسلام معاشرے کی قیادت کر سکے اور پوری انسانی زندگی اس کے احکامات وقوانین کے عین تابع ہو جائے۔ تحریکِ احیاءِ اسلامی سراپا عملِ پیہم اور جہدِ مسلسل کا نام ہے۔

تحریک ایک ہمہ جہتی عمل ہے۔ یہ بالیدگی بخشنے والا ایک فکری عمل ہے، یہ جوش دلانے والا ایک دعوتی عمل ہے جو دل کے تاروں کو چھیڑتا ہے، یہ ایک ایسا تکوینی عمل ہے جو اسلامی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے، یہ ایک ایسا سماجی عمل ہے جو معاشرے کے مسائل کو حل کرتا ہے اور اس میں بھلائیوں کو فروغ دیتا ہے، یہ ایک ایسا سیاسی عمل بھی ہے تاکہ اسلام کے احکامات کا نفاذ، اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آسکے، شریعتِ اسلامی کا بول بالا اور ملت کی شیرازہ بندی کی جائے، یہ ایک جہادی عمل بھی ہے تاکہ اس وقت کے طول وعرض میں سرزمینِ اسلام کو بیرونی تسلّط اور داخلی بغاوت سے نجات مل جائے۔'' (۱۲)

## تحاریکِ اسلامی کا تاریخی کردار

قرآنِ کریم نے مسلمانوں کو حق و باطل کے جس معرکے کی تیاری کا حکم دیا ہے، جس کشمکش کو بیان کیا ہے وہ اس تحریکِ اسلامی کی جدوجہد کا ایک خاکہ ہے اور وہی اسلام کی تاریخ میں نمایاں اور تابناک دور رہا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے مبارک دور کے بعد جب بھی غیر معیاری صورتِ حال پیدا ہوئی، بدعت و جہالت کی ملاوٹ کی ناپاک کوشش کی گئی، جبر واستبداد کی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد ہوئی، تحاریکِ اسلامی کے علم برداروں نے اس کا بروقت نوٹس لیا، اُمّت کو خطرات سے آگاہ کر دیا اور اسلامی تحریک کی روایات کی حفاظت کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ (۱۳)

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے شخصی آمریت کا مقابلہ کیا اور اپنے خون کا نذرانہ پیش کر کے اُمّت کو جبر واستبداد کے خلاف صف آراء کر دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے شاہی میں فقیرانہ روش اختیار کی تو تحریکِ اسلامی کو باطل کے مقابلے میں بہت قلیل مدت کامیابی حاصل ہوئی، حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ، حضرت بنوعباس رضی اللہ عنہ کے دور میں جبری بیعت کے خلاف آواز بلند کر کے تحریکِ اسلامی کے کاز کو تقویت پہنچاتے ہیں، حضرت امام ابوحنیفہؒ ملوکیت کے حقِ وراثت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور تحریک کو آگے بڑھاتے ہیں، امام احمد بن حنبلؒ خلقِ قرآن کے مسئلے میں قرآن وسنت کے ماسوا تمام دلائل کو رد کر دیتے ہیں، امام غزالی ؒ ، حسن بصریؒ، امام بن تیمیہؒ، ابن قیمؒ، مجدد الف ثانی ؒ ، شاہ ولی اللہؒ، محمد بن عبدالوہابؒ، علامہ اقبالؒ، حسن البناء، سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ وغیرہ یہ تحریکِ اسلامی کے مایہ ناز سپوت ہیں۔ جنہوں نے تحریفات وتاویلات، عجمی اثرات، مشرکانہ رسوم، مادیت اور نفس پرستی، لادینیت وعقل پرستی وغیرہ کے خلاف آواز بلند کی اور سینہ سپر ہوئے اور دینِ خالص اُجاگر کرنے کی جدوجہد کرتے رہے، انہوں نے عوام الناس کو اتنا بیدار رکھا کہ انہوں نے تمام غیر اسلامی رجحانات اور اقدار کے ساتھ مصالحت اور سودے بازی سے انکار کر دیا۔

ان تحریکوں کے تذکرے نے واضح کیا کہ گذشتہ تحریکوں کی وارث بیسویں صدی میں مسلم دنیا کی ایک بڑی قوت احیائے اسلام کی تحریکیں رہی ہیں جو اپنے مزاج، ساخت، طریقۂ کار اور حکمتِ عملی کے لحاظ سے گذشتہ صدیوں کی مسلم جماعتوں سے کسی حد تک مختلف تھیں۔ ان تحریکوں نے انفرادی اور روایتی دین داری میں اجتماعیت اور حرکت پیدا کرنے اور ایمان وعمل کی طاقت کو بدلتے ہوئے حالات میں شعوری طور پر منتقل کرنے کی بڑی کوشش کی۔ نئی نسل میں دبے ہوئے اسلام کے انقلابی کردار کو ازسرِ نو متحرک کرنے اور اسلام کو انسانی زندگی کی قوت کا سرچشمہ ثابت کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

فصل دوم

# اُمّتِ مسلمہ کا عروج و زوال

## سترھویں صدی مسلمانوں کے عروج کی آخری صدی

جیسا کہ اُمّتِ مسلمہ کی ذمہ داریوں کے حوالے سے قرآن و حدیث کے احکامات کے تحت تاریخ میں ایک بڑی انقلابی جدوجہد اور اسلامی باوقار حکومتیں زمین پر پوری قوت کے ساتھ اُبھرتی ہیں۔

۱۔ مسلمان دنیا میں ایک ہزار سال تک سرداری کے اہل رہے۔ اقوام کے ذہنوں کو کھولنے اور ان محکم اُصولوں تک رہنمائی کرنے میں اسلام کے ایک زبردست عامل کی حیثیت سے کام کیا۔ اس سے پہلے کی قومیں ایک شدید قسم کے مذہبی استبداد اور پیشوائیت کے تسلّط میں جکڑی ہوئی تھیں، جس نے ان کے افکار و آراء پر بند باندھ رکھے تھے اور ان کے جسم اور مال کو اپنے شکنجے میں کس رکھا تھا۔(۱۴)

۲۔ سترھویں صدی عیسوی مسلمانوں کے عروج کی آخری صدی تھی۔ دنیا کی سب سے بڑی طاقت اور سب سے بڑی تہذیب تھی۔ مشرق میں انڈونیشیا سے لے کر مغرب میں بحراوقیانوس کے ساحل تک اور شمال میں نیکری سے لے کر جنوب میں ایک طرف راس کماری اور دوسری طرف غانہ تک مسلمانوں کی حکومتیں قائم تھیں۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی عظیم الشان حکومت قائم تھی، ایران میں صفوی خاندان کا دور تھا، بغداد سے الجزائر تک اور ہنگری سے عدن تک عثمان سلطنت کا پرچم لہرا رہا تھا اور مغرب اقصیٰ میں مراکش سے سوڈان تک مراکش کے خاندان فلالی کی حکومت قائم تھی۔ گویا اسلامی دنیا کا بیشتر حصہ چار بڑی حکومتوں میں منقسم تھا، خوشحالی کا دور دورہ تھا۔(۱۵)

شاہ عبدالحق، مجدد الف ثانی اور حاجی خلیفہ جیسے اہلِ علم اصحاب اور بے دل جیسے شاعر، اُستاد حامد اور احمد جیسے ماہرِ فنِ تعمیر اسی دور میں پیدا ہوئے۔ تاج محل، لال قلعہ دہلی اور لاہور کی جامع مسجد، اصفہان کی شاندار

عمارتیں لاہور اور کشمیر کے باغ اسی زمانے میں تعمیر ہوئیں۔ ڈھاکہ کی ململ، ملتان کی تلواریں، نیپال کا ریشم، ایران اور ترکی کے بہترین قالین اسی سترھویں صدی میں بنائے گئے۔ آبادی کے لحاظ سے بھی اسلامی دنیا کے شہر یورپ کے شہروں سے زیادہ خوب صورت تھے، استنبول، قاہرہ، ڈھاکہ، دہلی، لاہور یورپ کے شہروں کے مقابلے میں ترقی اور علم و ہنر میں یکتا تھے۔

ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ مسلمان دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنے رہے۔ ۱۷۰۰ء میں اس عروج کا خاتمہ ہوا۔ (۱۶)

## عروج کے دو (۲) دور

مسلمانوں کے عروج کے اس دور کو دو (۲) حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا دور ۱۲۵۷ء تک جبکہ بغداد تباہ ہوا۔

دوسرا دور ۱۲۵۷ء سے ۱۷۰۰ء تک جبکہ یورپ کا غلبہ شروع ہوا۔

پہلے دور کی خصوصیت یہ تھی کہ اس دور میں مذہبی جوش و خروش بہت تھا، عربی زبان ہر جگہ چھائی ہوئی تھی۔ پوری اسلامی دنیا کا ایک دوسرے سے تعلق قائم تھا۔ علم و فضل کی ترقی کا اگر جائزہ لیا جائے تو علماء کا طویل سلسلہ قائم نظر آتا ہے: امام غزالیؒ، بوعلی سیناؒ، رازیؒ، ابن زبیر البیرونیؒ، ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، طبریؒ، مسعودیؒ جیسے اہلِ علم اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مثالی شخصیات نے مذہب، طب، سائنس، غرض ہر چیز پر کتابیں لکھیں۔ یہ مسلمانوں کی جدت اور دانش مندی کا دور تھا اور دنیا کا کوئی ملک علمی معاملات میں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

## عروج کا دوسرا دور

دوسرا دور اس سے مختلف تھا۔ سیاسی ہیئت سے تو اس زمانے میں بھی مسلمانوں کا عروج رہا بلکہ ان کی سلطنت کی حدود پہلے سے بھی بڑھ گئیں، وہ پاک و ہند، روس کے بڑے حصے اور انڈونیشیا پر غالب آ گئے۔ ہر جگہ اسلام کا بول بالا ہو گیا لیکن علمی لحاظ سے یہ زمانہ بہت خراب رہا۔ طب، ریاضی، فلسفہ سائنس میں بالکل

کتابیں نہیں لکھی گئیں، جغرافیہ پر بھی کوئی اچھی کتاب نہ لکھی جا سکی، سیاح بھی اس دور میں نہیں پیدا ہوئے، حالانکہ دنیا کی ترقی کے لئے یہی علوم ضروری ہیں۔

یہ تقلید کا دور تھا جس میں پچھلے علماء کی تقلید کی گئی اور انہی پر تکیہ کیا گیا۔ تقلید پر زور اور اجتہاد سے فرار صرف علماء دین تک ہی محدود نہ تھا دنیوی علوم اور حکمت اور معقولات کے دعوے دار بھی اس مرض میں مبتلا تھے۔

مسلمانوں کے دورِ عروج کے آخری حصے میں یعنی سقوطِ بغداد کے بعد علم امراض چشم میں آخری بڑا اضافہ جمال الدین کمال نے کیا۔ اندلس میں متعدی امراض سے متعلق ابن خطیب (۱۳۱۳ تا ۱۳۷۴) اور گردشِ خون سے متعلق ابن نفیس (۱۲۱۰ تا ۱۲۸۸) کی تحقیقات علم طب میں مسلمانوں کے آخری بڑے اضافے ہیں۔

اس طرح ارسطو کی منطق پر ابن تیمیہ (۱۲۶۳ تا ۱۳۲۸) کی اجتہادی انداز میں تنقید اور فلسفۂ تاریخ اور فلسفۂ اجتماعیت کی ابنِ خلدون کے مقدمہ میں وضاحت فکری میدان میں مسلمانوں کے آخری اضافے ہیں۔ ابن ماجہ (پندرھویں صدی) آخری مسلمان جہاز ران ہے جس کے آلات جہاز رانی یورپ کے جہاز رانوں کے آلات سے بہتر تھے۔ سقوطِ بغداد کے بعد ابن بطوطہ (۱۳۰۴ء تا ۱۳۷۷ء) اور اولیاء چلپی (۱۲۱۶ء تا ۱۶۷۹ء) کے علاوہ اسلامی دنیا میں سیاح نہیں پیدا ہوا۔ بارود اور آتشیں اسلحہ کو استعمال کرنے والے مسلمان ہی تھے۔ ۱۴۵۳ میں فتح قسطنطنیہ کے موقع پر اور سولہویں صدی کے وسط میں دکن میں مسلمانوں نے جو بڑی اور بھاری توپیں استعمال کی تھیں اس کے بعد وہ اسلحہ سازی میں کوئی اضافہ نہ کر سکے۔ غرض یہ کہ جو ایجادات و اختراعات کے لحاظ سے مسلمانوں پر جمود طاری ہو گیا اور عروج کا دور ختم ہوتا چلا گیا۔ (۱۷)

## مسلمانوں کے عروج کے اسباب شکیب ارسلان کی نظر میں

دنیائے اسلام کے ادیب اور مفکر امیر شکیب ارسلان نے گذشتہ عروج کا بنیادی سبب لکھتے ہیں کہ:

''مسلمانوں کی گذشتہ ترقی کا باعث حقیقی جزیرۂ عرب میں اسلام کا ظاہر ہونا تھا جس نے عربوں کے مختلف فرقوں کو ایک قوم بنادیا اور بت پرستوں کو خدائے واحد کے سامنے جھکا دیا۔ گویا ان کی پہلی روحیں کھینچ لی گئیں اور بالکل نئی روحیں ان کے جسموں میں داخل کر دی گئیں۔ اس اندرونی تبدیلی ہی سے ان میں اس قدر طاقت پیدا ہوگئی کہ وہ عزت وشان، علم وہنر اور دولت وثروت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گئے اور پچاس سال کے عرصے میں آدھی دنیا کو فتح کر لیا۔ اگر حضرت عثمان غنیؓ اور ان کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریمؓ کی خلافت کے دوران باہمی اختلافات سر نہ اُٹھاتے تو مسلمان ضرور تمام دنیا کو فتح کر لیتے۔ (۱۸)

## یورپ کے عروج میں مسلمانوں کا حصہ

اسلامی تاریخ کے ابتدائی پانچ سو سال کے دوران جب کہ مسلمان تہذیب وتمدن اور علم وفن میں ساری دنیا سے آگے تھے اور یورپ کے رہنے والے غیر مہذب زندگی گذارتے تھے یہ زمانہ یورپ کی تاریخ میں تاریک دور کہلاتا ہے۔ ان کے یہاں نہ بڑے بڑے شہر تھے نہ طاقتور اور منظم حکومتیں اور نہ اسلامی دنیا کی طرح شاندار مدرسے، شفا خانے، کتب خانے، مسافر خانے اور حمام۔ عربوں سے تعلقات، عربی اور یونانی کتابوں کے لاطینی ترجموں اور یورپ کے مخصوص سماجی اور معاشی حالات کی بدولت وہاں نشاۃ ثانیہ اور تحریکِ اصلاح کا آغاز ہوگیا تھا۔ (۱۹)

انہوں نے کئی نئی ایجادات کیں۔ سستے کاغذ کی تیاری اور وسط پندرھویں صدی میں چھاپے خانے کی ایجاد اہم تھی۔ اس سے یورپ میں کتابیں عام ہوگئیں اور علوم وفنون کو فروغ حاصل ہوا۔

قطب نما بھی مسلمانوں کی ایجاد تھا، اس کی مدد سے یورپ کے جہاراں ساری دنیا کے گرد چکر لگانے لگے۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز اٹلی، ھولی فراش اور اسپین سے ہوا یہ وہ ممالک تھے جو اسلامی دنیا کے قریب

تھے اور جن کے مسلمانوں سے تعلقات قائم تھے۔

یورپ والوں نے مسلمانوں سے کاغذ بنانا، ہندسوں کا اور صفر کا استعمال سیکھا۔ اندلس کے شہر طلیطلہ میں ۱۰۸۵ء کے بعد دو سو سال تک عربی کتابوں کی لاطینی زبان میں ترجمے ہوتے رہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ صقلیہ، اٹلی اور جنوبی فرانس تک پھیل گیا۔ اطالوی شاعر دانتے کی کتاب طربیۂ خداوندی اور ہسپانوی ادیب سروانتے کی کتاب ''دان کوئک زوت'' کو یورپ کے ادب کے اخبار میں بنیادی مقام حاصل ہے لیکن یہ دونوں کتابیں مسلمان مصنّفین کے زیر اثر لکھی گئیں۔ پہلی کتاب ابن عربی کی فتوحات مکیّہ سے ماخوذ ہے۔ راجر بیکن کو اور فرانس بیکن کو یورپ کی علمی نشاۃ ثانیہ میں بنیادی مقام حاصل ہے۔ لیکن ان دونوں نے عربی کتابوں سے استفادہ کر کے یورپ میں علم و حکمت کی بنیاد ڈالی۔ رازیؒ، ابن سیناؒ، ابن رشدؒ، غزالیؒ، ابن عربی، ابن حزم اور ابن منتہج وہ ممتاز مسلمان حکماء تھے جن کی تحریروں نے یورپ میں نئی بیداری پیدا کی۔ مشہور فرانسی محقق موسیو دنان نے کولمبس کے ایک خط کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابنِ خلدون ان مصنّفین میں سے ہے جس کی تصنیفات پڑھ کر کولمبس کو امریکہ کے وجود کا خیال پیدا ہوا۔ (۲۰)

یورپ کی نشاۃ ثانیہ پر مسلمانوں کا جو اثر پڑا اس کو اہل یورپ جانتے ہیں اور یہ مسلمانوں کے عروج کی ایک بڑی دلیل ہے۔ چنانچہ مغربی مصنف لکھتا ہے:

''اگرچہ یورپ کی ترقی اور نشو و نما کا ایک بھی پہلو ایسا نہیں جس پر مسلمانوں کا اثر نہ پڑا ہو، لیکن مسلمانوں کا یہ اثر تحقیق کے میدان میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔'' (۲۱)

موسیو دنیان نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ:

''مراکش اور قاہرہ میں جو کتاب لکھی جاتی تھی وہ اس سے کم مدت میں جتنی کہ آج کل ایک اہم کتاب جرمنی سے رائن پار پہنچے، پیرس یا کولون میں مشہور ہو جاتی تھی۔'' (۲۲)

مغربی دنیا نے جس طرح مسلم دنیا کی اصلاحات سے فائدہ اُٹھایا وہ ان اصلاحات میں مزید کام کر کے ترقی کی شاہرہ پر روانہ ہوئی اور مسلمانوں کا دورِ عروج جمود اور تقلید کا شکار رہا۔

فصل سوم

# مسلمانوں کے زوال کے اسباب

دنیائے اسلام حقیقت میں ایک دار الاسلام تھی اگرچہ اس کے مختلف حصوں میں الگ الگ حکومتیں پائی جاتی تھیں اس دار الاسلام کی ہر حکومت کیلئے پوری اسلامی دنیا کی افرادی قوت قابلِ حصول تھی، ہر مسلمان ہر مسلم حکومت کا وفادار تھا اور اسلامی حکومتوں کی حفاظت و مدافعت تمام مسلمانوں کی مشترکہ ذمہ داری تھی۔ مسلمان جب اپنی اس اہم ترین ذمہ داری کی قدر و قیمت بھی فراموش کر گئے۔ مغربی قومیں جب اسلامی دنیا پر چھاپے مارتی آگے بڑھیں تو مسلمانوں نے تلوار کے ہی نہیں تہذیب و فلسفہ کے محاذ پر بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ ان اسباب زوال کا ہم اگر جائزہ ترتیب وار لیں تو محقق اور مفکرین کی رائے تاریخ کے اوراق پر یوں نظر آتی ہے۔

## اسباب زوالِ اُمّت

پہلا سبب: مالی اور جانی جہاد سے پہلو تہی

اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے قرآن میں وعدہ فرمایا ہے:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَo(۲۳)

ترجمہ: ''عزت تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور مومنون کے لئے ہے۔''

اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ تھا۔ نہ تو اللہ اپنے وعدہ سے پھرا نہ قرآن بدلا بلکہ مسلمان بدل گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تنبیہ فرمائی تھی:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْo(۲۴)

ترجمہ: ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدلتی۔''

اگر اللہ کسی انسان کو بغیر کوشش کے اور بغیر محنت کے مدد دے دیتا تو اپنے رسول ﷺ کو لڑائیوں کے بغیر فتح مند کر دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے قرآن میں جو وعدہ فرمایا وہ تو مشروط تھا۔ جب مسلمانوں نے اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا، راہِ خدا میں لڑنا چھوڑ دیا تو ذلت اس کے اُوپر غلبہ پاتی چلی گئی۔

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَ اَمۡوَالَھُمۡ بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّۃَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَ یُقۡتَلُوۡنَ وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىۃِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ وَ الۡقُرۡاٰنِ وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِعَھۡدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِہٖ وَ ذٰلِکَ ھُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ۝ (۲۵)

ترجمہ: ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔ ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمّہ ایک پختہ وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔''

مسلمان اب ان اوصاف پر پورے نہیں اُترتے اور نہ مسلمانوں میں صحابۂ کرام ؓ کی سی وہ قربانیاں موجود ہیں کہ وہ صحابۂ کرام ؓ جو میدانِ شہادت میں خود اپنی موت کو تلاش کیا کرتے تھے، جب ان کے غازی کفار پر حملہ آور ہوتے تھے تو کہتے تھے ''ہم جنت کی خوشبو سونگھ رہے ہیں۔''

یورپین اقوام نے جنگِ عظیم میں اپنی ہستی اور حقوق کے لئے جو قربانیاں دی ہیں وہ انسانوں کی عقل سے بالاتر ہیں۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنوں نے جنگِ عظیم میں زبردست جانی اور مالی قربانیاں دیں ''روسیوں نے اپنی دولت کو اس کثرت سے خرچ کیا کہ ان کے ملک پر ہر طرف سے قحط کی مصیبت ٹوٹ پڑی اور پھر اسی قحط سے باتو یکی قحط نے جنم لیا۔'' (۲۶)

مسلمانوں نے جہاد کا راستہ ترک کیا، اپنے آباء کے نقش قدم کو چھوڑا اور صرف خدا سے مفت میں نصرت وتوفیق کا مطالبہ کرنے لگے، حالانکہ اللہ خود فرماتا ہے:

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ o (۲۷)

ترجمہ: ''اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔''

یعنی اللہ کے دین کو قائم کرنا جو مسلمانوں کی ذمّہ داری ہے وہ اس کی زمین پر نافذ کریں یہی اللہ کی اور اللہ کے دین کی مدد ہے۔

اِنْ تَنْصُرُوْا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ o (۲۸)

ترجمہ: ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جمالے گا۔''

# حواشی وحوالہ جات (باب اوّل)

(۱) مصطفیٰ حجازی: ''المعجم الوجیز'' المرکز العربی لثقافۃ والعلوم، بیروت ولبنان، ۱۹۸۰ء، ص: ۲۵

(۲) القرآن (۳:۱۱۰)

(۳) ایضاً (۲:۱۴۳)

(۴) بخاری، محمد بن اسمٰعیل البخاری ''صحیح بخاری'' امجد اکیڈمی لاہور، جلد: دوم، باب: امر بالمعروف والنہی عن المنکر

(۵) القرآن (۳:۱۰۴)

(۶) ایضاً (۴۲:۱۳)

(۷) اصلاحی، صدرالدین ''فریضۂ اقامتِ دین'' اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص: ۱۷

(۸) القرآن (۴۲:۱۳)

(۹) ابوداؤد، سلیمان بن اشعث ''سنن ابی داؤد'' مصر، مصطفیٰ البالی، ۱۹۵۲ء، باب: مایذکر فی قرن المدہ

(۱۰) الدہلوی، شاہ ولی اللہؒ ''حجۃ اللہ البالغہ'' مطبع منیریہ، ۱۳۵۲ھ، باب: الاعتصام بالکتاب والسنۃ

(۱۱) مودودیؒ، ابوالاعلیٰ سیّد: ''تجدید واحیائے دین'' اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص: ۱۳

(۱۲) ملک حافظ محمد سجاد: ''اسلامی تحریکات عہد جدید میں'' اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص: ۴۳

(۱۳) ایضا (محولہ بالا) ص: ۴۴

(۱۴) السباعی، ڈاکٹر مصطفیٰ ''اسلامی تہذیب کے درخشاں پہلو'' اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص: ۵۴

(۱۵) ثروت صولت ''ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ'' اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ج: ۲، ص: ۳۵۲

(۱۶) ایضاً (محولہ بالا) ص: ۲۵۶-۲۵۴

(۱۷) ایضاً (محولہ بالا)، ۳۵۶-۳۵۴

(۱۸) ارسلان امیر شکیب ''اسباب زوال اُمت''، دعوۃ اکیڈمی اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص:۹

(۱۹) ثروت صولت ''ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ''، ص:۳۶۰

(۲۰) موسیو دینان ''ابن رُشد وفلسفہ ابن رُشد'' مکتبہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، دکن، ۱۹۲۹ء، ص:۳۰۶

(۲۱) ثروت صولت ''ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ''، ص:۳۱۱

(۲۲) موسیو دینان ''ابن رُشد وفلسفہ ابن رُشد''، ص:۲۰۱

(۲۳) القرآن (۸:۶۳)

(۲۴) ایضاً (۱۱:۱۳)

(۲۵) ایضاً (۱۱۱:۹)

(۲۶) A History of Russia "George Vernadaky"

(۲۷) القرآن (۲۲:۴۰)

(۲۸) ایضاً (۴۷:۷)

# باب دوم

# اسلامی دنیا کی بیداری


فصل اوّل : شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ

فصل دوم : سنوسی تحریک

فصل سوم : اخوان المسلمون

باب دوم

# اسلامی دنیا کی بیداری

فصل اوّل

## شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ

(ان کی پیدائش ۱۷۰۳ء میں ہوئی۔ ۱۷۲۰ء سے ۱۸۰۰ء تک ان کا زمانہ تھا۔)

ایک عظیم مصلح اور مجدد کے نام سے تاریخ کے ماتھے پر جھومر کی طرح ہیں جن کی عظیم اسلامی اور انقلابی تحریک نے معاشرے کے کفر و جہل اور تاریکی کو نہ صرف روشنی اور تابندگی عطا کی بلکہ نجد کے چمنستان سے توحید اور حق پرستی کی ایسی خوشبو پھیلی کہ جس نے تمام عالم کو زعفران زار بنا دیا۔

ان کے دور کا جائزہ لے کر ہی ان کے کارناموں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بارہویں صدی کی اسلامی دنیا کا سرسری جائزہ لیتے ہیں تو اس دور کی یہ صورتِ حال سامنے آتی ہے کہ دنیا ایک بار پھر تاریکی کے سفر پر روانہ ہو چکی تھی۔ مسلمان کتاب و سنت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے تھے۔ ملتِ اسلامیہ کی اس دور میں پستی اور زبوں حالی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ غیر مسلم بھی دورِ اوّل کے مسلمانوں سے ان کا تقابلی جائزہ لیتے تو اظہارِ رنج کرتے تھے۔

اسلامی رنگ زندگی سے اس حد تک جدا ہو چکا تھا کہ مذہب موجود ہونے کے باوجود کہیں مذہبیت کا نام و نشان نظر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ مسعود عالم ندوی ان بدترین حالات کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں:

> ''مذہب بھی دیگر اُمور کی طرح پستی میں تھا، تصوّف کے طفلانہ توہمات کی کثرت نے خالص اسلامی توحید کو ڈھک لیا تھا، مسجدیں ویران اور سنسان پڑی تھیں، جاہل عوام ان

سے بھاگتے تھے اور تعویذ و گنڈے اور توہمات میں پھنس کر گندے فقیروں اور دیوانے درویشوں پر اعتقاد رکھتے تھے اور بزرگوں کے مزاروں پر زیارت کو جاتے جن کی پرستش بارگاہِ ایزدی کے شفیع ولی کے طور پر کی جاتی تھی۔ کیونکہ ان جاہلوں کا خیال تھا کہ خدا کی برتری کے باعث وہ اس کی اطاعت بلاواسطہ نہیں کرسکتے تھے۔ قرآنِ کریم کی تعلیم نہ صرف پس پشت ڈال دی گئی تھی بلکہ اس کی خلاف ورزی بھی کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ مقاماتِ مقدسہ بداعمالیوں کا مرکز بن گئے تھے اور حج جس کو رسول اللہ ﷺ نے فرائض دین میں داخل کرلیا تھا بدعات کی وجہ سے حقیر ہو گیا تھا۔ فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی اگر رسول اللہ ﷺ پھر دنیا میں تشریف لاتے تو اپنے پیروؤں کے ارتداد کو اور بت پرستی کو دیکھ کر ان سے بیزاری کا اظہار فرماتے۔''(۱)

یہ صورتِ حال تھی جس سے نجد اور اہلِ نجد بھی اس سے آگے نکل کر انحطاط کی حد سے گذر چکے تھے۔ اہلِ نجد اخلاقی طور پر بھلائی، بُرائی کے معیار سے دور ہو چکے تھے، مشرکانہ عقیدے دلوں میں گھر کر چکے تھے، ان خرافات ہی کو لوگ دین کا صحیح نمونہ جانتے تھے۔

سیاسی حالت اور بھی خراب تھی۔ اس پر آشوب دور اور موافق حالات میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نے آنکھیں کھولیں۔ آپ عینیہ کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ ایک غیر معمولی حساس دل کے مالک تھے، اپنے چاروں طرف نجد کی بستیوں کی خراب حالت دیکھ کر بے حد پریشان ہوتے اور ان کی اصلاح وسدھار کے لئے جوش اور ولولہ ان کے دل میں پیدا ہوجاتا لیکن انہوں نے اصلاحِ احوال کے لیے علم وتدّبر سے کام لیا۔ نجد کے علماء میں آپ کے والد ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے اپنے والد سے بھی آپ نے بھرپور استفادہ کیا اور پھر مزید علم حاصل کرنے کے لئے حجاز روانہ ہوگئے اور وہاں جاکر تحصیلِ علم میں پوری تندہی سے مصروف ہوگئے۔

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ نے طالب علمی ہی کے زمانے سے معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنے کا فریضہ انجام دینا شروع کیا۔

باقی اسلامی دنیا سے بھی اخلاقی بُرائیوں اور بدعتوں کو ختم کرنے میں انہوں نے کردار ادا کیا لیکن باطل پرستی کے اس دور میں حق کا غلبہ نفس پرستوں کو کہاں گوارا ہوتا ہے۔ایسے تمام طبقے ہمیشہ حق اور اہلِ حق کی مخالفت کا بیڑا اُٹھالیتے ہیں چنانچہ جہاں اسلام کے زندہ کرنے کی کوششیں تیز ہوئیں اہلِ باطل بھی اپنے ہتھیار لے کر میدان میں آگئے۔

## دعوتِ دین کی ابتداء

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ نے اقامتِ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ضروری سمجھا کہ اقتدار، ریاست کی عظیم طاقت کے حصول کے بغیر دعوت وتبلیغ کی یہ کوششیں کچھ زیادہ بار آور نہیں ہوسکتیں چنانچہ انہوں نے عینیہ کے امیر عثمان بن معمر سے خط وکتابت کی اور بگاڑ کی صورتِ حال اور اس کو دور کرنے کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلا کر دعوتِ دین دی۔امیر نے ان کی کوششوں کو سراہا اور انہیں دعوت دی تو شیخ عینیہ منتقل ہوگئے، انہوں نے امیر کے سامنے دعوت دوٹوک الفاظ میں رکھی ،توحید کا صحیح مفہوم سمجھایا اور اس عظیم کام میں امداد و تعاون کی استدعا کی جس کے جواب میں امیر نے امداد کا وعدہ کیا اور انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دعوت کھلم کھلا دینی شروع کردی اور رفتہ رفتہ اہلِ عینیہ کے دل قبولِ حق کی طرف مائل ہونے لگے۔

انہوں نے امیر کے تعاون سے بدعات کے ان مقامات کو ختم کیا جو درختوں اور قبّوں کی شکل میں تھے۔عوام تو عوام خواص نے بھی انہیں معبود بنالیا تھا، ہر شخص خیال کرتا تھا کہ جس نے ان مقامات یا چیزوں کو ہاتھ لگایا وہ تباہ ہوجائے گا مگر جب شیخ نے اپنے ہاتھ سے یہ کام کیا اور ان پر کوئی بلائے آسمانی نازل نہ ہوئی تب لوگوں کی آنکھیں کھلیں کہ واقعی یہ سب ڈھونگ ہے۔کوئی خدائی طاقت ان درختوں، قبروں اور قبّوں کو حاصل نہ تھی۔

عینیہ ہی میں شیخ نے حدود شرعیہ بھی نافذ کروائیں اور تبلیغی رسالوں کا سلسلہ بھی جاری کیا جو مرتے دم تک جاری رہا۔انہوں نے نماز باجماعت کے احیاء کی بھی کوششیں کیں اور اس سلسلے میں سستی ،غفلت اور ٹال مٹول سے کام لینے والوں کے لیے سزائیں تجویز کیں۔حکام طرح طرح کے ٹیکس وصول کرتے تھے، شیخ نے

تمام ٹیکس منسوخ کرائے اور زکوٰۃ کی وصولیابی اور خرچ کا نظام قائم کرایا۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے ایک بدنام مصلح صفحہ ۴۰ تا ۴۵۔

اس راہ میں ان کو ہر طرح کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے ان کی پرواہ کیے بغیر اپنے کام کو جاری رکھا۔ اسی دوران ۱۱۵۸ء کے قریب نجد شہر درعیہ کے امیر محمد بن سعود نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ انہوں نے فریضۂ اقامتِ دین پر عمل کرنے کا عہد کیا اور کتاب وسنت کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنے کے لیے آمادگی ظاہر کی۔ امیر محمد بن سعود کی مدد سے ان کی تحریک سارے نجد میں پھیل گئی اور امیر کی حکومت بھی شہر درعیہ سے بڑھ کر سارے نجد پر قائم ہو گئی۔

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ نے پچاس سال تبلیغ واصلاح کا کام انجام دینے کے بعد ۱۷۹۲ء میں وفات پائی۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ''کتاب التوحید'' بہت اہم ہے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نے پچاس سال تبلیغ واصلاح کا کام انجام دیا. گوکہ یہ ۱۷۹۲ء میں انتقال کر گئے تھے مگر بعد کے آنے والے تمام معلّمین اور اسلامی دنیا پر ان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ان کی کتاب ''کتاب التوحید'' احیائے اسلام کی تاریخ میں ایک اہم حیثیت رکھتی ہے۔ بعد کے آنے والوں نے اصلاح و تبلیغ کے ذریعے عوام الناس کو کتاب وسنت کی طرف بلایا اور ان تمام مصلحین کی ایک اور مشترک بات یہ تھی کہ یہ سب ایسی حکومتیں قائم کرنے میں کامیاب ہوئے تھے جو انیسویں صدی میں اسلامی حکومت کا ایک مکمل ترین نمونہ کہی جاسکتی ہیں۔

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ ان میں زیادہ مؤثر طریقے پر سعودیہ کی ایک ایسی مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے جو زیادہ پائیدار ثابت ہوئی اور آج تک اسلامی دنیا پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

درعیہ کے اسلامی حکومت کے پہلے امیر محمد بن سعود کا شیخ محمد عبدالوہابؒ کی زندگی ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۷۶۵ء تا ۱۸۰۳ء ان کا بیٹا عبدالعزیز تختِ نشین رہا۔ جس کے زمانے میں سعودی حکومت بحرین اور ساحل عمان تک پھیل گئی۔ اس کے بعد سعود بن عبدالعزیز ۱۸۰۳ء تا ۱۸۱۴ء کے دور میں سعودی حکومت نقطۂ عروج پر پہنچ گئی. حجاز پر بھی سعودیوں کا قبضہ ہو گیا اور سعودی فوجیں بصرہ، کوفہ اور شام تک پہنچنے کی

کوششوں میں لگ گئیں۔

معاشرتی بُرائیوں کے سد باب کے لئے چلنے والی تحریکِ شیخ ابن عبدالوہابؒ نے سعودی حکومت کے استحکام میں مرکزی کردار ادا کیا۔ سعودی حکومت قائم ہو جانے سے لوگوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔ جزیرہ نمائے عرب میں جہاں چوری، ڈکیتی عام تھی اور بڑے بڑے قافلے لوٹ لیے جاتے تھے، ایسا امن قائم ہوا کہ خلافتِ راشدہ کے بعد کبھی ایسا امن قائم نہ ہوا تھا اور مساوات کا یہ عالم تھا کہ ایک معمولی حبشی غلام بڑے سے بڑے قبیلے کے سردار کو یک وتنہا گرفتار کر کے درعیہ لے آتا تھا۔

اس دور میں ناجائز ٹیکس اُٹھا لیے گئے، شراب نوشی اور دوسری نشہ دار چیزوں کا استعمال جو عرب میں عام ہونے لگا تھا، ختم کر دیا گیا۔ قبر پرستی اور دوسری تمام شرک و بدعات ختم ہو گئیں اور شریعت پر لوگوں کا عمل بڑھ گیا۔

لڑائیوں میں اسلامی اُصولوں کے مطابق عمل کیا جاتا تھا اور مالِ غنیمت منصفانہ طریقہ پر سب فوج میں تقسیم ہوتا تھا۔ حکومت اگرچہ موروثی تھی لیکن حکمران اور عوام کے افراد کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہ تھا۔ حکمران بادشاہ کے بجائے امیر کہلاتا تھا۔ امیر سعود عام لوگوں کے ساتھ نماز باجماعت پڑھتا تھا۔ سب کے ساتھ قرآن وحدیث کے درس میں شریک ہوتا تھا اور خود بھی درس دیتا تھا۔ تمام فیصلے علماء کے مشورے سے کیے جاتے تھے۔ نظامِ حکومت ملوکیت پر مبنی تھا لیکن حکومت کسی طرح استبدادی نہیں تھی۔ (۲)

شیخ محمد عبدالوہابؒ کے پیشِ نظر اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول تھی جس دعوت کو وہ لے کر اُٹھے تھے وہ قرآن پاک کی دعوت الی اللہ تھی جس کو برپا کرنے کے لیے اللہ ربّ العالمین نے اپنے رسول زمین پر بھیجے کہ ایک اللہ کی عبادت اور فرماں برداری ہو۔

قرآنِ کریم میں خود باری تعالیٰ نے یہ دعوت اس طرح دی۔ فرمایا:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ o اَللّٰهُ الصَّمَدُ o لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ o

ترجمہ: ''کہہ دو اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس کی کوئی اولاد ہے

نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہیں ہے اس کا کوئی ہمسر۔" (۳)

حدیثِ رسول ﷺ:

عن ابی ذر قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما من عبد قال لا الہ الا اللّٰہ، ثم مات علیٰ ذالک الا دخل الجنۃ

یہ روایت حضرت ابو ذر غفاریؓ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جو بندہ لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو اور پھر اس کی موت آئے وہ یقیناً جنت میں داخل ہوگا۔" (۴)

یہاں حدیث شریف میں محض زبانی رسمی اقرار مراد نہیں ہے بلکہ ایسا اقرار جس کے ساتھ قلبی یقین و تصدیق بھی شامل ہو۔

شیخ کی یہ دعوتِ توحید قرآن وسنت کی بنیادی فکر یعنی عقیدۂ توحید کا مظہر تھی۔ ان کے پیشِ نظر اسلام کا یہ عقیدہ اس وقت کی خرابیوں، مشرکانہ افعال اور انفرادی اور اجتماعی معاملات میں مسلمانوں کی اصلاح کرنا مقصود تھا اور یہی فکر اسلام کی طرزِ تعلیم کے مطابق تھی۔

شیخ محمد عبدالوہابؒ کو توحید پر مبنی تحریک نے نجد کے علاقہ کو مکمل فتح کر کے عرب کے گرد ونواح اور مشرقِ وسطیٰ میں بیداری کی لہر دوڑا دی۔ شیخ کی کتاب "کتاب التوحید" بہت مقبول عام ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ بار بار ہزاروں کی تعداد میں طبع ہوئی اور بگاڑ کی اس گہری کھائی کو سلفؓ کے طریقوں کے مطابق عقیدۂ توحید کی درستگی سے بڑی حد تک پاٹ دیا۔ انہوں نے اپنی کتاب کے ذریعے جو دعوت دی وہ یہ کہ صرف اللہ تعالیٰ کو عبادت کا مستحق قرار دینا یعنی لا الٰہ الا اللہ وہ ہر ایک کو اس کلمہ کا مفہوم سمجھاتے اور اس کی حیثیت سے آگاہ کرتے۔

شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک نے عبدالعزیز بن سعود امیر نجد کے ذریعے جو انقلاب برپا کیا اس کے بارے میں قاضی ابن علی شوکانی کہتے ہیں جو امیر عبدالعزیزؒ کے معاصر تھے:

"جو اس کی حکومت میں داخل ہوتا نماز، روزہ، زکوٰۃ اور تمام شعائرِ اسلام

کا پابند ہو جاتا۔ اس کے حلقۂ اطاعت میں شام کے عرب داخل ہوئے اور فرائضِ دین کے سخت پابند ہو گئے حالانکہ اس سے پہلے وہ اسلام کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے اور غلط سلط کلمۂ شہادت ادا کرنے کے سوا کوئی رُکن ادا نہیں کرتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ اس سے پہلے وہ بالکل جہالت میں گھرے ہوئے تھے اور اب نمازیں وقت پر ادا کرنے لگے تھے۔"(۵)

احیائے اسلام کی اس ابتدائی تحریک نے جو عرب میں اُٹھی دنیا بھر میں انقلابِ اسلامی کی راہ ہموار کی۔ کفر و باطل کے اندھیروں کو صدائے لا الٰہ الا اللہ نے چاک کر دیا گویا نصرتِ خداوندی ابتداء سے آخر تک مدد کرتی رہی۔

فصل دوم

# سنوسی تحریک

عبدالعزیز بن سعود کا دورِ عرب کے لئے آل سعود کا سنہرا ترین دور ثابت ہوا تھا۔ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک نے حجاز میں بدعات کے خاتمے اور اسلام کے احیاء کا کام بھرپور طریقے سے کیا۔ گو اس تحریک کو بدنام بھی کیا گیا مگر سعودی حکومت نے حجاز میں بُرائیوں کے خاتمے کے لئے عظیم جدوجہد کی۔ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کے پیشِ نظر وہ احادیث تھیں جن میں پختہ قبریں بنانے اور ان پر قبے تعمیر کرنے سے منع کیا گیا ہے اور ان کی وجہ سے غلط رسومات اور قبر پرستی جیسے افعال سرزد ہوتے ہیں۔

''ابن سعود نے حج و اجتماع کے مواقع پر خاص شرکت کرنی شروع کی اور اپنی تبلیغی کوششوں سے کبھی غافل نہ رہا، مختلف سالوں میں اس نے کچھ احکامات نافذ کیے، مصری اور شاہی محمل روک دیے گئے، قافلوں کے ساتھ باجے گاجے پر پابندی لگا دی گئی۔

مکّہ معظّمہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بول بالا ہوا، بازاروں میں اب تمباکو پینے والا کوئی نظر نہیں آتا، نماز کے لیے محتسب مقرر کر دیے گئے، اذان ہوتے ہی بازاروں میں صلوٰۃ صلوٰۃ کی منادی ہوتی۔''(۶)

اسی زمانے میں شمالی اور مغربی افریقہ میں بھی ایک اصلاحی تحریک شروع ہوئی یہ تحریک سنوسی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تحریک کے بانی ایک بزرگ محمد بن علی سنوسی تھے۔ ۱۷۹۱ء تا ۱۸۵۱ء اس تحریک کا زمانہ ہے. اس تحریک کا مرکز لیبیا کے صحرا میں جنوب نخلستان میں قائم ہوا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنے اخلاق و عادات میں بالکل قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح بنا دیا جائے۔ اس کے علاوہ افریقہ کے حبشی باشندوں میں اسلام کی تبلیغ بھی کرتے رہے۔

محمد سنوسی الجزائر کے شہر ستنغانم کے قریب پیدا ہوئے تھے۔ قرآن حفظ کرنے اور ابتدائی دینی تعلیم

حاصل کرنے کے بعد انہوں نے فاس کی جامع پروئین میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد انہوں نے مشرق کا رُخ کیا لیکن قاہرہ کا ماحول ان کو موافق نہیں آیا۔جامعہ ازہر کے علماء ان کے خلاف ہو گئے۔علاوہ ازیں ان کو والی مصر محمد علی کی اصلاحات بھی پسند نہیں آئیں اور انہوں نے اس کی غیر اسلامی سرگرمیوں کی اعلانیہ مذمت کی۔قاہرہ سے محمد سنوسی مکّہ معظّمہ چلے گئے اور وہیں انہوں نے اپنا پہلا زاویہ قائم کیا۔بعد میں یہی حلقے سنوسی تحریک میں مرکزی اہمیت اختیار کر گئے۔اس قسم کے حلقے انہوں نے اپنے قیام کے دوران مختلف مقامات پر قائم کیے اور ان کے ذریعے انہوں نے اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانا شروع کیا۔

سنوسی تحریک کا مرکز برقہ یا سائرنیکا کے صحراء میں جنوب کے نخلستان میں ۱۸۵۳ء میں اپنی دعوت کا مرکز قائم کیا۔اگرچہ بعد میں انہوں نے یہ مرکز جنوب میں کئی سو میل کے فاصلے پر نخلستان کفرہ میں منتقل کر دیا لیکن جنوب میں تحریک کا اہم ترین کام جاری رہا اور اسے ہمیشہ اہم مقام حاصل رہا۔

''سنوسی تحریک کا مقصد کتاب وسنت کی بنیاد پر عالمِ اسلام کا دینی احیاء تھا۔وہ احمد بن حنبلؒ،غزالیؒ، ابن تیمیہؒ اور شیخ محمد بن عبدالوہابؒ سے بہت متاثر تھے۔ان کی یہ تحریک شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی نجدی تحریک سے بہت مشابہ تھی۔اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کے علاوہ محمد سنوسی نے صحرائے اعظم میں خانہ بدوشوں کی بستیاں آباد کرنے اور کھیتی باڑی شروع کرنے کی حوصلہ افزائی کی اور اصل سنوسیوں کی یہی بستیاں حلقہ کہلاتی تھیں۔ہر حلقہ اقتصادی لحاظ سے خود کفیل تھا۔یہی حلقے یا زاویے اسلام کی تبلیغ کا مرکز بن گئے۔''(۷)

سیّد المہدی کی قیادت میں سنوسی تحریک کی قوت اور اثر و نفوذ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ان کی تعلیمات کا مطالبہ یہ تھا کہ اس کے متبعین دیرپا اور ٹھوس کام کریں۔

اس مشن کو عملی جامہ پہنایا گیا اور اس کے لیے جو ٹھوس کوششیں کی گئیں ان کے بارے میں مریم جمیلہ اپنی کتاب ''اسلام ایک نظریہ ایک تحریک''میں لکھتی ہیں:

''جنوب صحیح معنوں میں محض ایک قصبہ نہیں مذہبی مرکز ہے۔یہ ایک وسیع عمارت ہے جس میں طلبہ کی اقامت گاہیں، مدارس، سنوسی خاندان کے مکانات کے گرد پھیلی ہوئی ہے۔یہ لوگ باغات کا بہترین نظام رکھتے ہیں، ان کے لئے پانی تالابوں اور مصنوعی نالوں سے حاصل کرتے ہیں۔کھجوروں کے ان باغات سے

روزی حاصل کرتے ہیں اور طلبہ کو خوراک بھی مہیا کرتے ہیں۔ جنوب ایک یونیورسٹی ہے پاک، صاف اور سادہ، ساری جماعت کی زندگی اس کے گرد مرتکز ہے۔ اس کی ایک بڑی لائبریری ہے جس میں ۸ ہزار کتب ہیں اور صفِ اوّل کے علماء اور فضلاء کی ایک بڑی تعداد ہے جن کی موجودگی طلبہ کے لئے تحریک کا باعث ہوتی ہے۔ طلبہ کو صنعت و حرفت بھی سکھائی جاتی ہے۔ ان صنعتوں میں لوہار، معمار، کتابت، کپڑا بننا، جلد سازی، چٹائی بنانا اور دیگر کام شامل ہیں۔ سیّد المہدی بالعموم خود طلبہ کے ساتھ کام کرتے ہیں. جمعہ کا دن فوجی تربیت کے لیے اور جنگی مشقوں کے لیے وقف ہے۔ طلبہ گھڑسواری اور شتر سواری سیکھتے ہیں۔ ان مشقوں کی نگرانی بھی خود سیّد المہدی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دفاعی اسلحہ خانے بھی ہیں جن کی نگرانی بھی وہ خود کرتے ہیں۔ ایک بڑی پرشکوہ، پُرسکون مسجد ہے جس میں صرف سیاہ قالین ہیں یہ جنوب کی واحد قیمتی چیز ہے۔ لیکن یہ چیز بالکل سادہ ہے اسلامی سادگی کا بہترین نمونہ ہے۔'' (۸)

سنوسی تحریک نے نہ صرف عوام الناس پر اثر ڈالا بلکہ ایک بڑی تعداد ایسے افراد کی تیار کی جن کے دل و دماغ اسلام کی دعوت سے پوری طرح مسخر ہو چکے تھے اور وہ تربیت کے نظام سے گذر کر انقلاب کی راہ کے راہی بن گئے تھے۔

''درحقیقت سیّد المہدی ایک خودمختار ریاست کے فرماں روا تھے اور حکومت کے تمام کام انجام دیتے تھے۔ اپنی طاقت اور عروج کے زمانہ میں وہ ایک زبردست سلطنت پر حکومت کرتے تھے جو موجودہ لیبیا، صحرائے مغربی مصر اور شمال مغربی سوڈان پر مشتمل تھی۔ جس کی سرحدیں منطقۂ حارّہ افریقہ (Tropical Africa) کے قلب تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جہاں لاکھوں نومسلم اسلام کے دائرے میں داخل ہو کر اس کی رحمتوں اور برکتوں سے مستفیض ہو رہے تھے۔'' (۹)

یہ بات بھی ایک حقیقت تھی کہ اس سے پہلے محمد بن عبدالوہاب کی تحریک میں آنے والوں اور اس کے کارکنوں کی بھاری تعداد عرب کے بدوؤں کی تھی اور سنوسی تحریک بھی عربوں پر بے حد مؤثر انداز سے نفوذ کر رہی تھی۔

''سنوسی تحریک کے بانی سیّد محمد ابن علی السنوسی الجزائر میں اسی سال پیدا ہوئے جس سال سیّد محمد بن عبدالوہابؒ نے عرب میں وفات پائی۔ وہ چونکہ ایک علمی اور خدا پرست خاندان میں پروان چڑھے تھے، لہٰذا چھوٹی عمر میں ہی حافظِ قرآن ہوگئے اور علم کے حصول کے لئے مراکش گئے اور بعد میں جہاں گشت علماء کی صف میں شامل ہوگئے۔ پہلے تیونس گئے پھر لیبیا پھر مصر۔ اس سفر کے دوران انہوں نے علم کی تشنگی بجھائی یہاں تک کہ ان کے علم وفضل کا شہرہ ہر جگہ ہونے لگا اور ان کا شمار ممتاز ترین علماء میں ہونے لگا۔ انہوں نے تعلیمی و تدریسی حلقۂ فکر میں علماء کے اندر اسلامی سرگرمیوں کی وہ لگن اور جستجو نہیں پائی جو علماء کو عوام الناس کی بیداری کے لیے حریص بناتی ہے بلکہ وہ لوگ جو ان مناصب پر تھے ان کی راہ کے پتھر بننے لگے۔ آخر وہ قاہرہ کے احوال سے مایوس ومتنفر ہوکر مکّہ معظّمہ چلے گئے۔ یہاں انہیں وہ چیز مل گئی جس کی انہیں تلاش تھی۔ وہ مراکش کے سیّد احمد ابن ادریس الفاسی سے ملے اور ان کے مرید ہوگئے۔ چند سال بعد الفاسی کا انتقال ہوگیا تو سنوسی مکّہ معظّمہ واپس آئے اور اپنا پہلا زاویہ قائم کیا۔'' (۱۰)

اپنے مضبوط کردار کے ساتھ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے فرمان ''اپنے گردوپیش کے لوگوں میں امن وامان قائم کرو'' سے تحریک پا کر وہ مقامی قبائل کی دیرینہ عداوتوں کو مٹانے اور بالآخر علاقہ بھر کے خانہ بدوش قبائل کو مسلک اتحاد میں منسلک کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ جوں ہی اس علاقے میں امن وامان قائم ہوا، جو زمانہ دراز سے عنقا تھا، انہوں نے اپنی توجہ افریقہ کے دور افتادہ گرم ترخطوں میں اسلامی دعوت پھیلانے پر مرکوز کردی۔ انہیں سب سے نمایاں کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب قبیلہ زویا نے ان سے درخواست کی کہ وہ ان کے ہاں تشریف لائیں، کفرہ میں زاویہ قائم کریں اور رہیں۔ تحریکِ سنوسی نے اپنے مرید وہاں بھیجے کہ اس قبیلہ میں جہاں خون آشام واقعات معمولی سمجھے جاتے تھے، سارے صحرا میں یہ قبیلہ ایک عذاب بنا ہوا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے ان لوگوں کی کایا پلٹ ہوئی انہوں نے چوری چکاری اور قتل وغارت سے توبہ کی اور یہ عہد کیا کہ وہ اب ان بُرائیوں میں ملوث نہیں ہوں گے۔ اس زبردست روحانی انقلاب نے ان لوگوں کی زندگی کا رُخ بدل دیا، ساتھ ہی ساتھ منطقۂ حارّہ افریقہ کے بے شمار لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے۔

## سیّد المہدی ابن السنوسی

۱۸۵۹ء میں سنوسی کا انتقال ہوگیا۔ ان کے سب سے بڑے صاحب زادے سیّد المہدی جانشین ہوئے۔ وہ اس وقت دعوتی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے تھے جب وہ ۱۲ برس کے تھے۔ قاصد بھیجتے، وفود کا استقبال کرتے اور طالبوں کو تعلیم دیتے حالانکہ وہ خود بھی طالب علم تھے۔

''یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی حالت سخت مایوس کن تھی۔ یورپی استعمار زبردست خطرہ بن چکا تھا، ملحدانہ خیالات و تصوّرات مغرب کی فکر کا پرتو بن کر نوجوان طبقوں کو متاثر کر رہے تھے۔ چنانچہ سیّد مہدی مسلمانوں کی اُمیدوں کا مرکز بن گئے۔ یہ خیال عام تھا کہ وہی عدل و انصاف اور امن و آشتی کو واپس لائیں گے۔ انہوں نے بار بار اپنے مہدی ہونے کا بڑے زور کے ساتھ انکار کیا، اپنے والد کی طرح انہیں صرف اسلامی دعوت کے لئے مسلسل جدو جہد اور مؤثر کام سے دلچسپی تھی اور دیگر چیزوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔''(۱۱)

سیّد المہدی کی قیادت میں سنوسی تحریک کی طاقت اور اثر نفوذ اپنے عروج پر پہنچ گئی اور بڑی تعداد میں لوگ اس کے دائرہ اثر میں آ گئے۔

روم
بحیرہ
کریٹ
قبرص
لیبیا
جغبوب
دمشق
شام
بغداد
عراق
ایران
طہران
فارس
ریاض
سعودی
عرب
سوڈان
خرطوم
چاڈ
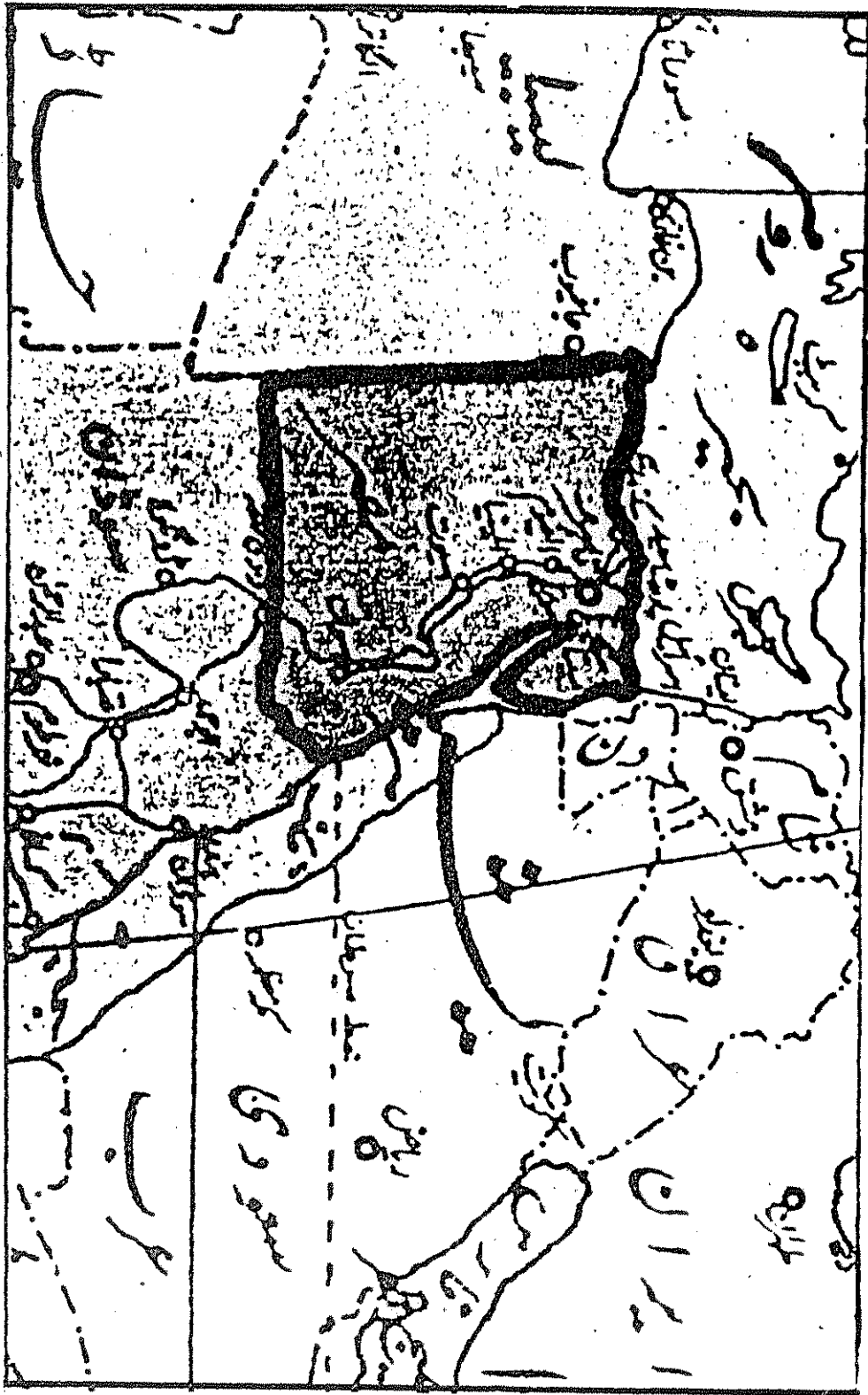
فصل سوم

# اخوان المسلمون

پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ کے ساتھ ہی مصر میں مغربیت کی حامی قوتوں نے زور پکڑ لیا۔ ملک کے اندر ملکی اور ملی مسائل نے ہر جانب سے سر اُٹھالیا تو رانی قومیت کے علمبردار ترکوں نے خلافت کی تنسیخ کا اعلان کیا تو اس کے ردِّ عمل میں عربوں کے اندر قومیت اور وطنیت کے رجحانات اُبھر آئے۔

تاریخی اور سیاسی حیثیت اور از ہر جیسے اہم علمی مقام اور بعض دوسرے اسباب کی وجہ سے مصر کو عرب دنیا کی قیادت حاصل رہی ہے اس لئے مصر میں قومیت اور وطنیت کے نعرہ نے جب سر اُٹھایا تو تمام عرب ملکوں میں اس کی صدائے بازگشت سنی گئی۔ مختلف وطنی تحریکوں نے زور دکھایا۔ مصطفیٰ نحاس پاشا کی قیادت میں وفد پارٹی کو عروج حاصل ہوا۔ اس وطن پرستی کی آڑ میں وطنی تحریک نے مغرب پرستی کو ہوا دی جس کے نتیجے میں اسلام اور مغرب کی طویل کشمکش کا آغاز ہوا جس کے نتائج دور رس اہمیت کے حامل تھے۔

مغربی تہذیب کے ہمنوا مضبوط محاذ رکھتے تھے کیونکہ حکومت اور پریس کی طاقت ان کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے مقابلے میں اسلامی روایات کے علمبردار نہ صرف کمزور تھے بلکہ جو تھے وہ بھی خود اعتمادی سے محروم تھے۔

''مصری من حیث القوم فکری جمود کا شکار ہو گئے حتیٰ کہ جامعۃ الازہر کے مشائخ اور شیوخ بھی اس فکری اور ذہنی جمود کو توڑنے میں ناکام رہے۔ سیّد جمال الدین افغانی پہلے مفکر تھے جنہوں نے اس پر آشوب دور میں اتحاد عالم اسلامی کا نعرہ لگایا اور خلافت کے قیام پر زور دیا۔ مصر سے ان کا جبراً انخلاء ایک عظیم قومی المیہ ثابت ہوا۔ اگر چہ سیّد موصوف کے شاگردوں محمد عبدہ اور رشید رضا نے اس خلاء کو پُر کرنے کی کوشش کی لیکن بوجوہ ناکام رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصری قوم اس وقت ذہنی اور فکری لحاظ سے مفلوج ہو چکی تھی۔ بے حیائی اور بے راہ روی کا ایک طوفان بدتمیزی تھا جو کلچر اور ثقافت کی آڑ لے کر مصری سوسائٹی میں داخل ہو رہا تھا۔'' (۱۲)

پوری مصری قوم بس مغربی یلغار کا شکار ہو رہی تھی اس میں زندگی کے تمام معمولات گمراہی پر مشتمل تھے۔ جوا، شراب، بدکاری، قتل وغارت گری جیسے جرائم روزمرّہ زندگی کا معمول بن گئے تھے۔ انگریزوں اور یہودیوں نے مصری سوسائٹی میں اپنی نوجوان نسل کے ذریعے اس طرح نفوذ کیا تھا کہ تمام نوجوان ان کی پیروی پر آمادہ ہو گئے تھے اور اس نفوذ کا مقصد سوسائٹی کو اخلاقی طور پر تباہ وبرباد کرنا تھا۔ اس مصری کلچر اور ثقافت میں نوجوان نسل جس طرح تباہی سے دوچار ہوگئی تھی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

مشہور مصنف خلیل احمد حامدی ''اخوان المسلمون، تاریخ، دعوت اور خدمات'' میں ان حالات کا یوں نقشہ کھینچتے ہیں:

> ''حالات اس درجہ بدتر ہوگئے کہ نہ صرف مصر میں بلکہ اکثر عرب ملکوں میں فرعونیت اور نمرودیت کا کلمہ پڑھا جانے لگا۔ دمشق یونیورسٹی میں اعلانیہ خدا کا جنازہ نکالا گیا، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کھلم کھلا اسلام اور محمد ﷺ پر زبان طعن دراز کی جانے لگی۔ سیاسی مجلسوں میں ان کا نام لینا نکو بن جانے کے مترادف ہوگیا، پارکوں اور باغوں میں اچھے خاصے مسلمان نماز پڑھتے ہوئے شرمانے لگے۔'' (۱۳)

ان حالات میں مصر میں ایک ایسی تحریک کی ضرورت تھی جس میں اصلاح کے تمام پہلو موجود ہوں جو قومیت اور وطنیت کے نعروں پر اُبھرنے والی تحریکوں اور ان کے منفی اثرات کا نہ صرف یہ کہ مقابلہ کر سکے بلکہ نہایت مثبت انداز سے قوم کی فکری اور ذہنی رہنمائی بھی کر سکے۔ قدرت نے یہ کام اسماعیلیہ کے ایک نوجوان حسن البنا سے لیا جو ایک مدت سے مصری سوسائٹی کی تباہ حالی کا مطالعہ کر رہا تھا اور ایک کرب کے ساتھ فکر میں مبتلا تھا کہ کس طرح قوم کو اس اندھیرے راستے سے ہٹا کر سیدھے راستے پر لایا جائے۔

## حسن البنا شخصیت وحالاتِ زندگی

۱۹۰۶ء میں محمودیہ میں پیدا ہوئے گھر کا ماحول خالص اسلامی تھا۔ والد شیخ احمد عبدالرحمان البنا کا پیشہ اگرچہ گھڑی سازی تھا مگر وہ خود بہت بڑے عالم تھے۔ فقہ وحدیث پر گہری نظر رکھتے تھے، حافظِ قرآن تھے اور

کئی کتابوں کے مصنف اور کتبِ احادیث کے شارح تھے۔

حسن البنا نے بچپن میں ہی قرآن حفظ کر لیا تھا۔ جس کے بعد اسماعیلیہ کے مدرسے ارشاد الدینیہ میں داخل ہوئے۔ تکمیلِ تعلیم کے لیے بعد میں قاہرہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جہاں سے اعزاز کے ساتھ گریجویشن کیا۔ انہیں وزارتِ تعلیم کی طرف سے اسماعیلیہ کے مدرسہ کا مدرس مقرر کر دیا گیا اس وقت ان کی عمر ۲۱ سال تھی۔ ۱۹۴۶ء میں وزارتِ تعلیم کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور یکسوئی کے ساتھ دعوت و تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔

دعوتِ اسلامی سے ان کی لگن اس زمانے سے تھی جب وہ مدرسہ ارشاد الدینیہ کے معصوم طالب علم تھے۔ بچپن میں ایک بار محمودیہ کی ندی سے گذر رہے تھے ایک بادبانی کشتی پر عریاں مورتی آویزاں دیکھ کر سخت رنجیدہ ہو گئے اور فوراً مقامی پولیس چوکی جا کر اس مورتی کے خلاف احتجاج کیا۔ پولیس افسران کی غیرت ایمانی سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے جا کر ملاح سے وہ مورتی اُتروا دی۔

اسی زمانے میں مدرسہ ارشاد الدینیہ کے طلبہ نے جمعیت اخلاق ادبیہ کے نام سے ایک بزم قائم کی حسن البنا اس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اور انجمن مدرسہ سے باہر قائم کی جس کا کام لوگوں کو خطوط کے ذریعے نیکی کی تلقین کرنا تھا۔

حسن البنا کے اندر بُرائی کے خلاف جدوجہد کا ایک لاوا تھا جو ابل رہا تھا۔ وہ لوگوں تک دعوت کو عام کرنے کے ساتھ علم اور جہاد کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ جب وہ قاہرہ پہنچے تو وہاں کے ماحول نے ان کی اندرونی کشمکش کو مزید بڑھا دیا وہ قاہرہ کے فساد زدہ ماحول میں اصلاح حالات کے لیے جمعیت مکارم اخلاق کے ممبر بن گئے۔ وہ قاہرہ کی واحد فلاحی انجمن تھی وہ اس کے درسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے لیکن جو بے راہ روی، اخلاق کی گراوٹ اور مغربی تہذیب کے اثرات قاہرہ کی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے اس کا علاج مسجدوں میں صرف درس دے کر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''حسن البنا نے مسجد میں آنے والوں کے علاوہ جو افراد تھے ان کی اخلاقی اصلاح کی فکر کی اور ازہر کے طلبہ پر مشتمل ایک گروہ تیار کیا اور انہیں قہوہ خانوں میں، پبلک مقامات میں درس و تدریس اور وعظ و نصیحت

لی طرف راغب کیا۔ یہ گروہ جس میں حسن البنا خود بھی شامل تھے قہوہ خانوں میں جا کر قرآن وحدیث کے درس دیتا اور عوام الناس کو دین کے تقاضوں کی جانب راغب کرتا۔ اس طریقہ وعظ پر مشائخ کی طرف سے بار بار انگشت نمائی کی گئی مگر یہ کامیاب رہا اور شہروں سے گذر کر قصبوں اور دیہاتوں میں بھی اس کا تجربہ کیا گیا۔ اسی گروہ کے اندر سے ایک کمیٹی وجود میں آئی جو دعوتِ اسلامی کی اشاعت کی نگران قرار پائی۔" (۱۴)

مصر میں اس وقت الحاد و بے دینی کی جو وبا پھیلی تھی اس کی لپیٹ میں عورت مرد بچے سب آ رہے تھے اور اس ریلے کے سامنے نوجوانوں کا یہ محدود و ناتواں گروہ جو دعوت کے کام کو لے کر بڑھا تھا، بے اثر ہو رہا تھا حسن البنا کی نظر میں حالات کسی بڑے کام کا تقاضا کر رہے تھے۔

حسن البنا اس وقت کے مصر کے چوٹی کے علماء سے ملے، شیخ الازہر شیخ محمد خضر حسین کے سامنے حالات رکھے اور مشورے کیے۔ حسن البنا نے ان سب علماء کو اسلام کے لیے ٹھوس بنیادوں پر کام کرنے کی دعوت دی۔ ان کی کوششوں اور محنتوں کے نتائج بار آور ثابت ہوئے۔

## جمعیت شبان المسلمین

حسن البناء کی اس محنت ومشقت اور رابطوں نے علماء کے حلقے میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔ پہلے پہلے ہفت روزہ "الفتح" کا اجراء ہوا پھر جمعیت شبان المسلمین کی تاسیس ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالمجید سعید کی قیادت میں نوجوان نسل کو بے راہ روی سے بچانے کا بیڑہ جمعیت شبان المسلمین نے اُٹھایا۔ حسن البنا اس میں شامل ہو گئے بلکہ بانیوں میں ان کا شمار ہوا۔

۱۹۲۷ء میں وہ دارالعلوم کا ڈپلومہ لے کر اسماعیلیہ کے مدرسہ کے امیر مقرر ہو گئے۔ اسماعیلیہ میں بھی یہ مشن دعوت وتبلیغ جاری رہا۔ اس کے ذریعے لوگوں کو بیدار کرنے اور فریضہ اقامت دین کا کام کرتے رہے۔

## اخوان المسلمون کا قیام

"مارچ ۱۹۲۸ء کو اسماعیلیہ کے معزز اور باشعور لوگوں کی ایک جماعت حسن البنا کے گھر جمع ہوئی ان کی

... حافظ عبدالحمید احمد المصری، فواد ابراہیم، عبدالرحمن حسب اللہ، اسماعیل عزّ اور زکی المغربی۔ یہ لوگ کام کا عزم لے کر آئے تھے، گفتگو اور تبادلۂ خیالات کے بعد انہوں نے حسن البنا کو نگرانی، قیادت اور رہنمائی کا فرض سونپا اور اتفاق رائے سے الاخوان المسلمین کے قیام کا اعلان کر دیا۔'' (۱۵)

حسن البنا کو پہلا مرشد عام چنا گیا۔ اس جماعت کا مشن ۵ سال تک خاموشی کے ساتھ لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرتا رہا۔ مسجد اس کا مرکز ہوتی تھی اور ''پوری زندگی کو اسلام کے رنگ میں رنگ دو'' ان کا مشن تھا، ان کا نعرہ تھا جو ان کی دعوت کا پہلا قدم تھا اس وقت انہوں نے ایک محدود مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر کام کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت یہی خیال تھا کہ اخوان المسلمون ایک اصلاحی اور دینی تحریک کی حیثیت سے سوسائٹی میں اپنا مقام پیدا کرے گی۔ تحریک کے جانباز کارکنان کی شب و روز محنت کے نتیجے میں کارکنوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ ابتداء میں شامل ہونے والوں کی تعداد قلیل تھی۔ مثلاً پہلے سال اخوان المسلمون میں صرف ۷۵ افراد شریک ہوئے ان کی چار برانچیں قائم کی گئیں لیکن آہستہ آہستہ یہ تعداد بڑھتی گئی حتیٰ کہ دس سال بعد ۱۹۳۸ء میں لاکھوں افراد اس میں شامل ہو چکے تھے اور پورے ملک میں ۲ ہزار سے زائد شاخیں کام کر رہی تھیں۔

۱۹۳۰ء میں اخوان نے اسماعیلیہ میں ایک مسجد تعمیر کی اس کے علاوہ طلباء و طالبات کے لئے ایک ایک اسکول ایک کلب اور دار الصنعت قائم کیا جہاں کارکنان کو مختلف فنون کی تربیت دی جاتی تھی۔

''اخوان کے کارکنوں نے کوئی قصبہ اور بستی ایسی نہیں چھوڑی جہاں وہ نہ پہنچے ہوں مسجدوں میں، گھروں میں اور چوراہوں میں جا جا کر انہوں نے دعوت پھیلائی۔'' (۱۶)

## اخوان المسلمون میدانِ سیاست میں: (۱۹۳۸ء تا ۱۹۵۱ء)

۱۹۳۸ء تک شرق اوسط اور خاص طور پر مصر کے حالات نے اس تیزی سے کروٹ لی کہ اخوان کے لئے خاموش رہنا ناممکن ہو گیا۔ ان دس سالوں میں چھ دفعہ حکومت بنی اور بگڑی، استحکام نام کی کوئی چیز ملک میں موجود نہ تھی لوگ تذبذب کی حالت میں بھی اور وفد پارٹی کا بوجھ کاندھوں سے اُتارنے کی فکر کر رہے تھے،

ان کی نگاہیں اخوان کی طرف اٹھ رہی ہیں کہ اس آڑے وقت میں قوم کی صحیح رہنمائی کرے اور ایک مؤثر محبّ وطن اپوزیشن کا کردار ادا کرے۔ اس موقع پر کمال تدبر اور سیاسی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے اخوان کے دسویں یوم تاسیس پر کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے شیخ حسن البنا نے کہا:

''سیاست اسلام کا لازمی جزو اور اخوان کا پروگرام ہے ہم تمہیں اسلام کی طرف بلاتے ہیں اگر اس کا مقصد سیاست ہے تو یہی ہماری سیاست ہے۔'' (۱۷)

اس کے اس اعلان سے کمیونسٹوں، یہودیوں، شاہ پرستوں اور قوم پرستوں پر مایوسی چھا گئی۔ ان کی مایوسی بھی اس وقت قابل دید تھی۔ اخوان ہر بستی تک نہی عن المنکر اور امر بالمعروف کا پیغام پہنچاتے رہے اور اپنے قائدین کی صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بہت جلد ہی مصر کی سیاست، صحافت اور معاشرت پر چھا گئے۔ لوگ جنون کی حد تک اخوان اور اس کے پروگرام سے محبت کرنے لگے یہاں تک کہ حکومت نے مئی ۱۹۴۰ء میں حسن البنا اور اخوان کے ڈپٹی مرشد عام احمد شقیری کی سرگرمیوں کو امن عامّہ کے خلاف قرار دے کر انہیں قاہرہ سے باہر نکال دیا۔ مگر اس قدر شدت سے عوامی احتجاج ہوا کہ انہیں واپس قاہرہ بلانا پڑا۔

اس وقت جبکہ جماعت قوت ونفوذ کی معراج پر پہنچی اس کا میدانِ سیاست میں اُترنا مغرب کے آقاؤں کو پسند نہ آیا اور مڈبھیڑ کا آغاز ہو گیا۔ ''اخوان نے الاخوان المسلمون کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا یہ پہلا موقع تھا کہ اسلامی نظام کا بے باک اور جری نقیب روزنامہ صحافت کے میدان میں اُترا اور نہ طویل عرصے سے مصری صحافت پر جہالت کا غلبہ تھا۔ اس اخبار نے بڑی بے خوفی کے ساتھ انگریزی استعمار کی اسرار کشائی کی اور استعماری حلقوں میں تہلکہ مچا دیا۔'' (۱۸)

داخلی استحکام اور منصوبہ بندی نے تحریک کے اثرات کو مزید پھیلا دیا چند ہی سالوں میں یہ تحریک روحانی، مادّی اور عسکری تربیت کے اعتبار سے نفوذ وقوت کی چوٹیوں کو چھونے لگی۔ ٹائمز آف لندن کی اطلاع کے مطابق صرف طبقہ عمال میں اخوان کی تحریک کے ارکان کی تعداد تین لاکھ اور ۶ لاکھ کے درمیان تھی۔ صرف مصر میں ان کی شاخیں ۲ ہزار کے قریب تھیں۔

مصر سے باہر بھی اخوان کی شاخیں قائم ہوئیں۔ شام میں ۱۹۳۷ء میں مصطفیٰ سباعی مرحوم کی قیادت

میں اخوان کی شاخ قائم ہو چکی تھی۔ باقی ملکوں میں اگلے مرحلے میں شاخیں وجود میں آئیں۔

اخوان المسلمین نے جنوبی افریقہ، شام، لبنان، شرق اردن، سوڈان، فلسطین وغیرہ میں وفود بھیجے اور شاخیں قائم کیں کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ مصریوں کو دوسرے عرب ممالک کی قیادت کرنی چاہیۓ۔ اس طرح فیکٹریاں، اسکول، مدرسے اور ایسی مفید اسکیمیں بھی ہر جگہ جاری کر دی گئیں جس سے عوام الناس کی نہ صرف تربیت ہو سکے بلکہ تعلیم اور روزگار میں بھی عام افراد کو مدد ملے۔

اُصول وضوابط تیسری جنرل کانفرنس میں قومی اور بین الاقوامی حالات کو پیشِ نظر رکھ کر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اخوان المسلمون نوجوانوں کے اسکاؤٹس دستے قائم کرے گی اس کے علاوہ ارکان کی قابلیت کے لئے معیار اور سوسائٹی کا ڈھانچہ بھی تیار کیا گیا۔ کارکنان کو درجات میں اس طرح تقسیم کیا گیا:

۱- پہلا درجہ : معاون

۲- دوسرا درجہ : رفیق

۳- تیسرا درجہ : عامل

۴- چوتھا درجہ : مجاہد

معاون: معاون کے لئے ہر ماہ باقاعدہ سے چندہ ادا کرنا اور تحریک کے بنیادی اُصولوں سے اتفاق لازم قرار دیا گیا۔

رفیق: تحریک کے اُصولوں پر کاربند رہنا اجتماعات میں شرکت اور اطاعتِ امیر۔

عامل: اپنے آپ کو تحریکِ اسلامی کے لیے وقف کر دینا، جسمانی تربیت، قرآنِ مجید کی تعلیم حاصل کرنا، ارکانِ اسلامی پر سختی سے کاربند رہنا۔ اس درجے میں کارکنوں سے مرشد عام بیعت لیتے تھے۔

مجاہد: آخری درجہ مجاہد کا تھا۔ اس درجہ میں شامل کارکن تن من دھن کی بازی لگانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اس میں شمولیت کے لئے کم از کم عمر ۱۸ سال اور باعزت اور دیانتدار سوسائٹی کے پروگرام کو سمجھنے کی اہلیت رکھنا لازمی تھا۔ اس درجہ میں چندہ ادا کرنا بھی لازمی قرار دیا گیا۔

۱۰ سال کی قلیل مدت میں بیشتر اخوان پارلیمنٹ کے ممبر بن چکے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں مزید بہتری کے لیے اقدامات ہوئے۔ چوتھی جنرل کانفرنس میں بٹالین سسٹم قائم کرنے کے علاوہ بعض اہم تنظیمی نوعیت کے فیصلے بھی کیے گئے۔ ''اب اخوان نے یہ محسوس کیا کہ ملکی سیاست انتہائی پراگندہ حالات میں گرفتار ہے۔ سیاسی جماعتیں بجائے اس کے کہ آزادی کی جنگ لڑیں، محلاتی سازشوں میں مصروف تھیں۔ وفد کا لیڈر مصطفیٰ نحاس پاشا جس سے لوگ اُمیدیں وابستہ کیے ہوئے تھے کہ وہ غیر ملکی آقاؤں کو ملک سے باہر نکالنے میں اہم رول ادا کرے گا دوستی اور رفاقت کا معاہدہ کرکے برطانوی شہنشاہیت کے سامنے دوزانو ہو گیا تھا۔ چنانچہ تحریک اخوان المسلمون لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی اور انہوں نے اس کے لیے سیاست میں آنے کا فیصلہ کیا۔

''۱۹۴۱ء میں چھٹی جنرل کانفرنس منعقد ہوئی اور انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس وقت مصر کے حالات نے پلٹا کھایا نحاس پاشا کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ جس نے آتے ہی پارلیمینٹ توڑ کر انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔ شیخ حسن البنا کا انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان مخالفین کے لیے وجہ پریشانی تھا اور نحاس پاشا کی پریشانی دیدنی تھی۔ اس نے شیخ سے ملاقات کرکے درخواست کی کہ وہ انتخابات میں حصہ نہ لیں چنانچہ حسن البنا نے چند شرائط کے تحت انتخابات میں حصہ نہ لینے کا اعلان کر دیا۔ شرائط حسبِ ذیل تھیں:

۱۔ اخوان المسلمون پر عائد پابندیوں کو فی الفور ختم کیا جائے اور کارکنوں کو آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت دی جائے۔

۲۔ پورے ملک میں شراب اور قحبہ گری پر پابندی لگا دی جائے۔ نحاسی پاشا نے ان شرائط کو من وعن قبول کر لیا۔'' (۱۹)

اس کے ساتھ ہی تمام پابندیاں ختم ہو گئیں اخبارات و جرائد کو دوبارہ اشاعت کی اجازت مل گئی۔ شراب خانوں اور قحبہ خانوں کو پورے ملک میں ممنوع قرار دے دیا گیا۔ انتخابات کے مقابلہ پر اخوان کی یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ لیکن انتخابات کے بعد نحاس پاشا نے وعدہ خلافی کی اور اخوان پر دوبارہ پابندی لگا دی۔

## شام میں اسلامی تحریک

اسلامی خلافت کا مدینہ کے بعد دوسرا دارالخلافہ ملک شام کا شہر دمشق تھا۔ عباسی دور میں شام کی حیثیت ایک صوبے کی تھی لیکن ایک ایسے صوبے کی جو علم و ادب، تہذیب و تمدّن اور صنعت و حرفت میں عباسی خلافت کے کسی بھی صوبے سے کم تر نہ تھا۔

''شام میں فوجی آمریت کا قیام شام کی بدقسمتی کا آغاز ہے۔ انقلابات زمانہ، سیاسی اُکھاڑ پچھاڑ اور بعث پارٹی کے بائیں بازو کے مارکسزم نے شام کو جو دھچکے دیے اور بعث پارٹی کے ابتدائی سات سالہ دور میں حالات اتنے خراب ہوئے کہ صحافی، صنعت کار، تاجر، سرکاری ملازمین بڑی تعداد میں ملک سے باہر چلے گئے۔ شام کا سرمایہ لبنان منتقل ہو گیا اور کارخانے اور فیکٹریاں بند ہو گئیں۔ ان حالات کے خلاف عوام کی آواز کو بھی دبا دیا گیا۔ مسلمانوں نے جب حکومت کے خلاف احتجاج کیا اور مسجدوں میں اس کے خلاف آواز اٹھائی تو حکومت نے انتقامی کاروائی میں مسجدوں کو بھی بے حرمت کیا، نمازیوں کو شہید کیا، لوگوں کی داڑھیاں نوچی گئیں اور ناخن اُکھاڑے۔'' (۲۰)

شام کے تمام محبّ وطن رہنما جنھوں نے شام کی آزادی اور ترقی میں نمایاں حصہ لیا تھا بعثی انقلاب کے بعد بیروت میں جلاوطنی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہو گئے۔

## شام میں اسلامی تحریک

عربوں کی بیداری میں شام کے رہنماؤں اور اہلِ قلم کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ ان رہنماؤں اور مصنفوں میں کئی منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً امیر شکیب ارسلان، مصطفیٰ حسن سباعی اور محمد معروف دوالبی۔

## امیر شکیب ارسلان

ان کا تعلق لبنان کے ایک اعلیٰ دردزی خاندان سے ملتا ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب قبل از اسلام کے سلوک میرہ کے تنونی خاندان سے ملتا ہے۔ وہ لبنان کی بستی شویفات میں ۱۲۸۶ھ ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔

انہوں نے بیروت کے مدرسہ دار الحکمت میں تعلیم پائی اور طالب علمی ہی کے زمانے میں مفتی محمد عبادہ اور رشید رضا مصری سے متاثر ہوگئے تھے جو اس زمانے میں بیروت میں جلاوطنی کا زمانہ گذار رہے تھے۔ وہ ترکوں اور عربوں کے اتحاد کے سرگرم حامی تھے وہ عثمانی خلافت کو قائم رکھنا چاہتے تھے اور عربوں کی مکمل آزادی کے بجائے عثمانی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے عربوں کی خودمختاری کے حامی تھے۔

١٩١٨ء سے ١٩٤٦ء تک وہ جنیوا میں رہے جہاں انہوں نے اپنا مرکز قائم کرلیا تھا کیونکہ جمعیت اقوام کا مرکز بھی اسی شہر میں تھا اسی لئے وہ یہاں سے اسلامی دنیا پر اثر انداز ہوسکتے تھے۔

جنیوا سے وہ (La nalican Arabs) کے نام سے فرانسیسی زبان میں ایک رسالہ نکالتے تھے جو عربوں کی آزادی اور اسلامی دنیا کے مسلمانوں کے حقوق کا پرزور علم بردار تھا۔ انہوں نے اقوام متحدہ میں عربوں کی ترجمانی کی اور عرب ملکوں کے نمائندے کی حیثیت سے فرانس اور دوسرے مغربی ملکوں سے مذاکرات کئے۔

١٩٣٠ء میں جب فرانسیسیوں نے مراکش کے قبائل پر فرانسیسی قانون فوجداری کے اطلاق کا فیصلہ کیا تو امیر شکیب ارسلان نے پوری اسلامی دنیا میں اس کے خلاف اور اسلامی قانون کے حق میں پرزور مُہم چلائی۔ جنیوا میں ان کا دفتر یورپ میں عرب قوم پرستوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ شمال افریقہ کی تحریکِ آزادی میں بھی امیر شکیب ارسلان کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ وہ عربوں کی آزادی کے ساتھ ہی ساتھ ساری اسلامی دنیا کے مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ اسلام کو عرب قومیت پر ترجیح دیتے تھے اور اتحاد اسلامی کے زبردست علمبردار تھے۔''(٢١)

امیر شکیب ارسلان عربی زبان کے مؤرّخ اور بڑے انشا پرداز تھے اور اعلیٰ درجے کے مقرر اور امیر البیان کے لقب سے مشہور تھے۔ عربی کے علاوہ فرانسیسی پر ان کو مکمل عبور حاصل تھا۔ جرمن اور انگریزی بھی جانتے تھے۔

## کتابیں

۱۔ ''الحلل السیدسیہ فی الرحلۃ الاندلسیہ''، یہ تین جلدوں میں اندلس کی تاریخ ہے۔

۲۔ ''غزوات العرب فی فرسنہ وشمالی اطالیہ'' اس کتاب کا جنوبی یورپ پر عربوں کے حملے کے نام سے اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

۳۔ ''تاریخ ودالدولۃ العثمانیہ'' یہ ۱۹۱۴ء تک کی سلطنت عثمانیہ کی مفصل تاریخ ہے۔

۴۔ ''تاریخ لبنان''

۵۔ ''حاضر العالم الاسلامی'' ترجمہ

۶۔ ''لماذا تاخر المسلمون'' اس کتاب کا مسلمانوں کے زوال کے اسباب کے نام سے اُردو میں شائع ہو چکا ہے۔

امیر شکیب ارسلان شاعر بھی تھے اور ان کا کلام دیوان کی شکل میں موجود ہے۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل بیروت آگئے تھے اور وہیں ۱۳۲۶ھ میں بمطابق ۱۹۴۶ء میں انتقال فرمایا۔ (۲۲)

ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی رفاعی، ڈاکٹر محمد معروف دوالبی، محمد کرد علی، محمد راغب الطابخ، مصطفیٰ احمد زرخا یہ وہ علماء، محقق، ممتاز اساتذہ اور سیاسی شعور رکھنے والے لوگ ہیں جنہوں نے شام میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی تحریکوں میں بے حد اہم کردار ادا کیا جن کی کتابیں خزانۂ علم میں ایک زبردست اضافہ ہیں۔

آزادی کے بعد شام کی اجتماعی اور سیاسی طرزِ زندگی کو اسلامی طرز پر قائم کرنے کی تمام کوششوں میں ان رہنما ہستیوں نے جو کردار ادا کیا اسے تاریخ نظر انداز نہیں کر سکتی اور اس کا ذکر مفکرینِ اسلام اور محققینِ اسلام نے اپنی تصانیف میں کیا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے شام میں اشتراکیت اور آمریت پسند عناصر سے مسلسل اذیتیں اُٹھائیں اور اس کے باوجود کہ مسلمان اسی فیصد سے زیادہ تھے، گمراہ فرقوں نے شام کی تاریخ میں مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔

ہندوستان کے ممتاز عالمِ دین اور رابطۂ عالمِ اسلامی کے رہنما ابوالحسن ندوی نے ۱۹۵۱ء اور ۱۹۷۳ء کے درمیان چار مرتبہ شام کا سفر کیا اور اس پہلے دو سفر بعثی انقلاب سے پہلے کیے اور دو بعد میں یعنی انقلاب کے بعد

شام کی زندگی میں جو تبدیلیاں انہوں نے دیکھیں وہ یہ تھیں:

۱۔ ہر جگہ جاسوس پھیلے ہوئے تھے، جہاں بھی آپ کا قیام ہوگا کچھ آنکھیں آپ کی نگرانی میں اور کچھ کان آپ کی گفتگو سننے میں مصروف ہوں گے۔

۲۔ وسیع پیمانے پر بے پردگی، عجیب وغریب قسم کا جنسی اختلاط، راستوں اور سڑکوں پر ہر طرف فحش تصاویر اور جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے والے اشتہارات لگے ہوئے تھے اور ہم کو اندازہ ہوا کہ جو شہر اپنی قدامت پسندی اور وضعداری کے لیے مشہور تھا اب آزادی، بے راہ روی اور اخلاقی انحطاط میں بہت آگے جا چکا ہے۔

۳۔ ملک اقتصادی پس ماندگی اور کسی قدر بدحالی کا شکار ہے۔ آمدنی کے ذرائع تقریباً مفقود ہیں اور شام اس خوش حالی سے محروم ہو چکا ہے جس میں اسے امتیاز حاصل تھا۔ (۲۳)

# حواشی وحوالہ جات (باب دوم)

(۱) مولانا مسعود عالم ندوی، محمد ابن عبدالوہاب، طارق اکیڈمی لائلپور، مئی ۱۹۷۵ء، ص:۲۴، ۲۵۔

(۲) ایضاً ، ص:۳۶

(۳) القرآن (۱۱۲:۱۔۴)

(۴) امام مسلم بن الحجاج القشیری، صحیح مسلم، دہلی، مطبع مجتبائی، ۱۳۰۸ھ، باب الایمان

(۵) مولانا مسعود عالم ندوی۔ محمد ابن عبدالوہاب، ص:۶۲

(۶) ثروت صولت، ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص:۹۸ تا ۹۹، ج:۴

(۷) ایضاً

(۸) مریم جمیلہ، اسلام ایک نظریہ ایک تحریک، لاہور، محمد یوسف خان اینڈ سنز، ۱۹۸۶ء، ص:۱۹۱

(۹) ایضاً ، ص:۱۷۷

(۱۰) Sanriya : The study of a renewalist movement in Islam By E.J Bill Leiden. pp 132.

(۱۱) مریم جمیلہ، اسلام ایک نظریہ ایک تحریک، ص:۱۷۸

(۱۲) افتخار احمد، اخوان المسلمون، فیصل آباد، المیزان پبلشرز، ۱۹۹۰ء، ص:۲۱

(۱۳) خلیل احمد حامدی، اخوان المسلمون تاریخ دعوت وخدمات، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص:۱۱

(۱۴) ایضاً ص:۱۲

(۱۵) ایضاً ، ص:۱۳

(۱٦) حسن البناء، حسن البناء شہید کی ڈائری، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء، ص:۲۲

(۱۷) افتخار احمد، اخوان المسلمون، ص:۱۱۵

(۱۸) خلیل احمد حامدی، اخوان المسلمون تاریخ دعوت وخدمات، ص:۵۵

(۱۹) افتخار احمد، اخوان المسلمون، ص:۱۱۸

(۲۰) ثروت صولت، ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ج:۴، ص:۳۸۳،۳۸۲،

(۲۱) ایضاً، ص:۳۸۹،

(۲۲) ایضاً، ص:۳۹۴،

(۲۳) ابوالحسن علی ندوی، دریائے کابل سے دریائے یرموک تک، ص ۱۱۰

# باب سوم

# ایشیاء میں اقامتِ دین کی جدوجہد

# ہندوستان میں تحریکِ احیائے دین

فصل اوّل : شاہ ولی اللہؒ

فصل دوم : سیّد احمد شہیدؒ

فصل سوم : سیّد جمال الدین افغانیؒ کی تحریک

فصل چہارم : جماعتِ اسلامی کی تحریک

فصل پنجم : ایران کی اسلامی تحریک اور امام خمینیؒ کا کردار

باب سوم

# ایشیاء میں اقامتِ دین کی جدوجہد
# ہندوستان میں تحریکِ احیائے دین

فصل اوّل

## شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

(۱۷۰۳ء۔۱۷۷۳ء)

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلوں کی سلطنت بڑی تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہوگئی۔

شاہ ولی اللہؒ ۱۷۰۳ء میں اورنگ زیب کی وفات سے چار سال پہلے پیدا ہوئے۔

اورنگ زیب کے فوراً بعد چند سالوں کے اندر مغلوں کی حکومت جو کبھی عظیم الشان سلطنت تھی ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہوگئی۔ سارے ملک میں بدامنی کی فضا پیدا ہوگئی اور مرہٹے بہت بڑے حصے پر قابض ہونے کے بعد دہلی پر قبضے کے خواب دیکھنے لگے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی حالت خراب تھی بلکہ وہ اخلاقی حیثیت سے بھی زوال کی طرف جا رہے تھے۔ مسلمان معاشرہ مذہبی شعائر اور علومِ دین سے لاتعلق ہوگیا تھا۔ بادشاہوں کے عیش و عشرت نے جس طرح ان کے نظم ونسق کو کمزور کیا تھا اسی طرح عوام الناس بھی آرام طلبی، دولت سے لگاؤ، خود غرضی اور بے ایمانی کی خرابیوں میں مبتلا ہوگئے تھے۔ اورنگ زیب کا زمانہ مرہٹوں کے ساتھ کشمکش کا زمانہ تھا۔ اگرچہ عالمگیر کی بیدار مغزی، ہمت، محنت اور شجاعت واستقلال میں کوئی کلام نہ تھا اور سپاہیوں، سپہ سالاروں میں آرام طلبی، فرض ناشناسی اور خود غرضی جیسی بُرائیاں پیدا ہوچکی تھیں۔ اس دور کی تصویر اس تحریر میں واضح نظر

آتی ہے:

''یہ وہ دور تھا جب انگریزوں کی حکمرانی عالم اسلام پر بالواسطہ یا بلاواسطہ قائم تھی اور جہاں نہیں تھی وہاں اندرونی فتنے سر اُٹھا رہے تھے۔ عالمِ اسلام مرئی طور پر انگریز سے مغلوب تھا بالخصوص برّصغیر کے مسلمان ہزیمت میں ڈوبے پڑے تھے، ان پر خوف و ہراس طاری تھا۔ افغانستان بھی انگریزوں کے زیرِ تسلّط آ چکا تھا ایران میں پھوٹ ڈال کر انگریز قدم جما رہے تھے۔ یورپ میں ترکی کے مقبوضہ علاقے قومیت کے بہانے سے ایک ایک کر کے نکلتے جا رہے تھے۔''(۱)

یہ زمانہ گو ہندوستان میں مسلمانوں کا عہد زوال کہا جا سکتا ہے مگر اصلاحی تحریکوں نے اس دورِ زوال میں اپنے کام کو آگے بڑھایا اور گرتی ہوئی مسلم اُمّت کی ساکھ بحال کی۔

شاہ ولی اللہ مجدد الف ثانیؒ کے انتقال کے تقریباً اسّی سال بعد دہلی میں پیدا ہوئے تھے اور ان میں ادوار کے لحاظ سے فرق تھا کہ مجدد الف ثانی نے اصلاح کا جو کام اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شروع کیا تھا وہ مسلمانوں کا عہدِ عروج تھا اس لئے ان کی تحریک اپنے زمانے کی ان بُرائیوں کے خلاف جہاد کرتی رہی جو غیر مسلموں کے میل جول اور ساتھ رہنے سہنے سے مسلمانوں میں پھیل گئیں تھیں۔ لیکن شاہ ولی اللہؒ کا دور سیاسی زوال کا دور تھا جب اخلاقی بُرائیاں سربراہانِ مملکت اور عوام الناس دونوں کے اندر اس طرح بڑھیں کہ آخر کار ملتِ اسلامیہ ٹکڑوں میں بٹ گئی اور مرہٹوں کی طاقت میں اضافہ کا سبب بنی۔

## ابتدائی زمانہ

شاہ ولی اللہؒ نے اپنے والدِ محترم سے تعلیم حاصل کی اور انہی کے مدرسے میں کئی سال تک پڑھاتے رہے، اعلیٰ تعلیم اور حج کے ارادہ سے عرب تشریف لے گئے۔ ۱۷۳۲ء میں وہ واپس دہلی آئے اور اپنے شاگردوں کو علومِ اسلامی کی تربیت اور تعلیم دینے میں مصروف ہو گئے۔ عالمِ دین ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اپنی ہر تدبیر مسلمانوں کے سیاسی زوال کو روکنے کے لیے کی اور تجدید و احیائے اسلام کے لیے تحریر و تقریر سے برسرِ اقتدار گروہوں کی بداعمالیوں پر بھی تنقید سے گریز نہیں کیا۔

''ان کی کوشش تھی کہ ایک طرف مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو اور وہ پھر سے ایک مضبوط سلطنت قائم کر دیں اور دوسری طرف وہ ان اخلاقی خرابیوں کو دور کر کے اور ان غیر اسلامی طریقوں اور رسم و رواج کو چھوڑ کر جو مسلمانوں میں عام ہوتے جا رہے تھے، دورِ اوّل کے مسلمانوں جیسی زندگی اختیار کر لیں۔'' (۲)

شاہ ولی اللہؒ نے امراء، افواج، اہلِ حرفہ، مزدور اور علماء سے مختلف مواقع پر اپنی تحریروں میں خطاب کیا۔ وہ جانتے تھے کہ عوام میں موجود یہ تمام طبقات اگر درست ہو جائیں، اپنی ذمّہ داریوں کو سمجھیں، اپنے دینی فرائض کو ادا کریں اور زندگی میں سے تساہل، غیر اخلاقی اعمال، توہمات کو نکال دیں تو مسلمان اپنی پس ماندگی دور کر کے زندہ اقوام میں شامل ہو سکتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ ملوکیت کو پسند نہیں کرتے تھے ان کے نزدیک ایک مسلم معاشرے کے لئے بہترین حکومت وہی تھی جو خلافتِ راشدہ کے اُصول کے مطابق قائم کی جائے اس فکر کو بیدار کرنے اور عوام میں اسلام کا صحیح شعور بیدار کرنے کے لیے انہوں نے ایک بڑا کارنامہ یہ سرانجام دیا کہ عربی زبان نہ جاننے والوں کے لیے اور قرآنی تعلیم عام کرنے کی غرض سے قرآنِ مجید کا ترجمہ پہلی بار فارسی زبان میں کیا جو ان کے صاحب زادوں نے بعد میں اُردو ترجمہ کیا۔ ایک عالمِ دین کا یہ اسلامی تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ انہوں نے قرآنِ کریم کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کیا۔

''انہوں نے نہایت ضخیم کتب تصنیف کیں۔ ان کی اہم ترین اور بلند پایہ تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' ہے جو عالمِ اسلام میں بے حد مقبول ہوئی اور قاہرہ کے جامعہ ازہر کے نصاب میں ایک مدت تک شامل رہی۔'' (۳)

مسلمانوں میں اس تحریک نے ایک انقلاب کی رُوح پھونک دی اور یہ انقلاب علمی، عملی اور اتحادِ اُمّت کے لیے تھا۔

''شاہ ولی اللہؒ ایک عظیم راست فکر عالم تھے۔ انہیں برّصغیر کی تاریخ میں جو مستند اور قابلِ اعتماد مرتبہ حاصل ہے اس کی وجہ سے ہر مصلح ان کا نام استعمال کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ چاروں فقہی مذاہب کے زبردست مداح تھے۔ اسلام میں ان کا مقام مجدد کا ہے۔'' (۴)

مندرجہ بالا اقوال، خطوط اور کتابوں کی رائے کو سامنے رکھتے ہوئے ہم شاہ ولی اللہؒ کو اسلام کے ایک بڑے مجدد کا کردار ادا کرتے دیکھتے ہیں۔ وہ دراصل ایک ذہنی و فکری انقلاب چاہتے تھے۔ انہوں نے

معاشرتی، معاشی اور مذہبی اقدار کی درستگی پر ہمیشہ زور دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ لوگ سادہ زندگی اپنا کر، صحت مند روّیے اپنا سکتے ہیں۔ حلال روزی ہی معاشرے کے نیک اور بھلے لوگ پیدا کرتی ہے۔ لوگوں کی معاشی بدحالی کا خاتمہ بھی ان کے پیشِ نظر تھا اور اخلاق و کردار کی درستگی، اسلامی اقدار کی عظمتوں کی بحالی ان کی تحریک کا بنیادی مرکز تھا۔

''شاہ ولی اللہؒ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے زوالِ دہلی پر گہرے مطالعے کے بعد یہ طے کیا کہ یہاں ایک ایسی نئی اسلامی تحریک جاری کی جائے جس کا مقصد اسلامی علوم کا احیاء اور اسلامی تاریخ کی گذشتہ عظمتوں کی بحالی کے ساتھ ساتھ مسلمانانِ ہند کے حال و مستقبل کی تنظیمِ نو کی جائے اور ان کی معاشی بدحالی کا بھی خاتمہ کیا جائے۔''(۵)

''مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر شاہ ولی اللہؒ نے غور کیا اور ان کا علاج معلوم کرنے کی کوششیں کیں۔ ان کے خیال میں برّصغیر کے اخلاقی انحطاط کا سبب خود اسلام سے ان کی ناواقفیت ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قرآنِ حکیم کے اُصولوں پر انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔ ان کے تجزیئے کے مطابق اس وقت کا معاشرہ عدم توازن کا شکار تھا۔''(٦)

شاہ ولی اللہؒ جو فکری انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے اس کی بنیاد انسانی روّیوں، اخلاق و کردار، خیالات وافکار غرض طرزِ زندگی کے ہر زاویے کی درستگی پر تھی۔

''شاہ ولی اللہؒ تاریخِ انسانی کے ان لیڈروں میں سے ہیں جو خیالات کے اُلجھے ہوئے جنگل کو صاف کر کے فکر و نظر کی ایک صاف سیدھی شاہراہ بناتے ہیں اور ذہن کی دنیا میں حالاتِ موجودہ کے خلاف ایسی بے چینی اور تعمیرِ نو کا ایسا دل آویز نقشہ پیدا کرتے چلے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ناگزیر طور پر تخریب فاسد اور تعمیر صالح کے لیے ایک تحریک اُٹھتی ہے۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے لیڈر اپنے خیالات کے مطابق خود کوئی تحریک اُٹھاتے ہوں اور بگڑی ہوئی دنیا کو توڑ پھوڑ کر اپنے ہاتھوں سے نئی دنیا بنانے کے لیے میدان میں نکل آتے ہوں۔ تاریخ میں اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس طرز کے لیڈروں کا اصل کارنامہ یہی ہوتا ہے کہ وہ تنقید سے صدہا برس کی جمی ہوئی غلط فہمیوں کا غبار چھانٹ دیتے ہیں۔ اذہان میں نئی روشنی

پیدا کرتے ہیں، زندگی کے بگڑے ہوئے مگر پختہ بنے ہوئے سانچے کو عالم ذہنی میں توڑتے ہیں اور اس کے ملبے میں سے اصل پائیدار حقیقتوں کو نکال کر دنیا کے سامنے رکھ جاتے ہیں۔ یہ کام بجائے خود اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کی مشغولیت سے آدمی کو اتنی فرصت مشکل ہی سے مل سکتی ہے کہ خود میدانِ عمل میں آ کر تعمیر کا عملی کام کر سکے۔"(۷)

اگر چہ شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تصنیف میں ایک جگہ یہ بات کہی ہے کہ:

"اگر موقع و محل کا اقتضاء ہوتا تو میں جنگ کر کے عملاً اصلاح کرنے کی قابلیت بھی رکھتا تھا۔"(۸)

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کے خیالات و افکار پر عملی جدوجہد ان کے بعد آنے والوں نے کی مگر ان کے اس صاف کیے ہوئے راستے پر عملی جدوجہد کرنے کے لیے اور دوسرے لوگوں کی ضرورت تھی اور وہ نصف صدی کے اندر خود انہی کے حلقۂ اثر سے تعلیم و تربیت پا کر اُٹھے۔

شاہ ولی اللہؒ نے جس طرح ملتِ اسلامیہ کے امراض کی تشخیص کی اور علاج تجویز کیا وہ ان کے تحریروں سے سامنے آتا ہے کہ ان کا ہاتھ کس طرح ملت کی نبض پر تھا۔

"پھر اس زمانے میں ایک بیماری یہ ہے کہ ہر ایک اپنی رائے پر چل رہا ہے اور بگٹٹ بھاگا چلا جا رہا ہے، نہ متشابہات پر جا کر رکتا ہے نہ کسی ایسے امر میں دخل دینے سے باز رہتا ہے جو اس کے علم سے بالاتر ہو۔ احکام کے معانی اور اسرار پر ہر ایک اپنی عقل سے کلام کر رہا ہے اور جو کچھ جس نے سمجھ لیا ہے اس پر دوسروں سے مناظرے اور مباحثے کر رہا ہے۔ دوسری بیماری یہ کہ فقہ میں حنبلی اور شافعی وغیرہ کے سخت اختلافات پائے جاتے ہیں، ہر ایک اپنے طریقہ میں تعصب برتتا ہے اور دوسروں کے طریقہ پر اعتراض کرتا ہے۔ ہر مذہب میں تحریفات کی کثرت ہے اور حق اس غبار میں چھپ گیا ہے۔"(۹)

اس طرح شاہ ولی اللہؒ نے ملتِ اسلامیہ کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اصلاح کی تجاویز بھی دیں اور مختلف طریقے ایسے معلوم و ایجاد کیے جس سے جاہلیت کی معاشرے پر سے گرفت ختم ہو اور اسلام کو پھر اجتماعی زندگی پر گرفت کا موقع ملے۔

صدیوں کی جمی ہوئی بغض و عناد، سرکشی، گمراہی کی گرد ناخنِ تدبیر ہی سے کھرچی جا سکتی ہے اور خیالات کی صفائی حکمت کی نرم اور صلح جو گفتگو ہی کر سکتی ہے اور یہ کام مجدد کا ہی ہوتا ہے جس کے منصب پر ہم شاہ ولی اللہؒ کو فائز دیکھتے ہیں کیونکہ مجدد کی خصوصیات، تحریکِ اسلامی اور انقلابِ اسلامی کی پوری جد و جہد اس دنیائے فکر و علم میں محسوس کی گئی۔

کارِ تجدید کی نوعیت کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں اور اس کے شعبہ جات کی نشاندہی کرتے ہیں جن کو شاہ ولی اللہؒ نے برپا کیا۔ فرماتے ہیں کہ:

''مجدد وہ ہوتا ہے جو نہایت صاف دماغ، حقیقت رس نظر، ہر قسم کی کجی سے پاک، بالکل سیدھا ذہن، افراط و تفریط سے بچنے اور توسط و اعتدال کی سیدھی راہ دیکھنے اور توازن قائم رکھنے کی خاص قابلیت، اپنے ماحول اور صدیوں کے جمے ہوئے اور رچے ہوئے تعصّبات سے آزاد ہو کر سوچنے کی قوت، زمانے کی بگڑی ہوئی رفتار سے لڑنے کی طاقت و جرأت، قیادت و رہنمائی کی پیدائشی صلاحیت، اجتہاد اور تعمیرِ نو کی غیر معمولی اہلیت اور ان سب باتوں کے ساتھ اسلام میں مکمل شرح صدر، نقطۂ نظر اور فہم و شعور میں پورا مسلمان ہونا، باریک سے باریک جزئیات تک میں اسلام اور جاہلیت میں تمیز کرنا، عرصہ ہائے دراز کی اُلجھنوں میں سے امرِ حق کو ڈھونڈھ کر الگ نکال لینا یہ وہ خصوصیات ہیں جن کے بغیر کوئی شخص مجدد نہیں ہو سکتا۔''(۱۰)

## شاہ ولی اللہؒ کے اصلاحی نظریات

متکلمینِ اسلام میں شاہ ولی اللہؒ کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے انہیں دورِ عباسیہ اور جدید متکلمینِ اسلام پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ انہوں نے اسلامی تعلیمات کے لیے جو عقلی بنیادیں مہیّا کی ہیں ان کی علمی قدر و قیمت کے علاوہ یہ خصوصیت بڑی اہم ہے کہ شاہ ولی اللہؒ نے فکرِ اسلامی کو کسی بیرونی تصوّر یا غیر اسلامی فکر کے

سانچے میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی اور نہ کسی غیر اسلامی فلسفۂ زندگی سے مرعوب ہوئے۔

ان کی حقیقت شناس اور دور بین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ جس طرح دورِ عباسیہ میں یونانی اور اسلامی فلسفۂ زندگی کے تصادم سے اس دور کے متکلمین نے علم الکلام کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے اس علم کی بنیاد رکھی تھی اس طرح آنے والے دور میں اسلام کو جدید عقلیات کے مقابلے میں ان سے بھی بڑے تصادم سے دوچار ہونا پڑے گا۔

حجۃ البالغہ اور تفہیماتِ الٰہیہ ان کی تصانیف اہم ہیں۔

## حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے تجدیدی کارنامے

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے تجدید و احیائے دین اور اصلاحِ اُمّت کے لیے جو علمی و عملی جد و جہد فرمائی اس کا دائرہ ایسا وسیع ہے اور اس کے شعبوں میں ایسا تنوع پایا جاتا ہے کہ اس کا احاطہ کرنا دشوار ہے۔ تاہم آپؒ کے تجدیدی کارنامے کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اصلاحِ عقائد و دعوت الی القرآن۔

۲۔ حدیث و سنت کی اشاعت و ترویج اور فقہ و حدیث میں تطبیق کی دعوت و سعی۔

۳۔ شریعتِ اسلامی کی مربوط و مدلل ترجمانی اور اسرار و مقاصدِ حدیث و سنت کی نقاب کشائی۔

۴۔ اسلام میں خلافت کے منصب کی تشریح، خلافتِ راشدہ کے خصائص اور اس کا اثبات اور شیعیت کی تردید۔

۵۔ مغلیہ حکومت کے سیاسی انتشار کے دورِ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کا مجاہدانہ و قائدانہ کردار۔

۶۔ اُمّت کے مختلف طبقات کا احتساب اور ان کو دعوتِ اصلاح و انقلاب۔

۷۔ علمائے راسخین اور ایسے مردان کار کی تعلیم و تربیت جو ان کے بعد اصلاحِ اُمّت اور اشاعتِ دین کا کام جاری رکھیں۔(۱۱)

## اصلاحِ عقائد و دعوت الی القرآن

اصلاحِ عقائد و دعوت الی القرآن، تجدیدِ دین اور اصلاح اُمّت کا سب سے اوّلین عنوان ہے۔ اس کے بغیر احیائے دین کے لئے جو کوشش کی جائے گی وہ نقش بر آب اور عمارت بے اساس ہوگی۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس سلسلہ میں جو تجدیدی کارنامے انجام دیے اس کے بارے میں علامہ سیّد سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں کہ:

> ''عقائد و کلام کی بے سروپا لغو تلقینوں کا، جن پر اب تک علم دین کا گویا مدار سمجھا جاتا تھا، بھرم کھول کر رکھ دیا اور ان کے مقابلے میں کتاب و سنت کے اسرار و مصالح منظرِ عام پر آئے اور ہندوستان کے علماء کو ان کی سات سو برس کی غلط کاریوں پر متنبہ کیا۔ قرآنِ کریم جو اصل میں اسلام کا مرکز و محور ہے اور جو ہندوستان میں اب تک صرف تبرکِ تلاوت کے لئے مخصوص تھا اس کے فہم و تعلیم کو طرف لوگوں کو دعوت دی۔'' (۱۲)

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی عقائد کی اہمیت و اصلاح اور دعوت الی القرآن کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اس دین کا سب سے پہلا امتیاز اور نمایاں شعار عقیدہ پر زور اور اصرار اور سب سے پہلے اس کا مسئلہ حل کرنے کی تاکید ہے......... حقیقت یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ جو علوم و معارف انسانوں تک پہنچتے ہیں ان میں سب سے اعلیٰ اور ضروری واہم علم خدا تعالیٰ کی ذات وصفات اور افعال کا علم اور اس مخصوص تعلق کا تعین ہے جو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان ہونا چاہئے۔ یہ علم سب سے برتر و افضل علم ہے، اس لئے کہ اس پر انسانوں کی سعادت و فلاح دنیوی اور نجات اُخروی موقوف ہے اور یہی عقائد و اعمال اور اخلاق و تمدّن کی بنیاد ہے۔ اسی کے ذریعہ انسان اپنی حقیقت سے واقف ہوتا، کائنات کی پہیلی بوجھتا اور زندگی کا

راز معلوم کرتا ہے۔ اسی سے اس عالم میں اپنی حیثیت کا تعین کرتا اور اس کی بنیاد پر اپنے ہم جنسوں سے اپنے تعلقات استوار کرتا ہے اور اپنے مسلک زندگی کے بارے میں فیصلہ اور پورے اعتماد و بصیرت اور وضاحت کے ساتھ اپنے مقاصد کا تعین کرتا ہے۔'' (۱۳)

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے عقائد کی اصلاح کے لئے مؤثر طریقہ قرآنِ مجید کی تعلیم کو سمجھا۔ چنانچہ مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی ایک دوسری کتاب میں لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس مرض بلکہ وبائے عام کے علاج کے لئے قرآنِ مجید کے مطالعہ و تدبّر اور اس کے فہم کو سب سے مؤثر علاج سمجھا اور یہ بات محض ذہانت، قوتِ مطالعہ اور قیاس پر مبنی نہیں تھی بلکہ ایک ایسی بدیہی حقیقت تھی جس پر قرآنِ مجید خود شاہد ہے اور نہ صرف عہد بعثت کی تاریخ بلکہ اسلام کی پوری تاریخ دعوت اور سرگزشت اصلاح و تجدید گواہ ہے۔ خاص طور پر حقیقت توحید اور حقیقت شرک کو ظاہر کرنے کے لیے اس سے زیادہ واضح، اس سے زیادہ طاقت ور اور دلنشین ذریعہ کا تصوّر نہیں ہوسکتا۔'' (۱۴)

## فتح الرحمٰن

چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قرآنِ مجید کا فارسی میں ترجمہ بنام ''فتح الرحمٰن'' کیا۔ شاہ ولی اللہؒ نے یہ ترجمہ حرمین شریفین سے واپسی کے بعد ۱۰/ ذی الحجہ ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷ء) کو شروع کیا اور ۱۱۵۱ھ (۱۷۳۸ء) میں اس کی تکمیل فرمائی۔ جب یہ ترجمہ قرآنِ مجید مکمل ہوا تو علمائے سُوء نے طعن و تشنیع کرنا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حج سے واپس آنے کے پانچ سال بعد (۳۸-۱۷۳۷ء) فارسی زبان میں کلامِ مجید کا ترجمہ کیا۔ جب علماء کو اس کا پتہ چلا تو تلواریں کھینچ کر

لئے کہ یہ کلامِ مجید کی انتہائی بے ادبی ہے۔ بعض سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اس مخالفت کی وجہ سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی جان اس طرح خطرے میں پڑ گئی کہ انہیں کچھ عرصہ دہلی سے چلے جانا پڑا۔ لیکن بالآخر حضرت شاہ ولی اللہؒ کی جرأت اور فرض شناسی کامیاب ہوئی۔ انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ کلام اللہ اس لیے نہیں آیا کہ اسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر طاق پر تبرکاً رکھا جائے یا جس طرح دوسری قومیں منتر پڑھا کرتی ہیں ہم اسے طوطے کی طرح بغیر سمجھے پڑھ دیں۔ یہ کتاب انسانی زندگی کے متعلق اہم ترین حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس کے نازل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے پڑھیں اور ان حقائق کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں اور اس کے لیے رائج الوقت زبانوں میں اس کا ترجمہ ضروری ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ معترضین کی مخالفت کم ہوئی اور نہ صرف حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ترجمے نے رواج پایا بلکہ اُردو اور دوسری زبانوں کے ترجموں کی راہ پیدا ہوگئی۔''(۱۵)

مولانا حافظ رحیم بخش دہلویؒ نے ''حیاتِ ولی'' میں اس کی تصریح کی ہے کہ:

''جب حضرت شاہ ولی اللہؒ نے قرآنِ مجید کا ترجمہ بزبان فارسی کیا تو علمائے سُوء نے ان کے خلاف زبردست ہنگامہ آرائی کی اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کو قتل کرنے کی دھمکیاں بھی دی گئیں اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کچھ عرصہ کے لیے دہلی سے باہر چلے گئے۔''(۱۶)

اس ترجمۂ قرآنِ مجید کے بارے میں مولانا رحیم بخش دہلوی لکھتے ہیں:

''حقیقت میں اگر قرآن مجید کا ترجمہ اس حادثہ زار زمانہ میں نہ ہوتا تو مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں جو اصلاح ہوئی ہے کبھی نہیں ہوتی اور معلوم نہیں کہ مسلمانوں کو کن کن سختیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا، ان پر مصائب وآفات کے کس قدر لشکر ٹوٹتے اور کیا کیا غضب الٰہی نازل ہوتے۔ اس وقت ہندوستان میں جہاں

سے جہاں تک سچے اسلام کی روشنی نظر آتی ہے اور شرک و بدعت سے صاف اور نتھرا
ہوا مذہب دکھائی دیتا ہے، سب اسی ترجمہ کا صدقہ ہے ۔
ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!''(۱۷)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ترجمہ اور تفسیر فتح الرحمٰن کے علاوہ اُصولِ ترجمہ پر ایک مقدمہ بھی لکھا جو اپنے موضوع کے اعتبار سے بڑا جامع، عالمانہ اور بصیرت افروز ہے۔ یہ مقدمہ فتح الرحمٰن کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

## الفوز الکبیر

دعوت الی القرآن اور خواص اور اہلِ علم کے حلقہ میں تدبّرِ قرآن کی صلاحیت پیدا کرنے اور اس کے ذریعہ سے اُمّت کی اصلاح کا جذبہ پیدا کرنے کے سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ایک تجدیدی و انقلابی کارنامہ ''الفوز الکبیر'' کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں اُصولِ تفسیر کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے اور مسئلہ نسخ پر خاص طور پر مجتہدانہ انداز سے نظر ڈالی ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں لکھی مگر اس کے عربی اور اُردو میں تراجم ہو چکے ہیں۔

## عقائد تشریح و تفہیم، کتاب و سنت کی روشنی میں

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے تجدیدی کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے عقائد کی تشریح و تفہیم کا کام کتاب و سنت کی روشنی میں انجام دیا اور اس بارے میں صحابۂ کرامؓ کے ذوق کے مطابق عمل کرنے کی دعوت دی۔ اس سلسلہ میں ان سے پہلے شیخ الاسلام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) اور ان کے تلمیذِ رشید حافظ ابنِ قیم (م ۷۵۱ھ) نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے عقائد کی تشریح و تفہیم کتاب و سنت کی روشنی میں عوام کے سامنے پیش کی اور ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا نام آتا ہے جو عقائد کی تشریح و تفہیم اور اس کو سلف کے فہم و مسلک کے مطابق پیش کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ اس لیے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے

ایک طرف یونانی فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور علمِ کلام کا پورا مطالعہ کیا تھا اور علم کلام کا پورا سرمایہ ان کے پیشِ نظر بلکہ ان کی دسترس میں تھا۔ دوسری طرف وہ قرآن کے دقیق النظر مفسر، علمِ حدیث کے مایۂ ناز شارح اور اسرار و مقاصد شریعت کے راز داں تھے۔

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے عقائد کی تشریح و تفہیم کے سلسلہ میں ''العقیدۃ الحسنۃ'' (فارسی) تصنیف فرمائی، جس کے بارے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں:

''یہ کتاب علمِ توحید (جسے عام طور پر علمِ کلام سے موسوم کیا جاتا ہے) کا ایک ایسا متن ہے جس میں اہلِ سنت کے عقائد کا وہ لُبِّ لباب آگیا ہے جس سے ہر اس تعلیم یافتہ مسلمان کو واقف ہونا چاہئے جو اپنے تئیں اہلِ سنت میں شمار کرتا ہو اور ان کے عقائد کو اپنا شعار بنانا چاہتا ہو۔'' (۱۸)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے عقائد کی اصلاح کے سلسلے میں زیادہ زور اس پر دیا ہے کہ کتاب وسنت کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ چنانچہ اپنے رسالہ ''وصایا'' میں (جو فارسی زبان میں ہے) لکھتے ہیں:

''اس فقیر کی پہلی وصیت یہ ہے کہ اعتقاد و عمل میں کتاب وسنت کو مضبوط ہاتھوں میں تھاما جائے اور ہمیشہ ان پر عمل کیا جائے، عقائد میں متقدمینِ اہلِ سنت کے مذہب کو اختیار کیا جائے اور (صفات و آیاتِ متشابہات) کے سلسلہ میں سلف نے جہاں تفصیل و تفتیش سے کام نہیں لیا ان سے اعراض کیا جائے اور معقولیان خام کی تشکیکات کی طرف التفات نہ کیا جائے۔'' (۱۹)

## حدیث وسنت کی اشاعت و ترویج

علمِ حدیث کی ترویج واشاعت اور اس کے احیاء کے سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے وہ ان کے صحیفہ تجدید اور کتابِ زندگی کا ایک روشن باب ہے۔ آپ کے اس تجدیدی کارنامے کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ ''حدیث''، دین وشریعت کے

نظام، اسلام کو، اپنی اصل شکل میں باقی رکھنے کی کوششوں اور اسلامی مزاج و ماحول کی تشکیل وحفاظت میں کیا حیثیت رکھتی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی نے اپنے رسالہ ''حدیث کا بنیادی کردار'' میں بڑے اچھے اور عمدہ پیرایہ میں واضح کیا ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> حدیثِ نبوی ﷺ ایک ایسی صحیح میزان ہے جس میں ہر دور کے مصلحین ومجددین اس اُمت کے اعمال وعقائد، رجحانات وخیالات کو تول سکتے ہیں اور اُمت کے طویل تاریخی و عالمی سفر میں پیش آنے والے تغیّرات وانحرافات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اخلاق واعمال میں کامل اعتدال وتوازن اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک قرآن وحدیث کو بیک وقت سامنے نہ رکھا جائے۔ اگر حدیثِ نبوی ﷺ کا وہ ذخیرہ نہ ہوتا جو معتدل، کامل ومتوازن زندگی کی صحیح نمائندگی کرتا ہے اور وہ حکیمانہ نبوی ﷺ تعلیمات نہ ہوتیں اور یہ احکام نہ ہوتے جن کی پابندی رسول اللہ ﷺ نے اسلامی معاشرہ سے کرائی تو یہ اُمت افراط وتفریط کا شکار ہوکر رہ جاتی اور اس کا توازن برقرار نہ رہتا اور وہ عملی مثال موجود نہ رہتی جس کی اقتداء کرنے کی اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں ترغیب دی ہے:
>
> لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ o

ترجمہ: ''یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات اُسوۂ حسنہ ہے۔''(۲۰)

اور یہ فرما کر آپ ﷺ کے اتباع کی دعوت دی ہے:

> قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ o

ترجمہ: ''آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمادے گا۔''(۲۱)

یہ ایک ایسا عملی نمونہ ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے اور جس سے وہ زندگی، قوت واعتماد اور یہ اطمینان حاصل کر سکتا ہے کہ دینی احکام کا زندگی پر نفاذ نہ صرف آسان بلکہ ایک امر واقعہ ہے۔

حدیثِ نبوی ﷺ زندگی، قوت اور اثر انگیزی سے بھرپور ہے اور ہمیشہ اصلاح وتجدید کا کام، فساد اور خرابیوں اور بدعتوں کے خلاف صف آراء اور برسرِ جنگ ہونے اور معاشرہ کا احتساب کرنے پر اُبھارتی رہی ہے اور اس کے اثر سے ہر دور اور ہر ملک میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اصلاح وتجدید کا جھنڈا بلند کیا، کفن بردوش ہو کر میدان میں آئے اور بدعتوں اور خرافات اور جاہلی روایات سے کھلی جنگ کی اور دینِ خالص اور صحیح اسلام کی دعوت دی۔ اسی لئے حدیثِ نبوی ﷺ اُمتِ اسلامیہ کے لئے ایک ناگزیر حقیقت اور اس کے وجود کے لئے ایک لازمی شرط ہے۔ اس کی حفاظت، ترتیب وتدوین، حفظ اور نشر واشاعت کے بغیر اُمت کا یہ دینی وذہنی، عملی واخلاقی دوام وتسلسل برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔

## تاریخ اسلام میں اصلاح وتجدید کی تحریکیں علمِ حدیث سے وابستہ ہیں

سنّتِ نبوی ﷺ اور حدیثِ نبوی ﷺ کے مجموعے ہمیشہ اصلاح وتجدید اور ملتِ اسلامیہ میں صحیح اسلامی فکر کا سرچشمہ رہے ہیں۔ انہی سے اصلاح کا بیڑہ اُٹھانے والوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں صحیح علمِ دین اور خالص فکرِ اسلامی اخذ کی۔ انہی احادیث سے انہوں نے استدلال کیا اور دین واصلاح کی دعوت میں وہی ان کی سند اور ان کا ہتھیار اور سپر تھی۔ بدعتوں، فتنوں اور شر وفساد سے جنگ ومقابلہ کے معاملہ میں وہی قوتِ محرکہ ودافعہ تھی۔ آج جو بھی مسلمانوں کو دینِ خالص اور اسلام کامل کی طرف آنے کی پھر دعوت دینا چاہتا ہے وہ ان کے اور نبوی زندگی یعنی کامل اُسوۂ حسنہ کے درمیان تعلق استوار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور جس کو بھی ضرورت اور زمانہ کے تغیرات نئے احکام کے استنباط کرنے پر مجبور کرتے ہیں، وہ اس سرچشمہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

اس حقیقت پر اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی حدیث وسنّت کی کتابوں سے مسلمانوں کے تعلق اور واقفیت میں کمی آئی اور طویل مدت تک یہ کمی باقی رہی تو داعیوں اور اخلاق کی تربیت،

نفوس کا تزکیہ کرنے والے روحانی مربّیوں کی کثرت، دنیا میں زہد اختیار کرنے اور کسی حد تک سنت پر عمل کرنے کے باوجود اس مسلم معاشرہ میں جو علوم اسلامیہ کے ماہرین اور فلسفہ وحکمت کے اساتذہ کے فن اور ادباء وشعراء سے مالا مال تھا اور اسلام کی قوت وغلبہ اور مسلمانوں کی حکمرانی میں زندگی گذار رہا تھا، نت نئی بدعتوں، عجمی رسم ورواج اور اجنبی ماحول کے اثرات نے اپنا تسلّط قائم کرلیا۔ یہاں تک کہ اندیشہ ہونے لگا کہ وہ جاہلی معاشرہ کا دوسرا ایڈیشن اور اس کا مکمل عکس بن جائے گا اور رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی اور حدیث حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی:

لَتَتَّبِعَنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَ ذِرَاعًا بِذِرَاعٍ

ترجمہ: ''تم پچھلی امتوں کے راستوں پر قدم بقدم چلو گے۔'' (۲۲)

اُس وقت اصلاح کی آواز خاموش اور علم کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔

دسویں صدی ہجری میں ہندوستان کے دینی حالات اور مسلمانوں کی زندگی کا جائزہ لیجئے جبکہ برّ صغیر ہند کے علمی ودینی حلقوں کا حدیث شریف اور سنت کے ماخذ ومراجع سے تعلق تقریباً منقطع ہو گیا تھا، علم حدیث کے مراکز اور حجاز ویمن، مصر وشام کے ان مدارس سے جہاں حدیث شریف کا درس ہوتا تھا، کوئی رابطہ نہ تھا اور کتب فقہ واُصول اور ان کی شروح اور فقہی باریکیوں اور موشگافیوں اور حکمت وفلسفہ کی کتابوں کا عام چلن تھا، بآسانی دیکھا جاسکتا ہے کہ کس طرح بدعتوں کا دور دورہ تھا، منکرات عام ہو گئے تھے اور عبادتوں اور تقربِ الی اللہ کی کتنی شکلیں اور نئے طریقے ایجاد کرلیے گئے تھے۔

اگر علمائے اسلام کی دسترس میں کتب حدیث نہ ہوتیں اور سنتوں اور بدعتوں میں تفریق وامتیاز کا یہ معتبر وسہل ذریعہ نہ ہوتا تو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸) کے عہد سے حکیم الاسلام شاہ ولی اللہؒ (م ۱۱۷۶ھ) کے عہد تک مصلحین اُمت اور دین خالص کے مبلغین کا یہ سلسلہ وجود میں نہ آتا اور مصلحین روزگار اور تصحیح عقائد واصلاح کے علمبردار نظر نہ آتے۔

## وفات

موت ہر شخص کے لیے مقدر ہے۔ ہزاروں عظیم الشان سلاطین، دنیا کے مشہور و نامور تاجدار، خدا کے پیارے اور بزرگانِ دین، اولیائے کرام اور نامور علمائے کرام اور مشاہیر اسلام چند روزہ مسافرانہ زندگی گذارنے کے بعد اپنے اصل مرجع کی طرف رجوع کر گئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ بروز شنبہ (۲۱ اگست ۱۷۶۲ء) بوقت ظہر انتقال کیا۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) اور اپنے والد مولانا شاہ عبدالرحیم دہلویؒ کے پہلو میں پرانی دہلی کے قبرستان مہندیاں میں دفن ہوئے۔ انتقال کے وقت عمر ۶۳ سال تھی۔ (۲۳)

فصل دوم

# سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک

(۱۷۸۶ء۔ ۱۸۳۱ء)

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فکری رہنمائی کے ذریعے اقامتِ دین کا جو جامع پروگرام مرتب کیا تھا اس کی روشنی میں ان کے فرزندارجمند نے اپنے تلامذہ اور جگر گوشوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جس نے درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور وعظ و تبلیغ کے ذریعہ پہلے اس انقلابی فکر کو عوام کے سامنے پیش کیا۔ بعد ازاں اپنی تبلیغی مساعی میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اقامتِ دین کے لیے عملی جدوجہد کا آغاز کر دیا اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی وفات کے ٹھیک ۶۵ سال بعد ۱۲۴۲ھ میں پشاور اور افغانستان کے آزاد قبائلی علاقوں میں ایک آزاد اسلامی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی مگر یہ کامیابی زیادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکی کیونکہ ۱۲۴۵ھ کو بالاکوٹ کی شہادت گاہ میں اس تحریک کے سرکردہ رہنما ایک ایک کر کے شہید ہوگئے اور اس طرح یہ انقلابی تحریک بظاہر ناکام ہوگئی لیکن شاید یہ اسی تحریک کی برکت تھی کہ حضرت سیّد احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کرام نے اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جن علاقوں کو منتخب کیا تھا سوا سو سال کے بعد حق تعالیٰ نے ان ہی علاقوں میں ایک آزاد و خود مختار اسلامی حکومت کے قیام کو پاکستان کی صورت میں ممکن بنا دیا۔

حضرت سیّد احمد شہیدؒ اور ان کی تحریکِ جہاد کے ساتھ ایک ناانصافی یہ ہوئی کہ ان کے بعض سوانح نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے کسی سیاسی مصلحت یا اپنی کوتاہ اندیشی سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ حضرت سیّد احمد شہیدؒ کی تحریکِ جہاد صرف سکھوں کے خلاف تھی انگریزی حکومت کے خلاف اقدام کرنا ان کے پروگرام کا حصہ نہ تھا حالانکہ حضرت سیّد احمد شہیدؒ کے مکتوبات و ارشادات کے ذریعہ ان کے جو عزائم دنیا تک پہنچے ہیں وہ اس خیال کی تردید کرنے کے لیے بہت کافی ہیں۔

حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنے مرتب کردہ مکتوبات میں سیّد صاحبؒ کے جو اہم خطوط نقل کیے ہیں

ان میں سے دو اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں جن کے مطالعے کے بعد ان کے عزمِ جہاد اور نصب العین کے تعین میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

''نصاریٰ اور مشرکین ہندوستان کے بلاد پر دریائے سندھ سے لے کر ساحلِ بحر تک قابض ہو گئے، یہ اتنا بڑا ملک ہے کہ انسان پیدل چلے تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے میں چھ مہینے لگ جائیں۔ انہوں نے خدا کے دین کو ختم کرنے کے لیے تشکیک وتزویر کا جال بچھایا ہے اور ان تمام خطوں کو کفر کی تیرگی سے بھر دیا ہے۔''

اسی خط میں آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

> ''جب اسلامی بلاد پر غیر مسلم مسلّط ہو جائیں تو عام مسلمانوں پر عموماً اور بڑے بڑے حکمرانوں پر خصوصاً واجب ہو جاتا ہے کہ ان غیر مسلموں کے خلاف مقابلہ ومقاتلہ کی کوشش اس وقت تک جاری رکھیں جب تک اسلامی بلاد ان کے قبضے سے واپس نہ لے لیے جائیں ورنہ مسلمان گنہگار ہوں گے، ان کے اعمال بارگاہِ باری تعالیٰ میں مقبول نہ ہوں گے اور خود قربِ حق کی نعمتوں سے محروم رہیں گے۔''(۲۴)

ہر دو اقتباسات میں نصاریٰ ومشرکین اور غیر مسلموں کے خلاف بلا امتیاز عام مسلمانوں اور مسلم حکمرانوں کو اقدامِ جہاد میں شرکت کرنے اور پورے ہندوستان کو غیر مسلم قوتوں کے تسلّط سے آزاد کرانے کی دعوت دی گئی ہے۔

''یہاں مولانا غلام رسول مہر کی کتاب ''سیّد احمد شہیدؒ'' کے حوالہ سے ایک انگریز سیاح میسؔن کا قول نقل کر دینا ان خیالات کی تردید کے لئے کافی ہوگا جس میں سیاح مذکور نے جن دنوں سیّد صاحب مصروف تھے۔ سرحد، افغانستان اور بلوچستان کا دورہ کرنے کے بعد ان کی تحریکِ جہاد کا یہ مقصد بیان کیا تھا کہ سکھوں کا استحصال، پنجاب پر قبضہ پھر ہندوستان اور چین پر تسلّط، گویا انگریز سیاح اپنوں سے بڑھ کر سیّد صاحب کے اصل پروگرام اور مقاصدِ جہاد سے باخبر تھا۔''(۲۵)

## ولادت اور ابتدائی حالات

حضرت سیّد احمد شہیدؒ ۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء کو بمقام بریلی پیدا ہوئے۔ والد کا نام سیّد محمد عرفان تھا۔ جن کے جد امجد عہدِ عالمگیر کے مشہور عالم ربّانی سیّد علم اللہ صاحبؒ تھے۔ سید صاحبؒ حسن مثنیٰ بن امام بن امام حسنؓ کی اولاد میں سے ہیں۔ ۳۷ ویں پشت میں آپ کے سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم ﷺ سے مل جاتا ہے۔

ابتدائی عمر میں پڑھنے لکھنے کی طرف رغبت بہت کم تھی۔ ۱۷-۱۸ سال کی عمر میں چند ساتھیوں کے ہمراہ فکرِ معاش اور تلاشِ روزگار کی غرض سے لکھنؤ کا سفر کیا، یہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد حصولِ علم اور طلبِ سلوک کا شوق لے کر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں دہلی پہنچے۔ ابتدائی کتابیں حضرت شاہ محمد اسحٰقؒ، مولانا عبدالحئیؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیلؒ سے پڑھیں اور تفسیر وحدیث کا بیان حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے حلقۂ درس میں سنتے رہے۔ دورانِ تعلیم جب یہ کیفیت پیدا ہوگئی کہ پڑھتے وقت کتاب کے حروف نظر سے غائب ہوجانے لگے جبکہ دوسری تمام چیزیں صاف نظر آتی تھیں تو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے مشورہ سے سلسلۂ تعلیم منقطع ہوگیا اور علومِ ظاہری کی تکمیل نہ ہوسکی۔

''شاہ صاحبؒ کے خاندان میں شادی کی کوئی تقریب تھی۔ تینوں بھائی تشریف فرما تھے۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کو سیّد صاحبؒ کی کوئی ادا بھا گئی اور انہوں نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے کہہ کر سیّد صاحب کو اپنی تربیت میں لے لیا۔ سیّد صاحب مدرسہ رحیمیہ سے حضرت شاہ عبدالقادرؒ کی اکبری مسجد میں آگئے اور ان کے حجرے کے قریب سہ دری میں ذکر و شغل کرتے رہے، جو جگہ شاہ صاحبؒ نے بتادی تھی اسی جگہ بیٹھے رہتے اور جب تک شاہ صاحب وہاں سے اُٹھنے کو نہ کہتے وہیں بیٹھے رہتے۔ اڑھائی برس تک ان کی خدمت میں رہ کر منازلِ سلوک طے کیں ایک روز حضرت شاہ عبدالقادرؒ، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں لے کر گئے اور عرض کیا کہ: ''اب انہیں آپ بھی پرکھ لیں'' انہوں نے فرمایا: ''تم جو کچھ سمجھتے ہو ٹھیک ہے اب تم انہیں بیعت کی اجازت دیدو!'' (امیر الروایات) حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے فرمایا: انہیں اجازت بھی آپ ہی دیں گے اور ان سے سلسلہ بھی آپ ہی کا چلے گا۔''(۲۶)

جب حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے تصوّرِ شیخ کی تعلیم کی تو سیّد صاحب نے نہایت ادب سے عرض کیا:
آپ کسی معصیت کا حکم فرمائیں تو وہ میں کرلوں گا مگر یہ تو بظاہر شرک کی صورت معلوم ہوتی ہے!
حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے سینے سے لگالیا اور فرمایا: تمہیں طریقِ ولایت سے مناسبت نہیں لہٰذا تمہیں طریقِ نبوت سے راہ سلوک طے کرائیں گے۔

سیّد صاحبؒ ۱۸۰۴ء میں دہلی آئے تھے۔ ۱۸۰۸ء حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے خلعت خلافت سے سرفراز فرمادیا۔ حصولِ خلافت کے بعد شاہ صاحبؒ کی اجازت اور مشورہ سے والیٔ ٹونک امیر خان کے لشکر میں ملازمت اختیار کرلی اور چھ سات سال لشکر سے وابستہ رہے۔ لیکن ۱۸۱۷ء کے اواخر میں والیٔ ٹونک نے حالات سے مجبور ہوکر انگریزوں سے صلح کرلی تو سیّد صاحب نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کو لکھا کہ:

''خاکسار قدم بوسی کو حاضر ہوتا ہے، یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہوگیا، نواب صاحب انگریزوں سے مل گئے اب یہاں رہنے کی کوئی صورت ممکن نہیں۔'' (۲۷)

والیٔ ٹونک کے لشکر سے علیحدگی کے بعد سیّد صاحب حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حسبِ معمول اکبری مسجد میں قیام فرمایا۔

ایک روز حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی مجلس میں آپ کے داماد مولانا عبدالحئیؒ بھی موجود تھے۔ اسرار صلوٰۃ اور حضورِ قلب پر گفتگو چھڑ گئی، شاہ صاحب نے فرمایا: حضورِ قلب چاہتے ہو تو سیّد صاحب سے رجوع کرو!
وہاں سے اُٹھ کر سیدھے سیّد صاحب کی خدمت میں اکبری مسجد آئے۔ سیّد صاحب نے حقیقتِ صلوٰۃ اور اس کے معارف بیان کیے اور فرمایا: صرف زبانی تعلیم سے یہ نعمت حاصل نہیں ہوتی آیئے دو رکعت نماز پڑھیں۔ نماز پڑھنے کے بعد حضرت مولانا عبدالحئیؒ اسی وقت بیعت ہوگئے انہوں نے واپس آکر حضرت شاہ اسماعیلؒ کو شوق دلایا انہوں نے بھی جاکر سیّد صاحب کے ساتھ نماز پڑھی اور وہی دولت پائی اور بعد نماز بیعت کرلی۔ اس کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے اکثر اہلِ خاندان مثلاً مولانا محمد اسحاق، شاہ محمد یعقوب، مولانا محمد یوسف (برادر زادہ شاہ ولی اللہ) سیّد صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔ ان کے علاوہ مولانا وجیہہ الدین، حکیم مغیث الدین، حافظ معین الدین مع اہل خاندان بیعت ہوئے۔ دہلی کے ان اکابر کی

بیعت کی وجہ سے لوگ جوق در جوق مرید ہونے لگے۔

## پہلا تبلیغی دورہ اور اس کے نتائج

جہاں جہاں یہ خبر پہنچی کہ خاندان حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بیشتر حضرات اور دہلی کے اکابر نے سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے تو لوگوں میں طلب وشوق کی بے تابی بڑھ گئی، لوگ دور دور سے بیعت کے لئے آنے لگے اور اطرافِ ملک سے دعوت نامے وصول ہونے لگے جب بہت سے خطوط جمع ہو گئے تو سیّد صاحبؒ نے یہ تمام دعوت نامے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں پیش کر دیے وہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اپنا لباسِ خاص پہنا کر تبلیغی دورے پر روانہ ہونے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ اس دورے میں حضرت مولانا عبدالحیؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیلؒ بھی آپ کے شریکِ سفر تھے۔ تقریباً ستر آدمی آپ کے ساتھ تھے، آغازِ سفر سے پہلے ہی اس تبلیغی دورے کو بڑی شہرت حاصل ہو گئی تھی جن شہروں اور بستیوں سے یہ قافلہ گذرتا لوگ شہر سے باہر آ کر استقبال کرتے اور عزت وتکریم کے ساتھ خدماتِ مہمان داری بجالاتے۔ دہلی سے روانہ ہو کر پہلی منزل غازی آباد ہوئی۔ یہاں سے مردان نگر پہنچے جہاں حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ کے صاحبزادے نے عوام وخواص کی جمعیت کے ساتھ استقبال کیا۔ مردان نگر سے میرٹھ تشریف لے گئے۔ یہاں کے لوگ کئی روز سے منتظر تھے، عوام وخواص کی بڑی تعداد نے استقبال کیا۔ ہر جگہ دعوتیں ہوئیں۔ ہزاروں آدمی بیعت ہوئے۔ میرٹھ چھاؤنی میں بھی بہت سے لوگ مرید ہوئے۔ ایک ہفتے کے قیام کے بعد سردھنہ اور وہاں سے بڑھانہ پہنچے۔ یہاں حضرت مولانا عبدالحیؒ کے یہاں بارہ دن قیام ہوا بے شمار لوگ بیعت ہوئے، سترہ دن قیام فرما کر مظفر نگر ہوتے ہوئے دیوبند تشریف لائے۔ یہاں دس روز قیام کرنے کے بعد سہارنپور پہنچے۔ دیوبند سے سہارنپور جتنی بھی بستیاں راستے میں آئیں ان بستیوں کے تمام لوگ بیعت ہو گئے۔ سہارنپور میں عوام وخواص کے ایک جمِ غفیر نے شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا۔ نمازِ مغرب بوبنی کی مسجد میں پڑھی جہاں حاجی امداد اللہؒ مہاجر مکی کے پیر میاں جی نور محمد کے شیخِ طریقت حاجی عبدالرحیمؒ ولایتی مسجد کے ایک حجرے میں رہتے تھے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنے ہزاروں مریدوں کے ساتھ سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

سہارنپور میں بیس دن قیام رہا۔ لوگ بہت سی بدعتوں اور خلافِ سنت اُمور سے تائب ہو گئے۔ قصابوں اور نور بافوں کی پوری برادریاں داخلِ بیعت ہوئیں۔ لوگوں نے غیر شرعی وضع ترک کر کے اسلامی وضع اختیار کر لی، ایک ایک دن میں تین تین آدمیوں نے بڑھی ہوئی مونچھیں ترشوا دیں۔

## بیعتِ عام اور اس کے مقاصد

''پہلے تبلیغی دورے میں سیّد صاحبؒ کے ہاتھوں پر بلا مبالغہ لاکھوں مسلمانوں نے بیعت کی، پوری پوری بستیاں اور برادریاں حلقۂ ارادت میں داخل ہوئیں مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عام پیروں کی طرح محض مریدوں کی تعداد بڑھانے اور حلقۂ ارادت کو وسعت دینے کیلئے بیعت عام کا یہ سلسلہ جاری تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسکے ذریعہ سیّد صاحبؒ نے اصلاح و تبلیغ دین کا وہ زبردست کارنامہ انجام دیا جس کی کوئی مثال برصغیر کی گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ درست ہے کہ سیّد صاحبؒ اپنی مجالس وعظ میں پگڑیاں پھیلا کر بیک وقت ہزار ہا اشخاص کو بیعت کر لیا کرتے تھے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حق تعالیٰ نے اس بیعت عام میں وہ خیر و برکت عطا کی تھی کہ آپ جہاں جہاں تشریف لے گئے وہاں سے بدعت و ضلالت کا خاتمہ ہو گیا اور لوگ آپ کے چند روزہ قیام کی خیر و برکت سے برسوں کی عاداتِ بد سے تائب ہو کر صحیح معنوں میں متبع شریعت بن گئے۔''(۲۸)

یہ کامیاب دورہ چھ مہینے کی مدت میں مکمل ہوا۔ سہارنپور سے دہلی واپسی کے لئے انبہٹہ، رام پور، نانوتہ، گنگوہ، لوہاری، تھانہ بھون اور کاندھلہ کا راستہ اختیار فرمایا کیونکہ اس سفر کے تمام تذکروں میں ان مقامات کا ذکر بصراحت کیا گیا ہے اس لیے غالب گمان یہی ہے کہ مراجعت اس راستے سے ہوئی ہو گی۔

دورۂ تبلیغ سے واپسی پر کچھ دن دہلی قیام فرمانے کے بعد اپنے وطن بریلی تشریف لے گئے۔

## سنت متروک کا اجراء

بریلی میں قیام کے دوران اپنے مرحوم بھائی مولانا سیّد محمد اسحاق صاحب کی بیوہ سے نکاح کی خواہش کی، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے مسلم شرفاء میں نکاح بیوگان کی سنت عملاً متروک ہو چکی تھی، اپنے اہلِ

خاندان سے فرمایا کہ وہ یہ نکاح حظ نفس کے لیے نہیں بلکہ اجراء سنت اور ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک رسمِ جاہلیت کو مٹانے کے لئے کر رہے ہیں۔ دو تین مہینوں کی کوشش کے بعد اہلِ خاندان اور وہ مخدومہ نکاح پر راضی ہوگئیں اور آپ کے اس عمل کی برکت سے ہندوستان کے مسلم معاشرے میں یہ سنتِ متروک دوبارہ جاری ہوگئی۔

## صراطِ مستقیم

بریلی میں قیام کے دوران مولانا عبدالحیؒ اور مولانا شاہ اسمٰعیلؒ نے فارسی زبان میں آپ کے ملفوظات وارشادات کا ایک مجموعہ مرتب کیا جس کا نام "صراطِ مستقیم" رکھا گیا۔ یہ مجموعۂ ملفوظات چار ابواب پر مشتمل ہے: پہلا باب اور چوتھا باب مولانا شاہ اسمٰعیلؒ نے مرتب کیا ہے جبکہ دوسرا اور تیسرا باب مولانا عبدالحیؒ نے لکھا ہے۔ پہلے باب میں طریق ولایت اور طریق نبوت کا فرق بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ان تمام بدعات ورسومات کا ذکر ہے جو کفار ومشرکین سے اختلاط کی وجہ سے تصوّف کے نام پر اہلِ اسلام میں داخل ہوگئی تھیں۔ تیسرے باب میں تصوّف کے مختلف طریقوں، ان کے اوراد ووظائف اور طریقۂ تعلیم کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں سلوک راہ نبوت کا بیان ہے جو طریقت میں سیّد صاحب کا مخصوص طریقہ ہے اور ایّامِ طلب سلوک سے آخر وقت تک جب دنیا نے آپ کو شیخ کامل اور مجددِ وقت تسلیم کرلیا، اسی مخصوص سلوک پر عامل رہے۔

## واقعۂ نصیر آباد

بریلی کے دورانِ قیام اکتوبر ۱۸۱۹ء میں نصیر آباد کا مشہور واقعہ پیش آیا جس سے لوگوں کو پہلی بار سیّد صاحب کے تدبّر، معاملہ فہمی اور قائدانہ صلاحیوں کا اندازہ ہوا۔

نصیر آباد کا قصبہ رائے بریلی سے دس بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس قصبے کی قدیم آبادی سنی تھی مگر شاہانِ اودھ کے زمانے میں شیعیت کو فروغ حاصل ہوا اور چار محلوں میں سے صرف ایک محلّہ سنیّوں کا باقی

رہ گیا۔ ۶ محرم کو نصیر آباد کی سنی آبادی کا پیغام لے کر ایک شخص سیّد صاحب کی خدمت میں آیا اس نے بتایا کہ اس سال قصبہ کی شیعہ آبادی اعلانیہ تبرا کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔ سیّد صاحب اگلے دن ستر رفقاء کے ساتھ نصیر آباد تشریف لے گئے۔

آپ نے اہلِ تشیع کو پیغام بھجوایا کہ ہم تمہاری مذہبی رسوم کی ادائیگی میں قطعی مزاحم نہ ہوں گے شوق سے علم اور تعزیے نکالیں، ماتم عزاداری کریں، ہم تبرا کے مخالف ہیں، مگر قصبے کے شیعوں نے اس سال احتجاجاً محرم کی تمام رسمیں موقوف کر دیں اور ایک وفد ماتمی لباس میں بادشاہ بیگم کی خدمت میں لکھنؤ گیا جس کے نتیجہ میں وہاں کے حاکم نصیر آباد کے نام سنّیوں کی تادیب وسرزنش کا حکم جاری ہو گیا۔

یہ خبر پا کر فقیر محمد خان رسالدار چند ساتھیوں کے ساتھ معتمد الدولہ آغا میر کے پاس گئے اور انہیں صورتِ حال کی نزاکت سے آگاہ کیا، معتمد الدولہ نے بادشاہ سے جا کر کہا کہ سیّد صاحبؒ جن کے ہزاروں مرید لشکرِ شاہی میں ہیں اور جن کے معتقدین کا سلسلہ سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے، نصیر آباد کے کچھ لوگوں نے حاکم نصیر آباد کے نام شاہ بیگم کی طرف سے ان کے خلاف تادیبی کاروائی کے احکام صادر کرالئے ہیں، اگر حاکمِ نصیر آباد نے احکام کی تعمیل میں کوئی اقدام کیا تو بہت بڑا ہنگامہ اور زبردست فتنہ کھڑا ہو جائے گا اور پھر یہ آگ بجھائے نہ بجھ سکے گی۔ بادشاہ نے تمام باتیں غور سے سنیں اور وزیر اعظم کو حکم دیا کہ متوقع فتنے سے بچنے کے لیے مناسب کاروائی عمل میں لائیں۔

معتمد الدولہ اور فقیر محمد خان نے اخوند زادہ کو پانچ سو سوار اور پیادہ فوج کے ساتھ فوراً نصیر آباد روانہ کیا تاکہ حاکمِ علاقہ اہلِ سنّت کے خلاف کوئی سخت قدم نہ اُٹھا بیٹھے۔ شیعہ مجتہد مولانا سیّد دلدار علی جو نصیر آباد کے رہنے والے تھے انہیں صورتِ حال کا علم ہوا تو انہوں نے نصیر آباد کے اہلِ تشیع کو خفیہ پیغام بھجوا دیا کہ سیّد صاحب سے فوراً صلح کر لیں چنانچہ نصیر آباد کی شیعہ برادری نے سیّد صاحبؒ سے صلح کر لی اور ایک تحریری صلح نامہ مرتب ہوا جس کی ایک نقل لکھنؤ روانہ کر دی گئی اور ایک نقل سیّد صاحبؒ کے پاس رہی۔ اخوند زادہ نے حاضرِ خدمت ہو کر معتمد الدولہ اور فقیر محمد خان کی طرف سے بارہ ہزار روپے کی نذر پیش کی اور فتنہ پردازوں کے خلاف کاروائی کرنے کا عزم ظاہر کیا۔ آپ نے فرمایا جو مقصد تھا وہ صلح کے ذریعہ پورا ہو گیا اب کسی تادیبی

کاروائی کی ضرورت نہیں۔

جو رقم اس نے بطورِ نذر پیش کی تھی سیّد صاحبؒ نے یہ رقم بھی شکریہ کے ساتھ واپس کردی اور اس طرح سیّد صاحبؒ کے تدبّر اور معاملہ فہمی سے ایک بہت بڑا خطرہ سر سے ٹل گیا۔

## بنارس اور لکھنؤ کے تبلیغی دورے

لکھنؤ کے دورے سے قبل سیّد صاحبؒ نے مریدین و معتقدین کے ہمراہ الٰہ آباد، بنارس اور کانپور کا دورہ کیا۔ بریلی سے الٰہ آباد پہنچنے میں ایک مہینے سے زیادہ وقت صرف ہوا کیونکہ راستے میں جتنے دیہات و قصبات آئے وہاں کے لوگوں کے اصرار پر ٹھہرنا پڑا، ہر جگہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ بیعت ہوئے اور بدعات ورسومات سے توبہ کی. بنارس میں ایک مہینے کے قیام کے دوران کم وبیش ۲۰ ہزار مسلمان داخلِ بیعت ہوئے نور باف برادری کے لوگ بڑی تعداد میں مرید ہوئے۔

بنارس سے واپس آکر کچھ دن بریلی میں قیام کیا پھر ایک سو ستر ہمراہیوں کے ساتھ لکھنؤ کے تاریخی دورے پر روانہ ہوئے۔ یہ نواب غازی الدین حیدر کی بادشاہت اور معتمد الدولہ آغا میر کی وزارت کا زمانہ تھا۔ بادشاہ وزیر اور امراء دولت عیش عشرت کی بدمستیوں میں غرق تھے، لوٹ کھسوٹ، دولت ستانی، حق تلفی اور ایذاء رسانی ان کا معمول تھا. ایسے ظالمانہ عہدِ حکومت اور بگڑے ہوئے معاشرے میں اعلاء کلمۃ الحق اور اصلاحی و تبلیغی کوششیں آپ کے مجاہدانہ عزم وحوصلے کی روشن دلیل ہیں۔

لکھنؤ پہنچ کر پہلے اکبری دروازہ کے قریب میر مسکین کی حویلی میں قیام کیا بعد ازاں جگہ کی تنگی کی وجہ سے دریائے گومتی کے کنارے امام بخش سوداگر کی نوتعمیر حویلی میں منتقل ہوگئے۔ یہاں آنے کے بعد مولانا عبدالحیؒ صاحبؒ کے اصلاحی وعظوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جو عوام وخاص میں بہت مقبول ہوئے۔ سارے شہر میں سیّد صاحبؒ کی تشریف آوری کی شہرت ہوگئی لوگ جوق در جوق زیارت و بیعت کیلئے آنے لگے، ہر جمعہ کو نمازِ جمعہ کے بعد مولانا کا وعظ ہوتا تھا ایک روز نمازیوں کا اتنا ہجوم ہوا کہ صفیں اتنی قریب کرنی پڑیں کہ پچھلی صف کے نمازیوں نے اگلی صف کے نمازیوں کی پشت پر سجدہ کیا۔ مولانا عبدالحیؒ صاحبؒ نے بڑا مؤثر وعظ

ارشاد فرمایا۔ آپ نے سورۂ انبیاء کے پانچویں رکوع کی آیات کے حوالہ سے لکھنؤ کے بگڑے ہوئے مسلم معاشرے کی ساری خرابیاں ایک ایک کر کے گنوادیں، مجلسِ وعظ میں فرنگی محل، شیعہ مجتہدین اور عمائدین شہر کی بڑی تعداد شریک تھی. اس مجلس وعظ میں مولانا محمد اشرف، مولوی سیّد محمد مخدوم، مولوی امام الدین بنگالی، مولوی سیّد ابو الحسن نصیر بادی، مولوی عبداللہ فرنگی محل، مولوی رحیم بخش فرنگی محل، مولوی نجیب اللہ بنگالی، مولوی عبدالوہاب، مولوی ولایت علی عظیم آبادی، شاہ یقین اللہ لکھنوی اور مولوی نور احمد نگرامی جیسے فضلاء نے بیعت کی۔ ان کے علاوہ مینڈو خان رسالدار اور ان کے بھائی عبداللہ بیگ نے بھی چار سو سواروں کے ساتھ بیعت کی، حمزہ خاں رام پوری بھی انہی دنوں لکھنؤ آ کر حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔

ایک دن لکھنؤ کے مشہور عالمِ دین مولانا حسن علی محدث نے (جو شافعی تھے) مولانا عبدالحئیؒ اور مولانا شاہ اسماعیلؒ کے ساتھ بیس اہلِ علم رفقاء کی دعوت کی بعد از اں سیّد صاحبؒ اور ان کی پوری جماعت کی دعوت کا اہتمام کیا دونوں مرتبہ سوالات بغرض استفادہ کیے گئے بحث ومناظرہ کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔

قیامِ لکھنؤ کے دوران ہزاروں کی تعداد میں جو لوگ داخلِ بیعت ہوئے ان میں شیعہ حضرات کی بھی اچھی خاصی تعداد شامل تھی جس سے امراء حکومت اور معتمد الدولہ آغا میر کو تشویش لاحق ہوئی اور اس نے پیغام بھجوایا کہ سیّد صاحبؒ اہلِ تشیع کو بیعت نہ کریں۔ آپ نے کہلا بھیجا کہ:

''میں کسی کو جبراً نہیں بلاتا مگر جو از خود آئے گا اسے ضرور پیغامِ حق سناؤں گا۔''

معتمد الدولہ نے دوبارہ جواب میں کہلایا کہ: اس صورت میں اگر کوئی ناخوشگوار صورتِ حال پیدا ہوئی تو ہم ذمّہ دار نہ ہوں گے۔ آپ نے اس انتباہ پر بھی کوئی اثر نہ لیا اور ہر طبقہ و مسلک لے لوگوں کو تلقینِ دین فرماتے رہے۔

معتمد الدولہ نے آپ کے عقیدت مند فقیر محمد خان رسالدار کی زبانی فہمائش کی کہ اگر سیّد صاحب باز نہ آئے تو دو چار توپیں لگا کر ان کی قیام گاہ کو مسمار کرادوں گا۔ سیّد صاحبؒ نے فرمایا:

''فقیر محمد خان تم مجھے مدت سے جانتے ہو، یہ مجھ سے ہرگز نہ ہوگا کہ کلمۂ حق کہنے سے باز آجاؤں، معتمد الدولہ دو چار تو کیا سو توپیں بھی لگا دیں گے تو پرواہ نہیں۔ مالکِ حقیقی اگر میرا

مددگار ہے تو وہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔''(۲۹)

سیّد صاحبؒ کا جواب سن کر معتمد الدولہ کو بڑی حیرت ہوئی اور کہنے لگا کہ یہ لوگ واقعی علماء حق معلوم ہوتے ہیں۔ فقیر محمد خان کی وساطت سے سیّد صاحبؒ اور ان کے تمام ساتھیوں کو دعوت کا پیغام بھجوایا جسے سیّد صاحبؒ نے قبول فرمالیا۔ اگلے روز دعوت ہوئی جس میں سیّد صاحبؒ کی جماعت کے علاوہ فقیر محمد خان، مینڈو خان رسالدار، تاج الدین، حسین خان، سیّد نقی خان اور سبحان علی خان بھی شریک ہوئے۔ کھانے میں کچھ دیر تھی، سیّد نقی خان نے مولانا شاہ اسماعیلؒ سے کہا کہ آپ کچھ بیان فرمائیں۔ مولانا سیّد صاحب کے سامنے تقریر نہیں کرتے تھے انہوں نے مولانا عبدالحیؒ صاحب سے بیان کرنے کو کہا۔ مولانا عبدالحیؒ صاحب حسبِ عادت کچھ دیر خاموش رہے، سبحان علی خان کہنے لگا کہ اس مجلس میں فریقین کے علماء موجود ہیں اس لئے مولانا کو تقریر کرتے ہوئے تامل وشرم دامن گیر ہے یا تو سیّد صاحب خود ارشاد فرمائیں یا مولانا شاہ اسماعیلؒ کو حکم فرمائیں۔ اس پر مولانا عبدالحیؒ نے فرمایا: ''الحیاء شعبۃ من الایمان'' اور یہ کہہ کہ تقریر شروع کر دی اوّل حضرت آدم علیہ السلام کا باحیا ہونا اور ابلیس کا بے حیا ہونا ثابت کیا پھر حضرت نوح علیہ السلام کا باحیا ہونا اور ان کی قوم کا بے حیا ہونا ثابت کیا بعد ازاں دوسرے تمام انبیاء علیہم السلام کا باحیا ہونا اور ان کے مخالفین کا بے حیا ہونا ثابت کیا آخر میں رسول اللہ ﷺ کا باحیا ہونا اور ان کے مخالفین کا بے حیا ہونا ثابت کیا پھر اسلام کے مختلف فرقوں میں اہلِ سنّت کا باحیا ہونا اور مخالفین کا بے حیا ہونا ثابت کیا اور ریش مبارک پر ہاتھ پھیر کر فرمایا الحمدللہ سنتِ انبیاء اور ان کے متبعین کے مطابق مولانا عبدالحیؒ بھی باحیا ہے۔

دورانِ تقریر ایک موقع پر سبحان علی نے حدیث لحمک لحمی ودمک دمی کا حوالہ پیش کیا مولانا شاہ اسماعیلؒ نے تقریر رکوا کر فرمایا: اوّل تو یہ حدیث ثابت نہیں ہے، بتقدیر ثبوت میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ حدیث اپنے حقیقی معنی پر محمول ہے یا مجازی معنی پر؟ سبحان علی نے کہا: حقیقی معنی پر محمول ہے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم رضی اللہ عنہ سے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح درست نہ ہوا۔ یہ جواب سن کر سبحان علی کا رنگ اُڑ گیا اور اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

مولانا کے خطاب کے بعد معتمد الدولہ نے عرض کیا کہ آپ حضرات کے جو اوصافِ حمیدہ سنے تھے ان سے بڑھ کر پایا۔ کھانے کے بعد پانچ ہزار کی نذر پیش کی سیّد صاحبؒ نے ہر چند انکار فرمایا مگر وہ نہ مانا اور ایک بار تنہائی میں ملاقات کی خواہش کی چنانچہ سیّد صاحبؒ جب بریلی جانے لگے تو چند مخصوصین کے ہمراہ ملاقات کیلئے تشریف لے گئے رفقاء کو ڈیوڑھی پر چھوڑا اور خود فقیر محمد خان رسالدار کے ساتھ اندر گئے دو گھنٹے کی ملاقات میں معتمد الدولہ کو بہت سی نصیحتیں کیں۔ معتمد الدولہ نے آئندہ لوگوں پر زیادتی نہ کرنے کا عہد کیا اور اخلاقی بُرائیوں سے توبہ کی سیّد صاحبؒ نے ایک اعلیٰ نسل کی گھوڑی تحفۃً پیش کی جسے نواب نے سیّد صاحبؒ کے بے حد اصرار پر قبول کیا۔

قیامِ لکھنؤ کے دوران جہاں لاکھوں مسلمان بیعت ہو کر بدعات و رسومات سے تائب ہوئے، جرائم پیشہ فاسق و فاجر افراد بھی چوری، ڈکیتی، حرام کاری کے پیشوں سے ہمیشہ کیلئے تائب ہو گئے اور ان بُرائیوں سے دلوں میں ایسی نفرت بیٹھی کہ پھر کبھی ان کے قریب نہ گئے۔ ان کے علاوہ دو ہندو جوہری اور تین دوسرے ہندو خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہوئے۔

## عزمِ جہاد

واقعۂ نصیر آباد اور سفرِ لکھنؤ کے بعد جہاد کی تیاری میں انہماک بڑھ گیا تھا روحانی اشغال پر جہاد کے معاملات کو ترجیح دینے لگے تھے۔ رفقاء نے اس تبدیلی کو محسوس کیا تو سیّد صاحبؒ نے گفتگو کے لئے مولانا محمد یوسف پھلتیؒ کو بھیجا، سید صاحب نے ان کے جواب میں فرمایا:

> ''ان دنوں ایک دوسرا کام اس (سلوک) سے بڑھ کر ہم کو درپیش ہے اور ہمارا دل اسی میں مشغول ہے اور وہ جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری ہے اس کے سامنے اس حال کی کچھ حقیقت نہیں اور یہ کام یعنی تحصیلِ علم سلوک اس کام کے تابع ہے۔ آپ ہمارے بھائیوں کو سمجھائیں کہ اب اس کام میں دل لگائیں اور حاجی عبدالرحیم صاحب ولایتی سے مشورہ کر کے جواب دیں۔'' (۳۰)

مولانا محمد یوسف صاحب نے حاجی عبدالرحیم صاحب سے گفتگو کی تو انہوں نے فرمایا:

جب اللہ تعالیٰ نے سیّد صاحب کو سہارن پور پہنچایا اور مجھے ان کے ہاتھ پر بیعت کی توفیق بخشی اور میں نے آپ کے طریقے کو دیکھا تو اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں اگر اپنی پہلی حالت پر مرجاتا تو میری بری موت ہوتی ........میری صلاح ومشورہ تو یہی ہے کہ تم لوگ اپنا سارا کاروبار حضرت پر چھوڑ دو جو کچھ بہتر جان کر تم کو فرمائیں اس کو بجالاؤ اور اپنی ناقص رائے کو اس میں دخل نہ دو۔

چونکہ حاجی عبدالرحیم ولایتی سلوک ومعرفت میں بڑے درجے کے مالک ایک صاحب نسبت بزرگ اور مانے ہوئے شیخِ طریقت تھے ان کی باتیں سن کر لوگوں کے تمام شکوک وشبہات رفع ہوگئے اور وہ سب جہاد کی تیاریوں میں ہمہ تن مشغول ہوگئے۔ جب سیّد صاحب کی جماعت ذہنی طور پر شرکتِ جہاد کے لئے تیار ہوگئی تو انہی دنوں شاہ عبدالعزیزؒ نے جو سیّد صاحبؒ کی جماعت کے مربی وسرپرست تھے اپنے تاریخی ''فتویٰ دارالحرب'' کی اشاعت فرمائی جس میں آپ نے واضح کیا کہ:

''ہندوستان کے جس قدر حصے غیر مسلم طاقتوں کے قبضے میں جاچکے ہیں ان قطعات میں اگرچہ برائے نام سلطان دہلی کا دخل مانا جاتا ہے لیکن وہ سب کے سب دار الحرب ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جو زبردست قوتیں موجود ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ یا تو یہاں سے ہجرت کر جائیں یا دشمنوں سے لڑ کر اپنی نئی اسلامی حکومت قائم کریں۔''(۳۱)

## ارادۂ حج

اس فتوے کی اشاعت کے بعد سیّد صاحبؒ اپنی جماعت کے ساتھ قبائلی علاقوں کی طرف ہجرت کی تیاریوں میں مشغول تھے تاکہ کسی مناسب مقام کو مرکز جہاد بنا کر اپنی عملی جدوجہد کا آغاز کرسکیں لیکن ایک روز رفقاء کو جمع کر کے اعلان فرمایا کہ ہم حج کو جائیں گے۔ ساتھیوں نے عرض کیا آپ تو ہجرت کی تیاریوں میں

مشغول تھے۔ جواب ملا: اب مرضیٔ الٰہی یہی ہے۔

عزمِ ہجرت و جہاد میں تبدیلی کا بظاہر سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے سفر کے دوران علماء کے ایک مخصوص گروہ نے بحری سفر میں اندیشۂ ہلاکت کے پیشِ نظر فریضۂ حج کے اسقاط کا فتویٰ دیا تھا جس کا مفصل جواب مولانا عبدالحیؒ اور مولانا شاہ اسماعیلؒ نے لکھا اور دلائل کے ساتھ فرضیتِ حج کو ثابت کیا۔

## مسلم بنگال میں احیاءِ اسلام کی تحریک

کلکتہ کے دورانِ قیام مسلم بنگال اور آسام میں بھی آپ کے فیوض و برکات پہنچے۔ مولوی امام الدین بنگالی اپنی والدہ سے ملاقات کیلئے نواکھالی گئے تو واپسی میں ان کے ساتھ چالیس پچاس اشخاص حاضرِ خدمت ہو کر بیعت و زیارت سے مشرف ہوئے۔ ڈھاکہ، چاٹگام اور سلہٹ کے لوگ بھی کشتیوں میں سوار ہو کر آئے اور بیعت ہوئے۔ ان سب نے واپس جا کر سیّد صاحبؒ کی ہدایات کے مطابق اپنے اپنے علاقوں میں اصلاح و تبلیغ کی زبردست خدمات سرانجام دیں۔

مسلم بنگال کی اصلاحی تحریکوں میں پہلی تحریک حاجی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک تھی جس کا آغاز ۲۲-۱۸۲۱ء میں اس وقت ہوا جب وہ مکہ معظّمہ کے بیس سالہ قیام کے بعد وطن واپس آئے۔ ان کے قیامِ حجاز کے زمانے میں حجاز مقدس میں نجد کی وہابی تحریک کا زور تھا جس سے انہیں باخبر ہونے کا موقع ملا۔ آپ نے وطن آکر مسلم بنگال کے مسلمانوں کی اصلاح و ہدایات پر خصوصی توجہ دی، ہندوانہ رسموں کی مخالفت، اتباعِ شریعت، فرائض کی ادائیگی اور گناہوں سے توبہ پر زور دیا۔ اسی لیے یہ تحریک ''فرائضی تحریک'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تحریک نے مسلم بنگال میں بالعموم اور فرید پور، ڈھاکہ اور باری سال کی مذہبی زندگی میں بالخصوص ایک نئی حرکت پیدا کی لیکن اس تحریک میں نجدی تحریک کے زیرِ اثر شدت و انتہا پسندی کا رنگ نمایاں تھا جس کے باعث تصوّف کے انتہا پسند طبقات کے علاوہ اعتدال پسند مذہبی طبقات کی طرف سے بھی اس تحریک کو مطلوبہ تعاون حاصل نہ ہوسکا۔ چنانچہ سیّد احمد شہیدؒ کے ایک مرید مولوی کرامت علی جونپوری تھے جنہوں نے سیّد صاحبؒ کی ہدایت پر چالیس پچاس سال مسلم بنگال کی اصلاح و ہدایت پر صرف کیے۔ تحریکِ جہاد سے

الگ رہنے کے باوجود بنگال کی اصلاحی سرگرمیوں میں ان کی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔مولوی کرامت علی نے بھی فرائضی فرقے کے بعض انتہا پسند نظریات کی شدت سے مخالفت کی اور ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے خلاف بھی فتویٰ دیا اور جن حضرات نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر نمازِ جمعہ وعیدین کی نمازوں کو ترک کرنے پر زور دیا تھا ان کی پُر زور مخالفت کی، ان سے مناظرے بھی کیے اور ان کے خلاف مضامین بھی لکھے اور کہا کہ اگر ہندوستان کو دارالحرب تسلیم کرلیا جائے تو اس صورت میں تو شعائرِ اسلامی کی بقاء و احیاء زیادہ ضروری ہو جاتی ہے غرض مولوی کرامت علی نے فرائضی تحریک کے انتہا پسندانہ نظریات کے ساتھ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے نظریے کی بھی شدت سے مخالفت کی۔

اسی زمانے میں یعنی ۱۸۲۱ء میں سفرِ حج کی غرض سے سیّد صاحبؒ اور ان کے رفقاء کا قیام تقریباً تین ماہ تک کلکتہ میں رہا۔سیّد صاحبؒ کو تو مسلم بنگال کے علاقوں میں تشریف لے جانے کا موقع نہ مل سکا مگر ان کے پر جوش عقیدت مند مولوی امام الدین بنگالی اور ان کے رفقاء کی کوششوں سے پورے مسلم بنگال میں احیائے اسلام کی تحریک زور پکڑ گئی۔مولوی امام الدین کے علاوہ سیّد صاحبؒ کے ایک اور خلیفہ صوفی نور محمد نے بھی مسلمانوں کی اصلاح و تربیت میں سرگرمی سے حصہ لیا۔حج سے واپس آکر سیّد صاحبؒ نے میدانِ جہاد سے مولوی عنایت علی عظیم آبادی کو چند رفقاء کے ساتھ بنگال روانہ کیا ان حضرات نے یہاں پہنچ کر کئی سال تک بڑی محنت و جاں فشانی سے کام کیا۔

ڈاکٹر وائز نے اپنی انگریزی کتاب میں بنگال کے مسلمانوں میں احیائے اسلام کی تحریک کے متعلق لکھا ہے کہ:

> ''انیسویں صدی کا احیاء اسلام جدید ہندوستان کی تاریخ کے سب سے اہم واقعات میں سے ہے۔''(۳۲)

## کلکتہ سے روانگی

سفرِ حج کے لیے کلکتہ سے دس جہاز کرائے پر لیے، ہر جہاز پر سفر کرنے والوں کی تعداد اور ان کے امیرِ قافلہ کا تعین کر دیا گیا۔قلعہ کے میدان میں لاکھوں مسلمان رخصت کرنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔

نمازِ عصر کے بعد کشتی پر سوار ہو گئے اگلے دن صبح کے وقت جہاز پر سوار ہوئے۔

دورانِ سفر جزیرۂ سراندیپ اور کالی کٹ میں بہت سے لوگ بیعت ہوئے عدن، مخا اور جدیدہ کے مقامات پر ٹھہرتے ہوئے جدہ پہنچ کر دوسرے جہازوں کا حال معلوم کیا تین دن یہاں ٹھہرے، چوتھے دن مکہ روانہ ہو گئے مقامِ حدیبیہ میں رک کر تمام رفقاء سے بیعتِ جہاد لی، یہ پہلی بیعتِ جہاد تھی ورنہ اس سے پیشتر لاکھوں مسلمان آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے مگر سب نے بیعت طریقت ہی کی تھی۔

شعبان کی ۱۸ تاریخ مطابق ۲۱ مئی ۱۸۲۲ء کو مکہ معظّمہ میں اس راستے سے داخل ہوئے جس راستے سے رسول اللہ ﷺ فتح مکّہ کے دن داخل ہوئے تھے۔ ۸ ذی الحجہ سے ۱۳ ذی الحجہ تک مناسکِ حج ادا کئے اور بیعتِ عقبہ کے مقام پر تمام ساتھیوں سے دوسری مرتبہ بیعتِ جہاد لی. اواخرِ محرم تک مکّہ معظّمہ میں قیام رہا۔ مولانا عبدالحیؒ صاحبؒ نے مشکوٰۃ اور مولانا شاہ اسمٰعیلؒ نے حجۃ اللہ البالغہ کا درس شروع کر دیا جس سے علماء حجاز کو ان حضرات سے علمی استفادہ کا موقع ملا۔

عید کے دن مشہور عالمِ دین محدث شیخ بن عبدالرسول، شیخ عبداللہ سراج اور دیگر علماء مکہ ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ حنفی مصلے کے امام شیخ مصطفٰی خواجہ الماس ہندی، شیخ شمس الدین ستار، شیخ حسن آفندی جو احمد پاشا سلطان مصر کے نائب تھے، بلغار کے ایک بزرگ اور جادہ کے تین مسلمان بیعت ہوئے۔ شیخ حسن آفندی کی خواہش پر مولانا عبدالحیؒ اور مولانا شاہ اسماعیلؒ نے ''صراطِ مستقیم'' کا عربی میں ترجمہ کیا جن کی متعدد نقلیں علماء حجاز نے حاصل کیں۔

محرم کے آخر میں مدینہ کا قصد فرمایا ۱۲۰ اونٹ کرایہ پر لیے اور مدینہ روانہ ہو گئے۔ باب السلام سے حرم نبوی ﷺ میں داخل ہوئے نماز سے فارغ ہو کر روضۂ اقدس کی زیارت کی مدینہ میں ''وفاء الوفاء'' کے مصنف سیّد سمہودی کے مکان میں باب الرحمۃ کے قریب قیام فرمایا ایک ماہ کے قیام کے بعد ۹ ربیع الاوّل ۱۲۳۸ھ کو مکہ واپس آ گئے اور ۵ شوال کو یہاں سے روانہ ہو کر بمبئی ٹھہرتے ہوئے ۶ صفر ۱۲۳۹ھ کو کلکتہ اور ۲۹ اپریل ۱۸۲۴ء کو بریلی پہنچ ئے۔ سفرِ حج میں کل دو سال ۱۰ ماہ کی مدت صرف ہوئی۔ قافلۂ حج کے تمام مصارف سفر جو سیّد صاحبؒ نے برداشت کیے بشمول ان رقموں کے جو اہلِ بیت اور دوسرے مقامات پر

ضرورت مندوں کو بطورِ امداد دی گئیں ایک لاکھ سے متجاوز تھے۔ بریلی پہنچنے کے بعد بیت المال میں دس ہزار کی رقم موجود تھی اور جب سیّد صاحبؒ حج کے لیے بریلی سے روانہ ہوئے تھے تو آپ کے پاس صرف سو روپے تھے جو شہر سے باہر نکل کر غرباء میں تقسیم کر دیے تھے۔ نام نہاد علماء لکھنؤ کے فتویٰ ''اسقاطِ حج'' کا جواب کیا اس عملی جواب سے بہتر کسی دوسری صورت میں ممکن تھا؟

## تحریک جہاد

حج سے واپس آ کر ہجرت و جہاد کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ واصل بحق ہو چکے تھے اس لیے سیّد صاحبؒ کو یہ موقع نہ مل سکا کہ حاضرِ خدمت ہو کر جماعت کے حالات اور تحریکِ جہاد کے سلسلے میں شاہ صاحبؒ سے مناسب ہدایات حاصل کرنے کے بعد ہجرت و جہاد کے میدان میں قدم رکھتے ورنہ اس سے پیشتر ان کی ہر اصلاحی و تبلیغی مہم کا آغاز شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے حصولِ اجازت کے بعد دہلی سے ہوا مگر اس مرتبہ یہ صورت ممکن نہ ہو سکی۔

مولانا شاہ محمد اسماعیلؒ اور مولانا عبدالحئیؒ کو دعوتِ جہاد کے لئے اطراف ملک کے دورے پر روانہ کیا۔ اس کامیاب دورے کے بعد ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء سفرِ جہاد پر روانہ ہو گئے اس وقت مجاہدین کی تعداد بمشکل دو ہزار تھی، دورانِ سفر اس تعداد میں تھوڑا بہت اضافہ ہوتا رہا۔

گوالیار، ٹونک، اجمیر، مارواڑ، حیدر آباد، سندھ، شکار پور ہوتے ہوئے درۂ بولان کے راستے قندھار کابل پہنچے وہاں سے براستہ خیبر، پشاور میں داخل ہوئے اور جماعتِ مجاہدین ۱۹ دسمبر ۱۸۲۶ء کو نوشہرہ پہنچ گئی بدھ سنگھ کا لشکر اکوڑہ میں مقیم تھا جس کی تعداد سات ہزار تھی جبکہ مجاہدین کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی۔ سکھ لشکر سامانِ جنگ اور توپ خانے سے مسلح تھا اور مجاہدین میں سب کے پاس توڑے دار بندوقیں بھی نہ تھیں اس لئے لشکر پر شبخون مارنے کا فیصلہ ہوا۔ اس مقصد کے لیے نو سو مجاہدین کا انتخاب ہوا اور اللہ بخش مور النوی سالار مقرر کیے گئے جو اسی معرکے میں شہید ہوئے۔

مجاہدین کے یک لخت حملے سے افراتفری اور سراسیمگی پھیل گئی نہیں بے اندازہ جانی نقصان پہنچا اور سیّد صاحبؒ کی جماعت سے صرف ۸۲ مجاہدین شہید ہوئے۔ اس کامیاب معرکے کے بعد اہلِ سرحد جماعت میں بکثرت شریک ہونے لگے اور بہت جلد مجاہدین کی تعداد پانچ ہزار سے تجاوز کرگئی۔

شبخون کے کامیاب معرکے کے بعد خادے خاں رئیس نہڈ کی خواہش پر (جس نے سیّد صاحبؒ کا خیر مقدم کرنے میں پہل کی تھی) نہڈ کے مقام پر مرکزِ جہاد بنایا گیا۔

## بیعت امامت

باقاعدہ شرعی جہاد کے لئے قیامِ امامت کا ہونا ضروری تھا۔ مولانا شاہ اسمٰعیلؒ نے علماء خوانین کے ساتھ اس مسئلے کے شرعی پہلوؤں پر گفتگو کی جس کے بعد تمام علماء نے سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت کا فیصلہ کیا چنانچہ ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء کو ہندوستان، سرحد اور قندھار کے ہزاروں مسلمانوں نے جن میں علماء کرام، صوفیاء اور خوانین بھی شامل تھے۔ سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت امامت کرلی۔ مرکزِ جہاد کے تعین اور بیعتِ امامت کے بعد لوگوں نے جوق در جوق بیعت جہاد شروع کردی اور بڑے بڑے خوانین ورؤساء اور سردارانِ قبائل سیّد صاحبؒ کے طبقۂ اطاعت میں داخل ہوگئے۔

سردارانِ پشاور میں سلطان محمد خان اور سیّد محمد خان پہلے ہی بیعت کرچکے تھے یار محمد خان اور پیر محمد خان کی طرف سے بھی اطاعت وفرماں برداری کے پیغامات موصول ہوئے۔ مخلصین نے ان کی بیعت واطاعت کو موقع پرستی پر محمول کیا مگر سیّد صاحبؒ کے پاس ان کی پیش کش کو رد کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہ تھی۔ ان کی طرف سے عذر وخیانت کے جو واقعات آگے چل کر پیش آئے ان کا اندازہ پیش از وقت کوئی بھی نہیں کرسکتا تھا کیونکہ انہی بیعت کنندگان میں اشرف خان رئیس زیدہ، فتح خان بختیار، ارباب بہرام خان اور گدڑی شہزادہ جیسے مخلصین بھی شامل تھے جنہوں نے آخر دم تک حق رفاقت نبھایا اور راہِ حق میں اپنی قیمتیں جانیں قربان کردیں۔ اندریں حالات سیّد صاحبؒ کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اطاعت کیشی کی کسی درخواست اور امداد واعانت کی کسی پیش کش کو معقول وجہ کے بغیر رد کردیتے۔

## معرکۂ شیدو

بیعتِ امامت کے بعد سکھوں کے ساتھ جماعت مجاہدین کی پہلی باقاعدہ جنگ شیدو کے مقام پر ہوئی یہ مقام اکوڑہ سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں سکھ لشکر تیس پینتیس ہزار کی تعداد میں خیمہ زن تھا۔ اس وقت مجاہدین کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی۔ سیّد صاحبؒ کے رفقاء اور خوانین سرحد کے باہمی مشورے سے طے پایا کہ پوری قوت کے ساتھ سکھوں پر ضرب کاری لگائی جائے۔

مارچ ۱۸۲۷ء کے پہلے ہفتے میں سیّد صاحبؒ مجاہدین کو ساتھ لے کر نوشہرہ پہنچ گئے جہاں سے بدھ سنگھ کے لشکر پر حملہ کرنے کا منصوبہ تھا۔ تمام خوانین و سردارانِ سرحد اپنے اپنے مخصوص نشانات لیے ہوئے تھے ایک لاکھ سے زیادہ مجاہدینِ اسلام کی قوت و طاقت کا یہ مظاہرہ اتنا شاندار تھا جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں صدیوں سے ترس رہی تھیں اگر یہ متحدہ قوت برقرار رہتی اور عذر و خیانت کے وہ واقعات پیش نہ آتے جن سے سیّد صاحب کی تحریکِ جہاد کو زبردست نقصان پہنچا تو آج برّصغیر ہند و پاکستان کی تاریخ کا نقشہ بالکل مختلف ہوتا۔

## زہر خورانی

جس دن سے لشکرِ اسلام خیمہ زن ہوا تھا۔ سیّد صاحبؒ کے لئے دونوں وقت کا کھانا اور پھل یار محمد خان کے یہاں سے آرہے تھے۔ جس روز لشکر کشی کا فیصلہ ہوا اس کی شبِ گذشتہ کو یار محمد خان کے گھر سے کھچڑی اور گنڈیریاں آئی تھیں جو زہر آلود تھیں۔ سیّد صاحبؒ نے تھوڑی سی کھچڑی کھائی اور گنڈیریاں چوسیں کچھ دیر کے بعد طبیعت بگڑ گئی رات کے آخری حصے میں جب لڑائی کا نقارہ بجا اور مولانا شاہ اسمٰعیلؒ سیّد صاحبؒ کے خیمہ میں تشریف لائے تو آپ بے ہوش تھے اور منہ سے قے جاری تھی جس کے باعث زہر کا بیشتر حصہ خارج ہو گیا تھا جب کچھ افاقہ ہوا تو آپ نے ضعف و نقاہت کے باوجود میدانِ جنگ میں جانے پر اصرار کیا اور شرکتِ جہاد سے محرومی کو گوارہ نہ فرمایا آخر بمشکل تمام آپ کو سوار کیا گیا۔

عین مقابلے کے وقت یار محمد خان نے اپنے لشکر سمیت راہ فرار اختیار کی، اس کے پیچھے سلطان محمد

خان اور پیر محمد خان کے لشکر بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ خوانین سمہ کی مختلف ٹولیوں نے جب تین بڑے لشکروں کو بھاگتے ہوئے دیکھا تو ان میں سے بہت سوں کے قدم اُکھڑ گئے، آگے بڑھتے ہوئے مجاہدین نے گریز و فرار کا یہ نقشہ دیکھا تو انہوں نے بھی پیچھے ہٹنا شروع کر دیا سکھ لشکر نے ان کا تعاقب کیا اور اس پسپائی میں بہت سے مجاہدین شہید ہو گئے، صرف گدڑی شہزادہ آخر دم تک لڑتا رہا اور اپنے ایک ایک ساتھی کے ساتھ جام شہادت نوش کر گیا۔

یار محمد خان کی غداری کے بارے میں دو روایتیں مشہور ہیں:

ایک روایت یہ ہے کہ سکھ لشکر کی طرف سے توپ کا ایک گولہ اس کے لشکر پر آ کر پڑا تو اس کے کئی سوار اڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ رنجیت سنگھ نے خود پشاور جا کر یار محمد خان کے ساتھ تعلقات استوار کیے تھے اور اسے حاکمِ پشاور مقرر کر دیا تھا۔

چنانچہ ''عمدۃ التواریخ'' میں بصراحت لکھا ہے کہ:

''یار محمد خان نے رنجیت سنگھ کے ساتھ روابطِ اتحاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سیّد صاحب کو زہر دیا۔''

اس غیر متوقع ہزیمت کے بعد حالات بہت دگرگوں رہے، سردی کا موسم تھا، ان کے پاس نہ سردی سے بچنے کے لیے کپڑے تھے نہ سر چھپانے کے لیے کوئی ٹھکانہ تھا۔ اکثر مقامات پر لوگوں نے اپنے یہاں ٹھہرانے اور کسی قسم کی امداد کرنے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ اس طرح انہیں سکھوں اور سردارانِ پشاور کے قہر و غضب کا نشانہ بننے کا اندیشہ تھا۔ حسرت و فاقہ کشی کا یہ عالم تھا کہ جنگلی درختوں کے پتوں کو اُبال کر کھانا پڑا مگر ان کے صبر و استقامت میں پھر بھی کوئی کمی نہ آئی اور وہ ہر آزمائش پر راضی برضا رہے۔ اب ہندوستانی اور قندھاری مجاہدین کی تعداد بمشکل سات سو آٹھ سو باقی رہ گئی تھی۔

انہی دنوں مولانا عبدالحئی صاحبؒ جنہوں نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اہلِ خاندان میں سیّد صاحبؒ سے بیعت کرنے میں سبقت کی تھی۔ ۲۴ فروری ۱۸۲۸ء کو وفات پا گئے ان سے سیّد صاحبؒ اور جماعتِ مجاہدین کو بڑی تقویت حاصل تھی۔

ان مصائب و مشکلات کے باوجود سکھوں کے ساتھ معمولی جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہا اور مولانا شاہ اسمٰعیلؒ کی سرکردگی میں سکھ دستوں پر جو شبخون مارے گئے بیشتر کامیاب ثابت ہوئے۔ آئے دن کی جھڑپوں سے تنگ آکر رنجیت سنگھ نے حکیم عزیز الدین اور سردار وزیر سنگھ پر مشتمل ایک سفارت روانہ کی جس نے سیّد صاحب کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ اگر دوسرے علاقوں پر حملے ترک کر دیے جائیں تو مہاراجہ ماورائے سندھ کا پورا علاقہ آپ کی تحویل میں دینے کو تیار ہیں۔ سیّد صاحبؒ نے مولوی خیر الدین شیر کوٹی اور حاجی بہادر شاہ کو اپنا وکیل بنا کر گفتگو کے لیے بھیج دیا۔ ان کی ملاقات پہلے جنرل ونٹورا سے ہوئی۔ اس نے فریبِ سیاست کاری سے کام لیتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اگر علاقہ یوسف زئی کی مالگزاری سیّد صاحبؒ کے ذریعہ وصول کر لیا کریں تو فوج کشی کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

مولوی خیر الدین صاحب نے اس تجویز کو سختی کے ساتھ رد کر دیا اور فرمایا کہ سیّد صاحبؒ کسی کافر حکمران کا جاگیردار یا باج گذار بننا ہرگز پسند نہ کریں گے۔ جب ونٹورا کی یہ سیاست نہ چلی تو اس نے رسمی تحائف کی تجویز پیش کی اور چاہا کہ سیّد صاحبؒ مہاراجہ کو ایک گھوڑی تحفۃً بھیج دیں دراصل وہ چاہتا تھا کہ خالصہ سرکار میں اس کا سفارتی مشن ناکام قرار پائے۔ مولوی صاحب نے اس تجویز سے بھی اتفاق نہ کیا (کیونکہ خالصہ سرکار میں گھوڑا بطور خراج پیش کرنے کی رسم جاری تھی) غرض یہ سفارت رنجیت سنگھ سے ملاقات کئے بغیر ونٹورا سے گفتگو کر کے واپس آ گئی۔

## ایک غلط فیصلہ

یار محمد خان مجاہدین کے ساتھ ایک معرکہ میں کام آیا اس کے بعد جنگ مایار میں درانیوں کی ہزیمت کے بعد سلطان محمد کے حوصلے بھی پست ہو گئے اس نے اپنے وکیل ارباب فیض اللہ خان مہمند کے ذریعہ سید صاحب سے معافی طلب کی جسے سیّد صاحبؒ نے سابقہ روّیے پر اظہارِ ندامت اور اجرائے شریعت کے وعدے پر قبول کر لیا۔ دوران مذاکرات اپنے مخلص رفقاء مولانا اسماعیل، مولوی مظہر علی، شیخ ولی محمد پھلتی، ملا لعل قندھاری، ملا قطب الدین ننگرہاری اور ارباب بہرام خان کو مشورے میں شریک رکھا۔

## رفقاء کا اختلاف

جب تک پشاور کی حوالگی کا فیصلہ نہیں ہوا تھا تمام رفقاء خاموش تھے لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ پشاور کی حکومت دوبارہ درانیوں کے حوالہ کی جارہی ہے تو یہ مضطرب ہوکر مولانا اسمٰعیلؒ کی خدمت میں پہنچے۔

مولانا اسمٰعیلؒ نے فرمایا کہ:

''میں امیر المؤمنین کا تابع فرمان ہوں اگر مجھ سے دریافت کیا گیا تو اپنی رائے کا اظہار کردوں گا۔لہٰذا آپ جو کچھ کہنا چاہیں براہِ راست کہیں۔''

اس کے بعد یہ لوگ ارباب بہرام کے پاس گئے اور یہی بات اس سے کی انہوں نے جاکر احباب کے اضطراب وشبہات کو سیّد صاحبؒ کے سامنے بیان کیا سیّد صاحبؒ نے تمام باتیں سننے کے بعد ارشاد فرمایا:

''رضائے حق کے سامنے ہفت اقلیم کی بادشاہت ہیچ ہے اب سلطان محمد خان تائب ہے،دل کا حال خدا جانے حکمِ شریعت کا مدار تو ظاہر پر ہے،ہم کیوں عذر نہ مانیں؟ ہمارے پاس کون سی دلیل و حجت ہے؟ ہاں اگر کوئی دیندار خدا پرست عالم دلیل شرعی سے سمجھادے کہ ہماری رائے غلط ہے تو ہم مان لیں گے۔''

ایک اور روایت کے مطابق ارباب بہرام خان کے ذریعہ سے سیّد صاحبؒ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی تھی کہ:

''ملک دینا ہی ہے تو مجھے عنایت فرمادیں، میں خود اس کی حفاظت کروں گا اور چار ہزار سپاہی ملازم رکھ کر حضرت کے ہم رکاب کردوں گا۔''

سیّد صاحبؒ نے اس پیشکش کے جواب میں متبسم ہوکر فرمایا تھا کہ:

''ہمارے اور ارباب کے درمیان مطلق مغائرت نہیں ہے، ملک کو اس کے حوالہ کرنے کا مطلب یہی ہوگا کہ ہم نے اپنا قبضہ بحال رکھا ہے۔سیّد صاحبؒ کے ان جوابات کے بعد ارباب بہرام خان نہ صرف مطمئن ہوگئے بلکہ انہوں نے اپنے اختلاف پر معافی طلب کی اور اپنے حق میں دعاء خیر کی درخواست پیش کی۔''

ان تفاصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتداء میں چند مخلصین کو جن میں ارباب بہرام خان بھی شریک تھے سردارانِ پشاور کو حکومتِ سرحد کی حوالگی کے فیصلے سے اختلاف تھا مگر سیّد صاحبؒ سے گفتگو کے بعد رفقاء مطمئن ہو گئے تھے اور مولانا اسمٰعیلؒ نے تو کسی موقع پر بھی اس فیصلے سے اظہارِ اختلاف نہیں کیا بلکہ اپنی ذاتی رائے پیش کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی، اس کے باوجود مولانا عبیداللہ سندھی کا یہ فرمانا کہ:

> ''اس موقع پر جماعتِ مجاہدین کے خواص وعوام سب متفق الکلمہ تھے کہ یہ فیصلہ غلط ہے۔ مولانا اسمٰعیلؒ اور ہندوستانی اور افغانی اہل الرائے نے پورا زور صرف کیا کہ امیر شہید یہ غلطی نہ کریں مگر انہوں نے کسی کی نہ مانی۔'' (۳۳)

بالکل غلط اور حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش ہے۔

سردارانِ پشاور کے حق میں پشاور کی حوالگی کا فیصلہ ہر اعتبار سے ایک غلط فیصلہ تھا لیکن اس کی ذمّہ داری تنہا سیّد صاحبؒ کی ذات پر نہیں ڈالی جاسکتی کیونکہ انہوں نے اپنے دوسرے تمام فیصلوں کی طرح یہ فیصلہ بھی رفقاء سے صلاح ومشورہ کے بعد کیا تھا لیکن ناقدین کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جس شخص نے پشاور کی حوالگی کے سلسلے میں اپنی ذاتی رائے تک پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، اختلاف کرنے والوں میں اسی کا نام سرفہرست پیش کیا گیا ہے۔

اگر یہ بات درست ہوتی تو جس وقت سیّد صاحبؒ نے ارباب بہرام خان کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ اگر کوئی دیندار اور خدا پرست عالم دلیل شرعی سے سمجھا دے کہ ہماری رائے غلط ہے تو ہم مان لیں گے، مولانا شاہ اسمٰعیلؒ سے بڑھ کر خدا پرست عالم دین کون تھا جو حق بات کہنے میں کبھی رو رعایت سے کام نہ لیتے تھے اور معمولی سی شرعی فروگزاشت پر سیّد صاحبؒ کو بھی برملا ٹوک دیا کرتے تھے جیسا کہ انہوں نے ''جنگِ مایار'' میں عورتوں اور بچوں کو امب سے ستھانہ منتقل کرنے کی ہدایات پر سیّد صاحبؒ کی رائے سے اختلاف کیا تھا اور احمد ان کے بھائی رسول خان سے شرائطِ صلح کی معمولی سی خلاف ورزی پر جو محض لاعلمی میں سیّد صاحبؒ سے سرزد ہو گئی تھی مولانا نے انتہائی طیش کے عالم میں فرمایا تھا کہ جناب خود خلاف شرع امر کے مرتکب ہوئے لشکرِ اسلام میں سے ایک آدمی کے عہد کا ایفا بھی امام اور پورے لشکر پر واجب ہوتا ہے۔ آپ نے مجھے اپنا نائب بنا

کر بھیجا ہے، آپ نے میرے عہد کا بھی خیال نہیں کیا اور قصبے میں داخل ہو گئے۔ ایک ایسے شخص سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی امرِ حق کے خلاف فیصلے پر خاموش رہے ہوں مگر حقیقت یہی ہے کہ اس سارے معاملے میں انہوں نے کسی موقع پر بھی لب کشائی کی ضرورت محسوس نہ کی حالانکہ پشاور کی حوالگی کے فیصلے سے اظہارِ اختلاف کے لئے سیاسی وجوہ اور شرعی دلائل دونوں پیش کیے جاسکتے تھے۔

شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ:

''ایک بات مجھے بہت ادب کے ساتھ یہ کہنی ہے کہ حضرت سیّد صاحبؒ کی مساعی جہاد کی ناکامی کا بڑا سبب یہ تھا کہ غدار سلطان محمد خان کی توبہ اور معذرت قبول کرنے کے بعد پشاور کی حکومت اس کو واپس دے دی گئی۔ مجھے حیرت ہے کہ باوجود سیّد صاحب کی پیش کش کے کہ ''کوئی عالم دین شرعی دلائل سے ہماری رائے کو غلط ہونا ثابت کر دے تو ہم اپنی رائے سے رجوع کرلیں گے'' کسی بھی عالمِ دین نے یہ دلیل پیش نہ کی کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جو چند صحابۂ کرام ؓ مرتد ہو گئے تھے، جب دوبارہ اسلام کی طرف واپس آ گئے تو ان کی توبہ اور اسلام کو تو قبول کر لیا گیا مگر ان میں سے کسی کو بھی عامل و حاکم نہیں بنایا گیا۔ حضرت شیخین کا طرزِ عمل بھی ان کے ساتھ یہی رہا بلکہ بعض فقہاء کے نزدیک تو ان کا شرفِ صحابیت بھی باطل ہو گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی غدار اگر آئندہ کے لیے عذر سے توبہ کرلے تو اس کی توبہ تو قبول کی جائے گی اور جماعتِ مسلمین میں تو شامل کر لیا جائے گا مگر اس کو منصبِ حکومت نہیں دیا جائے گا اور نہ مخلصین کے برابر شمار کیا جائے گا۔ حدیث ''**لا یلدغ المؤمن من حجر واحد مرتین**'' (کہ مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ ڈنگ نہیں کھاتا) سے اسی امر کی تائید ہوتی ہے۔

پھر سلطان محمد خان کی دوسری بار غداری سے دل برداشتہ ہو کر مفتوحہ علاقوں کو چھوڑ دینا جن کے باشندوں نے غدر میں حصہ نہیں لیا تھا اور برابر مخلص اور وفادار

رہے تھے، اسلامی سیاست کے خلاف تھا کیونکہ اگر مفتوحہ علاقوں پر قبضہ برقرار رکھ کر ان کو منظم کیا جاتا اور دوبارہ قوت فراہم کر کے پشاور پر حملہ کیا جاتا اور سلطان محمد خان کو عبرتناک سزا دی جاتی، پھر پشاور یا پنجتار کو مرکز جہاد بنا کر وہاں سے کشمیر کے لئے فوجیں روانہ کی جاتیں تو یہ صورت ہرگز پیش نہ آتی جو پیش آئی۔'' (۳۴)

## درانیوں کی مخالفت کے اسباب

سردارانِ پشاور سلطان محمد خان وغیرہ نے بظاہر سیّد صاحبؒ سے اطاعت و وفاداری کا اظہار کر کے درحقیقت پشاور کی حکومت پر اپنا قبضہ قائم رکھنے کی ایک صورت پیدا کی تھی ورنہ درپردہ خوانین کا یہ ٹولہ رنجیت سنگھ سے ملا ہوا تھا۔

سلطان محمد خان کی طرف سے اظہار اطاعت کے بعد پورے علاقے میں شرعی عدالتیں قائم ہوگئیں مولوی مظہر علی عظیم آبادی پشاور کے قاضی شہر مقرر ہوئے، دوسرے شہروں میں قاضیوں کا تقرر عمل میں آیا۔ انہوں نے شریعت کے مطابق فیصلے شروع کر دیئے۔ عشر کی وصولی کا نظام قائم ہوا، شراب کی بھٹیاں، بھنگ، چرس اور افیون کی دوکانیں بند ہوگئیں، کسبی عورتیں بازاروں سے اُٹھ کر گھروں میں جا چھپیں، لڑکیوں کی شادی پر مقامی باشندے داماد سے بھاری رقم وصول کرتے تھے اور منگنی کی رسم کے بعد لڑکی کو اس وقت تک رخصت نہیں کرتے تھے جب تک مطلوبہ رقم وصول نہ ہو جاتی۔ اکثر اوقات رقم کی عدم ادائیگی کی صورت میں لڑکیاں ماں باپ کے گھر بیٹھی بوڑھی ہو جاتی تھیں۔ احکامِ شریعت کے نفاذ کے بعد دختر فروشی کی یہ قبیح رسم ختم کر دی گئی۔

## نگاہ بازگشت

سیّد صاحبؒ کے مساعی جلیلہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی عہد میں آپ نے اصلاح اُمت اور تبلیغ دین کی قابلِ رشک خدمات انجام دیں۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں رہ کر منازلِ سلوک طے کرنے کے بعد جب دعوت و تبلیغ کا آغاز کیا تو عام مشائخ و صوفیاء کی طرح

کسی گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر طالبانِ حق کی تربیت باطنی اور تزکیۂ نفس کا سلسلہ جاری نہیں کیا بلکہ اپنے شیخ و مرشد حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی زندگی ہی میں تبلیغی سفر شروع کر دیے تھے جن میں ہزار ہا ہزار افراد کو نہ صرف اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کیا بلکہ آپ جس علاقے میں بھی تشریف لے گئے وہاں سے مشرکانہ رسوم و بدعات کا خاتمہ کر دیا۔ دہلی سے سہارنپور کے پہلے تبلیغی دورے میں اور اس کے بعد لکھنوٴ، الٰہ آباد، بنارس اور کلکتہ کے اصلاحی دوروں میں جو قابلِ رشک کامیابیاں آپ کو حاصل ہوئیں اور عامۃ الناس نے جس والہانہ انداز میں آپ کی دعوت و تبلیغ کی پذیرائی کی برّصغیر کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔

مریدین و مسترشدین کے لئے آپ کا طریق تربیت اپنے معاصرین سے یکسر مختلف تھا۔ آپ سفر و حضر میں اپنے خاص ارادت مندوں کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے تا کہ ان کی عملی زندگی اور باطنی تربیت پر ہمہ وقت توجہ فرما سکیں۔ پہلے تبلیغی دورے میں کم و بیش ایک سو ستر افراد شریک سفر تھے۔ تقریباً اتنی ہی تعداد لکھنوٴ، الٰہ آباد اور بنارس کے سفر میں ہمرکاب تھی۔ بریلی سے روانگی کے وقت رفقاء حج کی تعداد چار سو کے قریب تھی جن کے تمام مصارف سفر و لباس و خوراک کے جملہ اخراجات آپ نے برداشت کیے (جن کی تفاصیل تبلیغی دوروں اور سفر حج کے سلسلے میں بیان کی جا چکی ہیں) ان تفاصیل کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شروع ہی سے اقامتِ دین کے لیے مؤمنین و صالحین کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتے تھے جو اصلاح و تربیت کے مراحل سے گذر کر برّصغیر میں احیاء اسلام کا فریضہ انجام دے سکے۔

سفرِ حج سے واپسی کے بعد آپ اور آپ کے رفقاء کرام ہجرت و جہاد کی سرگرمیوں میں ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتے تھے جو اصلاح و تربیت کے مراحل سے گذر کر برّصغیر میں احیاء اسلام کا فریضہ انجام دے سکے۔ سفرِ حج سے واپسی کے بعد آپ اور آپ کے رفقاء کرام ہجرت و جہاد کی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحئیؒ نے دعوۃ جہاد کے لئے ملک کے طول و عرض کا دورہ کیا جس کے نتیجے میں عملی جہاد کے لیے دو ہزار کی جمعیت فراہم ہوگئی اور اس مختصر سی جماعت کے ساتھ انتہائی بے سر و سامانی کے عالم میں سیّد صاحبؒ سرزمینِ ہند سے آزاد قبائلی علاقوں کی طرف بنیت ہجرت و جہاد روانہ ہو گئے جہاں سے وہ باقاعدہ شرعی شرائط کے ساتھ اور موافق سنت جہاد کرنا چاہتے تھے۔ کسی غیر اسلامی حکومت کے

حدود میں بیٹھ کر بلوا یا فساد کرنا آپ کے پروگرام کا حصہ نہ تھا اسی لئے وہ ایک ایسے محفوظ و مامون آزاد علاقے کی تلاش میں تھے جہاں سے قیام امامت کے بعد شرعی طور پر جہاد کا آغاز کرسکیں۔ وہ انگریزوں سے ٹکر لینے سے پہلے سکھوں سے جنگ کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان کے ظلم وتعدی سے سرحد و پنجاب کے مسلمان ان سے سخت نالاں تھے اور سیّد صاحبؒ کو بجا طور پر توقع تھی کہ جب وہ اس سرزمین پر اعلانِ جہاد کریں گے تو علاقے کے لاکھوں مسلمان دل وجان سے ان کا ساتھ دیں گے۔

بالآخر ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ کو جمعرات کے دن آزاد قبائلی علاقے میں ہُنڈ کے شمالی تالاب کے کنارے ہندوستان و سرحد اور قندھار کے ہزاروں مسلمانوں نے جن میں علماء وصوفیاء امراؤ وخوانین اور عوام و خواص سبھی شامل تھے سیّد صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت امامت کرلی اور اس طرح برّصغیر کے آزاد قبائلی علاقے میں ایک اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ دی گئی۔ علماء ربانی مناصب حکومت پر متمکن ہوگئے اور انہوں نے اس علاقے میں اسلامی عدل وانصاف پر مبنی حکومت قائم کردی۔

''مگر قدرت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔ یہ حکومت چار سال کی مختصر مدت پوری کرنے کے بعد سردارانِ پشاور کے غدر وخیانت کے باعث مشہد بالاکوٹ میں سیّد صاحبؒ اور ان کے تین سو رفقاء کرام کی شہادت کے ساتھ ختم ہوگئی اور اس طرح سیّد صاحبؒ کی یہ آرزو کہ پنجاب و سرحد اور سندھ کے وسیع علاقوں پر مشتمل ایک مضبوط و مستحکم حکومت قائم ہوجائے پوری نہ ہوسکی مگر یہ اسی تحریک جہاد اور اس کے مخلص جاں نثاروں کی قربانیوں کی برکت تھی کہ پوری ایک صدی کے بعد انہی علاقوں میں حق تعالیٰ نے پاکستان کے نام سے ایک عظیم اسلامی مملکت قائم کردی۔''
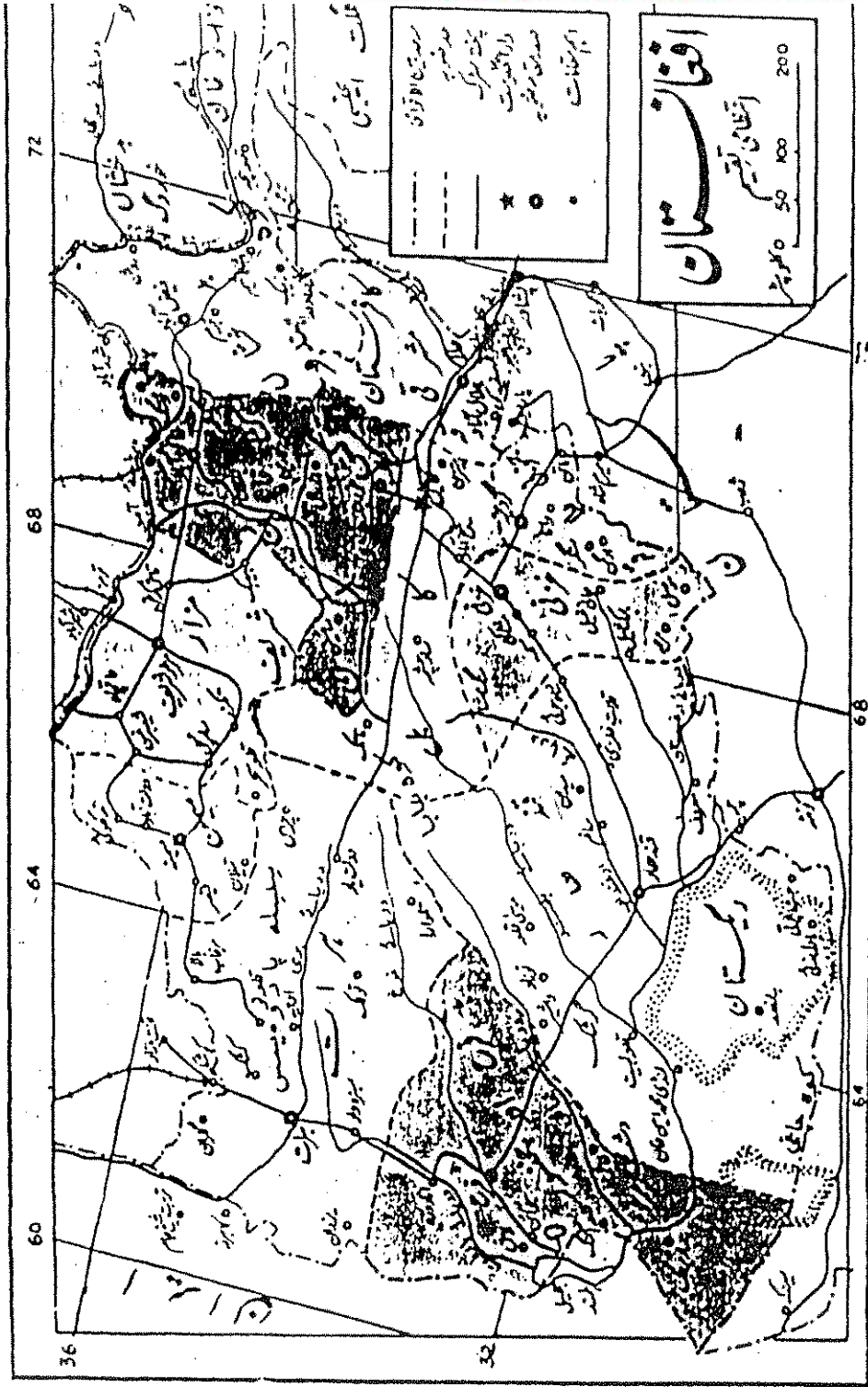
فصل سوم

# سیّد جمال الدین افغانی کی تحریک

اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اوائل میں دو اسلامی تحریکیں، وہابیت اور سنوسیت کا لقب اختیار کر کے نجد اور شمالی افریقہ کے صحرائی علاقوں میں آباد ہوگئیں، تو اسی عرصہ میں تیسرا علم بردار افغانستان سے اُٹھا اور اس سسکتی ہوئی تحریک میں ایسی جان ڈالی جس نے نہ صرف اہل مغرب کو بلکہ مسلمان حکمرانوں کو بھی ان کی کمزوریوں کے باعث ہلا ڈالا۔ اسلام کا یہ بطل جلیل کابل میں ۱۲۵۴ھ بمطابق ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوا۔ والد کا نام سیّد صفدر تھا۔ جو سیّد علی الترمذی محدث کی اولاد میں سے تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر تک تمام علوم اسلامی میں دسترس حاصل کرلی۔ بعد میں وہ حج کی غرض سے روانہ ہوئے اور ہندوستان پہنچے۔ جہاں وہ ڈیڑھ دو برس رہے۔ انگریزی زبان پڑھی اور مغربی علوم کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے اہل یورپ کے خیالات سے آگہی حاصل کر کے مسلمانوں کو اُخوت، محبت رواداری، سیاست اور حکومت کا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔

شیخ سنوسی اور سیّد جمال الدین افغانی کی دعوت اور مسلک و مشن میں صرف اتنا فرق ہے کہ شیخ موصوف نے علوم دین اور ترقی علوم کے اعتبار سے وحدت و اجتماعیت کی رُوح پھونکی اور جمال الدین افغانی نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ یورپ عالم اسلامی کا اور مشرق کا جانی دشمن ہے اور اس کے آئندہ آنے والے خطرات سے مسلمانوں اور مشرق کو خبردار کیا کہ اگر عالم اسلام اسی طرح جمود کے عالم میں رہا تو اس کی ہلاکت و بربادی لازمی ہے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹ جائیں گے۔ اس کٹھن اور دشوار گذار راستہ میں سیّد صاحب نے جان جیسی عزیز شے کو بھی قربان کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کو اجتماع و وحدت کی دعوت اور دولت برطانیہ کے طریقہ کار کی عیاریوں کے بیان کرنے سے باز نہ رہ سکے۔

سیّد جمال الدین افغانی ایک صاحب عزم و استقلال راہنما تھے جنہوں نے بیداری مشرق کی اوّلین

قیادت کی اور مسلمانوں کو یورپ کی متعصب اور حق شکن ذہنیت سے آگاہ کیا اور حقائق کو کتاب اللہ وحدیث رسول اللہ ﷺ سے اخذ کر کے عالم اسلام کے سامنے پیش کیا۔ وہ ملتِ اسلامی کی نشاۃ الثانیہ کے سب سے پہلے علمبردار تھے۔

عالم اسلام کا جو زمانہ سیّد جمال الدین افغانی نے پایا تھا وہ اس لحاظ سے بہت اہم تھا کہ اس وقت سارے عالم اسلام میں قعرِ انحطاط سے نکلنے اور ترقی کی جانب بڑھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ہندوستان میں وہ لوگ جو ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانانِ ہند کی تعلیمی، اخلاقی اور مذہبی پستی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے تھے اور دہلی، لکھنؤ اور دیگر مقامات میں گردش افلاک سے امیروں کو غریب ہوتے دیکھ چکے تھے۔ غور وخوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندی مسلمانوں کی ترقی صرف اس وقت تک ممکن ہے جب کہ وہ جدید تعلیم کے ہتھیار سے آراستہ ہو جائیں۔ اس وقت مصر، ایران، ترکی کئی سال سے انقلاب کی حالت سے گذر رہے تھے۔

ہندوستان میں علوم جدیدہ کی تعلیم حاصل کرتے رہے اور پھر پاپیادہ فریضۂ حج کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں انہوں نے نہایت مفید معلومات حاصل کیں۔ جس قوم اور ملک سے گذرتے ان کے عادات و اخلاق، غفلت و بیداری، ارتقاء وتنزل کے اسباب معلوم کر لیتے۔ ان کے نقائص دور کرنے کے لیے اصلاحی تدابیر سوچتے، اگر چہ یہ کام مشکل تھا مگر چونکہ آپ اصلاح اُمت کا کام شروع کرنے والے تھے لہٰذا یہ کام آپ نے عملاً اختیار کیا۔

حج کے بعد واپس وطن تشریف لائے پھر وہاں سے ہندوستان آ گئے۔ ایک ماہ گذرنے کے بعد حکومت ہند نے انہیں قاہرہ کے لئے سرکاری جہاز سے روانہ کر دیا۔ ان کی زندگی کا اہم زمانہ وہی ہے جو انہوں نے مصر میں گذارا۔ حکومت برطانیہ جو اس وقت ہندوستان پر قابض تھی، اسے ان کا وہاں پھرنا خطرناک معلوم ہوا اور اس نے آپ کو مصر روانہ کرا دیا۔ قاہرہ میں ان کا قیام چالیس روز رہا۔ جامعہ ازہر قیام مصر کے دوران آپ جاتے رہے اور طلبا آپ کی محبت اور علم سے فیض حاصل کرتے رہے۔ چونکہ زیادہ عرصے قیام کا ارادہ نہ تھا لیکن اصلاح احوال کے لئے آپ ارکان حکومت سے ملتے رہے اور ان کی تجاویز و مشوروں میں شریک

ہوتے رہے۔ مصر میں آپ نے دوبارہ قیام بھی کیا۔ اپنے دروس سے علماء وطلباء کو فیض پہنچاتے رہے۔ غرض آپ نے مصر کی سرزمین میں سیاسی بیداری کی نئی رُوح پھونک دی۔ سیّد صاحبؒ کا اسلوب تحریر وتقریر، درس و تلقین بالکل جداگانہ تھا، سرزمین مصر کیا، تمام عالم اسلام مدتوں سے اس اسلوب وطریق سے بالکل خالی تھا۔ سیّد صاحبؒ کے اس جدید اسلوب نے طلبہ کے اندر وہ رُوح اور جذبہ عمل پیدا کر دیا کہ ہر شخص نشہ حریت اور اعلاء حق سے معمور ہو گیا۔ ان کے جذبہ رُوحانی نے ان کو ہر میدان میں اعلائے کلمۃ اللہ اور حق گوئی پر آمادہ کیا۔ اس لئے وہ نہایت آزادی کے ساتھ مافی الضمیر کی تبلیغ کر رہے تھے۔

دنیا کی کوئی طاقت بھی ان کو اس تبلیغ دین سے نہ روک سکی۔ امریکہ کا ایک مؤرّخ لوتھروپ سٹوڈرڈ (Luthrop Stodard) اپنی کتاب عالم حاضر اسلامی میں آپ کے متعلق لکھتا ہے۔ جس کا خلاصہ ہے کہ:

> ''سیّد جمال الدین افغانی زبردست حکماء اسلام میں سے تھے۔ آپ ایک زبردست خطیب ولکچرار تھے۔ پیشانی سے رعب وجلال ٹپکتا تھا۔ آپ کی قوت بیانی صحیح استدلال، واضح براہین کے لحاظ سے نہایت مؤثر اور ایسی تیر بہدف ہوتی تھی کہ دل میں جاگزیں ہوتی۔ آپ کی آواز میں ایک مقناطیسی اثر ہوتا کہ فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی اور سننے والے کو بالکل مسحور کر لیتی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ جہاں گئے قلیل عرصے میں مناصب جلیلہ حاصل کر کے ایسی ایسی اصلاحات کیں کہ آنے والی قوموں نے ان سے نصیحت حاصل کی اور استفادہ کیا۔'' (۴۵)

ان کا سب سے بڑا خیال اسلام کی سربلندی اور اتحاد اُمت تھا اور اس کو وہ اسلام کی ترقی اور احیاء عظمت کی بنیاد قرار دیتے تھے اور اسی میں وہ یورپ کے غلبہ اور تسلّط سے اسلام کی نجات مضمر سمجھتے تھے اور جس امر کو حق خیال کرتے تھے اسے کھلم کھلا اور بے محابا بیان کرتے تھے۔ انہوں نے افغانستان، ایران، مصر، ترکی، غرض ہر جگہ سوئی ہوئی اُمت کو اس کا فریضہ یاد دلایا اور اپنے عالمانہ مضامین، دروس، تقاریر سے انسانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے رہے۔

خدیو توفیق نے جس کو حکومت دلانے میں جمال الدین افغانی کا بڑا حصہ تھا۔ ان کو مصر سے جلاوطن

کر دیا۔ ان کی حقیقت پسند فطرت نے ان کو ہمیشہ حق بات کہنے پر اُکسایا اور اسی لیے وہ ہمیشہ حسد اور چشمک کا نشانہ بنتے رہے۔ اب سیّد صاحبؒ ہندوستان گئے۔ تقریباً دو سال حیدر آباد دکن میں رہے اور مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ اس کے بعد انگریزی حکومت نے ان کو گرفتار کر کے کلکتہ بھیج دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانانِ ہند اپنی تعلیمی، اخلاقی اور مذہبی پستی کے قعر انحطاط سے نکلنے کی کوششوں میں مصروف ہو چکے تھے۔

سیّد جمال الدین افغانی النسل اور شریف النسب تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔ (افغانستان میں حسب نسب کی سب ملکوں سے زیادہ تعظیم و تکریم کی جاتی ہے) شرفِ سیادت اس کے علاوہ تھا۔ ان کے گھر والے بعض علاقوں کے حاکم تھے۔ بہت سے خاندان ان جیسے یا ان سے اونچے بھی ہوتے ہیں، لیکن ان میں ان جیسا فرد نہیں پیدا ہو سکا۔

چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

فَذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ۝

ترجمہ: ''یہ تو اللہ کا فضل ہے جسے چاہے وہ عطا کرتا ہے۔''(۳۶)

سیّد افغانی نے اس زمانے کے دستور کی طرح ازہری طریقہ کے مطابق فارسی اور عربی کی تعلیم پائی تھی۔ اس درس کا نمایاں وصف اسلامی فلسفہ اور تصوّف کا بغائر مطالعہ ہے۔ اس سے ان کی ثقافت کی بنیاد پڑی. ہندوستان آکر جدید طریقہ کے مطابق حساب پڑھا۔ تمام ممالکِ اسلامیہ کی سیاحت کی اور مکہ معظّمہ تک پہنچے اور مشرق کی زندگی سے آگاہی حاصل کی۔

اس وقت افغانستان میں اقتدار کے لیے رسہ کشی ہو رہی تھی۔ انہوں نے بھی ملکی سیاست میں سرگرم حصہ لیا۔ ایک فریق کی حمایت کی اور اس کے وزیر بن گئے۔ فتح و شکست سے بھی دوچار ہوئے۔ جب اجنبی طاقتوں نے مداخلت کی تو انہیں سیاست، خصومت اور مکاری کا پتہ چلا۔

سیّد افغانی نے بڑی عمر میں فرانسیسی زبان سیکھی، کسی سے حروف ہجائیہ سیکھ لیے تھے، پھر تین ماہ زبان کی مفردات یاد کرتے رہے، جس سے اتنی لیاقت بہم پہنچالی کہ کتابیں پڑھنے اور ان سے ترجمہ کرنے لگے۔ پیرس جا کر رہے تو کچھ اور وسعت پیدا کر لی۔ فنون میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ اختراعی قوت اس کے علاوہ

تھی۔ گویا کہ ان کا ذہن اختراع وابداع کا عالم تھا۔ بحث ومناظرہ کے ماہر اور تیز طرار تھے۔ اس باب میں کوئی بھی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔

سلاست کلام سیّد افغانی کا امتیازی وصف تھا. بڑے بردبار تھے۔ اگر کوئی ان کی شرافت اور دینداری کے درپے ہوتا تو یہ علم غضب میں بدل جاتا جس سے آگ بھبھوکا ہو جاتے۔ رحمدلی کے باوجود حملہ کرنے والے پر شیر بن جاتے. ہاتھ کے سخی تھے، اللہ تعالیٰ پر پختہ یقین رکھتے تھے، انقلاب زمانہ سے خائف نہ تھے۔

سیّد جمال الدین صورت شکل سے حرمین کے رہنے والے خالص عربی معلوم ہوتے تھے اور اپنے حجازی اسلاف کی تصویر تھے۔ درمیانہ قد، درمیانہ جسم اور گندم گون تھے۔ عصبی المزاج تھے۔ معتدل سر، چوڑی پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، موٹے موٹے رخسار اور چوڑی چکلی چھاتی رکھتے تھے، پُر ہیبت تھے، ملاقات کے وقت خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام اچھی خصلتوں سے نوازا تھا جو کہ ان کے کمال خلق پر دال تھا۔ اپنے فرائض اور اعمال کو خوب سمجھتے تھے۔ غرض مقصود پانے کے لئے جو کوشش کرنی پڑتی ہے اس سے آگاہ تھے۔

سیّد جمال الدین نے عمر بھر شادی نہیں کی اور نہ مال ودولت کی کبھی پرواہ کی۔ اپنے افکار اور مبادیات کے لئے جیتے تھے۔ دن میں ایک مرتبہ کھاتے، ہاں چائے اور سگریٹ کے رسیا تھے۔ ملک بدری کے لئے ہر لحظہ تیار رہتے تھے۔ اس لئے کپڑے ان کے جسم پر، کتابیں سینہ میں، افکار دماغ میں اور مصائب دل میں تیار رہتے تھے۔

ایران، ہندوستان، حجاز اور آستانہ کی سیاحت کر چکے تھے اور مدتوں قیام کیا تھا لیکن ان کی زندگی کا یادگار زمانہ مصر کی اقامت تھی جس کی میعاد اوّل محرم ۱۱۸۸ھ سے لے کر ۱۲۹۶ھ تک ہے۔ مارچ ۱۸۷۱ء تا اگست ۱۸۷۹ء اس زمانے میں انہوں نے اپنی اصلاحی تحریک کا بیج مصر میں بویا۔ یہ آٹھ سال عالم اسلام خاص کر مصر کے لئے خیر وبرکت کا زمانہ تھا۔ بعد میں جذبۂ آزادی اور اس کی راہ میں جو سرفروش پیدا ہوئے ان کی اصل یہی اصلاحی خیالات تھے۔ بعد میں دوسرے عوامل بھی پیدا ہوئے جن سے ان سرفروشانہ جذبات کی پرورش میں مدد ملی۔

سیّد جمال الدین کی اصلاحی تحریک ایران اور آستانہ میں تو نہ پنپ سکی مگر مصر میں خوب بڑھی اور پھلی پھولی۔ سیّد جمال الدین کی تدریسی زندگی دو طرح کی تھی: وہ خان خلیلی میں باضابطہ طور پر اپنے گھر میں درس دیتے تھے۔ دوسرا درس عملی ہوتا جو ہر وارد و صادر کو دیتے جو ان سے ملنے آتا۔ البوستہ کے قہوہ خانے میں بھی اجتماعات ہوتے تھے۔

سیّد جمال الدین کا ایک دوسرا مدرسہ بھی تھا جس کا اثر دور رس اور فائدہ عام تھا۔ اکابر اور اعیان قوم ان سے ملنے آتے اور وہ بازدید کے لئے ان کے ہاں جاتے۔ پڑھے لکھے اصحاب البوسطہ کے قہوہ خانے میں ان کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے، یہ ان کے خیالات سے مستفید ہوتے اور عوام الناس قومی تقریبات میں ان کی باتیں شوق سے سنتے۔

سیّد جمال الدین کا یہ عوامی مدرسہ تھا۔ اس مدرسہ میں محمود سامی البارودی، عبدالسلام المویلحی، ان کے بھائی ابراہیم المویلحی اور جوانوں میں سے محمد عبدہ، ابراہیم اللقانی، سعد زاغلول، علی مظہر، سلیم نقاش اور ادیب اسحٰق وغیرہ نے بھی تعلیم حاصل کی تھی۔

اس مدرسہ میں سیّد صاحب نے ادب کی تعلیم کی تجدید کی۔ (لٹریچر) ادب قدامت پرستوں کا تابع فرمان تھا۔ بادشاہوں اور امیروں کی مدح سرائی، ان کے ظالمانہ افعال اور صفات کی مدح طرازی ادب کا وظیفہ تھا۔ زمانہ کا حاکم عجوبۂ روزگار اور معصوم عن الخطاء سمجھا جاتا۔ حاکم اگر لوٹ کھسوٹ کرتا تو کوئی بھی اس کو ملامت نہ کرتا، اس کی بندہ نوازی کی تعریف کی جاتی، قتل کر دیتا تو بھی پوچھنے والا نہ تھا، معاف کر دیتا تو اس کے رحم و کرم کے گُن گائے جاتے۔ فن، ادب شعر و نثر اس کے لئے سامانِ طرب بلکہ اس کا غم غلط کرنے والے تھے۔ ان سے دشمنوں کو زیر و زبر کرنے اور اس کے دوستوں کی تعریف کرنے کا کام لیا جاتا۔ ادیب صغیر چھوٹے دولت مندوں کی مدح سرائی کرتا۔ جمال الدین آئے تو انہوں نے ادب سے قوم کی خدمت کا کام لیا، ادب و فن کے ذریعہ سے عوام کے حقوق حاصل کئے اور ان سے ظلم روکا، لوگوں پر عوام کی نکبت اور ابتری روشن کی، ان کو ان کے فقر و فاقہ کے اسباب بتائے، ان کو اندھیرے سے باہر روشنی میں نکلنے کے لئے آمادہ کیا، دلوں سے حاکم کی ہیبت دور کی۔ ان کو سمجھایا کہ وہ تو حاکم کی اصلی قوت ہیں، حاکم کا کام محکوم کے بغیر چل نہیں

سکتا لہٰذا ان کو غصب شدہ حقوق اور سعادت کی بازیابی کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔

سیّد جمال الدین عوامی مدرسہ میں ایک دوسرے مسلک کو اختیار کیے ہوئے تھے۔ وہ قہوہ خانوں، محفلوں اور گھروں میں اصلاح ہی کی باتیں کرتے۔

سیّد صاحبؒ بہت کم کھاتے اور کم سوتے تھے، زیادہ بیدار رہتے، بات چیت کے زیادہ شائق تھے، اس میں معانی اور زبان دونوں ان کی مدد کرتے. ہر بات میں نئی بات پیدا کرتے، سگریٹ سلگاتے یا کوئی منظر دیکھتے، چاہے کسی بچے کا سوال ہوتا یا طلاق کا واقعہ ہوتا اس قسم کی معمولی باتوں سے وہ گرمیٔ محفل کا کام لیتے۔

اس زمانہ میں مصر میں واقعات کی کمی نہ تھی. وہ کسی افواہ پر رائے زنی کرتے تو سامع شوق سے ان کی باتیں سنتا، جس سے سننے والا سمجھتا کہ جو راحت عمل میں ہے وہ سکون میں نہیں۔ ان کا جسم اور قلب متحد العمل تھے۔ ان سے ایک ہی ساز سنائی دیتا۔

بات چیت میں ان کا خاص طریقہ تھا جو ان کا دل پسند بھی تھا۔ وہ سمجھدار اور ناسمجھ، مستعد اور غیر مستعد سب سے باتیں کرتے. ان کی مثال ایسی بارش کی تھی جس میں صالح زمین کو فائدہ اور غیر صالح کو نقصان پہنچتا ہے لیکن اس میں بادل کا کیا قصور ہوتا ہے؟

شیخ جمال الدین افغانی حکمت کی باتیں خواہش مند اور غیر خواہش مند دونوں سے کرتے۔ ان کا خاصہ تھا کہ وہ اپنے مخاطب پر خاطر خواہ اثر ڈال لیتے تھے اور اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے اگر چہ وہ اس کا اہل نہیں ہوتا۔

سیّد جمال الدین کی عادت تھی کہ سارا دن اپنے گھر میں رہتے، جب شام ہوتی تو عصا تھامے ازبکیہ کے قریب قہوہ خانہ میں چلے جاتے، ان کے گرد لوگ آدھے دائرے کی شکل میں جا بیٹھتے اور وہ صدر میں ہوتے۔ اس حلقہ میں لغوی، شاعر، منطقی، طبیب، کیمیادان، مؤرخ، جغرافیہ دان، مہندس اور ماہر طبعیات سبھی ہوتے۔ ایک سے ایک آگے بڑھ کر مشکل سوالات کرتا اور اپنے دلائل پیش کرتا۔ سیّد صاحبؒ فرداً فرداً سب کے سوالات کے جوابات ایسی صاف اور فصیح زبان میں دیتے جس میں کسی قسم کا اشکال یا تردد نہ ہوتا۔ ان کی تقریر سیلاب کی طرح تھی جو ان کی طبیعت سے امڈتا تھا، جس کو تکان محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس سے سامعین

مدہوش، سائلین چپ اور معترضین خاموش ہو جاتے۔ جب رات کا بڑا حصہ گذر جاتا تو گھر کی راہ لیتے۔ اس مجلس کا سارا خرچ اپنی جیب سے ادا کرتے۔

وہ مصریوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

''اے مصریو! تم نے استبداد میں پرورش پائی ہے۔ صدیوں سے فاتحوں اور کشور کشاؤں کے ظلم و بے انصافی اور ذلت و مسکنت نے تمہیں پامال کر رکھا ہے اور تم راضی برضا ہو کر یہ سب کچھ برداشت کر رہے ہو۔''

''ظالم حکام نے ڈنڈے اور کوڑے کے زور پر تمہاری زندگی کا خون نچوڑ لیا ہے اور تم اُف تک نہیں کرتے۔ اگر تمہاری رگوں میں خون رہتا جس میں حیا تین ہوتی اور تمہارے دماغ میں متاثر ہونے والے اعصاب ہوتے جو نخوت اور حمیت کو جوش میں لاتے تو تم اس ذلت اور مسکنت کو پسند نہ کرتے۔ تم پر یونانی، رومن، ایرانی، عرب اور کرد حکومت کرتے آئے ہیں اور سب تمہاری کھال اُدھیڑتے رہے ہیں لیکن تم جنگل کے پتھر کی طرح بے حس و حرکت پڑے رہے ہو۔ تم اہرامِ مصر، ھیاکل منفیس، آثار طیبہ اور مشاہد سیوہ اور دمیاط کے قلعوں کی طرف دیکھو وہ تمہارے آباء و اجداد کی عظمت و اقبال کے شاہد ناطق ہیں۔ غفلت کی نیند سے جاگ اُٹھو باقی قوموں کی طرح آزاد اور سعادت مند بن کر رہو۔''

اس وقت سے پاشا کی بغاوت کی آگ بھڑکنے لگی۔ اب شیخ نے حجرہ کے درس کو چھوڑ کر قوم کو مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے مخاطب خاص و عام، راہ چلتے ہوئے مسافر اور ایوانِ وزارت کے کرسی نشین سبھی تھے۔

سیّد صاحبؒ کے پروگرام میں فرقہ ماسونی کی محفل میں شریک ہونا بھی داخل تھا۔ اس میں بڑے بڑے لوگ تھے۔ سیّد صاحبؒ نے سوچا کہ شاید ان لوگوں تک ان کے افکار کی رسائی ہو سکے لیکن یہاں جاتے ہی وہ سخت ہیجان میں آ گئے اور متواتر تقریروں سے ان کا نقد و احتساب کرنے لگے۔ محفل کے ارکان سیاسی

باتوں پر کان نہ دھرنا چاہتے تھے۔انہوں نے فرمایا کہ:

''آزادی پسندوں کے کلب کے عنوان: حریت، مساوات اور اُخوت نے مجھے کام کرنے کا شوق دلایا ہے۔اس کی غرض انسان کی نفع رسانی اور عدل وانصاف کے نشانات راہ کی تعمیر ہے۔ میں مصر میں عجیب وغریب باتیں سننے کے انتظار میں تھا لیکن یہ میرے وہم وخیال میں بھی نہ تھا کہ بزدلی اس کلب میں راہ پالے گی۔''

''اگر فری میسن (آزادخیال) ملکی سیاست میں دخیل نہ ہوں گے اور اپنے آلات سے قدیم عمارت کو ڈھا کر صحیح حریت، اُخوت اور مساوات کے نشانات نہ کھڑے کریں گے، ظلم و جور کے محل کو منہدم نہیں کریں گے، ان کے ہاتھ ہتھوڑا نہ پکڑیں گے تو ان کے افکار کی عمارت کے لئے زاویہ قائمہ کہاں سے بنے گا؟''

اس طرح سیّد صاحبؒ نے سیاست میں عدم مداخلت، اراکین کی اقتدار کے لئے رسہ کشی اور عوام پر ظلم وستم سے اغماض کی وجہ سے ان لوگوں کی خوب خبر لی۔ آخرکار وہ اس مجلس سے دستکش ہو گئے اور ایک دوسری مجلس کی تشکیل کی جس کے ممبروں کی تعداد جلد ہی تین سو تک پہنچ گئی جن میں مصری مفکر اور نوجوان سبھی شامل تھے۔

اس مجلس میں کامل آزادی تھی۔مختلف اعمال کے لئے شعبے تھے: ایک قانون کا تھا، دوسرا مالیات کا، تیسرا قومی اُمور کا اور چوتھا جہاد کا۔ ہر وزارت اور اس کے اُمور کے لیے الگ شعبہ تھا جس میں تمام معاملات کو دیکھا اور پرکھا جاتا تھا۔ظلم وناانصافی کی نشاندہی اور اس کی اصلاح کی تدابیر سوچی جاتی تھیں اور ان کو وزیر متعلقہ کی خدمت میں دوراندیشی اور صراحت سے پیش کیا جاتا تھا۔اس سے محافل اور مجمعات میں چرچا رہتا۔

اس طرح سیّد صاحبؒ کے حلقۂ اثر واعمال کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ پہلے تو وہ اپنے حجرہ میں درس دیتے تھے پھر قہوہ خانہ میں سننے والوں کی عقلوں کو قابو میں لانے لگے۔اس کے بعد وزارت اور حکومت کے مصالح پر اثرانداز ہونے لگے۔گھر میں تو فلسفہ اور حکمت کی کتابوں کا درس دیتے تھے اور محفل اور جلسہ میں قوم کی حالت اجتماعی پر تبصرہ کرتے۔اس کے حقوق وفرائض کی تشریح کرتے کرتے بالآخر سیاست سے گہری

دلچسپی لینے لگے۔

سیّد صاحبؒ کی یہ طبعی خصوصیت اس وقت ظاہر ہوئی تھی جب وہ عہد جوانی میں اپنے ملک کی امارت کا فیصلہ کرنے کے لئے کسی ایک امیر کا ساتھ دے رہے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ جب تک تمام اُمور کو اپنے ہاتھ میں نہ لیتے انہیں چین نہ آتا۔ ان کی شخصیت میں برقی طاقت تھی۔ اس سے اضطراب تو ضرور پھیلتا لیکن انہیں قطعاً پرواہ نہ تھی۔

درس نظامی سے سیّد جمال الدین کی غرض طلبہ میں وسعت نظر پیدا کرنا اور جدید آفاق کا کھولنا تھا تا کہ ان میں اس عالم کے سمجھنے اور بحث ونظر میں آزادی کی طاقت پیدا ہو جائے اور ایسے لوگ پیدا ہوں جو بحث و تنقید کر سکیں اور حکم لگا سکیں چاہے اس سے نص کی مخالفت ہوتی ہو یا معروف و مالوف پر زد پڑتی یا اس کی تائید ہوتی ہو۔

درس عام سے ان کا منتہائے مقصود قوم کو حکمرانوں کی غلامی سے آزاد کرانا تھا۔ حاکم اور محکوم کو ایک دوسرے کا موقف سمجھانا تھا تا کہ وہ اپنے فرائض اور واجبات سے آگاہ ہوں۔ جب حاکم اپنی حدود سے تجاوز کرے تو رعایا زور سے ''نہیں نہیں'' کہہ اُٹھے۔ اس سے ان کی غرض رائے عامّہ کی تکوین تھی جو مضبوط سمجھدار اور وسیع النظر ہو۔ اپنے داخلی اور خارجی اُمور کو سمجھتی ہو۔ جب اہم معاملات درپیش ہوں تو یک رائے ہو کر اپنا فیصلہ حکمرانوں کی خدمت میں پیش کرے جس سے ان کو مجال سرتابی نہ ہو سکے۔ حاکم یہ سمجھ لے کہ اسے اپنی تنخواہ پر گذر بسر کرنی ہوگی۔ ٹیکس بقدر مصالح عامّہ لگنے چاہئیں نہ کہ اس کی اپنی خواہشات کے مطابق۔ قوم کا حق ہے کہ وہ اخراجات اور آمدنی پر نظر رکھے۔

سیاست سے ان کا مطلب یہ تھا کہ قوم کو حکمرانی میں شرکت پر قائل کیا جائے۔ جب اس کے اندر سوجھ بوجھ پیدا ہوگی وہ از خود نمائندہ مجلس کے قیام کا مطالبہ کرے گی تو حاکم کو قوم کے فہم وادراک کے مطابق اس کے حقوق بحال کر دینے ہونگے، یہ کوئی غیبی عطیہ نہ ہوگا جب اس مطالبے کے پیچھے کوشش اور جدوجہد ہوگی تو قوم جان سے زیادہ اس کی حفاظت کریگی اور وہ قائم ودائم رہے گی اور کوئی طاقت اس کو نظر انداز یا باطل نہ کر سکے گی۔

خدیو توفیق پاشا نے سیّد صاحبؒ کو قصر عابدین میں بلایا اور کہا کہ میں مصریوں کی فلاح کا تہہ دل سے متمنی ہوں، میں قوم اور ملک کو ترقی کے اعلیٰ مدارج پر دیکھنا چاہتا ہوں لیکن افسوس ہے کہ ملک کی اکثریت جاہل ہے، ان کو اس طرح ہیجان انگیز تعلیم دینا جس طرح تم دیتے ہو بے فائدہ ہے اس سے قوم اور ملک پر تباہی آئے گی۔

سیّد صاحبؒ نے جواب دیا کہ اگر آپ مجھے آزادی اور خلوص سے کچھ کہنے کی اجازت دیں تو گذارش کروں گا کہ اگر مصری جاہل اور غیر معروف ہیں تو ان میں عالم اور عاقل بھی پائے جاتے ہیں۔ جس نظر سے آپ ان کو دیکھتے ہیں اسی نظر سے وہ آپ کو دیکھتے ہیں۔ اگر آپ میری خیر خواہانہ نصیحت قبول فرمائیں طریقِ شوریٰ سے قوم کو حکومت میں شریک کریں، نمائندوں کے انتخاب کا حکم صادر فرمائیں جو قانون سازی کا کام کریں اور آپ کے نام اور مرضی سے ان قوانین کا نفاذ کریں تو آپ کا تاج وتخت ہمیشہ کے لئے قائم رہے گا۔ یہ کہہ کر آپ باہر نکل آئے اور اپنے شاگردوں اور ہمدردوں کو جوش وقوت سے لکھنے پر اُبھارتے رہے۔ جب سیّد صاحبؒ مصر میں پہلے پہل آئے تو ان کی رائے تھی کہ جب تلک مصریوں میں بیداری اور شجاعت پیدا نہ ہوگی مجلسِ شوریٰ کا کچھ فائدہ نہ ہوگا لیکن جب انہوں نے حکام کا استبداد دیکھا اور آٹھ سالوں میں قوم کی پختہ کاری معلوم کر لی تو پہلی رائے سے دستبردار ہو گئے۔

اسمٰعیل پاشا کے آخری دنوں میں امیر توفیق ان کی عزت کرتے تھے اور ان کے افکار کے مؤید تھے۔ سیّد جمال الدین امیر توفیق سے محفل ماسونی میں ملا کرتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اگر یہ اسمٰعیل کے بعد خدیو بنیں تو قوم کا بھلا ہوگا لیکن جب زمام کار اس کے ہاتھ آئی تو اس نے سیّد صاحبؒ کے پیچھے جاسوس لگا دیئے۔ مجلس وزراء منعقد ہوئی تو اس نے سیّد جمال الدین کے جلاوطنی کے احکام صادر کر دیے۔

الزام یہ لگایا کہ وہ سرپھروں کی جماعت کے سردار ہیں جو دین اور دنیا میں فساد ڈالنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اس سے سقراط کا واقعہ تازہ ہو گیا۔ اس کے بعد بتاریخ ۶ رمضان ۱۲۹۶ھ کو وہ اپنے ملازم امین الفیلسوف ابو تراب سمیت گرفتار کر لئے گئے اور ۲۴ اگست ۱۸۷۱ء کو ایک جہاز میں سوار کر کے بمبئی روانہ کر دیے گئے۔ ان کو مصر دوبارہ آنا نصیب نہ ہو سکا لیکن ان کے افکار و مبادیات کی اشاعت ہوتی رہی۔

جلاوطنی کے یہ ایّام سیّد جمال الدین نے حیدرآباد دکن میں گذارے۔ان کو نہ تو کوئی کام کرنے کی اجازت تھی، نہ کہیں آنے جانے کی اجازت تھی۔لوگوں سے ملنے جلنے، کتاب خوانی یا کسی سوال کے جواب دینے پر کوئی قدغن نہ تھی۔

وہ فرمایا کرتے تھے کہ:

''اسلام میں وہ خوبیاں ہیں جو کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہیں۔توحید سے ذہن کی صفائی اور تمام اوہام سے پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔سب سے بڑا اُصول یہ اعتقاد ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی دنیا کے کارخانے کو چلانے والا اور افعال کا خالق ہے اور کسی انسان یا جماد، علوی یا سفلی کو کسی دوسرے کو نفع نقصان اور عزت و ذلت دینے پر کوئی قدرت حاصل نہیں ہے۔اسلام نے شرف کے تمام دروازے انسان پر کھول رکھے ہیں، ہر ایک کے لئے ترقی کی گنجائش رکھی ہے، اجناس اور اصناف کے فرق کو مٹا دیا ہے، لوگوں کو کمال عقلی اور نفس عطا کیا ہے، لوگوں میں درجۂ امتیاز علم اور فضیلت سے ہوسکتا ہے کسی دوسری چیز سے نہیں۔اس کے خلاف باتیں وہ خرافات ہیں جو عقل کو اندھا کرتی اور نورِ بصیرت کو بجھا دیتی ہیں۔اسلام اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اپنے پیروکاروں کو ظن اور شبہات پر زجر و توبیخ کرتا ہے۔غیر مدلل بات اس کو ناپسند ہے، جب خطاب کرتا ہے تو عقل سے، حکم لگاتا ہے تو عقل سے، اس کی نصوص شاہد ناطق ہیں کہ سعادت عقل اور بصیرت کا نتیجہ ہے، غفلت اور عدم بصیرت سے بدبختی اور گمراہی آتی ہے۔''(۳۷)

اسلام نے تمام قوم پر تعلیم کو فرض کیا ہے۔علوم و معارف سے عقلوں کو روشن کرنے کے لیے کہا ہے۔ معلم کو تعلیم دینے اور مؤدب کو اچھی باتوں کے حکم دینے اور بُری باتوں سے روکنے کے لیے کہا ہے:

''ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ

(غیر اسلامی روش) سے پرہیز کرتے۔''(۳۸)

وہ اور محمد عبدہ آپس میں صلاح ومشورہ کر رہے تھے کہ کونسا اصلاحی کام کریں؟ شیخ محمد عبدہ جدید نسل سے کچھ مایوس سے تھے. وہ اعرابی پاشا کی بغاوت کے زمانے میں لوگوں کی بے وفائی اور خود غرضی دیکھ چکے تھے۔اس بناء پر انہوں نے سیّد جمال الدین کو مشورہ دیا کہ وہ دونوں ایک دور دراز مقام کی طرف نکل جائیں جہاں کوئی امیر اور سلطان ان کے کام میں رکاوٹ نہ ڈال سکے۔ وہاں جا کر ایک مدرسہ قائم کریں جس میں ممالک اسلامیہ سے ایسے منتخب نوجوان داخل کیے جائیں جن سے نیک کام کرنے کی توقع ہو،ان کو ایک خاص طرز کی تعلیم دے کر قیادت اور اصلاح کے لیے تیار کیا جائے۔ دس سال کے عرصہ میں بہت سے شاگرد تیار ہو جائیں گے جو اپنا وطن چھوڑ کر اصلاح مقصود کی اشاعت کریں گے۔

سیّد صاحبؒ کو یہ رائے پسند نہ آئی۔اس میں ان کو ارادہ کی کمی،امن پسندی اور عصر حاضر سے از حد مایوسی نظر آئی۔محمد عبدہ سے کہا تم میں عزم وحوصلہ کی کمی ہے۔

سیّد صاحبؒ نے خود پروگرام بنایا۔اس کے مطابق پیرس سے عربی اخبار نکالنے کا فیصلہ ہوا جس کی تمام اسلامی ممالک میں اشاعت ہوگی جو مسلمانوں کو ان کے واجبات اور حقوق سے روشناس کرائے گا اور ان میں حبّ الوطنی پیدا کرے گا۔

اس مقصد کے پیشِ نظر العروۃ الوثقیٰ کا اجرا ہوا۔اس میں افکار ومعانی سیّد صاحبؒ کے ہوتے تھے جن کو شیخ محمد عبدہ تحریر کے قالب میں ڈھال لیتے تھے۔مرزا محمد باقر بیرونی اخبارات سے مشرقی ممالک سے متعلق خبروں کا عربی میں ترجمہ کر دیتے تھے۔اس مجلّہ کے پیچھے ایک خفیہ جماعت کام کر رہی تھی جو تمام اسلامی ممالک میں پھیلی ہوئی تھی۔

جماعت کے ارکان گنے چنے،سمجھدار اور پر جوش دیندار تھے۔اس جماعت میں شامل ہونے کے لئے ان کو حلف اُٹھانا اور عہد کرنا پڑتا تھا کہ:

> ''وہ اُخوت اسلامیہ کے احیاء کے لیے امکان بھر کوشش کریں گے،اس کو والدین کے برابر سمجھیں گے،دین کے مطابق قدم اُٹھائیں گے اور کوئی ایسا اقدام نہیں

کریں گے جس سے مذہب کو جزئی یا کلی نقصان پہنچے۔ اُخوت کی تقویت کے لئے
عقلی اور امکانی وسائل تلاش کریں گے اور عالمِ اسلام سے امکان بھر معرفت پیدا
کریں گے۔" (۳۹)

اس جماعت کی شاخیں مختلف ممالک میں تھیں۔ شاخ میں مذاکرہ کے لیے اجتماع ہوتا اور ہر اجتماع کے بعد ممبر لکڑی کے چھوٹے سے صندوق میں خفیہ چندہ ڈال دیتے تاکہ ایک دوسرے کو پتہ نہ چل سکے کہ زیادہ دیا ہے یا کم۔ اس چندہ سے اخبار اور اس کے منتظمین کا خرچ اُٹھتا کیونکہ اخبار کے بہت سے پرچے مفت روانہ کیے جاتے تھے۔

آٹھ ماہ میں اٹھارہ پرچے نکلے تھے۔ پہلا نمبر ۱۵ جمادی الاوّل ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۳ مارچ ۱۸۸۴ء کو نکلا تھا اور آخری نمبر ۲۶ ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو۔ اخبار کے اغراض و مقاصد کیا تھے؟

پہلے پرچہ میں اغراض و مقاصد مختصر طور پر اس طرح بیان ہوئے ہیں:

۱۔ اہل مشرق کے ان فرائض اور واجبات کا بیان جن کی تفریط کی وجہ سے ضعف پیدا ہوا ہے۔ تدارک مافات کے لئے طریقہ کی وضاحت۔ اس کے بعد ان اسباب اور علل کا بیان ہوگا جن کی وجہ سے حالات خراب ہوئے اور ان کو کوئی راستہ سجھائی نہ دیا، اوہام کا ازالہ۔

۲۔ لوگوں میں کامیابی کی اُمید کا عقیدہ پیدا کرنا اور نا اُمیدی دور کرنا۔

۳۔ انہیں ان کے آباء و اجداد کے اُصول کی پابندی کی دعوت دینا۔

۴۔ اہل مشرق خاص کر مسلمانوں کو الزام دیا جاتا ہے کہ وہ جب تک اپنے مذہب پر کاربند رہیں گے ترقی کی طرف قدم نہیں اُٹھا سکتے، اس اتہام کا ابطال۔

۵۔ مشرق کے رہنے والوں کو سیاست عامہ اور خاصہ سے خبردار کرنا۔

۶۔ مختلف مسلمان قوموں میں باہمی روابط کو مضبوط کرنا، افراد کے درمیان اُلفت پیدا کرنا، مشترک منافع کی دعوت، انصاف پسند سیاست خارجہ کی حمایت۔

سیّد جمال الدین کا ارادہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو دینی، اجتماعی اور سیاسی اصلاح کی دعوت دیں گے

کیونکہ اسلام میں یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ عقیدہ صفات خلقیہ اور نظام سیاسی کے لحاظ سے وہ خلفائے راشدین کے عہد کو مسلمانوں کے لیے کامل نمونہ مانتے تھے۔ ان کے خیال میں وہ لوگ واحد دین کے حامی، یک جان اور یک قالب تھے، وہ غیرت منداور باہمت تھے۔ اپنے عقیدہ اور حفاظت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دیتے تھے، امکان بھر علم کی اشاعت کرتے تھے، وہ کسی نرمی یا لچک کے بغیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے تھے۔

وقت گذرنے پر پانچ دروازوں سے فساد داخل ہوا: جبر کے عقیدہ کو اختیار کرنے اور قضاء وقدر کو غلط سمجھنے سے عوام سعی و کوشش چھوڑ بیٹھے۔ قرآن ثالث اور رابع میں زنادقہ کے خیالات کی تعلیمات اسلام میں آمیزش ہوئی جس سے مسلمان فرقوں اور جماعتوں میں بٹ گئے اور دین کمزور ہوگیا۔

## اُمّتِ مسلمہ کو دعوت اتحاد و اتفاق

یہ خیالات دیکھنے میں حقائق نظر آتے تھے۔ جھوٹی احادیث جو آنحضرت ﷺ سے منسوب کی جاتی تھیں اور رُوحِ عمل اور خودداری کے لئے زہر قاتل تھیں۔ اس سے ہمتوں میں ضعف اور ارادوں میں فتور پیدا ہوا۔ عوام کی ناقص تربیت اور جمہور کو اُصول دین سے روشناس کرانے اور علم کی اشاعت میں علماء کی کوتاہی۔

بعض مقالات میں آپ نے دوسرے اسباب کی نشاندہی کی تھی جن میں اہم ترین اسباب اُمت کے مختلف اجزاء میں عدم رابطہ تھا۔ خود علماء کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ علماء اور امراء ایک دوسرے سے شناسا نہ تھے۔ دین اسلام نے تو مسلمانوں کو مجاہد بننے کا حکم دیا ہے، اس نے کہا ہے:

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ○

ترجمہ: ''اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو تا کہ اس

کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو
خوفزدہ کردو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ
تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور
تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا۔'' (۴۰)

یہاں حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ طاقت کا سامان فراہم ہو سکے وہ تیار رکھو لیکن مسلمانوں نے اس امر کو معمولی سمجھا۔ ہر موقف کے لئے کوئی ساز و سامان نہ تیار کیا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کی طاقت اور شان و شوکت کمزوری میں بدل گئی۔ ان میں بعض اسباب کو لے کر وہ ان کی اچھی طرح تفصیل بیان کرتے تھے یا ایک مقالہ کسی ایک سبب کی تشریح کے لئے وقف کر دیتے۔ جس طرح قضا و قدر کے بارے میں کیا ہے۔ ان کی عادت تھی کہ پہلے طعن و تشنیع سے دلوں میں حرارت اور اس کے بعد اُمید کی کرن روشن کرتے اور کہتے کہ اگر جڑ سالم ہے تو عوارض جلد مٹ کر رہیں گے۔ ہمیشہ عہد اوّل کے مسلمانوں کی حالت اور ان کا اقبال یاد دلاتے رہتے۔

سیّد صاحبؒ کے سامنے ایک ایسی اسلامی حکومت کا نقشہ رہتا جو اسلام اور اس کی تعلیمات کے عین مطابق ہو۔ جب یہ دیکھا کہ سارا عالم اسلام ایک امیر کے زیر فرمان نہیں ہو سکتا تو ان کے مختلف اجزاء کو پختہ روابط سے مربوط کرنا چاہا تا کہ ان کے سامنے ایک مقصد ہو، مختلف ممالکِ اسلامیہ میں ایسی حکومتیں قائم ہوں جو قرآن پاک کو اپنا مرشد و رہبر سمجھیں۔ حکومت کی بنا عدل و شوریٰ پر ہو، معاملات کا انتظام و انصرام بہترین ہاتھوں میں ہو۔

مسلمان قوموں کو اتحاد و اتفاق کی دعوت دینے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

''اس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمام ملکوں میں ایک ہی فرد سیاہ و سفید کا مالک ہو، ایسا ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن میری دلی آرزو ہے کہ ان پر قرآن کی سلطانی ہو اور وحدت مقصود دین ہو۔ ایک سلطان دوسرے ملک کے مسلمانوں کے مفاد کا خیال رکھے کیونکہ اس کی حیات اور بقا ان کی زندگی سے وابستہ ہے۔''

وہ عموماً جرمن ریاستوں کی مثال دیا کرتے تھے جو منتشر اور متفرق ہونے کے بعد ایک وحدت میں

منسلک ہوگئی تھیں۔ وہ دول اسلامیہ کے وفاق کی دعوت دیا کرتے تھے جس کی قیادت سب سے بڑا اور طاقتور اسلامی ملک کرے گا۔

سیّد صاحبؒ کو ڈر تھا کہ وہ جس نظام کی دعوت دیتے ہیں وہ مختلف ممالکِ اسلامیہ اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں میں ناانصافی نہ پیدا کردے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ہمارے اخبار میں مسلمانوں اور ان کے حقوق کا جو چرچا رہتا ہے اس سے کوئی یہ گمان پیدا نہ کرے کہ ہم مسلمانوں اور ان کے دوسرے ہم وطنوں کے درمیان اختلاف کی خلیج وسیع کرنا چاہتے ہیں یہ ہمارے اغراض و مقاصد سے بعید ہے، ہماری شریعت اس امر کی اجازت نہیں دیتی۔''

جس قسم کا نظامِ حکومت وہ دیکھنا چاہتے تھے یا قوم میں بلند اخلاق، غیرت، خودداری اور طاقت وغیرہ کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے تمام ممالکِ اسلامیہ خاص کر مصر میں غیر ملکی اقتدار کو چیلنج کیا اور سختی سے اس کی مخالفت کی۔ اخبار کا بڑا حصہ اس قسم کے مقالات، مخابرات اور تبصرات کے نذر ہو جاتا تھا۔

اس غرض کے لیے انہوں نے مختلف اقسام کی تعبیریں اور اسالیب انشاء استعمال کئے۔ سوڈان میں مہدی کے واقعات سے دلوں میں شعور اور ہیجان پیدا کیا۔ اس کے علاوہ بہت سے خفیہ قاصد ملکوں میں روانہ کئے۔ ان کو ایسی تعلیم دی گئی تھی جس کی اشاعت اخبار میں نامناسب تھی۔ ایک قاصد ماسکو اور دوسرا حجاز بھیجا گیا، شیخ محمد عبدہ جن کو جلاوطنی کی سزا ہوئی تھی، مصر اور تونس روانہ کیے گئے۔

ان کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ مصری اور ہندوستانی حکومتوں نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اخبار کا داخلہ روک دیا۔ نوبار پاشا کی وزارت نے بھی اسی قسم کی ایک قرارداد پاس کی۔ جب لوگوں کو اخبار ملنا مشکل ہو گیا اور اس پر کڑی نگرانی کی جانے لگی تو اخبار بند ہو گیا، اس سے منتظمین کو بہت رنج ہوا۔ اگرچہ سب لوگوں نے یہ دعوت قبول نہ کی تھی کہ وہ اقتدار حاصل کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے مگر اخبار پھر بھی اپنا دعوتی کام جاری

نہ رکھ سکا۔

اس سے سیّد صاحبؒ کی عمر کا آخری مرحلہ اختتام کو پہنچا۔ یہ تین سال جو انہوں نے پیرس میں گزارے تھے، سخت جدوجہد اور مشکل میں گزارے تھے۔ ان کو حسب دلخواہ کامیابی نہ حاصل ہو سکی مگر ان کے افکار و خیالات زندہ رہے۔

''العروۃ الوثقیٰ'' کہنے کو تو بند ہو گیا لیکن اس کا اثر جاری و ساری رہا۔ اس اخبار نے مشرق کے بہت سے روشن خیالوں کی روح کو بیدار کیا، ان کو سوتے سے جگایا، استعمار نے انہیں بدحال بنا رکھا تھا، اخبار نے اس کی نشاندہی کی، انہیں لکھنا، پڑھنا اور تقریر کرنا سکھایا، قومی شعور جس کا نام بعد میں استقلال پڑا اس کی طرف دعوت دی۔

یہ کہنا مبالغہ سے خالی نہ ہوگا کہ یہ مشرق میں اجنبی حکومت کے خلاف نفرت کی آگ کی پہلی چنگاری تھی۔ اخبار نے جامعہ اسلامیہ، رابطہ مشرقیہ، سوڈانی مصری اور ہندی مسائل کے متعلق جو کچھ بھی لکھا اس کو پورے جوش کے ساتھ بیان کیا۔ تمام مسائل کو عالمی سیاست کی نظر سے دیکھا، عوام کے دلوں کو گرمایا اور اجنبی حکومتوں کی سیادت کے نقصان سے خبردار کیا وغیرہ وغیرہ۔

اس دعوت سے نہ صرف عوام، ملکی اور غیر ملکی حکومتیں ہی متاثر ہوئیں بلکہ پڑھے لکھے لوگوں کا مختصر حلقہ بھی اثر پذیر ہوا جو بعد میں قومی تحریکوں کا قائد بنا۔ اخبار بند ہو گیا اور منتظمین تتر بتر ہو گئے۔ شیخ محمد عبدہ اور مرزا باقر نے بیروت کی راہ لی، سیّد جمال الدین شاہ ناصرالدین کی دعوت پر ایران چلے آئے جہاں شاہ اور علماء نے ان کی خوب آؤ بھگت کی لیکن جلد ہی شہنشاہ ایران نے خطرہ محسوس کر کے سیّد صاحبؒ سے آنکھیں پھیر لیں۔ سیّد صاحبؒ نے واپسی کی اجازت مانگی اور روس کے دارالحکومت پیٹرز برگ تشریف لے گئے جہاں انہوں نے ۱۸۸۶ء سے ۱۸۸۹ء تک تین سال قیام کیا۔

وہ روس کیوں گئے؟ اور اتنی مدت وہاں کیا کیا کام کرتے رہے؟ اس عرصہ کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ بیشتر گمان یہ ہے کہ وہ دو کاموں میں مصروف رہے:

۱- روس کے مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ تھی لیکن ان کی حالت مظلومانہ تھی وہاں کے ارباب حل

وعقد سے مل کر انہوں نے مسلمانوں کے لئے کچھ آسانیاں پیدا کیں۔ زار روس سے مل کر مسلمانوں کو قرآن پاک اور دینی کتابوں کے چھاپنے کی اجازت دلوائی۔

۲۔ روس کا مشرق کی سیاست پر بڑا اثر تھا اور وہ ایشیا میں انگریزی سیاست کا مدمقابل تھا. وہ دولت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کی فکر میں تھا۔ بہت سے سیاسی مدبروں کا خیال تھا کہ اس مخاصمت کی وجہ سے جتنا انگلستان، فرانس اور اطالیہ کو فائدہ پہنچا ہے اتنا روس کو نہیں پہنچا۔ اگر روس کا دولت عثمانیہ پر دباؤ نہ ہوتا تو فرانس الجزائر اور تونس پر، اطالیہ طرابلس پر اور انگلستان مصر پر قابض ہو سکتا تھا۔

خواہ کچھ بھی ہو سیّد صاحبؒ اثنائے قیام روس میں عالمی سیاست میں منہمک رہے اور روس کو انگلستان کے خلاف اُبھارتے رہے۔ روسی اخبارات میں بہت سے مقالات افغانی، ایرانی، عثمانی سیاست کے متعلق لکھتے رہے اور انگریزی سیاست پر نقد و تبصرہ کرتے رہے۔ قیصر (زار روس) نے انہیں شرف زیارت بخشا اور مشرق سے متعلق بہت سے سوالات کرتا رہا، شاہ ایران سے اختلافات کی نوعیت پوچھی۔

سیّد صاحبؒ نے جواب دیا کہ میں تو حکومت شوریٰ چاہتا ہوں۔ زار نے جواب دیا کہ اس معاملہ میں شاہ حق پر ہے۔ بھلا بادشاہ برداشت کر سکتا ہے کہ اس کے ملک کے دہقان اور کاشتکار نظم سلطنت پر قابض ہو جائیں۔

سیّد صاحبؒ نے جواب دیا کہ میرا تو عقیدہ ہے کہ اگر عوام مخلص دوست بن جائیں تو یہ اس سے بہتر ہوگا کہ وہ ہر وقت بادشاہ کے خلاف سازشوں میں مصروف رہ کر اس کے دشمن بن جائیں۔ زار کو یہ جواب پسند نہ آیا اور اُٹھ کھڑا ہوا اور سیّد صاحبؒ کو جانے کی اجازت دے دی۔

سیّد صاحبؒ نے ۱۸۸۶ء میں نمائش دیکھنے کی غرض سے پیرس کا رُخ کیا۔ راہ میں میونخ اُتر گئے تھے۔ وہاں شاہ ناصر الدین سے ان کی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ایران کی واپسی کے لئے کہا مگر سیّد صاحبؒ نے معذرت کر دی۔ شاہ نے اصلاحات کا وعدہ کیا سیّد صاحبؒ نے پہلے تو جواب دے دیا مگر بعد میں مان گئے۔

تہران پہنچے تو جمہور علماء اور عمائدین نے انہیں گھیر لیا۔ ملکی اصلاح کی باتیں ہونے لگیں، حکومت کے

شعبوں کی تنظیم، اقامت عدل اور قانون سازی کے چرچے ہونے لگے اور تحریک قوت پکڑنے لگی۔ شاہ ناصر الدین اصلاحی پروگرام کی طرف مائل تھے۔ سب کو فتح یابی کی اُمید تھی کہ اچانک مطلع ابر آلود ہو گیا۔

صدر اعظم نے شاہ کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ نمائندہ حکومت سے شاہانہ اختیارات کو دھچکہ لگے گا۔ یہ باتیں تو عوام کی سمجھ بوجھ سے باہر ہیں یہ وہی باتیں تھیں جو زمانۂ قیام مصر اور مدحت کے وقت ترکی میں بار ہا دہرائی گئی تھیں جس سے اصلاح کے حامیوں اور رجعت پسندوں میں نزاع برپا ہوئی تھی۔

جب شاہ ناصر الدین نے آنکھیں پھیر لیں تو سیّد صاحب نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے شاہ عبدالعظیم کے مزار کی پناہ لی۔ یہ مزار تہران سے بیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ ایرانیوں کی نظروں میں اس کو احترام حاصل ہے اور جو اس کی پناہ میں آجاتا ہے اسے مامون سمجھا جاتا ہے۔ اس مزار کو سیّد صاحبؒ نے اپنی اصلاحی دعوت کا مرکز بنا کر رائے عامّہ کو استوار کرنا شروع کر دیا۔ بعض علماء، وزراء اور فوجی افسر سیّد صاحبؒ کی تقریریں سننے جایا کرتے اور ان کے خیالات سے سرشار ہو کر واپس آتے تھے۔

سیّد صاحبؒ ایک مہینہ مزار میں ٹھہرے۔ ملک میں جوش و اضطراب بڑھتا گیا۔ اس سے شاہ اور ان کے حاشیہ برداروں کو خطرہ پیدا ہوا۔ اعلانات شائع ہونے لگے، شاہ کی خدمت میں گمنام خطوط پہنچنے لگے کہ یا تو وہ انصاف کرے یا تاج و تخت چھوڑ دے، نمائندہ حکومت قائم کرے یا علیٰحدہ ہو جائے۔

ایک دن اچانک پانچ سو مسلح سپاہیوں نے شاہ عبدالعظیم کے مزار کو گھیر لیا، سپاہیوں نے مزار کا احترام نہ کیا۔ سیّد صاحبؒ سخت بیمار تھے، اس گرفتاری کا حال اس طرح سناتے ہیں:

> ''سپاہی برف باری میں مجھے مزار سے گھسیٹتے ہوئے دارالحکومت لے گئے۔ میرے ساتھ ایسا ذلت آمیز برتاؤ کیا جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ پھر شاہ کے فوجی دستوں نے مجھے گھوڑے پر چڑھا کر خانقین بھیج دیا۔ یہ سخت سردی کا زمانہ تھا، برف گر رہی تھی اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔''

سیّد صاحبؒ خانقین سے بصرہ چلے گئے۔ اس حادثہ سے مرض میں اضافہ ہوتا گیا اور اگر اللہ تعالیٰ کا لطف شامل حال نہ ہوتا تو ان کا رشتۂ حیات منقطع ہو گیا ہوتا۔

بیماری کے علاوہ ان کو رسوائی کا بھی شدید احساس تھا۔ ان کے رنج اور صدمہ کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ حسب ونسب کے لحاظ سے اونچے تھے، دینداری، شرافت اور عقلمندی کی وجہ سے ممتاز تھے، بھلائی کے لئے آمادہ رہتے تھے۔ شاہ نے خود ان کو اصلاح کے سبز باغ دکھلا کر ایران آنے کی دعوت دی تھی۔ پھر اس نے سیّد صاحبؒ سے بھگوڑے غلام کا سلوک کیا اور تحقیر آمیز برتاؤ کیا۔ سیّد صاحبؒ نے بھی قسم کھالی کہ وہ سخت ترین انتقام لے کر رہیں گے اور جب تک اس کو تخت سے نہ اُتار دیں گے، چین سے نہ بیٹھیں گے۔

اب انہوں نے قسم پوری کرنے کی ٹھانی۔ انہوں نے مقبول عام علماء کو خط لکھے، شاہ کو بدترین صفات سے متصف کر کے انہیں اس کے خلاف بھڑکایا، قوم کے نقصان سے آگاہ کیا، ان کے دینی جذبات سے اپیل کر کے شاہ کی معزولی کی دعوت دی۔

شاہ ناصر الدین نے کسی انگریزی کمپنی سے تمباکو کے متعلق ٹھیکہ کر رکھا تھا۔ سیّد صاحبؒ نے موقعہ کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس ٹھیکہ کی ضرر رسانی ظاہر کی اور علماء کو قومی مفادات کی حفاظت کے لئے للکارا اس پر لوگ شاہ سے بگڑ گئے اور اس کے خلاف شورش برپا کر دی۔ شاہ نے مجبور ہو کر معاہدہ فسخ کر دیا اور نصف ملین لیرہ کمپنی کو ہرجانے میں دیے یہ پہلا انتقامی اقدام تھا۔

بیماری سے شفا پاتے ہی سیّد افغانی لندن چلے آئے اور بڑے نامی گرامی انگریز مدبروں سے ملاقات کر کے انہیں ایرانیوں کے مصائب سے آگاہ کیا جو وہ شاہ کے ہاتھوں جھیل رہے تھے۔ یہاں آکر وہ ایک رسالہ میں جس کا نام ''ضیاء الخافقین'' تھا اور انگریزی اور عربی میں نکلتا تھا، سیّد الحسینی کے نام سے مضامین لکھنے لگے۔

ان مضامین میں شاہ کی حکومت کی بُرائیاں، محکموں کی بدانتظامی، رشوت کی گرم بازاری، لوگوں کے مصائب کا ذکر ہوتا، علماء کو برانگیختہ کیا جاتا کہ وہ شاہ سے عدم تعاون کا فتویٰ صادر کر دیں۔ سیّد صاحب علماء اور ان کی طاقت وقوت پر رطب اللسان رہتے اور شاہ اور اس کی حکومت کی بدترین الفاظ میں مذمت کرتے۔ یہ ان کے جلاوطنی کے مشاغل تھے۔

یہ سیّد جمال الدین افغانی کی بڑی بھاری لغزش تھی۔ اس کا باعث ان کا جذبۂ انتقام تھا۔ حیرت ہے

کہ انہوں نے ایک اجنبی ملک میں ایک اسلامی ملک کی تشہیر کیسے جائز سمجھی جس سے اغیار کو دخل اندازی کا موقعہ ملتا تھا حالانکہ وہ العروۃ الوثقیٰ میں غیر ملکی مداخلت کی مذمت کر چکے تھے۔

ان سے تو مدحت پاشا با مروت نکلے۔ سلطان عبد المجید نے جب ان کو ملک بدر کیا اور سپاہی ان کو پکڑ کر جہاز میں لے گئے اور ان کو کسی چیز کے لے جانے اور اہل وعیال سے ملنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی تھی۔ لیکن انہوں نے یورپ میں قدم رکھتے ہی اپنی قوم کی حمایت شروع کر دی۔ یورپ میں ترکوں کی برتری جتلانے لگے اور سلطان عبد الحمید کی مذمت میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔

سچ بات یہ ہے کہ شاہ ناصر الدین کی مذمت میں سیّد جمال الدین کی گرم مزاجی کو بڑا دخل ہے۔ ایرانی سفیر نے بھی ان کو طعن و تشنیع سے روکنا چاہا۔ اس کے لئے بھاری رقم بھی پیش کی۔ سیّد صاحبؒ نے جواب دیا کہ میں تا قیامت اس سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔

بعض اسباب سے مجبور ہو کر سلطان عبد الحمید نے سیّد صاحبؒ کو آستانہ آنے کی دعوت دی۔ اس کو ڈر تھا کہ وہ نوجوان ترکوں سے مل کر اس کے مدمقابل نہ بن جائیں، سیّد صاحبؒ پیرس میں اس جمعیت کے بعض ارکان سے ملے تھے۔ ان کا طریق کار انہیں بے حد پسند آیا تھا اور وہ ان کی ہمت افزائی کیا کرتے تھے اس جمعیت کا نام ''جمعیت الصالحۃ'' تھا۔ سلطان کے کان میں اس کی بھنک پڑ چکی تھی۔ اس کے علاوہ شاہ ناصر الدین نے سلطان کو بیچ میں ڈالا کہ وہ سیّد جمال الدین کو اس کی توہین سے روکے۔ لہٰذا سلطان عبد الحمید نے سیّد صاحبؒ کو آستانہ (قسطنطنیہ) آنے کی دعوت دی۔ پہلے تو سیّد صاحبؒ نے انکار کیا لیکن جب سلطان نے ان کی اصلاحی دعوت پر عمل درآمد کرنے کی اُمید دلائی تو وہ مان گئے۔

آستانہ میں قدم رکھتے ہی ان کو معلوم ہوا کہ وہ سنہری پنجرہ میں قید کر لئے گئے ہیں۔ سلطان نے پہلے تو وعدہ کیا تھا کہ وہ جب چاہیں جا سکتے ہیں لیکن بعد میں یہ سب دھوکہ ثابت ہوا۔

سلطان عبد الحمید کے حکم سے آستانہ میں ان کا شاہانہ استقبال ہوا۔ ۷۵ پونڈ کا وظیفہ ان کی گذران کے لئے منظور ہوا۔ یلدوز کے نزدیک ہی ایک بڑے عالیشان مکان میں ٹھہرائے گئے، سیر کے لئے گاڑی مرحمت ہوئی، نوکر چاکر خدمت میں متعین ہوئے، ان میں بعض جاسوسی بھی کرتے تھے غرضیکہ ان کو ہر طرح آرام و

آسائش بہم پہنچایا گیا۔

سیّد صاحبؒ کو فریب دیا گیا کہ وہ سلطان کی مدد سے اپنی دعوتی اصلاح کا دائرۂ وسیع کر سکیں گے جس میں جامعہ اسلامیہ کا قیام بھی شامل ہوگا۔ اس سے ایران، افغانستان، ترکیہ اور اس کے عرب صوبوں کا وفاق قائم کیا جائے گا اس کے بعد دولت عثمانیہ کے نظم اور نظامِ تعلیم کی اصلاح کی باری آئے گی۔

سیّد صاحبؒ بھول گئے تھے کہ دولت عثمانیہ کی زمین شور ہے۔ اس میں اصلاحی دعوت کا کم بار آور نہیں ہوسکتا۔ وہ مدحت پاشا کے معاملہ سے بھی عبرت پذیر نہ ہو سکے تھے۔ عبدالحمید کے عہد کے اواخر میں جب شیخ محمد عبدہ سیّد صاحبؒ کی وفات کے بعد آستانہ آئے تو ان کے تاثرات یہ تھے کہ انہوں نے کسی جگہ بھی عقل و فکر و قلب کو زیادہ پراگندہ حال نہیں دیکھا جیسا کہ انہوں نے یہاں دیکھا ہے۔ علوم و افکار سے آستانہ بے بہرہ تھا۔ اگر ترک احرار وطن چھوڑ کر مسافری میں مارے مارے پھرتے ہیں اور ہر قسم کے مصائب ہنسی خوشی برداشت کر رہے ہیں تو وہ معذور ہیں۔ سلطان عبدالحمید نے قصر یلدوز میں سیّد صاحبؒ سے ملاقات کی تو ان کو حیرت ناک شخص پایا۔ وہ قول و فعل میں جری تھے۔ ایسا شخص اس نے اس سے قبل نہ دیکھا تھا۔ سلطان نے مشورہ دیا کہ وہ شاہ ناصرالدین کی توہین و تذلیل سے باز رہیں۔ سیّد صاحبؒ نے جواب دیا کہ میں آپ کی وجہ سے اس کو معاف کرتا ہوں۔ سلطان یہ سن کر حیرت میں آ گیا۔ اس وقت سیّد صاحبؒ تسبیح کے دانوں سے کھیل رہے تھے۔ سیّد صاحبؒ باہر نکلے تو اس فوجی افسر سے کہنے لگے کہ سلطان اپنے عوام کے مستقبل سے کھیلتا ہے۔ کیا جمال الدین کو ان کے حضور تسبیح کے دانوں سے کھیلنے کا بھی حق نہیں پہنچتا؟ فوجی نے یہ بات سنی تو ڈر کر بھاگ نکلا مبادا کوئی دوسرا ان کی گفتگو سن لے۔

انہوں نے سلطان کے حضور دولت عثمانیہ کے لئے نمائندہ حکومت کی تجویز پیش کی۔ سلطان نے ہر ممکن امداد کا یقین دلایا۔ سیّد صاحبؒ بھی یہ سن کر خوش ہوئے اور سلطان کے ساتھ مل کر جامعہ اسلامیہ کے قیام کی تجویز پر اتفاق ہوا۔ سلطان نے شیخ الاسلام کا منصب پیش کیا، سیّد صاحبؒ نے معذرت کر دی اور کہا کہ پہلے نظام اساسی کو درست کیا جائے۔

سلطان سے بار دیگر ملاقات اور بات چیت کی اور سلطان عبدالحمید کے متعلق یہ تاثر لے کر اُٹھے کہ وہ

ذہین اور یورپی سیاست اور اس کی چالوں سے باخبر ہیں۔ایک ملک کو دوسرے ملک سے لڑانے میں مہارت رکھتے ہیں، ساتھ ہی ڈرپوک ہیں جس سے ان کی ذہانت اور واقفیت احوال کو نقصان پہنچا ہے۔اس اثناء میں سلطان کی نوازشات سیّد صاحبؒ کے شامل حال رہیں۔سیّد صاحبؒ ملاقات کو جاتے اور اصلاح کا مشورہ دیتے تھے۔

ایک دفعہ سلطان سے کہنے لگے:

''اپنے دادا سلطان محمود کا حزم اختیار کریں، اپنے خائن حاشیہ نشینوں کو باہر نکال دیں جو آپ کو حقائق احوال سے بے خبر رکھتے ہیں۔حجاب کم کردیں، عوام کے سامنے کھل کر بیٹھیں اس سے بددیانتوں کا قلع قمع ہوگا۔میرے اعتقاد میں سب سے بہتر محافظ موت ہے۔''

قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہُ لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ اِذَا جَاءَ اَجَلُھُمْ فَلَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ٥

ترجمہ: ''کہو میرے اختیار میں تو خود اپنا نفع ونقصان بھی نہیں۔سب کچھ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ہر اُمت کے لیے مہلت کی ایک مدت ہے جب یہ مدت پوری ہوجاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم وتاخیر بھی نہیں ہوتی۔'' (۴۱)

یہ سب باتیں پادر ہوا ہوئیں۔آستانہ میں ان کا ایک جانی دشمن ڈھونڈ کر نکالا گیا۔یہ ابوالعدیٰ الصیادی تھا، حیلہ ومکر اور دسیسہ کاری میں ماہر اور سلطان کے مزاج میں دخیل تھا، جس سے جمال الدین کا اخلاص اور خیر خواہی بے نتیجہ ثابت ہوئی۔اس نے سیّد جمال الدین اور سلطان کے درمیان ناچاقی پیدا کردی اس سے اصلاح کی آخری اُمید بھی جاتی رہی۔سیّد صاحبؒ اپنی نجی گفتگو میں کہنے لگے کہ سلطان تو دولت عثمانیہ کے پھیپھڑے میں ناسور ہیں۔

آستانہ میں ان کی اقامت کی مدت چار سال اور ایک ماہ تھی۔اس عرصہ کی اہمیت ان کے بعض ارشادات وآراء کی بناء پر ہے جن سے ان کے ملنے والے شادکام ہوا کرتے تھے یا پھر ان دسیسہ کاریوں کی

بدولت ہے جن کا پردہ چاک کرنے میں وہ مصروف رہا کرتے تھے۔

اس زمانہ کا فکری ورثہ سیّد صاحبؒ کے لطف آمیز باتیں تھیں جو سننے والوں کے دلوں میں ملکی اصلاح کا داعیہ پیدا کرنا تھا۔ کبھی کبھی ان پر غم وحزن کے آثار ظاہر ہونے لگتے۔ زمانہ ماضی میں جدوجہد کر کے انہوں نے مسلمان قوموں کو متحد ہونے کی دعوت دی تھی لیکن کسی کی رگِ حمیت نہ پھڑکی۔ بہت سے لوگوں سے انہوں نے اُمید وفا باندھی تھی لیکن وہ غدار ثابت ہوئے۔ شاہوں اور خانوں نے ان سے بدعہدی کی۔ اخبار بند ہو گئے۔ یہ تمام زندگی جو انہوں نے مسلسل جہاد، غریب الوطنی، قید و بند، سوچ بچار، لکھنے پڑھنے اور لوگوں کو بیدار کرنے میں گذاری تھی اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوا؟ اب وہ چڑیا گھر کے شیر تھے اور اپنی آزادی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے حالانکہ اس سے قبل وہ تمام مسلمان قوموں کی آزادی کے جویا تھے اور اس کے حاصل کرنے کی اُمید رکھتے تھے۔

امیر شکیب ارسلان نے ان سے ملاقات کی اور گفتگو عربوں کے بحر اطلانطک عبور کرنے اور امریکہ کے اکتشاف پر ہونے لگی۔ سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ اب تو مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ کسی شخص نے ان سے کہا کہ تم بنی آدم بن جاؤ۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے آباء واجداد ایسے ایسے تھے۔ یہ اپنے اسلاف کے کارناموں کے خیال میں مگن رہتے ہیں اور یہ خیال نہیں کرتے کہ اگر ان کے آباء واجداد بلند مرتبہ تھے تو ان سے گمنامی اور پستی کا دھبہ کیسے دور ہو سکتا ہے؟ جب مشرقی قومیں موجودہ پستی کے جواب میں کچھ کہنا چاہتی ہیں تو اپنے اسلاف کے کارناموں کو پیش کر دیتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ تمہارے بزرگ ایسے ہی تھے لیکن تم کیا ہو؟ جب تلک تم ان جیسے کام نہ کرلو تمہارے لئے ان کے مفاخر کی یاد نازیبا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَا کَسَبْتُمْ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا کَانُوْ یَعْمَلُوْنَo

ترجمہ: ''وہ کچھ لوگ تھے جو گذر چکے۔ ان کی کمائی ان کے لیے تھی اور تمھاری کمائی تمھارے لیے۔ تم سے ان کے اعمال کے متعلق سوال نہیں ہوگا۔'' (۴۲)

''اب مسلمان پست ہمت ہیں، ان کے عزائم خوابیدہ ہیں، ان کے ولولے سرد ہو چکے ہیں اگر کوئی چیز باقی ماندہ ہے تو وہ ان کی نفس پرستی ہے۔ محمود سامی البارودی بہترین مسلمان ہے لیکن اس نے بھی میرے ساتھ عہد کر کے بدعہدی کی۔ اُمید ہے کہ یاس و حرماں کے یہ بادل چھٹ جائیں گے، مشرق اور مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا ہوگی، بیماری کی تشخیص کے بعد اس کا علاج کیا جائے گا اور شفایابی کی اُمید بندھے گی جیسا کہ علاج کے وقت نفس انسانی اُمید و بیم اور خوشی و غم کی کشمکش سے دوچار رہتا ہے یا بادل کے گرجنے اور کڑکنے کے بعد سورج نکل آتا ہے۔'' (۴۳)

سیّد صاحبؒ اپنے رفقاء کے ساتھ مشرقی اقوام کی بیماری کی تشخیص اور علاج بتلانے میں مصروف رہا کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ:

''اس کا علاج مغربیوں کی طرح آبرومندانہ زندگی گذارنا ہے جیسا کہ ایک عرب شاعر نے کہا ہے:

**عش عزیزاً او مت و انت کریم (۴۴)**

ترجمہ: ''نیک نامی کی زندگی بسر کرو اور مرو تو تمام لوگ تمہارے مدح خواں ہوں۔''

چونکہ ابھی اس کا حصول مشکل سا نظر آتا ہے لہذا جدید نسل کی صحیح دینی تربیت کرنی چاہئے۔ یہ کام اُن لوگوں کے سپرد کرنا چاہئے جو قسم کھالیں کہ وہ کبھی بھی کسی سلطان کے دروازے پر نہ جائیں گے، انقلاباتِ زمانہ سے ہراساں نہ ہوں گے، کوئی دھمکی ان کو ان کے عزائم سے باز نہ رکھ سکے گی اور نہ کسی منصب و جاہ کے وعدے پر وہ فریفتہ ہوں گے، کسی قسم کا کسب یا تجارت ان کو ان کے نصب العین سے نہ ہٹا سکے گی بلکہ وطن کی آزادی کے لئے ہر قسم کی تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کریں گے۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا یہ سب کچھ ممکن ہے تو فرمایا کہ:

''استقلال سے ہمت پیدا ہوتی ہے، تنگی کے بعد کشائش کی اُمید رکھی جا سکتی ہے۔ طلوع فجر سخت اندھیرے کے بعد ہوا کرتا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ مشرق پر مصائب کی جو کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے، پو پھٹنے سے چھٹ جائے گی۔ اس عالم میں یہی فطری

قانون ہے کہ تنگی کے بعد کشائش ہوتی ہے۔''

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۝

ترجمہ: ''پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔''(۴۵)

مجلس میں اس خطرے کا ذکر بھی چل نکلا جو بعض مغربی اقوام کی طرف سے کئی قومی زبانوں کے رائج کرنے اور قومی تعلیم سے تغافل کے باعث درپیش ہے۔ اہل مغرب مشرقی قوموں کو ان کے آداب سے متنفر کر کے اپنی زبانوں اور ادب کو رواج دے رہے ہیں۔

سیّد صاحبؒ نے فرمایا:

''قوم کا بندھن تو اس کی قومی زبان ہوتی ہے اور جس قوم کی قومی زبان نہ ہو اس کا کوئی ادب نہیں ہوتا اور جس کی کوئی تاریخ نہ ہو اس کی عزت و وقعت نہیں ہوتی۔ تاریخ قوم کے اکابر و اعاظم رجال کے تاثر کی یاد سے بنتی ہے تا کہ ان کی پیروی کی جائے۔''

سیّد صاحبؒ کی ان مجالس میں موضوعِ سخن مناسب احوال سے پیدا ہوتا جن کا مقصد عقیدہ، اجتماع اور زبان کی اصلاح ہوا کرتا۔

کبھی ابوالہدیٰ الصیادی کی مکاری سے سلطان غضب ناک ہو جاتا۔ خدیو عباس سلطان کی ملاقات کے لئے آستانہ آتے اور جمال الدین سے بھی ملنا چاہتے جو سلطان کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔ سلطان انکار کر دیتا تو سیّد جمال الدین خدیو کے قاصد کو کہہ دیتے کہ میں تو سلطان کا مہمان بھی ہوں اور قیدی بھی۔ ہر روز ہوا خوری کے لئے کاغذ خانہ کی طرف جایا کرتا ہوں اگر خدیو مصر وہاں ملنا چاہیں تو مل سکتے ہیں۔

خدیو مصر نے وہاں جا کر تخلیہ میں ملاقات کی اور ان کی بہت کچھ مدح و ستائش کی اور بڑی اچھی طرح سے پیش آئے۔ جاسوسوں کو موقعہ ملا تو انہوں نے مختلف افواہیں پھیلا دیں کہ سیّد جمال الدین نے خدیو عباس سے معاہدہ کر لیا ہے کہ وہ دونوں مل کر دولت عباسیہ قائم کریں گے۔ انہوں نے شعر بھی گھڑ کر سیّد جمال الدین

سے منسوب کر دیے۔

سلطان نے سیّد صاحب کو بلایا اور حقیقت حال پوچھی۔ سیّد صاحب نے جواب دیا کہ معاملہ تو صاف ہے، میں نے بات بھی لکھ رکھی ہے، ہم دونوں تھے اور کوئی تیسرا نہ تھا تو کس نے یہ بات سن لی؟ اگر یہ صحیح ہوگی تو میں نے کہی ہوگی یا عباس نے۔ پھر آپ نے قسم کھائی کہ اس قسم کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا، نہ انہوں نے عمر بھر بیت بازی کی ہے۔ اس طرح ظاہر میں یہ معاملہ بڑے شور و شر کے بعد ختم ہو گیا۔

اس زمانے میں اتفاق سے شاہ ناصر الدین کو قتل کر دیا گیا۔ شاہ اور سیّد صاحبؒ کے درمیان مخاصمت چل رہی تھی۔ اتفاق سے شاہ کا قاتل سیّد صاحبؒ کا شاگرد تھا اور ان سے ملنے آستانہ آیا کرتا تھا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب اس نے نیزہ مارا تو کہا کہ: یہ ہاتھ تو جمال الدین کا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب انہیں قتل کی خبر ملی تو اظہارِ پسندیدگی کیا۔ اس سے سلطان عبدالحمید ڈر گیا اور اپنی زندگی کو خطرہ میں محسوس کیا اور لوگوں کو سیّد صاحبؒ سے ملنے کے لئے اجازت کی شرط لگا دی۔

سیّد جمال الدین بھر گئے اور آستانہ چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے، انگریزی سفارت خانہ نے انہیں پاسپورٹ دینے کا بھی وعدہ کر لیا لیکن سلطان ان کے باہر جانے سے ڈرتا تھا بہ نسبت ملک میں رہنے کے۔ کیونکہ اندرون ملک میں سیّد صاحبؒ اس کی نظروں کے سامنے تھے اور سلطان ان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھ سکتا تھا۔ آخر کار سلطان نے انہیں راضی کر لیا اور ایک غیر ملکی حکومت سے مدد مانگنے کی عار دلائی، سیّد جمال الدین مان گئے۔ جب سیّد صاحبؒ نے سرطان کے عارضہ سے وفات پائی تو سلطان کی مشکل بھی حل ہو گئی۔ ان کی موت پر مختلف افواہیں پھیلی تھیں کہ ان کے علاج سے قصداً اغماض کیا گیا اور سرکاری ڈاکٹر کی مدد سے ان سے چھٹکارا حاصل کیا گیا۔

اسباب خواہ کچھ رہے ہوں انہوں نے وفات پائی، ان کے جنازہ کے ساتھ گنتی کے چند آدمی تھے جو جری اور وفادار تھے۔ انہیں عام آدمیوں جیسا کفن دفن دیا گیا اور مملکتِ عثمانیہ میں تمام اخبارات کو ان کی یاد سے روک دیا گیا۔

''سیّد صاحبؒ کی کیا تعلیمات تھیں؟ اور ان کی اجمالی غرض کیا تھی؟ مسٹر لوتھروپ سٹوڈرڈ

(LOTHROP STODDARD) نے لکھا ہے کہ سیّد جمال الدین کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ مغرب مشرق کا دشمن ہے اور آج بھی صلیبی رُوح یورپ کے سینہ میں کام کر رہی ہے جس طرح پیٹرز راہب کے وقت مصروف کار تھی۔ مغربی عناصر میں تعصب جاری و ساری ہے جو ہر طریقہ سے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کی تحریکات کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ دریں حالات عالم اسلام پر واجب ہے کہ اپنی بقا کے لئے متحد ہو جائے اور اس کے لئے لازم ہے کہ جن وسائل سے مغرب نے ترقی اور تفوق حاصل کیا ہے ان پر قبضہ کر لیا جائے۔"(۴۶)

"بقول براؤن سیّد جمال الدین فلاسفر، منشی، خطیب اور صحافی تھے۔ سب سے بڑھ کر سیاست دان تھے۔ ان کے مداح ان کو وطن پرست اور دشمن ان کو انتشار پسند سمجھتے ہیں۔ دول اسلام کے نظام حکومت کی اصلاح کے لئے جو کوششیں ان دس سالوں میں ہوئی ہیں ان سب میں ان کا اثر موجود ہے۔ ان کی کوشش تھی کہ تمام ممالکِ اسلامیہ یورپ کے چنگل سے آزاد ہو جائیں اور منظّم حکموں کی بدولت داخلی معاملات میں ترقی کریں۔ ان کا نصب العین بشمول شیعی ایران جامعہ اسلامیہ کا قیام تھا تا کہ اس اتحاد سے عالم اسلام کے معاملات میں یورپ کی مداخلت کا سدباب ہو سکے۔"

سیّد جمال الدین خود اپنے متعلق لکھتے ہیں:

> "میں نے فکر و نظر کی پراگندگی دور کر کے مشرق اور اہل مشرق کی طرف نظر کی تو دیکھا کہ افغانستان میرا مرز و بوم ہے، ہندوستان نے مجھے ثقافتِ علمی سے بہرہ مند کیا ہے، ایران ہمارے قرب میں ہے اور اس سے روابط ہیں۔ جزیرہ عرب میں حجاز مہبط وحی ہے، اسی طرح یمن، نجد، عراق، بغداد، شام اور اندلس وغیرہ کا حال ہے۔ مشرق مشرق ہی ہے۔ میں نے اپنی تمام دفاعی صلاحیتیں ان کے مرض کی تشخیص اور دوا کی تلاش میں صرف کر دیں مجھے معلوم ہوا کہ سارے امراض کی جڑ نا اتفاقی اور افکار کی پراگندگی ہے۔ وہ اتحاد کے مخالف اور مخالفت کے لئے متحد ہیں۔ میں نے انہیں ایک رشتہ میں پرونا چاہا اور مغربی خطرہ سے انہیں متنبہ کیا۔"(۴۷)

ان کے تمام افکار کا مرکز ان کا سیاسی مقصد تھا جس کے لئے عمر بھر ساعی رہے۔ انہوں نے جو تکالیف برداشت کیں اسی راہ نوردی کی پیداوار تھیں۔ وہ دول اسلام کو اپنے فرائض و واجبات سے آگاہ کر کے انہیں بام رفعت تک پہنچانا چاہتے تھے تا کہ (زندگی کی دوڑ میں) وہ باعزت قوموں سے پیچھے نہ رہیں، ایک ملک دوسرے ملک کا پشت پناہ ہوگا تو اسلام کو دوبارہ شان وشوکت اور دین حنیف کو بزرگی حاصل ہوگی اور بلاد مشرق سے برطانوی سایہ مٹ کر رہے گا۔

تمام لوگ متفق ہیں کہ ان کے دو واضح اغراض تھے:

۱۔ مشرق کے مردہ جسم میں بیداری کی رُوح پھونکنا تا کہ وہ ثقافتی، علمی، تربیتی اور دینی صفائی کے لحاظ سے ترقی کرے اور خرافات سے اپنے عقائد اور اخلاق کو پاک کرے اس سے اس کو دوبارہ عزت اور شرف حاصل ہو۔

۲۔ اجنبی قبضہ کی مخالفت تا کہ بلاد مشرق کو آزادی حاصل ہو اور وہ ایک دوسرے سے مربوط ہو کر رہیں۔ اس سے خطرات ٹلیں گے۔

زندگی بھر وہ دونوں دعوتوں کے علمبردار بنے رہے۔ جب انہوں نے وفات پائی تو ان اعلام کو بعد کے مصلحین نے تھام لیا۔ کسی نے ایک علم اُٹھایا تو دوسرے نے دوسرے علم کو تھاما۔ یہ دونوں علم ایک ذات میں جمع نہ ہو سکے۔ مثلاً محمد عبدہ نے جو ان کے سب سے بڑے اور قابل شاگرد تھے، ثقافتی علم اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، سیاست سے وہ تہی دست تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ العروۃ الوثقیٰ میں سیاسی مباحث پر سیّد جمال الدین کے کہنے سے خامہ فرسائی کرتے تھے۔ اسی واسطے انہوں نے سیّد صاحبؒ کی خدمت میں گذارش کی تھی کہ وہ اخبار چھوڑ کر ایک مدرسہ قائم کریں۔

جب محمد عبدہ خود مختار ہوئے تو انہوں نے بیروت میں اپنے آپ کو خاص علمی سرگرمیوں کے لئے وقف کر دیا۔ جب مصر واپس آئے تو ان کے پروگرام میں تعلیم اور ثقافت وسیع معنوں میں شامل تھی۔ ارباب بست و کشاد سے چاہا تھا کہ وہ انہیں دار العلوم کا نگران یا اُستاد مقرر کر دیں لیکن وہ لوگ ان کے سابقہ کردار کی وجہ سے ان سے خائف تھے۔ حکومت نے ان کو قاضی مقرر کر دیا تا کہ ان سے کسی قسم کا خدشہ نہ رہے۔

شیخ محمد عبدہ ببانگ دہل یہ اعلان کرتے رہے کہ مصلح پر واجب ہے کہ سب سے پہلے قوم کو مہذب اور تعلیم یافتہ بنائے جس کا نتیجہ آزادی ہوگا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے تعلیمی پروگرام کے نفاذ کے لئے انگریزوں سے تعاون کیا اور ان سے راہ رسم پیدا کی اور اندرونی ثقافت کی اصلاح کے لئے ان کی امداد کے طالب ہوئے۔ بس یہی وجہ مخاصمت تھی جو ان کے اور مصطفیٰ کامل کے مابین تھی۔

بعض دفعہ اسی وجہ سے شیخ محمد عبدہ اور سیّد جمال الدین کے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہو جاتا تھا۔ سیّد صاحبؒ جب آستانہ میں تھے تو شیخ محمد عبدہ نے ایک گُمنام خط لکھا تھا جس میں بعض اشخاص کے متعلق اشارے وکنائے سے کام لیا تھا لیکن ان کا نام نہیں لکھا تھا۔ اس سے سیّد صاحبؒ برافروختہ ہو گئے اور شیخ محمد عبدہ کو گرم گرم جواب دیا جس میں ان کو بزدلی پر توبیخ کی تھی۔

لکھتے ہیں:

''تم خط کو معمہ بنا کر لکھتے ہو شاید تم موت کو دیکھ رہے ہو اس سے خوف تمہیں نجات نہ دے گا۔ عالم کو فیلسوف کی نظر سے دیکھو اور خوف زدہ بچہ نہ بنو۔'' (۴۸)

غالباً یہ ان کی آخری خط وکتابت تھی۔ شیخ محمد عبدہ بزدل نہ تھے لیکن شعلۂ نوا، جسم معتدل کو ٹھنڈا محسوس کرتا ہے۔ سیّد صاحبؒ نے یہ جواب جو لکھا تو معلوم ہوتا ہے کہ ان پر حدت مزاج طاری تھی۔ بہرحال شیخ محمد عبدہ نے اپنے لئے ایک پروگرام بنالیا تھا اور اس پر کفایت کر کے بیٹھ گئے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے امکان بھر جدوجہد کی اور صحت، عقل اور مال کی بازی لگا دی اور امکان بھر دینی ثقافت کی پرورش اور اس کے اصلاح میں لگے رہے۔

جن لوگوں نے سیاسی علم اُٹھایا ان میں عبداللہ ندیم، مصطفیٰ کامل، فرید اور سعد زغلول کا نام آتا ہے۔ وہ سیّد صاحبؒ کے نشانِ راہ پر چلتے اور مغرب کے جدید ترین اسالیب اور وسائل سے کام لیتے رہے۔

مصر کی طرح سارے مشرقی ممالک کا ایسا ہی حال تھا۔ کسی نے اصلاحی اور ثقافتی علم کو تھاما تو کسی نے سیاسی کو۔ اگر سیّد صاحبؒ آج آنکھیں کھول سکیں تو مشرق کے حالات دیکھ کر اس کی تعریف کریں گے گمان غالب یہی ہے۔ وہ سُست گامی سے غضبناک رہا کرتے تھے، مزاج کے گرم تھے، اصلاحی دعوت کی سست

رفتاری سے نالاں تھے، انہیں تو برق رفتاری پسند تھی، بعض دفعہ یہی عجلت پسندی ناکامی کا سبب بن گئی تھی۔ سیّد جمال الدین جرأت سے آگے بڑھنے والے تھے اور موت کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ بعض اوقات فطانت جس چیز کو بلند کرتی ہے حدت مزاج اس کو گرا دیتی ہے۔

وہ سب سے زیادہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم ؓ سے مشابہ تھے نہ کہ حضرت امیر معاویہ ؓ سے۔ حضرت امیر معاویہ ؓ کی سیاسی زندگی کا عنوان تھا کہ ہم باطل کی راہ سے سچائی کی منزل تک پہنچیں گے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم ؓ صرف سچائی کی راہ سے منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہتے تھے وگرنہ نہیں۔ سیّد جمال الدین بھی ان کے نشانِ راہ پر چل رہے تھے۔

شیخ محمد عبدہ کہتے ہیں کہ:

> ''اگر وہ ابوالہدیٰ الصیادی کو سلطان سے کہہ کر پانچ سو پونڈ دلا دیتے یا اس کے لڑکے یا لڑکی کا وظیفہ مقرر کرا دیتے تو ان کا کیا بگڑتا؟ اس سے ان کو اصلاحی پروگرام کے نفاذ میں مدد ملتی۔ ابوالہدیٰ چاہتا تھا کہ اگر سیّد صاحبؒ اس کی موافقت نہ کریں تو اس کی مخالفت بھی نہ کریں لیکن سیّد صاحبؒ کیسے صبر کر سکتے تھے؟ وہ تو ابو الہدیٰ کو کمینہ اور مکار سمجھ رہے تھے۔''

جب سیّد صاحبؒ نے اپنے خاص احباب کو بتلایا کہ خدیو عباس کے بارے میں انہوں نے سلطان کی غلط فہمی دور کر دی ہے اور ان پر واضح کر دیا ہے کہ سب کچھ ابوالہدیٰ کی شرارتوں اور فتنہ پردازیوں سے سلطان کو مطلع کر دیتے۔ اس پر سیّد صاحبؒ غضبناک ہو گئے اور کہا: پناہ بخدا میں منافق بننا نہیں چاہتا۔ بھلا میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں جسے خود ناپسند کرتا ہوں۔ میں طعنہ باز اور چغل خور نہیں بننا چاہتا۔

اس طرح وہ سچائی کو منتہائے مقصود سمجھتے اور اس کے لئے سچائی کا وسیلہ ڈھونڈھتے۔ دنیا ہمیں بتلاتی ہے کہ حضرت امیر معاویہ ؓ کی سیاست کامیاب رہی ہے۔ دنیا کی سیاست کا مدار مصالحت پر رہا ہے۔ ایک چیز کے حصول کے لئے دوسری چیز سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ کامل حق کس کو ملا ہے؟ اس کی اعلیٰ مثال اخلاق میں ڈھونڈنی چاہئے نہ کہ سیاست میں یا اسے اس انتظار میں رہنا چاہئے کہ سیاست اخلاق کی

فرمانبردار بن جائے۔

سیّد صاحبؒ کے سوانح کا اہم باب ان پر الحاد کی تہمت ہے۔اس کی تاریخ کافی طویل ہے۔جب وہ پہلے پہل آستانہ گئے تھے تو انہیں الحاد سے متہم کیا گیا۔سیّد صاحبؒ نے دار الفنون میں ایک تقریر کی تھی جس میں کہا تھا کہ انسانی معیشت زندہ بدن کے مشابہ ہے۔تمام صنعتیں بمنزلہ عضو کے ہیں۔اسی طرح دماغ کا حال ہے، آہن گری بازو اور زراعت جگر کی مانند ہے۔جسم کی زندگی روح سے ہے اور معیشت انسانی کی رُوح نبوت اور حکمت ہے۔اس پر شور شغب برپا ہوا اور طعن وتشنیع کی گئی کہ آپ نبوت کو صناعت مانتے ہیں بالآخر آپ کو آستانہ سے نکلنے کا مشورہ دیا گیا۔

جب وہ مصر آئے تو شیخ علیش کی طرح بہت سے علماء نے انہیں ملحد کہا۔ان لوگوں کی نظر میں الحاد کا فتویٰ آسان شے تھا جو کوئی ان سا طور طریقہ اختیار نہ کرتا، ان جیسا لباس نہ پہنتا، سگریٹ پیتا، قہوہ خانے میں نشست و برخاست رکھتا، یہود و نصاریٰ اس کے ملنے والے ہوتے تو جھٹ اس پر الحاد کا فتویٰ جڑ دیتے۔ہر انسان کا اپنا اپنا عقیدہ ہوتا ہے اسی طرح اس کا تصوّر الحاد کے بارے میں اس کی ذہنی کیفیت کا مظہر ہوتا ہے۔

ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ:

”وہ علم الادیان کے ماہر تھے اور عالم کی قدامت کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ جراثیم فضا میں اڑ کر جرم سماوی تک پہنچتے ہیں لیکن ہمیں نظر نہیں آتے۔وغیرہ وغیرہ۔“

شیخ محمد عبدہ سلیم بک سے ملے اور بلا تحقیق و تصدیق اناپ شناپ لکھنے پر ملامت کی۔سلیم بک نے اخبارات میں اپنے خیالات سے رجوع کرتے ہوئے کہا:

شیخ محمد عبدہ نے مجھ سے مل کر بتایا ہے کہ یہ حسد کی کرشمہ سازیاں ہیں۔سیّد صاحبؒ مناظرہ کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کے معتقدات کھل کر بتلایا کرتے تھے اور پھر تردید کیا کرتے تھے۔شاید کسی نے کسی مناظرہ میں ایسی ویسی بات سن کر ان سے منسوب کردی ہو۔انہوں نے اپنے کانوں سے سیّد صاحبؒ سے ایسی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔وہ تو دین کی ضرورت، اسلام کی امتیازی خصوصیات اور الوہیت پر اعتقاد کے قائل تھے۔

سیّد صاحبؒ نے دین اسلام اور مسلمانوں کی حالت کا جو فرق بتلایا ہے وہ بالکل واضح ہے۔ خصوصاً انہوں نے رینان کے مقالہ میں نقص نکالا تھا کہ رینان نے اس مسئلہ پر بحث نہیں کی کہ یہ تمام تنزل اسلام کا پیدا کردہ ہے یا بعض مسلمان اقوام کے اخلاق سے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے اس میں ابہام پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے خیال میں دین اور علم کا دائرہ جدا جدا ہے اور اگر کسی دین کی علمی صحت ثابت ہے تو وہ علم کے خلاف نہیں ہوسکتا۔

سیّد صاحبؒ کے قریبی دوست شیخ محمد عبدہ بیان کرتے ہیں کہ:

سید صاحب مزاج کے لحاظ سے صوفی تھے۔ یہ عقیدہ ایک قسم کا مُبہم سا ہوتا ہے جو وحدت الوجود تک منتہی ہوتا ہے۔ خواص کو چھوڑ کر عوام اس کو الحاد سے ملتبس کر دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے شیخ محی الدین ابن عربی اور ان جیسے علماء پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے اقوال کی اچھی طرح تعبیر نہ ہوسکی۔

سیّد صاحبؒ تو عمر بھر دین اور توحید کی دعوت دیتے رہے۔ ان کے رسالہ ''الرد علی الدہرین''، ''العروۃ الوثقیٰ'' اور ''خاص مجالس'' میں ان چیزوں کا چرچا رہا کرتا تھا۔

ان کے بعض خاص احباب بیان کرتے ہیں کہ:

انہوں نے ایک بوڑھے شخص کو آنحضرت ﷺ کے متعلق ناشائستہ کلمہ منہ سے نکالتے ہوئے سُنا۔ انہوں نے اپنے ساتھی پٹھانوں کو اس کی مرمت کا حکم دیا انہوں نے مار مار کر اس کو باہر نکال دیا۔

سیّد جمال الدین کا عیب نفاق نہ تھا بلکہ ان کا سب سے بڑا عیب صاف گوئی تھا۔ وہ کسی چیز کو چھپا نہیں سکتے تھے، کہتے تھے کہ:

''کسی بشر میں کمال نسبی تب ہی پیدا ہوتا ہے جب وہ راز داری چھوڑ کر اعلان حق اختیار کرے۔''

ان کی زندگی کے مصائب بات کو صاف اور کھلے طور پر کہہ دیتے تھے۔ سیّد صاحبؒ جیسا انسان جوان اخلاق سے متصف تھا اگر ملحد ہوتا تو لوگوں کو بھی کھلے بندوں الحاق کی دعوت دیتا۔

وہ اُصولوں پر ایمان رکھتے تھے، فروع میں عقلی آزادی کے قائل تھے، وہ عجیب وغریب نتائج تک پہنچ جاتے تھے اس سے جامد انسان انہیں ملحد سمجھتے۔ وہ تقلید سے نفرت کرتے اور اجتہاد کے داعی تھے۔ ان کی مجلس

میں قاضی عیاض کا ذکر ہوتا اور روایت کرنے والے ان سے تمسک کرتے۔

سیّد صاحبؒ کہتے:

''سبحان اللہ قاضی عیاض نے جو کچھ کہا ہے بقدر اپنی عقل و سمجھ اور زمانہ کی ضروریات کے مطابق کہا ہے۔ کیا کسی دوسرے کو اس بات کی اجازت نہیں مل سکتی کہ وہ قاضی عیاض اور ان جیسے دیگر ائمہ سے زیادہ باصواب اور حق سے زیادہ قریب بات کہہ دے؟ اگر قاضی عیاض اور ان جیسے دوسرے ائمہ اپنے پیشرو صاحبان علم سے اختلاف کر سکتے ہیں اور اپنے زمانہ کی ضروریات کے لئے استنباط کر سکتے ہیں تو ہم اپنے زمانہ کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر کیوں نہ احکام مستنبط کر لیں۔''

اجتہاد کا دروازہ مسدود ہونے کے کیا معنی ہیں؟ یہ کس نص سے مسدود ہوا ہے؟ یا کس امام نے کہا ہے کہ میرے بعد دین کے فہم کے لئے اجتہاد کی ضرورت نہیں ہے اور قرآنِ کریم اور احادیث صحیحہ اور قیاس سے کام لے کر علوم عصریہ، ضریاتِ زمانہ اور احکام کی تطبیق کا کام نہیں کرنا چاہیئے۔

ائمہ اعلام نے اجتہاد کیا ہے اور خوب کیا ہے لیکن یہ اعتقاد رکھنا صحیح نہ ہوگا کہ انہوں نے قرآنِ کریم کے تمام اسرار کا احاطہ کر لیا تھا قرآنِ کریم کے علوم وفنون کے مقابلے میں ان کا اجتہاد سمندر کا ایک قطرہ ہے۔ فضل تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے۔

ان کی رائے تھی کہ اہل السنۃ اور شیعوں کے اختلاف بادشاہوں کی طمع اور عوام کی جہالت کی پیداوار ہیں۔ سب قرآن اور رسالتِ محمدی ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں تو اختلاف اور جدل وقتال کس واسطے ہے؟ یہ بھی کہتے تھے کہ دنیا کے تین بڑے مذہبوں کی اساس ایک ہی ہے صرف سودے باز، دنیا دار علماء نے اختلاف کی خلیج کو وسیع کیا ہے۔

اکثر اسلامی اشتراکیت کا مغربی اشتراکیت سے موازنہ کرتے اور کہتے:

''حاکموں کے جور وستم، مزدوروں کے حسد وبغض نے جو وہ امیروں سے روا رکھتے ہیں مغرب کی اشتراکیت کو جنم دیا ہے۔ اسلام کی اشتراکیت مذہب کے رگ وریشے میں

پیوست ہے، حسن خلق کے ساتھ مربوط ہے، بھلائی کا جذبہ اس کو حرکت میں لاتا ہے،
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے اعمال اس پر شاہد ناطق ہیں۔'' (۴۹)

ان کی مجالس میں مرد، عورت، بے حجابی اور پردہ وغیرہ کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ دیر تک گفتگو کرتے رہتے۔
ان کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک عقلی تکوین کا تعلق ہے مرد اور عورت برابر ہیں۔ مرد کا بھی سر ہوتا ہے اور عورت کا بھی اب ان میں جو جو تفاوت پیدا ہوا ہے وہ تربیت کا نتیجہ ہے۔ مرد کو کھلی چھٹی دے دی گئی اور عورت کو گھر اور بچوں کی پرورش پر لگا دیا گیا جو کہ مردوں کی نسبت اہم اور شریف ترین کام ہے۔ اگر کوئی مرد عورت کے ہر کام میں مساوات کا نعرہ لگائے تو وہ غلط کار ہے، ہر ایک کا وظیفہ کار جدا جدا ہے۔ ان دونوں کے تعاون سے معاشرے کا قیام ہے۔

اگر عورت کے لئے روزی کمانے والا نہ رہے تو وہ ظروف و احوال سے مجبور ہو کر باہر نکل کر کام کر سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ نیت خالص اور دامن پاک رہے پھر کہتے کہ:

''میرے نزدیک ننگے منہ پھرنے کی قید نہیں اگر فسق و فجور کا اندیشہ نہ ہو۔''

یہ بھی کہا کرتے تھے کہ صحیح دین حقائق علمیہ کا مخالف نہیں ہوسکتا اگر بظاہر مخالف ہوتا ہے تو اس کی تاویل واجب ہے. جو لوگ آج عالم بنے بیٹھے ہیں ان میں جہالت اور جمود کی فراوانی ہے۔ حتیٰ کہ قرآن پر زبان طعن دراز کی گئی کہ وہ ثابت شدہ علمی حقائق کا مخالف ہے حالانکہ قرآن ان سب باتوں سے بری ہے اور وہ تو علمِ حقیقی کی مخالفت نہیں کرتا خاص کر کلیات کے بارے میں۔

سیّد صاحبؒ باوجود وسعت نظر کے شبلی شمیل کے ملحدانہ نظریات کے سخت ناقد تھے جو مذہب ڈارون سے بھی تجاوز کر گئے تھے۔ اس کے ساتھ اس کے صبر و ثبات اور جرأت مندانہ قول کی وجہ سے اس کے مداح تھے۔ اس سبب سے بعض الزام دینے والے ان کو مالوف راستے سے ہٹا ہوا دیکھتے اور الحاد سے متہم کرتے۔

اس عالم کون و مکان کی یہی سنت رہی ہے کہ مصلحوں کو کفر و زندقہ اور جنون سے نوازا جاتا ہے۔ جو ان کی بھلائی کے درپے ہوتا ہے اسے ستایا جاتا ہے اور بالآخر اسے سعادت کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ اس کی خدمات کی صحیح قدر و قیمت اس کی موت کے بعد لگائی جاتی ہے اور زمانہ گذرنے پر اس کی دعوت

کی صحت واضح ہوتی ہے۔

ڈاکٹر امین مصری اپنی کتاب ''چند نامور مسلم شخصیات'' میں رقمطراز ہیں کہ:

''۱۹۲۸ء میں مجھے آستانہ (قسطنطنیہ) جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس وقت ان کی وفات پر ۳۱ برس گذر چکے تھے۔ میں نے واجب سمجھا کہ ان جیسے بڑے آدمی کی قبر کی زیارت سے شاد کام ہو کر ان کی عظمت اور اعلیٰ اعمال کے سلسلہ کو یاد کروں، بہت سے لوگوں سے ان کی قبر پوچھی تو کوئی بھی بتا نہ سکا۔ ایک پٹھان جو مکتبۂ شہید علی کا لائبریرین تھا اس نے جگہ بتلائی۔''

''میں اپنے دوست عبادی کو ساتھ لے کر بتاریخ ۸ جولائی ماچقہ گیا۔ باسفورس کے دروازہ کے پاس ایک ٹیلہ تھا جس پر قبرستان تھا۔ وہاں ایک فقیر نے شیخ کی تربت کی طرف رہنمائی کی۔ معلوم ہوا کہ ان کی قبر ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔ جن لوگوں کے لئے انہوں نے ساری عمر گنوائی تھی کسی نے بھی دھیان نہ دیا۔''

''ایک امریکی مستشرق ۱۹۲۶ء میں آستانہ آیا اور اس نے سیّد صاحبؒ کی قبر ڈھونڈ نکالی اور اس پر سنگ رخام کا مقبرہ تعمیر کرایا، اس کے اِرد گرد لوہے کا جنگلہ لگوایا، کتبہ پر سیّد صاحبؒ کا نام، تاریخ ولادت اور وفات کندہ ہے، دوسری طرف یہ مرقوم ہے:

''اس مزار کو مسلمانوں کے مخلص دوست مسٹر چالس کرین نے ۱۹۲۶ء میں تعمیر کرایا ہے۔'' ہم دیر تک ان کی قبر کے پاس ٹھہرے رہے۔'' (۵۰)

اس جگہ نفوس کو زندہ کرنے والے، عقلوں کو آزاد کرنے والے، دلوں کو گرمانے والے، قوموں کو بیدار کرنے والے، تاج و تخت کو ہلا ڈالنے والے جمال الدین محو خواب تھے۔ سلاطین ان کی عظمت سے غیرت کھاتے اور ان کی زبان اور رعب و داب سے ڈرتے تھے۔ بڑے بڑے لشکروں والی حکومتیں ان کی حرکت سے لرزہ براندام اور ان کی آزادی سے بڑے بڑے ممالک تنگ دل رہا کرتے تھے۔ جہاں بھی وہ گئے شعلہ جوالہ بن کر رہے۔ افغانستان ہو یا مصر، ایران ہو یا پیرس، لندن ہو یا آستانہ انہوں نے عربی اور ایرانی انقلاب

لی حم ریزی لی۔ اجنبی حکومتوں کے مقابلے پر تمام عالمِ اسلام کو آمادہ کیا اور اجتماعی اصلاحات کا مطالبہ کیا۔ مصر میں استبدادی حکومت سے ٹکر لی، ایران میں شاہ ناصرالدین کی مخالفت کی اور انگریزوں کی پیرس میں۔ جہالت، ناخواندگی اور ذلت کے خلاف مشرق میں اعلانِ جنگ کیا، جاسوسی اور نفاق کے خلاف آستانہ میں لڑے اور موت کے سوا کوئی چیز ان کو مغلوب نہ کر سکی۔ ہم نے ان کو جلیل القدر اور عظیم الشان راہنما سمجھا۔ ان کی یاد ہمارے دلوں کو گرماتی ہے ان کی موجودگی اور زندگی کا کیا کہنا!

جب سیّد صاحبؒ مصر آئے تو ماسونیوں (FREEMASONS) کا پروگرام جو حریت، اُخوت اور مساوات کی دعوت دیتا تھا ان کو بہت بھایا۔ سیّد صاحبؒ اس جماعت میں شامل ہو گئے۔ ایک ممبر کے لئے چندہ کا اعلان ہوا۔ سیّد صاحبؒ نے پوچھا کہ: کیا وہ مریض ہے؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا۔ پھر پوچھا: وہ صحیح الجسم ہے؟ جواب ملا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: بدنی صحت اور سوال کی ذلت ایک انسان میں کیسے جمع ہو سکتی ہے؟

جب سیّد صاحبؒ مصر سے نکالے گئے تو ان کے دوست سویز تک گئے اور بڑی رقم پیش کی۔ ان سے درخواست کی کہ وہ یہ رقم قرض کے طور پر قبول کرلیں۔ جواب دیا کہ تم کو اس مال کی زیادہ ضرورت ہے، شیر جہاں جائے گا اپنا شکار خود ڈھونڈ ھ لے گا۔

جب سلطان عبدالحمید نے ۱۸۹۲ء میں آستانہ آنے کی دعوت دی اور آپ وہاں گئے تو سلطانی خدام ان کے انتظار میں تھے۔ سیّد صاحبؒ سے پوچھا کہ آپ کے اسباب کے صندوق کہاں ہیں؟ فرمایا کہ میرے پاس سوائے کتابوں اور کپڑوں کے صندوق کے کوئی شے نہیں ہے۔ خادم نے پوچھا کہ آخر وہ کہاں ہیں؟ ہنسے لگے کہ کتابوں کا صندوق سینہ میں ہے اور کپڑوں کا صندوق یہ ہے (اپنی پیشانی کی طرف اشارہ کر کے بتلایا) سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ پہلے میں دوسرا جبہ ساتھ رکھتا تھا لیکن روز روز کی ملک بدری سے تنگ آ کر ایک ہی جبہ رکھتا ہوں۔ جب یہ پرانا ہو کر پھٹنے لگتا ہے تو دوسرا لے لیتا ہوں۔

سلطان عبدالحمید کے ہاں ان کی بکثرت آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ لوگوں نے اس کے متعلق رائے پوچھی تو کہا کہ اگر سلطان کا عصر حاضر کے چار ذہین ترین آدمیوں کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ذکاوت، چالاکی

اور سیاست کے لحاظ سے ان کا پلڑا بھاری رہے گا خصوصاً ہم جلیسوں کی تسخیر سے لہٰذا یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ وہ دول مغرب کی پیدا کردہ مشکلات سے عہدہ برآ ہو جاتے ہیں۔ ان کا بدترین دشمن بھی ان کی مجلس سے راضی اور مطمئن ہو کر نکلتا ہے چاہے وہ وزیر اور بادشاہ ہو یا امیر اور سفیر ہو لیکن ان میں ایک بڑا بھاری عیب ہے اور وہ بزدلی ہے۔

سلطان عبدالحمید نے شیخ الاسلام کا منصب پیش کیا تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ:

> ''جب تک نظام حاضر نہ بدلا جائے گا وہ اس رفیع منصب کو منظور نہیں کر سکتے۔ عالم دین کا فریضہ سرکاری عہدہ دار جیسا نہیں ہے بلکہ ارشاد و تعلیم ہے اس کے لیے تبحر علم کے ساتھ حسن عمل بھی ضروری ہے۔''

سیّد جمال الدین ساری عمر اہل و عیال کے جھنجھٹ سے آزاد رہے۔ اگر کوئی عیال کی کثرت اور آمدنی کی قلت کا رونا روتا تو بقدر استطاعت اس کی مدد کرتے۔ سلطان نے انہیں قصر یلدز کی خوبصورت لونڈی کا رشتہ پیش کیا تھا لیکن سیّد صاحبؒ نہ مانے۔

اس بارے میں ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ ابو العطا المصری کے ہم نوا ہیں؟ سیّد صاحبؒ نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں۔ ایک عقلمند آدمی شادی کو کیسے سنگین جرم خیال کر سکتا ہے جب کہ بقائے نوع اور دنیا کی بقاء کی حکمت کا انحصار اسی پر ہے۔ میں حقوق زوجیت اور اس کے تقاضوں سے آگاہ ہوں چونکہ میں ان فرائض کی بآوری سے اپنے آپ کو قاصر پاتا ہوں اس لیے تجرد کی زندگی گزار رہا ہوں۔

ایک یہودی ڈاکٹر ان کا دوست تھا۔ پوچھنے لگا کہ عدم عدل کی بناء پر طبیعت کی مخالفت ایک انسان کے لیے کیسے جائز ہو سکتی ہے؟

سیّد صاحبؒ مسکرائے اور کہا کہ:

> ''انسانی طبیعت تم سے زیادہ مضبوط ہے، وہ اپنے نفس کی نگہداشت کرتی رہتی ہے، آدمی ایک چیز کو چھوڑ کر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔''

آپ سے کہا گیا کہ آپ سلطانی تحائف اور ہدایا از قسم مال تو قبول کرتے ہیں لیکن ایک خوبصورت

باندی کا عطیہ کیا جانا کیوں نامنظور کر دیا؟ جواب دیا کہ:

''مال ومنال کا عطیہ دیا جاتا ہے میں اس کا بدلہ اُتار دیتا ہوں لیکن خوبصورت باندی کا بدلہ کیسے اُتار سکتا ہوں؟''

سیّد جمال الدین شیخ محمد عبدہ کی ذکاوت اور علم وفضل کے مداح تھے۔ انہیں ''صدیق الشیخ'' کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

سیّد عبداللہ ندیم عمر کے آخری ایّام میں سیّد جمال الدین کے ہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ کہنے لگے کہ آپ شیخ محمد عبدہ کا اتنا ذکر کرتے ہیں کہ گویا آپ کا کوئی دوسرا دوست نہیں ہے، آپ دوسروں کو ہمارا ساتھی اور ہمارا اشنا سا کہہ کر پکارتے ہیں۔ سیّد صاحبؒ مسکرائے اور کہا:

''عبداللہ تم بھی میرے دوست ہو لیکن تمہارے اور شیخ محمد عبدہ کے درمیان یہ فرق ہے کہ انہوں نے مشکل کے وقت میرا ساتھ دیا ہے اور تم نے حالت تونگری میں۔''

یہ سن کر عبداللہ ندیم چپ ہو گئے۔

سیّد جمال الدین ڈارون کے نظریہ تنازع للبقاء کا استہزاء کیا کرتے اور کہتے کہ مبدأ تو تنازع للفنا کا ہے۔ غیر فانی بقا کی طلب میں تو کوئی تنازع اور نزاع نہیں ہے۔ تنازع جو باقی ہے وہ فنا پذیر اشیاء کا ہے۔ متنزع، منازع اور منزوع سب ایک دن فنا ہونے والے ہیں لہٰذا تنازع للفنا کہنا زیادہ مناسب ہے۔

کہا گیا ہے کہ تمام متمدن عالم ایسی غلطی پر متحد ہو سکتا ہے؟ کہا کہ متمدن عالم کیا ہے؟ بڑے بڑے شہر ہیں، اُونچی اُونچی عمارت ہیں، عظیم الشان محلات ہیں، جن میں مختلف کیمیاوی اجزاء سے رنگا رنگ کا سوتی اور ریشمی کپڑا تیار ہوتا ہے۔ معدنیات کے ذخائر ہیں۔ تجارت پر قبضہ ہے جس سے دولت کی ریل پیل ہے۔ مہلک اور خوفناک ہتھیاروں کی تیاری میں ایک متمدن قوم دوسری قوم سے آگے بڑھنے کی کوشش میں ہے اس کے ماسوا اور کون سا متمدن عالم ہے؟

فرمایا:

''اگر ہم علمی ترقیوں اور ان سے حاصل شدہ خوبیوں اور عمدگیوں کو کئی گنا دگنا تگنا

کرکے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیں اور دوسرے میں جنگوں کی ہلاکت آفرینیوں کو تو علوم مدنیت اور تمدّن کا پلڑا جھک جائے گا تو معلوم ہوا کہ یہ ترقی، علم اور تمدّن جہل محض ہے اور حد درجہ کی وحشت ناکی ہے اور انسان حیوان سے بھی گرا ہوا نظر آتا ہے۔

کیا کسی نے سنا ہے کہ تین لاکھ سانپ ایک دوسرے کے آمنے سامنے آکر آپس میں لڑ مریں ہوں یا شیروں نے ایک صف میں کھڑے ہو کر ایک دوسرے کا گوشت نوچا اور خون پیا ہو؟ یہ کیسی تہذیب اور کہاں کا تمدّن ہے؟ بلکہ یہ تو جہالت اور وحشت ہے۔''

ان کے کئی حکیمانہ اقوال ہیں جو وہ مناسب مواقع پر کہا کرتے تھے:

- ''جب قسم کھاتے تو کہتے ''وعزۃ الحق وسر العدل''
- حقائق اوہام سے زائل نہیں ہوتے۔
- اگر انسان عمر کے تغیر اور بڑھاپے کو فضیلت سمجھے تو یہ اس کی نادانی ہے۔
- فخریہ قول کو عملی بزرگی باطل کر دیتی ہے۔
- طاقت کی ربوبیت پر ضعیف ہی ایمان لاسکتا ہے۔
- ہم عصر اہلِ علم دوست نہیں ہوا کرتے۔
- مقدمات کی طوالت نتائج کے سقیم ہونے کی دلیل ہے۔
- جو کسی جرم یا گناہ کے بغیر کسی بادشاہ کو ڈرائے تو وہ درویش ہے۔
- صاحب حاجت اگر اپنی حاجت کو بیان نہ کر سکے تو وہ گونگا ہے۔
- ہزار باتیں ایک عمل کے برابر نہیں ہو سکتیں۔
- صحت ضائع کرنا مال کے اسراف سے زیادہ ضرر رساں ہے۔
- تنگی اور دباؤ سے منتشر اجزاء متحد ہو جاتے ہیں۔

- خالی گنبد سے صرف صدا پیدا ہوتی ہے۔
- جاہل ڈینگیں مارے اور عقل مند چپ رہے تو سمجھو کہ زمانہ بُرا ہے۔
- مشرق کی ادیب کی زندگی دوبھر ہے، مرنے کے بعد اسے یاد کیا جاتا ہے۔
- عقلوں کا اوہام سے مقید ہونا ہتھکڑی سے زیادہ ذلت آمیز ہے۔
- مضبوط درخت دیر سے پھل دیتا ہے۔
- عربی زبان کو بدوؤں نے صحرا اور جنگلات میں وسعت دی ہے، شہریوں نے اسے تنگ دامن بنا رکھا ہے۔
- علم نوجوانوں میں بھی ہوسکتا ہے لیکن تجربہ صرف بوڑھوں کا ہوتا ہے۔" (۵۱)

پاکستان (انتظامی تقسیم)
100 0 100 200 300 400
چین
گلگت ایجنسی
جموں و کشمیر
(متنازعہ علاقہ)
ایران
جونا گڑھ و مناوادر
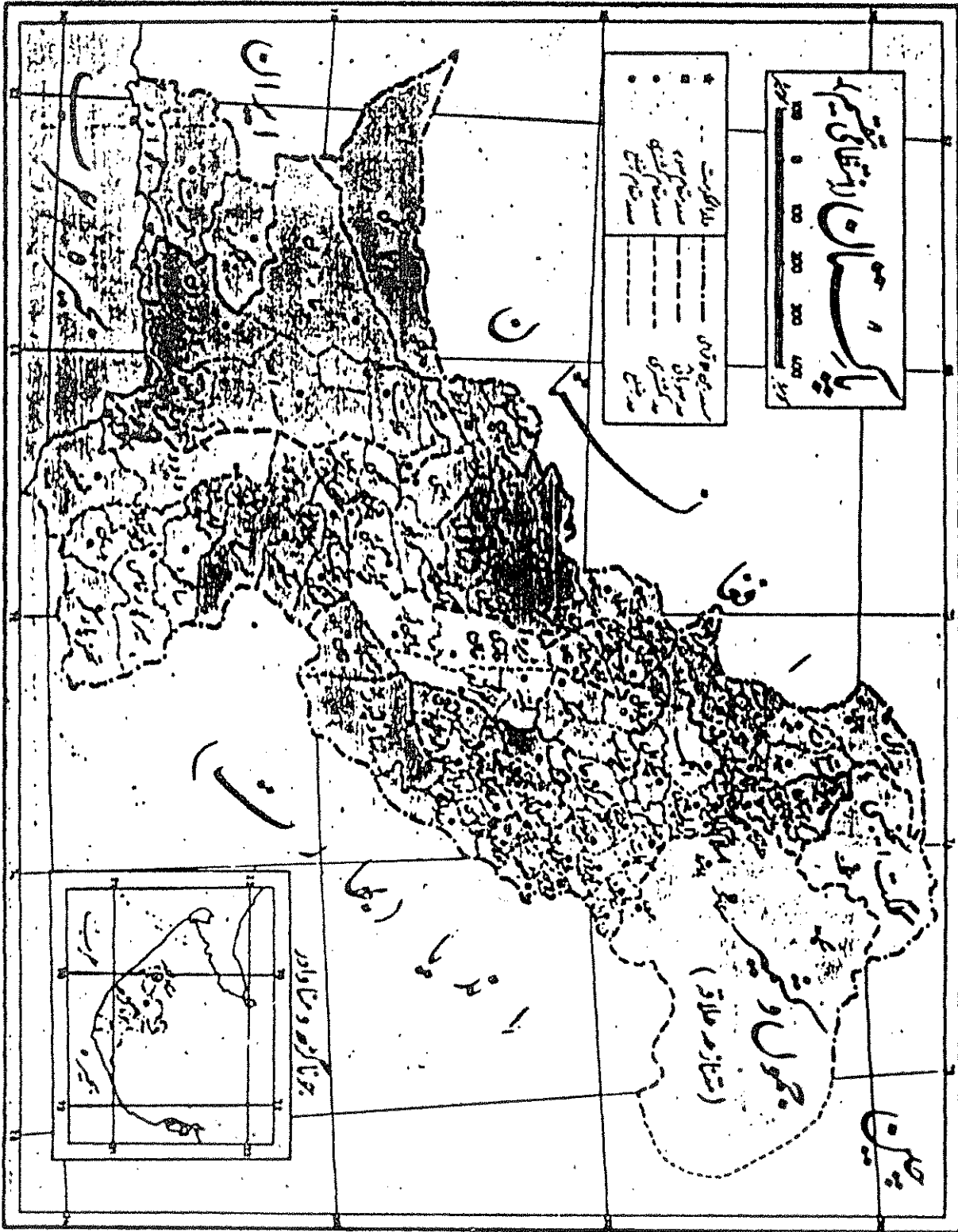
## فصل چہارم

# جماعتِ اسلامی کی تحریک

### تاریخی پس منظر

پہلی صدی ہجری کے اختتام سے قبل ہی دینِ اسلام ہندوستان پہنچ گیا۔نو جوان سپہ سالار محمد بن قاسم نے ۹۳ھ ۷۱۲ء میں سندھ فتح کیا۔وہ اسلام کی دولت لے کر ہندوستان پہنچے۔اس کے بعد مسلمان دو صدیوں تک سندھ پر حکمران رہے مگر بعد میں ان کی حکومت ختم ہوگئی۔ ہندوستان میں اسلام کا باقاعدہ تعارف ترکی النسل غزنوی حکمرانوں کے ذریعے ہوا۔سلطان محمود غزنوی نے 417ھ 1027ء میں لاہور فتح کیا سلطان محمد غوری کے زمانے میں دہلی اور اس کے غلام قطب الدین ایبک کے زمانے میں بنگال تک اسلامی سلطنت وسعت اختیار کرگئی۔ خلجی اور تغلق حکمرانوں نے بعد میں اہل ہند کو وحشی تاتاریوں کی قتل و غارتگری اور تباہی سے محفوظ رکھا یہی تاتاری مسلمان بن کر مغل حکمرانوں کے نام سے ایک مدت تک یہاں حکومت کرتے رہے اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل حکومت کمزور اور مضمحل ہوتی چلی گئی۔ ہندو اور مرہٹے مختلف ریاستوں پر قابض ہوتے چلے گئے لیکن بالآخر انگریزوں نے مرہٹوں ،فرانسیسیوں اور دوسرے حریفوں کو شکست دے کر یہاں اپنی حکومت قائم کرلی۔دوسو سال تک وہ یہاں من مانے طریقے پر حکومت کرتے رہے البتہ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد ان کے لیے مسائل پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔1906ء میں مسلم لیگ کے قیام کے بعد ہندوستان میں نمائندہ حکومت قائم کرنے کی جدوجہد شروع ہوگئی ،نمائندہ حکومت کی جدوجہد میں مسلمانوں نے نمایاں حصہ لیا بعد میں یہ مکمل آزادی کی تحریک بن گئی۔1947ء میں انگریزوں نے تحریکِ آزادی کے دباؤ کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ہندوستان چھوڑ دیں گے چنانچہ برطانوی حکومت نے 14اگست 1947ء (27رمضان) کو سیاسی اقتدار پاکستان کی حکومت اور 15اگست 1947ء کو بھارتی حکومت کو منتقل کردیا اس طرح برّصغیر دوسو سال کی غلامی کے بعد آزاد ہوگیا اور اسلامی ممالک میں ایک نئی اسلامی مملکت پاکستان کا اضافہ ہوگیا۔(۵۲)

## جماعت اسلامی کا قیام

سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے قیامِ پاکستان سے قبل 1941ء میں اسے قائم کر کے اپنے اجتماعی کام کا آغاز کر دیا تھا ابتدائی طور پر صرف پچھتّر 75 افراد نے سیّد مودودیؒ کی آواز پر لبیک کہا جبکہ اس موقعہ پر کل اثاثہ جات چوہتر روپے چار آنے (74.25 روپے) تھے وقت کے ساتھ ساتھ یہ ننھی کونپل بڑھتی اور تناور درخت بنتی چلی گئی۔

## عقیدہ و مسلک

یہ حقیقت ساری دنیا جانتی ہے کہ 1947ء میں جب برّصغیر پر برطانیہ کی حکومت تھی صرف جماعت اسلامی ہی ایک ایسی جماعت تھی جس نے اپنے دستور میں اپنے اس عقیدے کا صاف صاف اعلان کر رکھا تھا کہ:

> ''ہم اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک اور مقتدرِ اعلیٰ تسلیم نہیں کرتے، کسی کو بااختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہیں سمجھتے اور نہ کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز تسلیم کرتے ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔''

## نصب العین

اس عقیدے کے عملی نفاذ کے لیے جماعتِ اسلامی نے اپنے نصب العین میں یہ حقیقت بیان کی کہ ''جماعتِ اسلامی کی تمام سعی و جہد کا مقصود عملاً اقامتِ دین (حکومتِ الٰہیہ یا اسلامی نظامِ زندگی کا قیام) اور حقیقتاً رضائے الٰہی اور فلاحِ اُخروی کا حصول ہوگا۔

## طریقۂ کار

جماعتِ اسلامی نے اوّل روز سے اپنے پیشِ نظر انقلاب کے لئے یہ طریقِ کار اختیار اور متعین کیا تھا کہ:

(۱) جماعت جمہوری اور آئینی طریقِ کار کی پابندی کرے گی یعنی تبلیغ و تلقین اور اشاعت افکار کے ذریعے اصلاح انسانیت کی جدوجہد کی جائے گی۔

(۲) جماعت نصب العین کے حصول کی جدوجہد خفیہ تحریکوں کی طرز پر نہیں بلکہ کھلم کھلا اور اعلانیہ کرے گی اور کوئی ایسا ذریعہ یا طریقہ اختیار نہیں کیا جائے گا جو امانت و دیانت کے خلاف ہو اور جس سے فساد فی الارض رونما ہوتا ہو۔(۵۳)

## تنظیم و تربیت

جماعتِ اسلامی نے اپنے نصب العین کے عملی نفاذ کے لئے جو طریقِ کار، تنظیمی ڈھانچہ اور سخت ڈسپلن پیش کیا ہے۔برّصغیر کے حالات اور یہاں کے لوگوں کے مزاج کی موجودگی میں یہ ایک زندہ معجزہ ہے۔برّصغیر میں جماعت سازی کی سوسالہ تاریخ میں یہ کام کوئی اور نہیں کرسکا۔ایک ارب سے زائد کی آبادی کے اس ریجن میں کوئی دوسرا سیّد مودودیؒ پیدا نہیں ہوسکا جو یہاں کے لوگوں کو ایک ایسی (اسلامی) سیاسی جماعت قائم کرکے دے سکے جو زمانے کے نشیب و فراز اور گرم و سرد کی تاب لا سکے جس کے ارکان بک نہ سکیں جہاں کھڑے ہوں وہیں کھڑے رہیں بڑے سے بڑا لالچ اور بڑے سے بڑا خوف ان کے قدم نہ ہلا سکے۔آج بھی برّصغیر میں یہ واحد جماعت ہے جسے جماعتی تصوّر کی کسوٹی پر پرکھا جاسکتا ہے۔

## برادر تنظیمیں

مختلف شعبہ ہائے زندگی میں جماعتِ اسلامی کی ایسی تنظیمیں موجود ہیں جو آزاد اور خود مختار ہیں اور اپنے اپنے ضابطوں اور تحریری دساتیر کے تحت کے اپنے اپنے دائروں میں مصروف عمل ہیں۔ان تنظیموں میں

پیام ٹرانسپورٹ، پیغام واپڈا، پریم ریلوے، پیاسی پی آئی اے، پاسلو پاکستان اسٹیل، جمعیت اتحاد العلماء، تنظیم اساتذہ، اسلامی جمعیت وکلاء، حزب المجاہدین پاکستان، تحریک محنت، انجینئرز فورم، بزنس فورم، ڈاکٹر فورم، کسان بورڈ، جماعت اسلامی شعبہ خواتین، اسلامی جمعیت طالبات وغیرہ جیسی مثالی تنظیمیں دعوت الی اللہ اور اسلامی انقلاب کے لئے جماعت اسلامی کا ہراوّل دستہ ہیں۔

## قیادت

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ جماعت اسلامی کے قیام 1941ء سے لیکر 1972ء تک امیر جماعت رہے لیکن 1972ء میں خرابی صحت کی وجہ سے جماعت کی عملی قیادت سے علیحدہ ہوگئے۔ اگرچہ فکری طور پر آپ آج بھی جماعت اسلامی کے متفقہ قائد اور رہنما تسلیم کئے جاتے ہیں۔ آپ کے بعد آپ کے دست راست اور معتمد ترین ساتھی میاں طفیل محمد امیر منتخب ہوئے۔ انھوں نے سیّد مودودیؒ کے بعد جماعت کی قیادت کا حق ادا کردیا۔ 1987ء انہوں نے اپنی نظر کی کمزوری اور صحت کی خرابی ارکان جماعت سے خود درخواست کی کہ انہیں آئندہ امیر کی بھاری ذمّہ داری کے لئے منتخب نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس مرد درویش کے بعد قاضی حسین احمد نے امارت کی ذمّہ داری سنبھالی اور انہوں نے اپنے دن اور رات کے تمام لمحات اسلامی انقلاب کے لئے وقف کردیئے ہیں۔ جماعت اسلامی کی یہ روایت ایک انوکھی روایت ہے ورنہ معمولی سے معمولی جماعت کی قیادت بھی کوئی نہیں چھوڑتا کجا کہ جماعت اسلامی جیسی طاقتور اور بین الاقوامی جماعت کی قیادت پر فائز ہستیاں خود علیحدہ ہو جائیں۔ (۵۴)

## فکری و عملی خدمات......اثرات

جماعت اسلامی نے گذشتہ نصف صدی میں ایک ایسی قوم کے اندر کام کیا ہے جو زوال پذیر، انحطاط یافتہ اور اسلامی نقطۂ نظر سے اپنے بُرے بھلے سے بے خبر قوم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بگاڑ کی اس شدت میں

...یت کے باوجود اپنی جدوجہد میں انقلابی نوعیت کی تاریخ ساز کامیابیاں حاصل کی ہیں جن کا مختصراً تذکرہ حسبِ ذیل ہے۔

## اسلامی تصوّرِ قومیت

صدیوں کے جمود و انحطاط کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر بھی قومیت کا جاہلی تصوّر رائج ہو گیا تھا۔ کانگریس کے ہمنوا علماء نے متحدہ قومیت کا باقاعدہ پرچار کر کے گمراہی کا راستہ مزید صاف کیا۔ ان حالات میں سیّد مودودیؒ مسئلہ قومیت لکھ کر مسلمان قومیت کی وضاحت کی جس کے نتیجے میں کانگریسی علماء کا نظریہ وطنی قومیت مسلمانوں کے اندر روبہ زوال ہو گیا۔ قیامِ پاکستان کے لئے مسلم لیگ نے جب مسلمانوں کی قومیت کا نعرہ بلند کیا تو اسے فکری بنیادیں اور علمی پشت پناہی مولانا مودودیؒ کے قلم نے ہی مہیا کی۔ اس تصوّر میں یہ واضح کیا گیا کہ مسلمان کی قومیت اس کے دین میں پوشیدہ ہے اور وہ اسلام کی وجہ سے مسلمان ہے اور مسلمان کی حیثیت سے ہی اسے علیحدہ ملت کا امتیاز حاصل ہے۔

جماعت اسلامی کی اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ جماعت اسلامی میں فرقہ بندی، علاقائیت پرستی، گروہی اور لسانی عصبیت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ جماعت اسلامی کے اس تصوّر نے اُمّتِ مسلمہ کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنے کا کام کیا ہے۔

## اسلام...... مکمل ضابطۂ حیات

مسلمانوں میں یہ تصوّر پختہ ہو گیا تھا کہ اسلام صرف پانچ ارکان دین کا نام ہے اور ان پانچ اُمور میں انہماک سے اسلام کے سارے فرائض پورے ہو جاتے ہیں۔ جماعت اسلامی نے دین کے اس محدود تصوّر کو توڑ کر یہ ثابت کیا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرتے ہوئے انسان کا ہر فعل عبادت ہے۔ زراعت، کاروبار، رشتہ و تعلق حتیٰ کہ سیاست و حکومت ہر شعبے میں انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا لازم ہے۔

## اسلام ایک تحریک

جماعت اسلامی نے مسلمانوں کو بتایا کہ اسلام زندگی کا ایک مقصد، مشن، نصب العین اور جامع تحریک ہے اور اسلام کا اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ ہے کہ مسلمان جاں گسل جدوجہد کرتے ہوئے اسلامی نظام حیات کے نفاذ کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں جماعت اسلامی نے دورِ حاضر میں اسلام کو ایک جامد مذہب اور ایک انفرادی روش زندگی سے اُٹھا کر ایک تحریک بنا کر پیش کیا جس کی وجہ سے آج اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے ہمارے معاشرے میں برپا ہے اور لاکھوں زندگیاں اسے اپنا مشن بنا کر کام کر رہی ہیں۔اس حرکت وتحریک نے اسلام کے چہرے سے صدیوں کا جما ہوا زنگ اُتار دیا ہے۔

## اسلام......مغرب پر برتر

جماعت اسلامی نے اپنی جدوجہد سے مغربی تہذیب سے مرعوبیت کا طلسم توڑ دیا۔مغرب کے نظریات پر بھرپور تنقید کی اس کے فلسفے کو بے بنیاد، اس تہذیب کو جاہلانہ، اور اس کے شعائر کو بے دینی علامت ثابت کیا اور اپنے زبردست استدلال سے اہل مغرب کے پیش کردہ سارے طلسم خیال کا تار و پود بکھیر دیا۔ اس فکری یلغار کے نتیجے میں تعلیم یافتہ طبقے میں مغرب سے مرعوبیت کم ہوتی چلی گئی اور وہ لوگ جو مغرب کو علم کے ہر میدان میں سند کے طور پر پیش کرتے تھے وہ اسلامی معاشرہ اور کتاب وسنت کی تعلیمات کو سند کے طور پر پیش کرنے لگے ہیں۔اس طرح جماعت اسلامی نے تہذیب وروایات پر اعتماد کو بحال کیا ہے۔

## اسلامی تعلیمات کی اشاعت وترویج

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم سے نہایت جرأت مندی کے ساتھ اسلام کی انقلابی دعوت پیش کی اور بیش قیمت لٹریچر فراہم کیا۔گزشتہ پچاس سالوں میں جماعت اسلامی کے قیمتی لٹریچر کے تراجم ہوئے ہیں۔علاقائی زبانوں کے علاوہ عربی اور انگریزی تراجم نہ صرف عرب اور غیر عرب ممالک میں پھیل رہے ہیں بلکہ مغربی ممالک کے اندر بسنے والے مسلمان بھی ان دونوں زبانوں سے اکثر و

بیشتر استفادہ کرر ہے ہیں اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں جہاں کہیں اسلامی دعوت کا کام ہو رہا ہے۔ جماعت اسلامی کا لٹریچر کسی نہ کسی زبان میں پہنچ رہا ہے اور اس کی طلب روز بروز بڑھتی جا رہی ہے خاص طور پر سیّد مودودیؒ کی بعض تصانیف ایسی ہیں جنہیں عالمی پیمانے پر غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی مثلاً رسالہ دینیات، اسلام کا نظامِ حیات، عالم اسلام کی تعمیر میں مسلمان طلبہ کا کردار، تحریک اور کارکن، جہاد فی سبیل اللہ ایسی تصانیف ہیں جن کا ترجمہ (i.i.f.s.o) انٹرنیشنل اسلامک فیڈریشن آف اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کویت کی کوششوں سے دنیا کی ستر (70) سے زائد زبانوں میں چھپ چکا ہے۔ (۵۵)

## اشاعتی ادارے

اسلامی تعلیمات خصوصاً معاشیات، مسلم اُمت کے مسائل و معاملات، اسلامی فقہ و قانون، اسلامی تحریکوں کو درپیش چیلنج کے حوالے سے بے پناہ قیمتی لٹریچر کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ 1955ء میں سود پر سیّد مودودیؒ کی کتاب کو اس موضوع پر واحد تصنیف کہا گیا تھا۔ لیکن 1990ء میں جب مکہ میں اقتصادی کانفرنس ہوئی تو ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے صرف اسلامی معاشیات کے موضوع پر جن کتابوں کی فہرست اور تعارف پیش کیا ان کی تعداد سات سو تھی۔ (۵۶)

فکری ہم آہنگی اور اپنے معاملات میں خود مختاری کے ساتھ انسٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، ادارہ معارف اسلامی لاہور، اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی، ادارہ تعلیمی تحقیق لاہور، مہران اکیڈمی، انسٹیوٹ آف ریجنل اسٹڈیز سبھی مصروف عمل ہیں۔ ان کے ہفت روزہ شمارے، ماہنامے، خبر نامے، تجزیاتی و معلوماتی رپورٹیں نظری و عملی مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔

ان کے علاوہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور، اسلامک پبلیکشنز لاہور، البدر پبلیکیشنز لاہور، ادارہ الحسنات لاہور، ادارہ مطبوعات طلبہ لاہور، حراء پبلیکیشنز لاہور، منشورات منصورہ لاہور اور ادارہ مطبوعات کشمیر راولپنڈی جیسے ادارے جدید ترین ذرائع و وسائل کے ساتھ انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب گیٹ اپ کے ساتھ اسلامی لٹریچر وسیع پیمانے پر شائع کر رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر ادارے مختلف زبانوں میں بھی

تحریکی لٹریچر کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ یورپ، افریقہ، عالم عرب کے بعد اب وسطی ایشیا کی زبانوں کی طرف خصوصی توجہ ہے۔ کتاب کی اشاعت کتنی بڑی تعداد میں ہو رہی ہے اس کا اندازہ ایک اشاعتی ادارے ''اسلامک پبلیکیشنز لاہور'' کی سالانہ رپورٹ سے کیا جا سکتا ہے جس کے مطابق صرف 1996ء میں چوراسی لاکھ (8400000) روپے کی کتب فروخت ہوئیں جس میں سے تینتیس لاکھ (3300000) روپے کی کتب بیرون ملک روانہ کی گئیں۔ اسی طرح تحریک محنت نے (1996ء میں تقریباً بتیس لاکھ (3200000) روپے کی کتب تقسیم کیں جن میں سے صرف تفہیم القرآن کے سیٹوں کی تعداد چار ہزار پانچ سو ترانوے ہیں (۵۷)

## رسائل و جرائد

رسائل و جرائد جماعت اسلامی کی دعوتی اور فکری سرگرمیوں کا سرچشمہ ہیں۔ یہ رسائل و جرائد تفہیم دین، اسلامی تحریکوں سے واقفیت، تحریکی ضروریات، ترجیحات اور سعی وجہد کو عام کرنے کا ذریعہ ہیں۔ ماہانہ پرچہ جات میں ترجمان القرآن، ماہنامہ آئین، جریدہ الاتحاد، افکار معلم، ہمقدم، مشکوٰۃ، المصباح، ندائے کسان، پکار، نوید سحر، اسلام اور عیسائیت، وسطی ایشیا کے مسلمان، ہفت روزہ ایشیا، جسارت فرائیڈے اسپیشل اور پندرہ روزہ جہاد کشمیر جماعت اسلامی کی انقلابی فکر کے ترجمان ہیں۔ جبکہ بچوں کے رسائل کی ماہانہ اشاعت ایک لاکھ سے زائد ہے۔ ان رسائل میں پیغام، ساتھی، مجاہد، بزم قرآن، نور، چاند نگر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ خواتین کے لئے ماہنامہ بتول کی ترجیحات دورِ حاضر کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر ترتیب دی جاتی ہیں۔ (۵۸)

## تعلیم

جماعت اسلامی پاکستان نے حراء پاکستان پراجیکٹ تنظیم اساتذہ کے توسط سے شروع کر رکھا ہے اور ایک منصوبہ غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کا ہے۔ یہ جماعت اسلامی کا ایسا منصوبہ ہے جس نے کم عرصے میں کامیابیوں کے ریکارڈ قائم کئے ہیں۔ جماعت اسلامی نے تعلیمی نصاب اور جدید ترین لٹریچر کی تیاری اسلامی

نظامت کے انچارج ہیں۔ چھ سو سے زائد اسکولوں سے اس نظامت کا رابطہ ہے۔ ''بیٹھک اسکول'' کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا گیا ہے جس کے تحت ۱۰۰ سے زائد اسکولز نے کام شروع کر دیا ہے۔ رابطہ المدارس الاسلامیہ پاکستان کے تحت جماعت اسلامی کے ایک سو چونسٹھ (۱۶۴) دینی ادارے کام کر رہے ہیں۔ ان اداروں میں سے چورانوے (۹۴) مدارس تفہیم القرآن کے نام سے کام کر رہے ہیں۔ خواتین کے لیے جامعۃ المحصنات کے تعلیمی پروجیکٹ کا قیام ۱۹۹۰ء میں عمل میں آیا۔ اس کے تحت خواتین کی ۱۲ یونی ورسٹیاں پورے پاکستان میں قائم ہو چکی ہیں اور فروغ علم میں مصروف کار ہیں۔

## سیاسی خدمات

پاکستان مسلمانوں کی آزاد جمہوری مملکت کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ چنانچہ جماعت اسلامی نے قیام پاکستان کے فوری بعد ایک ایسے دستور کی تدوین کے لئے جدوجہد شروع کر دی تھی جو قرآن وسنت کے مطابق انسانوں کو بنیادی حقوق دینے کا ضامن ہو۔ جماعت اسلامی نے اپنی جدوجہد سے اسلامی دستور کے مطالبے کو ایک عوامی مطالبہ بنا دیا۔ جماعت اسلامی کی یہ پہلی سیاسی مہم تھی کتابچے، دوورقے اور پوسٹرز کثیر تعداد میں شائع کئے گئے۔ تقریریں، ملاقاتیں، خدمات اور مواعظ ہر طریقے سے جماعت نے اپنی آواز عوام الناس تک پہنچائی۔ ملک کے درودیوار اس مطالبے سے گونجنے لگے۔ پورے ملک سے گورنر جنرل، وزیراعظم اور دستور ساز اسمبلی کے اسپیکر کے نام خطوط اور ٹیلی گراموں کی بارش ہو گئی جن سے دستور ساز اسمبلی کا کمرہ بھر گیا۔

## قرارداد مقاصد

اس طرح جماعت اسلامی کی زیر قیادت جدوجہد کے نتیجے میں ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو قرارداد مقاصد منظور کر لی گئی۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی اسمبلی کے اندر جدوجہد، عوامی دباؤ اور لیاقت علی خان کے سیاسی فہم کا اس قرارداد کی منظوری میں قابل قدر حصہ ہے۔ ۱۹۲۴ء میں خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد ترکی، مصر اور ایران جیسے ملکوں میں بھی لادینی دستور بنائے جا رہے تھے۔ ایسی سیاسی فضا میں پاکستان میں اللہ تعالی کی

حاکمیت اعلیٰ کا اعلان انتہائی انقلاب انگیز قدم تھا یہ بڑا تاریخ ساز فیصلہ تھا اس کے بعد ریاست کے سیکولر بننے کا راستہ مسدود ہو گیا۔ اس طرح ایک ایسا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا جس کے بعد کسی حکمران کو اسے تبدیل کرنے کی ہمت نہ ہو سکی۔

## دستوری جدوجہد

قرارداد مقاصد پاس ہو جانے کے بعد یہ توقع کی جارہی تھی کہ اب اسلامی دستور کا راستہ آسان ہو گیا ہے مگر حکمران طبقے کا ایک طاقتور عنصر اسلامی دستور کے راستے میں رکاوٹ بن گیا۔ مختلف حیلے بہانوں میں کئی سال گزار دیئے گئے۔ حکومت نے اپنی طرف سے ایک ناقابل حل مسئلہ کھڑا کر دیا کہ مسلمانوں میں کتنے فرقے ہیں۔ کس فرقے کا اسلام نافذ کیا جائے۔ علماء کرام نے اس مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کر دکھایا۔ 1951ء میں اکتیس علماء کرام کراچی میں جمع ہوئے جن میں تمام فرقے، سنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی اور اہلحدیث وغیرہ سب شریک تھے۔ انہوں نے بائیس نکات پر مشتمل ایک دستاویز تیار کی تاکہ ان نکات کی بنیاد پر اسلامی دستور تشکیل دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے یہ پاکستان کے علماء کا شاندار کارنامہ ہے۔ اس شاندار کارنامے میں جماعت اسلامی نے بنیادی کردار ادا کیا۔

1956ء میں جب دستور کا پہلا مسودہ سامنے آیا تو اس میں بے شمار خامیاں تھیں جماعت اسلامی نے فوری طور پر پانچ سو مستند علماء کرام اور ماہرین قانون سے دستور کے لئے ترامیم تیار کرائیں۔ جماعت اسلامی کی اس مساعی کے نتیجے میں ان ترامیم کے ساتھ ملک کا پہلا باقاعدہ دستور 23 مارچ 1956ء کو نافذ ہوا اور ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان بن گیا۔

ایوب خان کے دورِ حکومت میں جب ملک میں اسلام سے کھلے بندوں بغاوت کر کے خاندانی منصوبہ بندی اور عائلی قوانین نافذ کر دیئے گئے۔ نیز دستور 1962ء میں اسلامی کا لفظ حذف کر کے ملک کا نام جمہوریہ پاکستان رکھ دیا گیا، جماعت اسلامی نے ان غیر اسلامی اقدامات کے خلاف زبردست مُہم چلائی تقریباً بارہ میل طویل دستخط شدہ محضر نامے تین ٹرکوں میں لاد کر اسپیکر اسمبلی کے دفتر میں جمع کرائے گئے چنانچہ جماعت کی

جد جہد کے نتیجے میں ملک کا نام دوبارہ اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھ دیا گیا۔

سقوط مشرقی پاکستان کے بعد ذوالفقار علی بھٹو ملک کے وزیراعظم بنے اس وقت اسمبلی نے نیا دستور دیا اس اسمبلی میں دینی جماعتوں کے ارکان کی تعداد اگرچہ بہت کم تھی لیکن ان کی جدوجہد کے نتیجے میں سوشلزم کے داعی بھٹو اس بات پر مجبور ہوگئے کہ دستوری مسوّدے سے سوشلزم کو ملکی معیشت کی بنیاد بنانے کی دفعہ حذف کردیں لطف کی بات یہ ہے کہ اس دستور میں ساری کی ساری اسلامی دفعات منظور کرالی گئیں۔ پاکستان کے انتہائی ممتاز قانون دان، اے کے بروہیؔ کے الفاظ میں ''اسلامی دستور کی اس تمام جدوجہد کا سہرا (جماعت اسلامی کے بانی) سیّدابوالاعلیٰ مودودیؒ کے سر ہے۔'' (۵۹)

## فتنہ قادیانیت

قادیانی فرقہ پاکستان کے جسم میں ایک ناسور ہے۔ ابتدائی دستوری جدوجہد کے دوران اس فتنے نے سر اُٹھایا تھا جس کے بعد سیّدابوالاعلیٰ مودودیؒ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ پھر پنجاب میں ہونے والے فسادات کی تحقیقات کے لئے عدالتی کمیشن مقرر ہوا تو اس موقع پر سیّدابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس مذہب کی حقیقت بیان کی پھر اسے کتابی شکل میں شائع کردیا گیا۔ اس طرح عوام الناس کو اس مسئلہ کی سنگینی سے واقفیت ہوئی لیکن وقتی طور پر یہ مسئلہ دب گیا۔

مئی 1974ء میں نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلباء کو قادیانیوں نے ربوہ اسٹیشن پر تشدد کا نشانہ بنایا۔ ان طلباء میں اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنان بھی شامل تھے۔ کالج یونین کے صدر ارباب عالم خان جمعیت کے رکن تھے۔ اس واقعہ کے بعد اسلامی جمعیت طلبہ نے قادیانیوں کے خلاف زبردست احتجاجی تحریک شروع کردی۔ جماعت اسلامی اور دیگر تمام دینی جماعتیں بھی تحفظِ ختم نبوت کے نام سے متحد ہوکر میدان میں نکل آئیں۔ تین ماہ سے زائد عرصہ تک پورا ملک ختم نبوت کے نعروں سے گونجتا رہا۔ جس کے نتیجے میں ذوالفقار علی بھٹو نے اس مسئلے کا نوٹس لیا۔ پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس بلا کر دونوں فریقوں کے دلائل سنے گئے۔ طویل بحث وجرح کے بعد 7 ستمبر 1974ء کو پارلیمنٹ نے قادیانیوں کو دائرۂ اسلام سے خارج فرقہ قرار دے دیا۔

معاصرانہ تاریخ میں جس مسئلے نے نوے سال سے مسلمانانِ برّصغیر کے جسد میں زخم ڈال رکھے تھے بالآخر ملت اسے جدا کرنے میں کامیاب ہوگئی اور اس طرح اس مسئلے کو مستحکم طریقے سے حل کر دیا گیا۔(۶۰)

## فتنہ انکار حدیث

دستوری جدوجہد کے دوران ہی فتنہ انکار حدیث بھی سامنے آیا۔ جدید تعلیم یافتہ افراد اس نظریئے سے متاثر ہونے لگے۔ غلام احمد پرویز اور ان کا رسالہ طلوع اسلام اس نظریئے کے پرچارک تھے۔ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے ایک جج جسٹس محمد شفیع نے ان افکار سے متاثر ہوکر ایک فیصلہ دیا جس میں انہوں نے سنت کو نافذ قانون تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس فیصلے سے اسلام میں قانون سازی کی تمام بنیادیں منہدم ہو رہی تھی۔ سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ستمبر 1961ء میں ترجمان القرآن منصب رسالت ﷺ نمبر شائع کیا جس میں سنت کی آئینی حیثیت کو ثابت کیا گیا تھا۔ ستائیس ہزار کی تعداد میں ابتدائی طور پر یہ نمبر پاکستان کے طول وعرض میں تقسیم ہوا۔ مولانا مودودیؒ کی عظیم مساعی کے نتیجے میں منکرین حدیث کے موقف کی کمزوریاں واضح ہو گئیں۔ مغربی پاکستان ہائی کورٹ نے پی ایل ڈی 1960ء میں سے اس مقدمے کو حذف کر دیا ''محترم جسٹس محمد شفیع'' نے بھی انتہائی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سنت کی اہمیت کے بارے میں جماعت اسلامی کی مؤقف کو درست تسلیم کر دیا۔ غلام جیلانی برقؔ، علامہ پرویزؔ کے دست راست سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے جماعت اسلامی کی اس مساعی کے نتیجے میں انکار حدیث کے عقیدے سے توبہ کی اس سلسلے کی اپنی تمام تحریروں کی منسوخی کا اعلان کر دیا۔ ملک میں ہر مکتبہ کے جید علماء موجود ہیں۔ خصوصا اہل حدیث کا تو ایک مستقل فرقہ ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود منکرین حدیث سے علمی جہاد کی سعادت جماعت اسلامی کے حصے میں آئی اس کے بعد کہیں مولانا یوسف بنوریؔ نے پرویز کے خلاف فتویٰ دیا۔(۶۱)

## ابتلا وآزمائش

اقامت دین کے سلسلے میں ابتلا وآزمائش کا آنا لازم ہے۔ تمام انبیاء کرام اور صلحائے اُمت کو ان آزمائشوں سے سابقہ پیش آیا۔ ایسی کوئی جماعت ''دینی'' ہو ہی نہیں سکتی جو حق کی دعوت دے تو سب لوگ اس

سے خوش رہیں اور اس پر کوئی ابتلا و آزمائش بھی نہ آئے۔ یہ بات سنتِ الٰہی کے خلاف ہے۔ جماعت اسلامی کو بارہا اظہار حق کی پاداش میں ابتلاء اور آزمائشوں کی وادی پر خار سے گذرنا پڑا ہے۔ نہ صرف قید و بند کے مرحلوں سے گذرنا پڑا بلکہ تختہ دار کو بھی چومنا پڑا ہے۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اکتوبر 1948ء میں مطالبہ نظام اسلامی کی وجہ سے مولانا مودودیؒ مولانا امین احسن اصلاحی اور میاں طفیل محمد نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ قرارداد مقاصد 1949ء میں منظور ہوئیں تب بھی مولانا مودودیؒ جیل میں بند تھے بعد میں ان کی قید کی مدت میں مزید اضافہ کر دیا گیا۔ 1953ء میں ''قادیانی مسئلہ'' کتاب لکھنے کی وجہ سے جماعت اسلامی کے امیر کو سزائے موت سنائی گئی۔

مولانا نے مومنانہ عزیمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا:

''زندگی اور موت کے فیصلے زمین پر نہیں آسمان پر ہوتے ہیں اگر وہاں میری موت کا فیصلہ ہو چکا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے بچا نہیں سکتی اور اگر وہاں میری موت کا فیصلہ نہیں ہوا تو چاہے یہ خود اُلٹے لٹک جائیں تب بھی مجھے پھانسی پر نہیں لٹکا سکتے۔''

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے یہ الفاظ مسلمانوں کی تاریخ دعوت و عزیمت کے باب میں شاندار اضافہ ہے بعد میں زبردست احتجاج کے نتیجے میں سزائے منسوخ ہوگئی اور اکیس ماہ جیل میں گذارنے کے بعد ایک عدالتی فیصلے کی بنا پر رہا ہو گئے۔

دنیا ایک بڑے حصے میں مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کی استقامت کے باعث جماعت کی دعوت کو سمجھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ایوب خان نے 1962ء کا دستور نافذ کیا تو شہری آزادیاں بحال ہوگئیں۔ ان سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جماعت اسلامی نے اجتماع ارکان کا فیصلہ کیا حکومت نے لاؤڈ اسپیکر کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ کھلی جگہ کی اجازت بھی نہ دی گئی اس کے باوجود 25 اکتوبر 1963ء کی صبح اجلاس شروع ہو گیا اور مولانا مودودیؒ تقریر کرنے لگے تو گورنر مغربی پاکستان نواب آف کالا باغ کے غنڈوں نے جلسہ گاہ پر حملہ کر دیا ایک کارکن اللہ بخش شہید ہو گیا۔ مولانا مودودیؒ کے سر کے اوپر سے فائر گذر گیا۔ اس کے باوجود مولانا مودودیؒ نے تقریر جاری رکھی ۔ اس موقعہ پر ایک صاحب نے کہا کہ مولانا بیٹھ جائیں تو مولانا نے

جواب میں یہ تاریخی الفاظ کہے" اگر میں بیٹھ گیا تو کھڑا کون رہے گا" چنانچہ جلسہ کا نظم ضبط برقرار رہا۔

مولانا مودودیؒ کی عزیمت نے کتنے ہی دلوں کو گرما دیا جماعت اسلامی کی اس استقامت سے حکومت جھنجھلا گئی۔ 6 جنوری 1964ء کو حکومت نے جماعت اسلامی پر پابندی عائد کر کے اسے خلاف قانون کردیا۔ مرکزی شوریٰ کے 50 ارکان قید کر لئے گئے تمام دفاتر سیل کر دئے گئے مگر آٹھ ماہ بعد سپریم کورٹ نے حکومتی فیصلہ کالعدم قرار دیدیا گرفتار شدگان رہا ہو گئے۔ جماعت اسلامی بھی میدان عمل میں آ گئی۔ (۶۲)

16 دسمبر 1971ء کو مشرق پاکستان کی علیحدگی کا سانحہ پیش آیا۔ جماعت اسلامی واحد جماعت تھی جس نے ملکی سالمیت کے لئے بے مثال قربانیاں دیں۔ مشرقی پاکستان کے اسلامی جمعیت طلبہ کے ایسے ہزاروں نوجوان البدر اور الشمّس کے نام سے منظم ہوئے جنہوں نے اپنی قربانیوں سے قرونِ اولیٰ کی یادیں تازہ کردیں۔ بھارتی گوریلا فوج "مکتی باہنی" کی تخریب کاریوں اور غداری کے سامنے بند باندھنے کے لئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے۔ اسلام اور پاکستان کی خاطر تقریباً دس ہزار کارکنان نے جام شہادت نوش کیا۔ متحدہ پاکستان کو بچانے کے لئے البدر اور الشمّس کی قربانیاں جماعت اسلامی کی تاریخ کا روشن باب ہیں۔ اس جرم کی پاداش میں جماعت اسلامی بنگلہ دیش میں عرصے تک سیاسی اور قانونی طور پر زیرِ عتاب رہی۔ (۶۳)

پیپلز پارٹی نے مشرقی پاکستان کے سانحے کے بعد حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ 1968ءمیں ذوالفقار علی بھٹو نے پیپلز پارٹی بنائی اور سوشلزم کے حق میں فضا اتنی ہموار کر لی کہ علماء کرام کی ایک خاص بڑی تعداد بھی ان کی ہمنوا بن گئی۔ جماعت اسلامی نے اس موقعہ پر واضح موقف اپنایا۔

سیّدابوالاعلیٰ مودودیؒ نے فرمایا:

> "یہ ملک اسلام کا ہے، اسلام کے نام پر اور اسلام کے لئے بنا ہے یہاں جب تک ہم زندہ ہیں کوئی مائی کا لال سوشلزم اور یا کوئی اور ازم نہیں لا سکتا۔"

چنانچہ جماعت اسلامی نے سوشلزم کے خلاف تقریباً ایک سو پمفلٹس اور کتابیں شائع کیں۔ وسیع پیمانے پر اس لٹریچر کی اشاعت سے نہ صرف پاکستان بلکہ بیرونی دنیا میں بھی سوشلزم اور اشتراکیت کی حقیقت آشکار ہو گئی بھٹو کے علاوہ مولانا بھاشانی بھی سیاسی محاذ پر سرگرم تھے۔ انہوں نے اشتراکیت کے لئے انقلابی

جدوجہد کا اعلان کر دیا اس کے جواب میں جماعت اسلامی نے 31 مئی 1970ء کو ''یوم شوکت اسلام'' منانے کا اعلان کیا۔ ملک بھر میں ایسے عظیم الشان جلوس نکالے گئے کہ تاریخ میں اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ جمعیت علماء اسلام نیشنل عوامی پارٹی اور پیپلز پارٹی نے یوم شوکت اسلام کی مخالفت کی لیکن اس تابناک جدوجہد کے نتیجے میں بھٹو سوشلزم کو مساوات محمدی کے نعرے میں تبدیل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ (۶۴)

پی پی کی آمرانہ پالیسیوں اور اشتراکی نظریات کی مخالفت کی وجہ سے حکومت نے جماعت اسلامی کے کارکنوں کو جیلوں میں بند کر کے ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا۔ ان کارکنوں میں ایک بڑی تعداد اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ طلباء کی تھی۔ ڈاکٹر نذیر احمدؒ جماعت اسلامی کے ایک نمایاں رہنما اور قومی اسمبلی کے رکن تھے۔ انہیں سرِ عام گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔ سابق امیر جماعت اسلامی پاکستان میاں طفیل احمد گرفتاری کے بعد سخت اذیت ناک مراحل سے گذرے۔ لیکن انہوں نے کمال صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے رہائی کے بعد یہ اعلان کیا کہ وہ اپنے مخالفین کی بدسلوکی پر انہیں معاف کرتے ہیں اور ان کے لئے ہدایت کی دعا کرتے ہیں۔ جماعت کو اشتراکیت کی مخالفت کی بھرپور قیمت ادا کرنی پڑی لیکن جماعت اسلامی بلا خوف و خطر اپنے موقف پر قائم رہی اور غلبہ دین حق کے لئے جدوجہد کرتی رہی۔ (۶۵)

ملک میں جب بھی اسلام اور جمہوریت سے انحراف کیا گیا، جماعت اسلامی نے آگے بڑھ کر ایسی کوششوں کا راستہ روکا اور انہیں ناکام بنادیا۔ جماعت اسلامی نے ہمیشہ آمروں کو للکارا اور ہر حال میں اسلام کا پرچم بلند رکھا۔ ایوب خان سے بھٹو تک ملک میں تین بار مارشل لاء لگا اور تینوں بار اپوزیشن کی متحدہ تحریکوں نے مارشل لاء کے ذریعے برسر اقتدار آنے والے آمروں کو پسپا کر دیا۔ ہر ایسی تحریک میں جماعت اسلامی نے ہراوّل دستے کا کردار ادا کیا۔ وزیر اعظم بھٹو نے مارچ 1977ء میں عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا یہ انتخابات بھٹو صاحب کی دھاندلی کی نظر ہو گئے ایک بڑی احتجاجی تحریک کے نتیجے میں چیف آف آرمی اسٹاف جنرل ضیاء الحق نے جولائی 1977ء میں مارشل لاء لگا دیا جنرل ضیاء الحق اپنے مختلف اعلانات اور اقدامات سے یہ تاثر پیدا کرنے میں کامیاب رہے کہ وہ اسلام پسند ہیں۔ افغان جہاد کے حوالے سے بھی ان پالیسیوں پر اطمینان کا اظہار کیا جاتا رہا۔ جماعت اسلامی کے رہنما اور کارکنان ان وجوہات کے بناء پر ان کے لئے نرم

گوشہ رکھتے تھے لیکن جنرل ضیاء الحق نے جماعت اسلامی کی اس قابلِ قدر پالیسی کا اعتراف کرنے کے بجائے ہمیشہ اسے نقصان پہچانے اور اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوششیں کی۔ روشنیوں کا شہر کراچی اس حوالے سے شہرت رکھتا تھا کہ یہ جماعت اسلامی کا شہر ہے۔ 1951ء کے بلدیاتی انتخابات میں 23 میں سے 19 نشستیں جیت کر جماعت اسلامی نے کراچی میں یہ حیثیت حاصل کی تھی۔ 1979ء اور 1983ء میں ضیاء دور کے بلدیاتی انتخابات میں کراچی کی میئر شپ جماعت اسلامی نے جیتی۔ جنرل ضیاء الحق نے جماعت اسلامی کی یہ حیثیت ختم کرنے کے لئے مہاجر قومی موومنٹ بنا ڈالی جس نے دہشت گردی کی لرزا دینے والی مثالیں قائم کر کے جماعت اسلامی کو کراچی میں کچھ عرصے کے لئے پس منظر میں دھکیل دیا۔ ٹار چر سیلوں میں جماعت کے لاتعداد افراد پر ظلم وتشدد کی انتہا کر دی گئی۔ ٹار چر سیلوں میں کتنا خوف ناک سلوک روا رکھا جاتا تھا اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے ایک رکن سیّد احسان انصاری شہید کئے گئے ان کے جسم میں ڈرل مشین سے تین سو سے زائد سوراخ کئے گئے تھے صرف سر میں پچاس سوراخ موجود تھے بعد میں جنرل ضیاء الحق کے ایک مشیر نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ایم کیو ایم جماعت اسلامی کو ختم کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔

پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز (PIA) میں جماعت اسلامی کی تنظیم پیاسی بھرپور اثرات رکھتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے پیاسی کے چھ سو سے زائد فعال رہنما اور کارکنان بیک جنبش قلم برطرف کرا دیئے۔ جب اس کے باوجود پیاسی مضبوط نظر آئی تو اس کے حصے بخرے کرنے کی مُہم چلائی گئی لیکن بفضل خدا پیاسی آج بھی ایک مضبوط قوت ہے۔

اسلامی جمعیت طلبہ جماعت اسلامی کا ہراوّل دستہ ہے۔ ان کی مجاہدانہ اور سرفروشانہ سرگرمیاں ممتاز اور منفرد مقام رکھتی ہیں۔ پاکستان میں تعلیمی ادارے سیکولر، فرقہ ورانہ، اور لسانی تنظیموں کا گڑھ تصوّر کئے جاتے تھے۔ جمعیت نے اپنی بے مثال قربانیوں اور جدوجہد سے ان تعلیمی اداروں کو تعلیم دشمن عناصر کے قبضے سے آزاد کرایا۔ حکومتوں کی تمام تر مخالفتوں کے باوجود اسلامی جمعیت طلبہ پورے ملک میں پہلی پوزیشن پر آ گئی۔ 1983ء کے آخری دنوں میں صوبۂ پنجاب، صوبۂ سرحد اور اسلام آباد میں طلبہ یونین کے انتخابات

ہوئے۔اسلامی جمعیت طلبہ نے شاندار کامیابی حاصل کر کے سابقہ کامیابیوں کے تمام رکارڈ توڑ دیئے۔ بڑے بڑے شہروں میں جمعیت کے علاوہ کسی اور تنظیم کا وجود ہی باقی نہ رہا۔تمام یونیورسٹیوں اور بڑے بڑے کالجز میں جمعیت نے عظیم الشان کامیابیاں حاصل کیں۔لیکن جنرل ضیاء الحق اسلامی تحریک کی اس کامیابی کو برداشت نہ کر سکے فوری طور پر طلباء تنظیموں اور یونینوں پر پابندی عائد کر کے ان کو خلاف قانون قرار دیدیا گیا۔ جمعیت نے ان پابندیوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں جمعیت کے لیے جیلوں کے دروازے کھل گئے تشدد کی انتہا کر دی گئی۔فرشتہ صفت نوجوانوں کو کوڑوں کی سزائیں دے کر ان کی کھالیں اُدھیڑ دی گئیں اس سب کچھ کے باوجود نظریہ اسلام کے غلبہ کی جدوجہد جاری تھی اب نیا حکم صادر کیا گیا۔ ہر طرف جمعیت کے مرکزی قائدین شہید کئے جانے لگے۔حکومتی سر پرستی میں پرورش پانے والے غنڈوں نے لاہور شہر کے سیکریٹری نواب خان پر تشدد کر کے انہیں شہید کر دیا اس کے بعد تو یہ سلسلہ باقاعدہ چل نکلا۔نشتر میڈیکل کالج، کنگ ایڈورڈ کالج لاہور، اور پنجاب میڈیکل کالج فیصل آباد میں یکے بعد دیگرے جمعیت کے بہترین ارکان کے سینوں میں خنجر گھونپ کر انہیں شہید کر دیا گیا۔جماعت اسلامی اور جمعیت کے دفاتر کے اندر داخل ہو کر ذمّہ داران کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔بعض مقامات پر تو وزیر اعلیٰ پنجاب کی اسپیشل پولیس نے براہِ راست قاتلوں کا کردار ادا کیا۔وزیر اعلیٰ پنجاب نواز شریف اور وزیر تعلیم غلام حیدر وائیں کی سر پرستی میں یہ ظلم روا رکھا گیا۔جبکہ ظلم و جبر کے ان سارے ہتھکنڈوں کے باوجود جمعیت زندہ ہے اور استقامت کی ایک لازوال تاریخ رقم کی ہے ان دنوں تعلیمی اداروں میں ہر طرف ایک ہی نعرے کی گونج سنائی دیتی تھی جو دلوں کو گرما دیتے تھے اور یہ بتا دیتے تھے کہ اسلام کے متوالے کبھی بھی اپنا راستہ ترک نہیں کرینگے۔جنرل صاحب نے ایک اور کوشش بھی کی کہ جہاں تمام دینی اور مذہبی جماعتوں کو تقسیم در تقسیم کر کے غیر مؤثر کر دیا وہاں جماعت اسلامی کو بھی تقسیم کرنے کی بھرپور کوشش کرتے رہے۔کراچی گروپ اور لاہور گروپ کی افواہیں آخری دم تک اڑائیں گئیں۔لیکن یہ ساری افواہیں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور جماعت اسلامی کی مضبوط تنظیم کے سامنے دم توڑ گئیں۔

جنرل ضیاء الحق نے 1985ء میں غیر جماعتی انتخابات کا اعلان کیا تو جماعت اسلامی نے ان انتخابات

میں شرکت کا فیصلہ کیا کیونکہ مارشل لاء کی پرامن رخصتی اور اقتدار کی عوام کو منتقلی کا یہی ایک راستہ تھا۔ 1985ء میں شروع ہونے والی اسی جمہوری اور آئینی عمل کا تسلسل جاری تھا کہ جب 17 اگست 1988ء کو اچانک صدر ضیاء اپنے 29 اعلیٰ ترین فوجی افسروں کے ہمراہ ایک فضائی حادثہ میں شہید ہوئے تو اتنے بڑے سانحے کے باوجود اتنے بڑے آئینی بحران پیدا نہیں ہوا۔ جنرل ضیاء الحق کے اچانک منظر سے ہٹ جانے کے بعد پیپلز پارٹی کی آہنی آمریت ایک بار پھر ملک کا مقدر بن چکی تھی۔ اس صورتِ حال میں جماعت اسلامی نے آگے بڑھ کر اسلامی جمہوری اتحاد کے قیام کو یقینی بنایا۔ جماعت اسلامی کی بھرپور جدوجہد کے نتیجے میں 1990ء کے انتخابات میں اسلامی جمہوری اتحاد کو قومی اسمبلی میں دوتہائی اکثریت حاصل ہوگئی۔ سینٹ میں بھاری اکثریت پہلے سے موجود تھی لیکن بتیس مہینے طویل حکومت عوامی توقعات کے برعکس امریکا کی خوشنودی کو اپنا مقصد بنائے رہی۔ افغان جہاد کا آغاز کرنے والے پاکستان کے ہمدرد رہنما گلبدین حکمت یار کے ساتھ جو رویّہ اپنایا گیا اس کا خمیازہ ہم آج تک افغانستان میں بھگت رہے ہیں۔ نواز شریف کی غلط پالیسیوں نے جو انہوں نے اقوام متحدہ کے نمائندہ کے حکم کی پیروی میں اختیار کیں جس نے افغان اسلامی انقلاب کو خانہ جنگی میں تبدیل کر دیا۔ وفاقی شرعی عدالت نے سود کے خلاف فیصلہ دیا جسے وزیر اعظم صاحب نے سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا۔

1985 سینٹ میں شریعت بل پیش کیا گیا تھا اس حکومت نے اسے پاس کر کے کریڈٹ لینے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں دانستہ اس کی شکل مسخ کر دی گئی کیونکہ اس میں اس شک کا اضافہ کیا گیا تھا کہ حکومت اور اس کا سیاسی نظام شریعت کی بالادستی سے مستثنیٰ ہوگا۔ حکومت کی اس اسلام دشمن اور ملک دشمن کارستانی پر جماعت اسلامی نے بھرپور احتجاج کیا اور ہر موقعہ پر بھرپور مزاحمت کی۔ لیکن حکومتی کارپردازوں خصوصاً وزیر اعظم نے پوری دیدہ دلیری سے اسلام دشمن اقدامات کیے۔ جماعت اسلامی نے ان وجوہات کے بناء پر اسلامی جمہوری اتحاد سے علیحدگی اختیار کر لی۔ جماعت اسلامی نے اسلامی جمہوری اتحاد کے اس حشر سے یہ سبق سیکھا کہ اتحادوں کے منفی سیاست سے ملک میں کوئی مثبت انقلابی تبدیلی نہیں آسکتی اور یہ اتحاد ہمیشہ صرف سیکولر لابی کو اقتدار تک پہنچانے کا ذریعہ ثابت ہوئے ہیں۔ اس لیے جماعت اسلامی نے اتحادی سیاست کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ دراصل جماعت اسلامی کی بقا اور تشخص کی بحالی کے لئے ضروری

تھا وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت واضح ہوتی چلی جا رہی ہے کہ صیہونی اور امریکی عزائم کے مقابلے کے لئے جماعت اسلامی کا نظریاتی تشخص، اس کی منفرد جماعتی حیثیت اور اس کا جہادی کردار نمایاں کرنا ضروری ہے۔

مئی 1993ء میں جماعت اسلامی نے اسلامک فرنٹ قائم کیا ہر مکتبہ فکر اور شعبہ ہائے زندگی کے نمایاں اور باصلاحیت افراد اس پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔ اُصولی طور پر 1995ء انتخابات کا سال تھا اس طرح اگر اسلامی فرنٹ کو دو سال کا عرصہ مل جاتا تو یہ فرنٹ تمام سیکولر قوتوں کی پسپائی کا سبب بن جاتا یقینی طور پر اس خطرے کو بروقت محسوس کر لیا گیا اور اس طرح نادیدہ قوتوں کی طرف سے فوری طور پر حکومت کی برطرفی اور نئے انتخابات کی سازش مکمل کر لی گئی۔ چنانچہ اس طرح کے انتخابات سے اسلامک فرنٹ غیر مؤثر ہو کر رہ گیا۔ اخبارات اور میڈیا کے تمام ذرائع جماعت اسلامی کے خلاف میدان میں آ گئے اسلام پسند کہلوانے والے صحافی بھی انہی کرپٹ اور سیکولر قوتوں کے علمبردار بن گئے جماعت اسلامی اس آزمائش سے بھی سرخرو گذر گئی اور آج الحمدللہ پہلے سے زیادہ مضبوط اور بہتر مقام پر کھڑی ہے۔

1993ء کے انتخابات میں اتحادی سیاست کے اثرات اور چند دیگر وجوہات کے پیشِ نظر جماعت اسلامی کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔ ان انتخابات میں جماعت اسلامی نے کھلے دل سے ان انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا لیکن پیپلز پارٹی نے اپنے تین سالہ دور میں بدعنوانی، کرپشن، بے حیائی، اقربا پروری اور جیالانوازی کی حد کر دی۔ جماعت اسلامی نے ان حالات میں پاکستان بچاؤ تحریک کا آغاز کر کے پاکستانی سیاست کو ایک نیا رُخ دیا۔ جماعت اسلامی نے تمام مسائل کے حل کے لئے اسلامی انقلاب کو ضروری قرار دیتے ہوئے 24 جون 1996ء کو دھرنا مُہم کا آغاز کیا۔ حکومت کی طرف سے تحریک کو کچلنے کے لئے تمام حربے آزمائے گئے جس کے نتیجے میں چار افراد شہید ہو گئے جبکہ درجنوں زخمی ہوئے حکومتی تشدد نے تحریک میں نئی جان ڈال دی۔ امیر جماعت اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد نے پورے ملک میں چار ہزار سے زائد مقامات پر عظیم الشان ریلیوں اور جلسہ عام سے خطاب کیا۔ ان پروگرام کے بعد 27 اکتوبر 1996ء کو پارلیمنٹ کے سامنے دھرنے کا فیصلہ ہوا۔ وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر نے دھرنا ناکام بنانے کے لئے

راولپنڈی اور اسلام آباد آنے والی تمام سڑکوں اور راستوں کو بلاک کر دیا۔ ٹرین سروس، موبائل فون اور پیجر سروس ملک میں پہلی بار معطل کر دی گئیں تقریباً دس ہزار قائدین اور کارکنان کی گرفتاریوں کے بعد حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ کوئی ایک فرد بھی مقررہ مقام (پارلیمنٹ) کے سامنے نہیں پہنچ سکے گا۔ مگر ان ساری رکاوٹوں کے باوجود تیس ہزار کے قریب کارکنان راولپنڈی اور اسلام آباد پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے پہنچنے والے ہزاروں افراد نے سیکریٹری جنرل جماعت اسلامی سیّد منور حسن کی امامت میں نوافل شکرانہ ادا کئے۔ اخبارات نے شہ سرخیاں لگائیں ''جنرل قاضی نے جنرل بابر (وزیر داخلہ) کو شہ مات دے دی۔''

اس تحریک کے نتیجے میں 5 نومبر 1996ء کو پیپلز پارٹی کی حکومت برطرف کر دی گئی۔ جس پر پوری قوم نے سکھ کا سانس لیا۔ یہ تحریک اس بنیاد پر چلائی گئی تھی کہ گزشتہ دور کی لوٹ مار کا حساب ہوگا اور لٹیروں بھارتی اور امریکی مفادات کے محافظوں کے لئے حکومت تک پہنچنے کے امکانات ختم کئے جائیں گے یہ صرف اس صورت میں ممکن تھا جب آئین کی دفعات 62، 63 کا لحاظ رکھتے ہوئے اُمیدواروں کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دی جاتی لیکن ان آئینی دفعات کی پابندیوں کو غیر ضروری سمجھا گیا اس لئے جماعت نے واضح آئینی اور قانونی بنیادیوں پر انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا اس بائیکاٹ سے بننے والی فضا کے نتیجے میں عوام کی بڑی اکثریت انتخابات سے دور رہی حکومتی دعوؤں کے مطابق صرف 36 فیصد ووٹ پول ہوئے جب کہ آزاد ذرائع کے نزدیک یہ شرح 30 فیصد سے بھی کم رہی ان انتخابات میں مسلم لیگ 17 فیصد ووٹ لیکر دو تہائی کی حق دار ٹھہری عام خیال یہ تھا کہ اس دفعہ نواز شریف صاحب سابقہ دور حکومت کی غلطیوں کا ازالہ کریں گے لیکن بعد کے واقعات نے جماعت اسلامی کی موقف کی تصدیق کر دی نواز شریف نے وزیر اعظم بننے کے بعد جمعتہ المبارک کے بجائے اتوار کی عام تعطیل، شراب فروشی اور شراب نوشی کے لاتعداد پرمٹوں اور لائسنسوں کا اجراء، ذرائع ابلاغ پر اباحیت، فحاشی اور عریانی کی ترویج اور اشاعت بہبود آبادی کے نام پر بے حیائی کی ثقافت کے فروغ، گولڈن شیک ھینڈ کے نام پر ہزاروں افراد کی جبری ریٹائرمنٹ، نجکاری کے پردے میں قومی اہمیت کے حامل حساس اداروں کی غیر ملکی کمپنیوں کے ہاتھوں فروخت، اے این پی اور ایم کیو ایم جیسی قوم

پرست اور علیحدگی پسند جماعتوں کی سرپرستی، خصوصاً ایم کیو ایم کے جرائم پیشہ افراد کی رہائی اور اس کے نتیجے میں کراچی میں قتل و غارتگری، امن و امان کی تباہی، ہندوانہ کلچر اور اداکاروں کی سرکاری سرپرستی، دستوری ترامیم کے ذریعے صدر اور پارلیمنٹ کے اختیارات کے خاتمے اور سپریم کورٹ کے باقاعدہ حملوں کے ذریعے اسے اپنے فرائض منصبی سے روک کر ان اداروں پر اپنی بالادستی قائم کرنے کی کوشش کی لیکن قرآن سنت کی بالادستی اور سود کے خاتمے کے اعلانات سے مکمل گریز، امریکی ایجنڈے کے مطابق تقسیم کشمیر پر آمادگی بھارت سے مستحکم دوستی کے لئے سرتوڑ کوششیں اور کیمیکل ویپن کمیشن (c w c) معاہدے پر دستخط کر کے آئین اور ملکی وفاداری سے صریحاً انحراف جیسے غیر آئینی اور غیر اسلامی اقدامات کئے جو واضح طور پر نظریہ اسلام، ملکی سالمیت خودمختاری اور قومی مفادات کے خلاف غداری کے مترادف تھے۔ ان حالات میں جماعت اسلامی پوری دیانت داری اور جرأت مندی کے ساتھ ہر مرحلے اور ہر موقعے پر قوم کی درست رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتی رہی۔ جماعت نے حکومت کو راہِ راست لانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ تمام قابل مذمت اقدامات کے خلاف بھرپور صدائے احتجاج بلند کی خصوصاً (c.w.c) معاہدے کے انکشاف کے بعد جب وزیر خارجہ نے ایٹمی تنصیبات کے معائنے کے لیے ایک سو پچاس رکنی عالمی انسپکٹروں کی ٹیم کی پاکستان آمد کا اعلان کیا تو اس نازک موقعے پر صرف جماعت اسلامی ہی تھی جس نے حکومت کے غلط اقدامات کی مزاحمت کا فیصلہ کیا۔ اس معاہدے اور عالمی انسپکٹروں کی پاکستان آمد کے خلاف عظیم الشان ریلی کر کے حکومتی ایوانوں میں زلزلہ برپا کر دیا۔ جماعت نے اسلام آباد کے مظاہرے میں اقوام متحدہ کے عالمی بلیک میلروں اور حکومت کو واشگاف الفاظ میں متنبہ کیا کہ ہم عالمی انسپکٹروں کو پاکستان نہیں آنے دیں گے اور اگر کسی نے اس سرزمین پر قدم رکھا تو اپنی حفاظت کا خود ذمہ دار ہوگا۔ قاضی صاحب نے اعلان کیا کہ ''اگر حکومت نے خفیہ طور پر کوئی ایسا قدم اُٹھایا تو حکومت کا آخری دن ہوگا'' انہوں نے کہا ''بجٹ کا ایک بہت بڑا حصہ قوم اپنا پیٹ کاٹ کر دفاعی ضروریات کے لئے دیتی ہے اس لئے فوج کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے قوم کی توقعات پر پورا اُترنا چاہیے۔''

6 اپریل 1998ء کو (اس احتجاج کے تین دن بعد) ڈاکٹر عبدالقدیر خان، ماہر سائنسدانوں اور فوجی

جرنیلوں نے قوم کو غوری میزائل کا تحفہ دے کر از سرِ نو اپنی ذمّہ دار حیثیت کا تعین کر دیا۔ آواز سے چھ گنا تیز رفتار میزائل کے کامیاب تجربے سے بھارت کی بالادستی کا غرور خاک میں مل گیا۔ پندرہ سو کلومیٹر رینج کا یہ میزائل بھارت کے تمام اہم شہروں کو نشانہ بنا سکتا ہے اور اپنے اندر سات سو کلو وزنی ہتھیار اور ایٹم بم لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

## پاکستان ایٹمی طاقت بن گیا

11 اور 13 مئی 1998ء کو بھارت نے پانچ ایٹمی دھماکے کیے۔ ان دھماکوں اور ملٹی بیرل میزائلوں کے تجربے کے بعد برّصغیر میں طاقت کا توازن بری طرح درہم برہم ہوگیا تھا۔ ان دھماکوں پر عالمی ردّعمل نہ ہونے کے برابر تھا۔ روس نے کھلم کھلا بھارت کی حمایت کی۔ یورپی برادری بھی پابندیاں لگانے اور مذمت کرنے سے گریزاں رہی۔ امریکا نے اگرچہ برائے نام پابندیاں لگائیں لیکن اس کی کٹھ پتلی اقوام متحدہ نے واضح طور پر کہا کہ اگر بھارت ''سی ٹی بی ٹی'' پر دستخط کر دے تو اس کے تمام گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔ اس عالمی ردّعمل سے بھارت کے حوصلے بڑھ گئے۔

بھارتی وزیراعظم نے کہا:

بھارت کے ایٹمی طاقت بننے سے جنوبی ایشیا کے جغرافیائی حقائق تبدیل ہو گئے ہیں۔ بھارتی وزیر دفاع نے آزاد کشمیر کو جنگ کے ذریعے فتح کرنے کا اعلان کیا۔

دوسرے بھارتی رہنماؤں کا کہنا تھا کہ:

''جب تک اکھنڈ بھارت کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا۔ خطے میں امن قائم نہیں ہوسکتا۔''

بھارت کے ان جارحانہ عزائم کے پیشِ نظر پاکستان کو جو خطرات لاحق ہو گئے تھے ان سے عہدہ براہونا حکومت اور عوام کی مشترکہ ذمّہ داری تھی۔ عوام نے بھارتی دھماکوں پر شدید ردّعمل کا اظہار کرتے ہوئے فوری دھماکے کا مطالبہ کیا۔

قاضی صاحب نے بھی فوری ردّعمل میں یہ بات کہی کہ:

''اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ بھارت کو اسی کی زبان اور انداز میں جواب دیا جائے اور اس میں ذرّہ بھر تاخیر نہ کی جائے۔لیکن حکومت مسلسل لیت ولعل سے کام لیتی رہی ٹی وی اور درباری صحافیوں کا گروہ امریکی مراعات کے پیکج کو ایٹمی دھماکے پر ترجیح دیتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک قلم فروش صحافی نے دھماکے کی حمایت کرنے والے رہنماؤں کو پاکستانی واجپائی کی گالی تک دے ڈالی۔ ہمیشہ کی طرح اس موقعے پر بھی جماعت اسلامی نے انتہائی ذمّہ دارانہ کردار ادا کیا۔ جماعت اسلامی نے باہمی مشاورت اور اتفاق رائے کے حصول کے لئے ملک کی تمام قابل ذکر سیاسی جماعتوں، مذہبی علماء، اور دیگر طبقات کے نمائندوں پر مشتمل آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد کیا۔ جس میں متفقہ طور پر حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ مراعات کے پیکج کی طرف جانے کی بجائے بھارت پر واضح کرے کہ ہمارا ایٹمی پروگرام صلاحیت، تیکنیک اور قوت میں اس کے پروگرام سے بہتر اور برتر ہے اور 30 مئی تک ہر حالت میں دھماکہ کر دیا جائے بصورت دیگر حکومت کے خلاف راست اقدام کیا جائے گا۔ جمعیت العلماء اسلام ،عوامی اتحاد اور جنگ فورم نے بھی آل پارٹیز کانفرنسوں کا اہتمام کیا۔ جماعت اسلامی کے علاوہ روزنامہ نوائے وقت خبریں اور اوصاف کا کردار بھی شاندار رہا۔اس موقعے پر مجید نظامی ،ضیاء شاہد اور حامد میر نے بلاشبہ رہنمائی کا حق ادا کر دیا۔ امریکا 1965ء اور 1971ء کی طرح ایک بار پھر دھوکا دینے پر کمر بستہ تھا۔اس نے ایف سولہ کی طیاروں کی قیمت وصول کرنے کے باوجود ان کی فراہمی روک رکھی تھی۔اس پر متضاد یہ کہ رسوائے زمانہ پریسلر ترمیم کے ذریعے اقتصادی اور فوجی امداد بند کر کے پاکستان کو اپنے ایٹمی پروگرام سے روکنے کی بھرپور کوششیں کرتا رہا تھا جبکہ دوسری طرف امریکا بھارت کے ایٹمی

پروگرام کی نہ صرف معاونت کرتا رہا بلکہ ایٹمی دھماکوں کے بعد بھی بھارت کے بجائے پاکستان پر دباؤ ڈالتا رہا کہ وہ ایٹمی دھماکوں کی غلطی نہ کرے۔صدر کلنٹن اس سلسلے میں اس قدر بے چین تھے کہ انہوں نے سترہ دنوں میں پانچ بار نواز شریف سے ٹیلیفون پر گفتگو کی اور مسلسل ایٹمی دھماکوں سے روکنے کے لئے اصرار کرتے رہے۔امریکا پاکستان کو بھارت کی بالادستی میں دینے اور بھارت کو علاقے کا پولیس مین بنانے کے ایجنڈے پر پوری مستعدی سے کام کرتا رہا لیکن پاکستانی قوم نے اپنی اجتماعی بصیرت کے ذریعے ایک ایسی فضا پیدا کر دی کہ بالآخر حکومت اور عسکری قیادت کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اب عمل کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے اس طرح اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے پاکستان کو بروقت ایک صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق ملی اور اس طرح امریکی ایجنڈا خاک میں مل گیا۔

28 تا 30 مئی اُمّتِ مسلمہ کی تاریخ کے یادگار دن ہیں۔اس دن پاکستان کے مایہ ناز سائنسدان اسلامی بم کے خالق ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور دیگر سائنسدانوں کی مساعی کے نتیجے میں پاکستان نے پانچ ایٹمی دھماکے کر کے ملتِ اسلامیہ کو خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد نئی زندگی عطا کی۔بھارت پر ان دھماکوں سے سکتہ طاری ہو گیا اس کے لیڈروں کے لہجے بدل گئے۔مُہم جوئی نے صلح جوئی کی صورت اختیار کر لی۔واجپائی نے نئے بیان میں جنگ کے بجائے مذاکرات کو مسائل کے حل کا ذریعہ قرار دیا۔اس بدلی ہوئی فضا کے سبب واضح تھا کہ اب پاکستان ایک عام ملک نہیں بلکہ دنیا کی ساتویں اور اسلامی دنیا کی پہلی ایٹمی طاقت بن گیا تھا۔27 اور 28 مئی کی رات اسرائیل اور بھارت نے پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر حملے کا فیصلہ کیا۔لیکن پاکستان کے بروقت فیصلے کے بعد صورتحال اس قدر تبدیل ہوگئی کہ اسرائیل اور بھارت کو اپنی امن پسندی ثابت کرنے کے لئے وضاحتی بیان جاری کرنے پڑے۔ان دھماکوں کے بعد مقبوضہ کشمیر میں جشن کا سماں رہا۔عالم اسلام میں احساس تحفظ،متحد ہونے کا جذبہ اور اسرائیل کے مقابلے میں کھڑا ہونے کی جرأت پیدا ہوئی۔ان دھماکوں کا عالم عرب میں زبردست خیر مقدم کیا گیا۔

سعودی عرب کے زیر اہتمام لبنان سے شائع ہونے والے عربی اخبار ''الشرق الاوسط'' نے اپنے مضمون ''اسلامی بم'' میں کہا:

''آج اسلامی بم کا خواب شرمندہ تعبیر ہو چکا ہے اب بہت سے مسلمان سکون کا سانس لے سکیں گے پاکستان کے ایٹمی قلب میں داخل ہو جانے کے بعد فیصلہ ساز قوتوں خاص طور پر امریکا کی رگوں کا خون منجمد ہو جائے گا۔''

پاکستان کی اس حیثیت کو تمام عالم اسلام نے اپنا مشترکہ سرمایہ سمجھا۔ پاکستان کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ پاکستان پچاس سال کے بعد امریکا کی محکومیت اور غلامی سے نکل آیا۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ پاکستان اپنی باوقار حیثیت کا از سرِ نو تعین کرے۔ چنانچہ وزیر اعظم نے 11 جون 1998ء کو قومی ایجنڈے کا اعلان کیا اس ایجنڈے میں خود انحصاری اور سادگی اپنانے اور ناجائز جاگیریں واپس لیکر بے زمین کاشت کاروں میں تقسیم کرنے جیسے انقلابی اقدامات شامل تھے لیکن ایمر جنسی کے نفاذ، بنیادی حقوق کی معطلی ہوم ورک کے بغیر کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے اعلان اور فارن کرنسی اکاؤنٹس منجمد کرنے جیسے انتہائی غلط فیصلوں کے نتیجے میں حکومت اپنا وقار کھو بیٹھی اور قومی ایجنڈا غیر مؤثر ہو کر رہ گیا اس تاریخی موقعے پر بھی وزیر اعظم نے گزشتہ غلطیوں کے مداوے کی چنداں کوشش نہیں کی اور شریعت اسلامی کے نفاذ جیسے مبارک اور انتہائی ضروری اقدامات سے مکمل گریز کیا پھر اگلے ہی روز 12 جون 1998ء کو نئے وفاقی بجٹ میں خود انحصاری اور سادگی کے وعدوں کے برعکس 143 ارب روپے کے مساوی بیرونی قرضے لینے کا اعلان کر دیا گیا۔ صرف سود کی ادائیگی کی مد میں 275 ارب روپے رکھے گئے۔ خود انحصاری کے نام پر قوم سے تو اربوں روپے وصول کر لئے گئے لیکن حکومت میں شامل کسی فرد نے ایک روپیہ تک جمع نہیں کرایا۔ انہیں دنوں حبیب بینک لمیٹڈ سے وزیر اعظم کے ایک ارب معاف کرانے کا اسکینڈل منظر عام پر آ گیا۔ اس سے بھی سنگین نوعیت کا واقعہ جسے ملک کے خلاف کھلی بغاوت قرار دیا جا سکتا ہے پیش آیا کہ جب ملک کو ایک ایک بوند پانی کی ضرورت تھی مالیاتی ایمر جنسی کے نفاذ سے چند گھنٹے پہلے وزیر اعظم نے اڑھائی ارب ڈالر بیرون ملک منتقل کر دیئے بجٹ میں درآمدات میں ٹیکس کم کر کے ملٹی نیشنل کمپنیوں کی گرفت مزید مضبوط کر دی گئی۔ جبکہ ٹیکسوں کے اضافی بوجھ سے ملکی صنعت کو

تباہی کے کنارے پر پہنچا دیا ان وجوہات کی بناء پر ماہرین معاشیات نے بجٹ کو قومی اُمنگوں اور نئے تقاضوں کے سراسر منافی قرار دیتے ہوئے عالمی بنک اور آئی ایم ایف کا بجٹ قرار دے دیا۔ فاروق لغاری نے الزام عائد کیا کہ وزیر اعظم نے قومی خزانے سے 40 ارب روپے کی لوٹ مار کی ہے 7 ہزار ایکٹر جاگیر کی ملکیت کے ثبوت بھی جماعت اسلامی کے پاس موجود تھے۔ جو برائے نام قیمت پر لوگوں سے جبراً ہتھیالی گئی تھی رائے ونڈ اسٹیٹ بھی اسی جاگیر میں شامل تھی۔ جس پر قومی خزانے سے کروڑوں روپے کے اخراجات کئے جا رہے تھے مغل بادشاہوں کو آئیڈیل قرار دینے والے وزیر اعظم اور ان کے ساتھیوں کی عیاشیوں کی وجہ سے ملک شدید ترین مالی بحرانی کا شکار ہو گیا۔ سنگین معاشی بدحالی، بدامنی اور انارکی نے حکومت کی ناکامی اور نا اہلی ثابت کر دی اس نازک اور پیچیدہ صورتِ حال میں جماعت اسلامی نے ملک کو بحران سے نکالنے کے لئے اسلامی انقلاب کو ازبس ضروری قرار دیا۔ 24 جون 1998ء کو لیاقت باغ راولپنڈی کے تاریخی اور فقید المثال جلسہ عام میں قاضی صاحب نے کارکنوں کو میدان میں نکلنے کا حکم دیا اور کہا کہ ''وہ گزشتہ سال بنائے گئے 40 لاکھ ممبران کی اعداد 80 لاکھ کر دیں اور جلد از جلد ان کی تنظیم سازی مکمل کریں اور یہ ثابت کر دیں کہ اسلامی انقلاب کی منزل بہت قریب ہے'' اس ہدف کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جماعت اسلامی کا پیغام اور دعوت آبادی کے اندر بہت گہرائی تک پہنچنے لگی اس پورے عمل کے نتیجے میں انشاء اللہ ایک بڑی تبدیلی، ایک زبردست انقلاب کا آغاز ہوگا اور یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ جماعت اسلامی کے کارکن منظر کو بدلنے کی کتنی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر جماعت اسلامی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگئی تو یہ قوم کے لئے اور آئندہ نسلوں کے لئے ایک بہترین تحفہ ہوگا۔ (٦٦)

## عالمی اثرات

جماعت اسلامی بنیادی کام پاکستان میں کر رہی ہے اس کے بعد اِردگرد کے ممالک آتے ہیں۔ پھر امریکا، یورپ اور افریقہ تک اس کے اثرات موجود ہیں اگر ان ممالک کے معاشرتی ڈھانچے اور اسلام سے عیسائیت کی دشمنی کو پیشِ نظر رکھا جائے تو جماعت اسلامی کے ان دور دراز اور اجنبی علاقوں تک پہنچنے والے

اثرات بہت بڑی کامیابی ہیں اسلام کے اوّلین دور کے بعد اسلام کی تبلیغ واشاعت کی یہ دوسری بڑی کوشش ہے سوڈیڑھ سوسال بعد صحیح اندازہ ہوگا کہ یہ کوششیں کیا رنگ لاتی ہیں؟

مثلاً جماعت اسلامی کے نام سے بھارت، بنگلہ دیش، مقبوضہ کشمیر اور سری لنکا میں باقاعدہ تنظیمیں قائم ہیں۔ یہ تنظیمیں نہ صرف تبلیغ واشاعت کا کام کررہی ہیں بلکہ اپنے ملکوں میں ان کے سیاسی اثرات بھی موجود ہیں۔ بھارت ہندو اکثریت پر مشتمل ملک ہے جہاں سیکولر نظام قائم ہے اس لئے یہاں جماعت اسلامی کا کردار قدرے محدود ہے۔ اگرچہ مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا محمد یوسف اصلاحی، مولانا ابواللیث، مولانا جلال الدین عمری اور سیّد عروج احمد قادری رحمتہ اللہ علیہ کا فکری کام بھی بہت زیادہ اور عالم اسلام کے لئے قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بنگلہ دیش میں جو 1970ء تک کا پاکستان کا حصہ تھا جماعت اسلامی کی جڑیں بہت گہری ہیں اور انتخابی سیاست میں بھی اس کا ایک خاص مقام ہے جبکہ سری لنکا میں جماعت اسلامی مخلوط حکومت میں شامل رہی ہے۔

ایشیا اور افریقہ کے ممالک میں جماعت اسلامی کی ہی طرز پر قائم اسلامی تحریکوں سے جماعت اسلامی کے براہِ راست فکری اور علمی روابط ہیں مثلاً مصر، تیونس، مراکش، سوڈان، اردن، شام، اور عراق وغیرہ میں اخوان المسلمون کے نام سے جو اسلامی تحریکیں کام کررہی ہیں جماعت کے ان پر گہرے فکری اثرات ہیں۔ فضیلت پارٹی، ترکی، ماشوری، انڈونیشیا، اسلامک پارٹی ملائیشیا، التوعیۃ الاسلام کویت، قطر، لبنان، اور فلسطین کی الجماعت الاسلامیہ سے جماعت اسلامی کے فکری، علمی اور بعض سطح پر عملی تعلقات ہیں۔

ایشیا میں بالائی سطح پر جماعت اسلامی وسطی ایشیا، روس اور چین میں بھی سرگرم رہی ہے چینی حکومت ایک عرصے تک اپنے مسلمان طلبہ کو سرکاری خرچے پر جماعت اسلامی کے تعلیمی اداروں میں بھیجتی رہی جبکہ وسطی ایشیا اور روس میں تبلیغ واشاعت کا کام جاری ہے۔ افغان جہاد سے اس کام میں وسعت پیدا ہوئی جماعت اسلامی وسطی ایشیا کی تقریباً تمام ریاستوں میں (تمام زبانوں) میں کتب اور تفسیر فراہم کردی ہے۔

برطانیہ میں یو کے اسلامک مشن، یورپ میں اسلامک فاؤنڈیشن، امریکہ اور کینیڈا میں ایم۔ ایس۔ اے کے نام سے جماعت اسلامی کام کررہی ہے لاطینی امریکہ اور افریقہ کے عیسائی ممالک میں بعض مقامات پر

مضبوط حلقے قائم ہیں اسپین میں جہاں عیسائیوں نے مسلمانوں کا نام ونشاں مٹادیا تھا، گزشتہ عشرے سے جماعت اسلامی کا کام شروع ہوگیا ہے کوریا، جاپان، اور فرانس، میں پہلی مرتبہ اسلام کی دعوت پیش قدمی کرر ہی ہے یہاں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہورہا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ (پیرس) کہتے ہیں کہ:

''صرف فرانس میں تقریبا دس افراد روزانہ اسلام قبول کرتے ہیں۔ پچاس سال کے مختصر دورانیے میں یہ بہت بڑا کام ہے اور بڑے وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے ۔جماعت اسلامی نے اس سارے کام کو مربوط کرنے کے لئے باقاعدہ شعبہ اُمورِ خارجہ قائم کررکھا ہے جو بیرونِ ملک حلقہ جات، اسلامی تحاریک، مسلم شخصیات اور اندرون و بیرون ملک سفارتخانوں سے رابطہ رکھتا ہے۔ چودہ ممالک میں باضابطہ جماعت اسلامی کا کام ہورہا ہے جبکہ بیالیس ممالک میں اسلامی تحریکوں سے جماعت کا مستحکم رابطہ موجود ہے اور پوری دنیا میں جماعتِ اسلامی دین کی دعوت دینے میں مصروفِ عمل ہے۔''(٦٧)
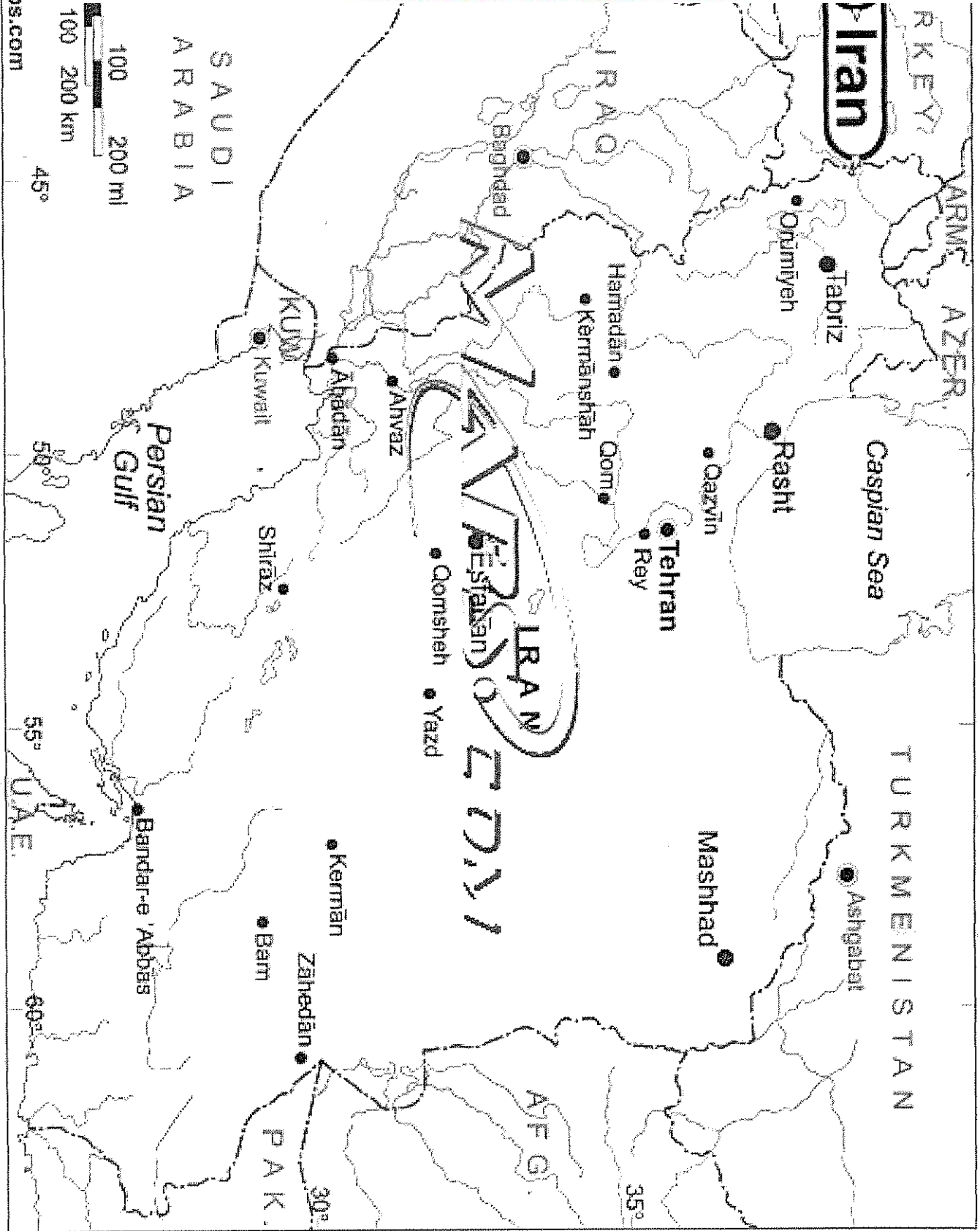
فصل پنجم

# ایران کی اسلامی تحریک اور امام خمینیؒ کا کردار

بیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اسلامی تحریکوں کے سیاسی اثرات نمایاں ہونے لگے۔ ان تحریکات کی تربیتِ فکر اور جمہوری و سیاسی کردار نے ملتِ اسلامیہ کے اندر جبر و طاغوت اور آمریت کے خلاف تحریک پیدا کی اور اُمت نے مغربی استعمار کے تسلّط کے خلاف منظّم ہونے کے ساتھ ساتھ استعمار کے گماشتوں کی خلاف بھی منظم سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔

ایران، جہاں ظلم وستم انتہا کو پہنچ چکا تھا، بداخلاقی، بے حیائی اور صنفی انارکی حدوں کو چھور ہی تھی، ایرانی قوم کو مغرب کا غلام بنایا جا رہا تھا، ان کی اپنے ہی ملک میں کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ اس صورتِ حال میں ایران کے علماء و مشائخ نے عوام کے اندر بیداری کا آغاز کیا اور اس کو منطقی انجام تک امام خمینیؒ نے پہنچایا۔ امام خمینیؒ نے خالصتاً نظریاتی نقطۂ نظر سے انقلاب کی توجیہ کی اور ولایتِ فقیہ کی بنیاد پر ایک نظریاتی انقلاب کی بنیاد رکھی اور عوام جو شہنشاہیت کے ظلم وستم سے تنگ آچکے تھے انہوں نے اس تحریک کا ساتھ دیا اور ایران کا اسلامی انقلاب کامیاب ہوا۔

## امام خمینیؒ کے حالاتِ زندگی

امام خمینیؒ ۱۹۰۲ء میں تہران سے ۳۴۹ کلومیٹر دور خمین نامی قصبہ میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہ صرف چھ ماہ کے تھے کہ حکومت کی استعماری سازش سے ایک مقامی جاگیردار نے ان کے والد کو شہید کر دیا۔ آپ جب چھ برس کے تھے کہ والدہ محترمہ ہاجرہ بھی انتقال کر گئیں۔ والدِ گرامی سیّد مصطفیٰ خمینی اور والدہ کے انتقال کے بعد ان کی پھوپھی صاحبہ نے ان کی پرورش کی۔ ۱۵ سال کی عمر کو پہنچتے ہی وہ بھی داغ مفارقت دے گئیں۔ اس طرح امام خمینیؒ کا بچپن نہایت ہی حزن و رنج کے ماحول میں گذرا۔

''انیس سال تک امام خمینیؒ نے اپنے قصبہ خمین میں تعلیم حاصل کی۔ یہاں ابتدائی طور پر انہوں نے عربی زبان منطق، اُصول اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء میں آپ خمین سے عازم اراک ہوئے اور حوزہ علمیہ میں ایک سال تک قیام کیا اور پھر حوزہ علمیہ قم آ گئے۔ یہاں علم الحساب، علم نجوم اور فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ ادبیات، فلسفہ، فقہ اور تصوّف و عرفان آپ کے پسندیدہ مضامین اور موضوعات تھے۔ تقریباً چھ سال تک آپ نے آیت اللہ آقا محمد مرزا محمد علی شاہ آبادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور علم و عرفان کے گوہر ہائے آبدار سمیٹے۔ ۱۹۲۹ء میں جب آپ کی عمر صرف ۲۷ سال تھی آپ نے پڑھانا شروع کر دیا۔ آپ نے حوزہ علمیہ قم میں ابتدائی دور میں فلسفہ، اُصول، تصوّف اور فقہ کا درس دینا شروع کر دیا۔ ۱۹۴۳ء میں آپ نے ''کشف الاسرار'' لکھی۔ اس کتاب میں آپ نے رضا شاہ پہلوی کی دور ظلم و ستم کو بے نقاب کیا۔

آپ نے جوانی میں اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ پہلوی حکومت کی مغرب نوازی اور استعمار دوستی کو بے نقاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن ۱۹۴۳ء میں صوبائی کونسلر بل کے خلاف امام خمینیؒ نے کھل کر شاہ ایران رضا شاہ پہلوی کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ آپ نے کہا کہ اس بل کا مقصد ایران کی اسلامی حیثیت کو ختم کرنا ہے. اس بل کی رو سے ایرانی شہری عدالتوں میں قرآن مجید پر حلف اُٹھانے کے پابند نہ تھے بلکہ وہ کسی بھی مذہب کی کتاب پر حلف اُٹھا سکتے تھے۔ دراصل یہ یہود و نصاریٰ اور بہائی فرقہ کی اسلام کے خلاف ایک شاش تھی۔ امام خمینیؒ کے سخت احتجاج پر یہ بل واپس لینا پڑا۔ لیکن حکومت شاہ نے امام خمینیؒ اور ان کے حامی علماء اور طلباء کو سبق سکھانے کا تہیہ کر لیا اور ۲۲ مارچ ۱۹۶۳ء کو مدرسہ فیضیہ قم پر فوج نے ہلہ بول دیا۔ جون ۱۹۶۳ء کو امام خمینیؒ نے قم میں خطاب کیا اور شاہ ایران کی اسرائیل نوازی پر شدید تنقید کی، بادشاہ کی فوج اور پولیس نے امام خمینیؒ کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ صبح کے وقت آپ کو گرفتار کر کے تہران لے جایا گیا۔ ۵ جون ۱۹۶۳ء کو پورے ملک میں اس گرفتاری پر احتجاجی مظاہرے ہوئے اور قم میں جلوس پر سکیورٹی فورسز نے گولی چلا دی جس سے ہزاروں لوگ شہید ہو گئے۔ ایران اور دوسرے ممالک میں شاہ ایران کے خلاف احتجاجی مظاہرے پوری شدت کے ساتھ شروع ہو گئے اور بالآخر شاہ ایران کو عوامی دباؤ کے تحت دس ماہ کی قید کے بعد امام خمینیؒ کو بادل نخواستہ رہا کرنا پڑا۔ ایک بار پھر حکومت ایران نے ایک ایسا منحوس بل پاس کیا کہ جس میں امریکیوں کو یہ

آزادی دی گئی کہ اگر وہ ایران میں کوئی جرم کریں تو حکومت ایران ان کو کوئی سزا نہیں دے سکے گی اور ان کا مقدمہ حکومت امریکہ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ یہ بل اتنا توہین آمیز تھا کہ امام خمینیؒ نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا اور پوری ملتِ ایران کی غیرت کو للکارا کہ اُٹھو اس ناپاک اور اہانت آمیز حکم نامہ کو پارہ پارہ کردو۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو امام خمینیؒ نے زبردست تقریر کی اور حکومت شاہ کو امریکہ کا غلام قرار دیا۔ ۴ نومبر ۱۹۶۴ء کو ایک بار پھر شاہ ایران کے فوجی کمانڈر نے امام خمینیؒ کو ان کے گھر واقع قم سے گرفتار کرلیا اور سیدھے تہران ایئرپورٹ پر لے گئے اور وہاں منصوبے کے تحت انہیں ترکی میں انقرہ لے جایا گیا اور وہاں انہیں نظر بند کردیا گیا۔''(۶۸)

آپ گیارہ ماہ تک ترکی میں رہے۔ آپ نے وہاں ''تحریر الوسیلہ'' لکھی جسے ''رسالہ عملیہ'' بھی کہتے ہیں۔ اس کتاب میں آپ نے ظالم اور استعماری حاکموں اور حکومتوں کے خلاف فلسفۂ جہاد پر روشنی ڈالی۔ آپ پر ترکی میں سیاسی خطابات، بیانات اور تحریک چلانے پر پابندی تھی مگر آپ نے کمال جرائت سے ہر جگہ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ترکی حکومت اس بات سے عاجز آگئی اور آخر کار ۱ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو آپ کو مع آپ کے فرزند مصطفیٰ خمینی کے ملک بدر کرکے عراق منتقل کردیا گیا۔ آپ نے نجف اشرف میں قیام کیا اور یہاں اسلامی فقہ اور حکومت اسلامی جیسے موضوعات پر لیکچرز دینا شروع کردیئے۔ ''ولایتِ فقیہہ'' نامی کتاب جسے ''حکومتِ اسلامی'' بھی کہا جاتا ہے اسی دوران میں لکھی گئی۔ یہاں ہزارہا ایرانی طالب علم آپ کی علمی اور سیاسی بصیرت و فراست سے سیراب ہوئے۔ آپ نے یہاں ایران کے عوام اور علماء کو بیانات تحریروں اور کیسٹوں کے ذریعہ پیغام انقلاب دینا شروع کردیا۔ اسرائیل اور عرب تنازعہ میں آپ نے کھل کر فلسطین کی حمایت کی جب کہ امریکہ نواز شاہ نے اسرائیل کو تسلیم کر رکھا تھا اور وہ اسرائیل کی پشت پناہی کرتا تھا۔ ادھر ایران میں اسلامی انقلاب کے حامیوں پر عرصۂ حیات تنگ کردیا گیا تھا اور شاہ ایران کی رسوائے زمانہ ایجنسی ''ساواک'' لوگوں کو زندانوں میں ڈال کر بے دریغ قتل کررہی تھی ایسے میں امام خمینیؒ کے بڑے فرزند سیّد مصطفیٰ خمینی کو بادشاہ کے گماشتوں نے ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو شہید کردیا جس پر سارے ایران میں تحریک چل نکلی۔ اسی اثناء میں تہران سے ایک روزنامے نے امام خمینیؒ کے خلاف نازیبا مضمون شاہ ایران کے ایماء پر شائع کیا۔ اس مضمون کے

شائع ہوتے ہی جلتی پر تیل کے مصداق عوام کے غیض وغضب میں اضافہ ہوگیا۔ ۹ جنوری ۱۹۷۸ء کو قم کے اندر عوام نے شدید احتجاج کیا اور حکومتِ شاہ کے خلاف مظاہرہ کیا دیکھتے ہی دیکھتے انقلاب کی یہ چناری شعلہ جوالہ بن گئی اور اس نے سارے ایران کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ عوام شاہ کی مغرب نوازی اور ظلم وستم سے بیزار تھے وہ انقلاب اسلام کے لئے سر پر کفن باندھ کر میدان جہاد میں کود پڑے۔ شاہ ایران نے گیارہ بڑے شہروں میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور فوج کو حکم دیا کہ تحریک انقلاب اسلامی کو کچل دیا جائے، اس نے وزیر اعظم کو بھی بدل دیا، کئی افسروں کو معطل کر دیا اور خونخوار اور ظالم قسم کے افسران مقرر کئے مگر ان تمام چیزوں کے باوجود انقلاب کی آگ بھڑکتی چلی گئی۔ ایران اور عراق کے وزرائے خارجہ نے نیویارک میں فوری ملاقات کر کے یہ فیصلہ کیا کہ امام خمینیؒ کو عراق سے فوراً نکال دیا جائے۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۷۸ء کو نجف اشرف میں امام خمینیؒ کے گھر کو عراقی سپاہ نے گھیرے میں لے لیا، آپ کو نظر بند کر دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ سیاسی سرگرمیاں فوراً ترک کر دیں۔ آپ کے انکار پر ۴ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو ۱۳ سالہ قیام نجف کے باوجود آپ کو کویت منتقل کرنے کا پروگرام بنا مگر حکومت کویت نے امام خمینیؒ کے داخلہ پر پابندی لگا دی۔ امام خمینیؒ آخر کار پیرس میں قیام کا فیصلہ کیا اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو پیرس پہنچ گئے۔ آپ نے نوفل لوشاتو میں جو کہ پیرس کے مضافات میں ایک قصبہ ہے، رہائش اختیار کی۔ شاہ نے فرانس کی حکومت پر زور دیا کہ وہ امام خمینیؒ کی سیاسی سرگرمیوں پر نظر رکھے اور انہیں وہاں سے نکال دے۔ امام خمینیؒ نے فرانس کے کار پردازوں پر واضح کر دیا کہ وہ آزادی اور جمہوریت کی جنگ لڑ رہے ہیں اور یہ ان کا انسانی حق ہے۔ ایران میں تحریک نے زور پکڑا۔ بادشاہ نے ایک وزیر اعظم کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا بدلا لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ حتیٰ کہ بادشاہ نے سیاسی قیدی بھی رہا کر دیئے اور کئی مراعات دینے کا اعلان کیا مگر اب پانی سر سے گذر چکا تھا۔ امام خمینیؒ نے انقلابی کونسل کی تشکیل کا اعلان کر دیا اور اس کے اراکین بھی نامزد کر دیئے۔ ۱۶ جنوری ۱۹۷۹ء کو بادشاہ یہ کہہ کر کہ وہ بیمار ہے اور اسے آرام کی ضرورت ہے ملک سے فرار ہوگیا۔ یکم فروری ۱۹۷۹ء کو پیرس سے امام خمینیؒ تہران کے مہر آباد ایئر پورٹ پر جہاز سے اُترے۔ ایک جم غفیر ان کے استقبال کے لئے موجود تھا اور ہر طرف سے یہ صدا آرہی تھی کہ ''شاہ رفت و امام آمد''۔ چودہ سال کی جلاوطنی کے بعد امام خمینیؒ ایران وارد ہوئے۔ ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء نوروز یا یوم مستضعفین

اور یومِ انقلاب قرار دیا گیا۔(٦٩)

## ایران میں تحریکِ اسلامی اور امام خمینیؒ کا تحریکی کردار

امام خمینیؒ کے چار خصوصی اقدامات اور بنیادی تحریکیں سیاسی و دینی افکار کے احیاء کا باعث بنیں اور سیاسی اسلام کو بھرپور انداز سے ایران کے سیاسی اور معاشرتی میدان میں نافذ کیا جن کے نتیجے میں آگے چل کر ان کی غیر متنازع اور با اختیار قیادت کی راہ ہموار ہوئی۔ وہ چار تحریکیں یہ ہیں:

۱- روحانیت و علماء دین کا ظلم و ستم، اغیار کا بھروسہ اور شہنشاہی ظلم و ستم کے خلاف مبارزت اور مزاحمت کو نمایاں کرنا۔

۲- دین کے نظریاتی پہلوؤں کو نمایاں کرنا اور اسلام کو ایک باصلاحیت سیاسی مکتب کے طور پر بتدریج روشناس کرانا۔

۳- ایرانی معاشرے کے دینی اعتقادات اور روایتی ثقافت پر مبنی شہنشاہی حکومت کی جگہ لینے کے لئے متبادل منصوبہ پیش کرنا۔

۴- شاہ کے تمام مخالفین کی اصلاح پسندانہ حکمت عملیوں کے مقابلے میں انقلابی روش اختیار کرنا۔

## علماء کی بیداری

امام خمینیؒ نے ٦٣-١٩٦٢ء کے سالوں میں حکومت کے خلاف واضح اور ٹھوس موقف اختیار کرتے ہوئے عام پبلک میں حکومت پر براہِ راست تنقید کی۔ یہ چیز گزشتہ چند صدیوں کے اندر علمائے دین کی طرف سے حکومت کے خلاف پہلا براہِ راست ٹکراؤ تھا۔ صفویہ دورِ حکومت میں ایران میں علماء کے طبقے کی باقاعدہ تشکیل کے زمانے سے لے کر اس زمانے تک علماء کا حکومت کے خلاف طرزِ عمل مخلوط تھا وہ کبھی تو حکومت کی تائید کرتے اور کبھی اس کی پالیسیوں کی مخالفت کرتے۔ بہر حال نہ تو فکری اور نہ ہی عملی لحاظ سے وہ ایران میں اصل حاکمیت کے لئے کوئی خطرہ پیدا کرتے تھے۔ علماء کا ''تحریک مشروطہ'' میں حصہ لینا بھی شاہ یا سلطنت کی

واشگاف مخالفت نہ تھی بلکہ یہ تو حکومت کے اختیارات کو محدود کرنے کی جدوجہد تھی۔ یعنی شاہ ہنوز رہے لیکن مخصوص اور نئی شرائط کے تحت حکومت کرے۔ چنانچہ شاہ سر تر حکومت پر متمکن رہے اور آئین کے خلاف انہوں نے پرانی استبدادی روایات کو جاری رکھا۔

۵۳-۱۹۵۱ء میں تیل قومیائے جانے کی تحریک کا حقیقی ہدف بھی مسلمانوں کی تقدیر کے فیصلوں پر سے غیر طاقتوں کے تسلّط کو ختم کرنا تھا نہ کہ نظام شاہی کی بساط اُلٹنا تھا۔ چنانچہ شہنشاہی نظام کی کھلم کھلا مخالفت نہ ہوئی بلکہ انگریز اور ان کی طرف سے ایرانی سیاست و معیشت کا استحصال اصل ہدف تھے۔ اس طرح سے جون ۱۹۶۳ء تک تقریباً ایک صدی علماء مذہب اور مذہبی طاقتوں کا ایران کے سیاسی معاشرتی میدان میں بطور واضح اور ٹھوس کردار رہا لیکن کبھی بھی منظّم شکل اختیار نہ کی اور نہ ہی ایران کے سیاسی نظام میں بنیادی تبدیلیوں کے لئے میدان میں نکلیں. پہلی بار فدائین اسلام کی تشکیل سے مذہبی طاقتیں منظّم شکل میں سامنے آئیں اور ان کا مقصد حکومت اور ایرانی معاشرے میں جزوی اور سرسری اصطلاحات کرنا تھا لیکن باوجود اس کے کہ ایک روحانی و علمی شخصیت اس کے رہنما تھی۔ فدائیانِ اسلام لوگوں کو متحرک کرنے کے سلسلے میں ضروری اثر ورُسوخ اور ساکھ نہ رکھتے تھے۔

۱۹۵۳ء کی فوجی بغاوت اور مذکورہ تنظیم کی باقیات کی سرکوبی کے بعد مذہبی طاقتوں کی جدوجہد کے لئے واحد کھلا راستہ بھی جلد ہی بند ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس واقعہ کے ایک عشرے کے بعد قم کے ایک نسبتاً کم مشہور لیکن باہمت مرجع کی تقریر کے بعد مذہبی طاقتوں کی جدوجہد کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس نوع کے واقعہ کا سیاسی اور معاشرتی پس منظر اسٹیج پر دو خاص منظّم قوتیں یعنی بائیں بازو کی مارکسٹ طاقتیں جو تودہ پارٹی میں متحد تھیں اور قوم پرست لبرل طاقتیں جو قومی محاذ میں اکٹھی تھی بتدریج مضمحل ہوتی چلی گئیں۔ ان دو اہم عناصر کے مٹ جانے کی دو طرح سے توجیہہ کی جاسکتی ہے:

۱- شاہ کی حمایت یافتہ حکومت کی طرف سے ان کی شدید سرکوبی۔

۲- لوگوں کو ان کے پیش کردہ سیاسی و معاشرتی مسائل کے حل کے راستوں سے مایوسی اور ان کا ساتھ چھوڑ دینا کیونکہ ان کی ایک تعداد شاہ کی حکومت کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔

فوجی بغاوت کے ایک عشرے بعد مذہبی طاقتوں کی حالت ایک لحاظ سے اس بغاوت سے پہلے والی حالت سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ وہ جس تیزی سے آیت اللہ کاشانی کے گرد جمع ہوئے تھے اسی تیزی سے منتشر ہو گئے۔ اسلامی قوتیں تحریک کو فعال، مستحکم اور جاری وساری رکھنے کے لئے ضروری تنظیم اور یک جہتی نہ ہونے کے باعث ابتری کی حالت میں تھیں۔ ان میں سے بعض قوتیں تو قومی محاذ کی مذہبی شاخ، جو تحریک آزادی ایران کے عنوان سے متحد ہوئی تھیں، کے ساتھ شامل ہو گئیں اور بہت سی دوسری قوتوں نے پراگندہ اور تتر بتر حالت میں اپنی جدوجہد کو جاری رکھا۔ لیکن امام خمینیؒ کی ۶۳-۱۹۶۲ء کی تحریک جوان کی مقناطیسی شخصیت اور دینی طاقتوں کی قوت کو اپنی ذات میں جذب کر کے انہیں درست سمت دینے کے نتیجے میں وجود میں آئی، اس قدر عظیم عوامی دینی تحریک تھی جو ایک سال سے کمتر عرصے میں حاصل ہوئی دینی قوتوں کے اتحاد وانسجام کا محور قرار پائی۔ اس سے پہلے کے علماء دین کے موقف کے برعکس ۱۹۶۲ء میں امام خمینیؒ کے موقف کا ایک اپنا ہی انداز تھا۔ فروری ۱۹۶۲ء میں انہوں نے ایک بیان کے ذریعے پوری صراحت اور یقین کے ساتھ شاہ کے سفید انقلاب کے ریفرنڈم کو دھونس اور آئین میں اسلام سے متعلق مواد کو خارج کرنے کا پیش خیمہ اور اسے حرام قرار دیا۔ اسی سال مارچ میں جب شاہ نے ویزفل کی چھاؤنی میں علماء دین کے خلاف بڑی سخت تقریر کی۔

امام خمینیؒ نے بھی طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے طولانی مدت اہداف ومقاصد اور جوابی طور پر علمائے دین کی طرف سے سخت شرائط کا خلاصہ یوں پیش کیا:

''اپنے آپ کو قتل ہونے، جیل چلے جانے اور فوجی ڈیوٹی پر بھیجے جانے کے لئے تیار کریں۔ مار پیٹ، توہین اور ان مصائب وآلام کا جو اسلام اور آزادی کے دفاع کی راہ میں پیش آتے ہیں، سامنا کرنے کے لئے تیار کریں۔ اپنے آپ کو تیار کریں اور استقامت دکھائیں۔'' (۷۰)

اگلے اقدام میں امام خمینیؒ نے شاہ کے خلاف آشکار اور ملک گیر سطح پر مقابلے کے لئے ۱۹۶۳ء کے نوروز میں عام سوگ منانے کا اعلان کر دیا اور مختصر مدت میں یہ عبارت ''اس سال مسلمانوں کی کوئی عید نہیں ہے'' ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔ امام خمینیؒ نے سخت الفاظ کے ذریعے جابر حکومت کو وارننگ دی۔ حکومت شاہ نے اس اقدام کا فوری جواب دیا۔

اس سال مدرسہ فیضیہ میں امام جعفر صادقؑ کی شہادت کے مراسم پر شہنشاہی فورس نے حملہ کر دیا۔ امام نے بھی اس تشدد اور قتل اور غارت کا بے مثال اور بے خوف وخطر جواب دیا۔

امام خمینیؒ نے اپنے بیان میں فرمایا:

''شاہ سے دوستی کے معنی ہیں قتل و غارت گری، اسلام کی توہین اور مسلمانوں کے حقوق پر تجاوز اور جارحیت علم و دانش کے مرکز پر جارحیت۔''

یہ بیان شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے ان الفاظ پر ختم ہوا:

''میں نے تمہارے گماشتوں کی سنگینیوں کے آگے سینہ تان دیا ہے لیکن بدمعاشوں، غنڈہ گردیوں اور تمہاری دھونس کے سامنے تواضع اور خضوع اختیار کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گا۔ اے شہنشاہ! اے جناب شاہ! میں تجھے نصیحت کرتا ہوں ان اعمال اور اس طرزِ عمل سے دست بردار ہو جاؤ مجھے پسند نہیں ہے کہ اگر ایک دن تیرے ارباب و آقا چاہیں کہ تو چلا جائے تو لوگ شکر ادا کریں۔ میں نہیں چاہتا تو اپنے باپ کی طرح ہو جائے اے بدبخت، عاجز! تیرے عمر کے پنتالیس سال گذر چکے ذرا سوچ کچھ تدبر و تفکر کر، ذرا عاقبت کو دیکھ، کچھ عبرت حاصل کر اپنے باپ سے عبرت لو۔''(۱۷)

امام خمینیؒ نے شاہ پر ٹھوس اور واضح اور بھرپور حملے کیے مبارزہ اعلانیہ ہو گیا تھا۔ ان کے اس طرزِ عمل اور ٹکراؤ سے شاہ کی ہیبت کا بت پاش پاش ہو گیا اور مذہبی طاقتیں ہر شخص اور ہر دور سے زیادہ بہادر اور طاقتور بن کر میدانِ عمل میں آ گئیں۔ اس بے پرواہی کا عینی نتیجہ اور مذہبی طاقتوں کے حکومتی مشینری سے مقابلے کے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہونے کا عملی مظاہرہ جون ۱۹۶۳ء بمطابق ۱۳۴۲ھ میں ہوا۔

اس تحریک نے مذہبی قوتوں کو ایک آزاد تشخص عطا کیا اور یہ احساس بیدار ہوا کہ وہ ایک قابلِ اعتماد، آزاد سیاسی اور معاشرتی طاقت ہیں۔ ایسی طاقت جس کا دوسری تمام سیاسی اور معاشرتی تحریکوں سے ایک واضح فرق تھا۔ ۱۵ خرداد کے قیام نے انہیں ضمنی اور نسبی خود اعتمادی بخشی کہ ان کے اندر عظیم طاقت چھپی ہے اور

اس عظیم طاقت کے ذریعے شاہ کی حکومت سے بھرپور مقابلے کو منظّم کرنے پر قادر ہیں۔

اب ڈھکے چھپے عمل کا زمانہ گذر چکا تھا۔ اب سب کے سب امام خمینیؒ کے محور کے گرد جمع ہو کر ان کی روش اور سلیقے کے مطابق شاہ کی حکومت کے خلاف کوشش کر سکتے تھے۔

## دین کے نظریاتی پہلوؤں کی اشاعت

شیعوں کے مرجع تقلید اور مسلمان جانبازوں کے پیشوا کے طور پر امام خمینیؒ کے گرد مذہبی طاقتوں کے اجتماع کے بعد اب اسلام کی معاشرتی و سیاسی توانائیوں کو متعارف کرنے کی باری تھی۔ اس عظیم کام کا خود امام کے ذریعے آغاز ہوا۔ ان کے شاگردوں اور تمام مسلمان مفکرین کے ذریعے جاری رہا۔ مسلمان مفکرین نے دین اسلام کے سیاسی و معاشرتی پہلوؤں اور صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کا کام شروع کر دیا۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں وہ مختلف فکری، جہادی، مکاتب اور طالب علموں اور یونیورسٹی کے جوانوں میں سے مؤثر اور فعال قوت کو نکھارنے میں مشغول تھے۔ اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ معاشرے کی ان قوتوں کو قانع کرنے کے لئے دین کی نئی تشریح کی جاتی۔ موجودہ زمانے کی زبان میں زمانے کی ضرورتوں کا جواب دینے کے لئے دین کی توانائیاں ثابت کی جاتیں۔ ان دینی قوتوں کی جدوجہد کے نتیجے میں دینی قیادت کے ۱۹۷۸-۷۹ء میں عظیم تر مقاصد پر دستیابی اس بات کو بخوبی ظاہر کرتی ہے کہ مسلمان مفکرین نے اسلام کو ایک پر جستجو اور باصلاحیت نظریہ کے طور پر متعارف کرنے میں کتنی عظیم کامیابی حاصل کر لی تھی۔ پیش کردہ اسلامی آئیڈیالوجی موجودہ معاشرتی طاقتوں کو حرکت کے لئے ضروری ہمہ گیری اور یک جہتی سے بہرہ مند تھی۔ مذہبی طاقتوں نے اسلامی تاریخ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس دین کے سیاسی ہونے کو ثابت کیا اور یہ کر دکھایا کہ سیاسی اسلام انسانی معاشرے اور تاریخ کے بارے میں اپنا ایک خاص نظریہ رکھتا ہے۔ اس نظریے میں ایک مسلمان انسان نہ صرف اپنا ذمّہ دار بلکہ اپنے معاشرے کا بھی ذمّہ دار ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں مسلمان انسان اپنے معاشرے اور اسلامی اُمّہ کی تقدیر کے سلسلے میں خاموش اور بے پرواہ نہیں رہ سکتا۔

## اسلامی حکومت کی نقشہ بندی

اس بات کا دعویٰ جرات وشجاعت سے کیا جاسکتا ہے کہ تحریک انقلاب اسلامی ایران کی اہم ترین خصوصیت میں سے ایک اور استعمار کے خلاف ایرانی عوام کے طویل مقابلے کے دوران مذہبی قوتوں کی دوسری تمام رقیب قوتوں پر تفوق و برتری کا موٴثر ترین عامل امام خمینیؒ کا حکومت کے لئے جدید اور نیا منصوبہ تھا .مذہبی قوتوں کی تحریک مبارزہ کو آسانی سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔یعنی امام خمینیؒ کے نظریہ حکومت سے قبل اور اس کے بعد کے زمانوں میں اور ایران کی تاریخ میں اس بات کی کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔

ٹھیک اسی زمانے میں جب حکومت سے مبارزہ ومقابلہ کرنے والی رقیب طاقتیں زوال کے مرحلے سے گذر رہی تھیں اور حکومت پٹرول ڈالر اور اپنی فورس کے سہارے خود کو مستحکم ترین حالت میں سمجھتی تھی۔امام خمینیؒ نے شہنشاہی سسٹم کو قدیم ،فرسودہ، ناکارہ اور ظالمانہ قرار دیا اور ولایت فقیہ کی بنیاد پر اسلامی حکومت کے نظام کو ایک جانشین سیاسی نظام کے طور پر پیش کیا۔

معاصر ایرانی تاریخ میں سالہا سال کا اولین مبارزاتی اسٹائل ایرانی مبارزین اور مخالفین کی وہ روش تھی جو کبھی بھی کسی خاص نتیجے تک نہ پہنچ سکی۔اس امر کا سبب حکومت کی نااہلی ومطلوب حکومتی معیاروں سے ازحد انحراف وکجی اور اس مبارزاتی روش اور طرز کا اصیل اور حقیقی نہ ہونا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ سلطنتی حکومتی مشکلات کی جڑیں اس کے اپنے بنیادی مفاسد میں تھیں۔اس کے خاص عیبوں میں سے ایک شاہ کے رژیم کا اغیار کے مکاتب اور پالیسیوں پر بھروسہ تھا۔ان مشکلات ومصائب کا بنیادی ہونا ہر قسم کی تعمیری اور اصلاح طلب تحریکوں کے ثمر دار ہونے کی راہ میں مانع تھا۔دوسری طرف سے تو وہ پارٹی کی طرف سے پیش کردہ حل یعنی شاہ کی حکومت کا تختہ الٹایا جانا اور اس کی جگہ ایک مارکیسنی حکومت کا قائم کیا جانا بھی نہ تو اس سرزمین کی تاریخی حقائق پر منحصر تھا اور نہ ایران کے عوام کی ثقافت اور روایات میں اس کی جڑیں تھیں۔یہی وجہ تھی کہ وہ پارٹی اور بائیں بازو کا مارکیسنی محاذ باد جود غیر معمولی تنظیمی طاقت رکھنے کے کبھی ایرانی معاشرے میں اپنے لئے ضروری اور کافی جگہ نہ بنا سکا۔ان کی تقریروں اور اقدامات کا انعکاس روشن خیالوں کی بعض محدود لابیوں اور چند ابتر مزدور تحریکوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔

''جس وقت مذہبی قوتوں کے مجتہد اور مرجع تقلید رہنما کی طرف سے پہلی بار حکومت سلطنت کی جانشینی کا منصوبہ مورد بحث قرار پایا تو حقیقت میں ایران میں مبارزے کے جدید مرحلے اور نئی قسم کا آغاز ہوا۔ یہ اختراع و بدیعانہ اقدام مذہبی قوتوں کی مبارزاتی روایات میں بھی موجود تھا اور تمام مبارزاتی اور مزاحمتی گروہوں کی ثقافت میں بھی اور اسے تقدیر ساز فیصلہ کُن سمجھا جاتا تھا۔ اس بار مذہبی قوتوں کا مقصد شاہ کی تدریجی اصلاح کرتا نہ تھا بلکہ سلطنت شاہ کو گرانا اور پہلے سے تجویز شدہ اسلامی حکومت کو قائم کرنا تھا۔ امام خمینیؒ کی طرف سے حکومت اسلامی قائم کرنے کا منصوبہ دو خاص عوامل کی بناء پر کامیابی سے ہمکنار رہا:

پہلے ایران کے عوام کے مبارزات کا کمال کی اس منزل پر پہنچنا جہاں تمام اصلاح پسندانہ اور مصالحت آمیز راہیں پہلے سے کہیں زیادہ غلط اور بے سود محسوس ہوئیں۔

دوسرے امام خمینیؒ کی اسلامی حکومت کے منصوبے کا ایران کی قومی شناخت پر مبنی ہونا جس نے اس کی کامیابی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کو دو چند کر دیا۔''(۷۲)

پہلی بار شاہ سلطنت کی جگہ ایک ایسے حکومتی نظام کی تجویز پیش کی جا رہی تھی جو مفید اور کارآمد بھی نظر آتی تھی اور ایرانیوں کی اسلامی، قومی ثقافت میں بھی اس کی جڑیں موجود تھیں۔ یہ منصوبہ بیرونی ممالک سے درآمد شدہ نمونۂ عمل نہ تھا، اس میں نہ تو روسیوں اور مارکسٹوں کے نقش قدم تھے اور نہ ہی اس میں مغربیوں، انگریزوں اور امریکیوں کے آثار دیکھنے کو ملتے تھے۔ یہ منصوبہ ایسے اُصولوں پر تکیہ کیے ہوئے تھا جس پر ایران کے عوام عرصۂ دراز سے زندگی گذارتی چلے آ رہے تھے۔ وہ اُصول ہیں امامت، عدالت، فقاہت، تقلید وغیرہ اور اس ملکی منصوبے کے تمام اجزاء ایرانی اور مکتبِ تشیع میں سے تھے۔ یہ قیمتی خصوصیت اس منصوبے کا اہم ترین نکتۂ قوت تھی۔

''ایرانی کئی سالوں سے اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے نتیجے میں آگہی و شعور کی پختگی اور علمی استعداد میں اضافہ رہنے کے سبب اغیار کے ثقافتی تسلّط کے نیچے زندگی گذارنے کی قوت برداشت کھو رہے تھے۔ خودی کی تلاش و جستجو کی اوج، ایران کی عظمتِ رفتہ کو دوبارہ حاصل کرنے، خفت، خواری اور اغیار سے وابستگی سے نجات حاصل کرنے کے لئے عوام اور ایرانی مفکرین نے ولایت فقیہ کے حکومتی نظام کو اپنے سامنے دیکھ کر اسے بڑی آسانی

سے قبول کرلیا۔

شاہ ایران کے تمام بڑے مخالفین کی اصلاح پسندانہ حکمت عملیوں کے مقابلے میں انقلابی راہ اختیار کرنا ایک اور فیصلہ کا عنصر تھا۔ جس نے تحریک کے آخر میں امام خمینیؒ کی رہبری کو مستحکم ومضبوط ثابت کیا اور تمام مخالف سیاسی رہنماؤں کو ان کی پیروی پر مجبور کیا وہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک بے چوں وچرا انقلاب کی سیاست کی راہ اپنائی۔ جب ۷۸-۱۹۷۷ء تک عوامی احتجاجی تحریک عام صورت میں پھیلنے لگی تو کوئی بھی مبارز انقلابی گروہ اس بات کا قائل نہ تھا کہ شاہ کی حکومت کو گرایا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے ممکن سمجھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے میدان میں ٹھہرنے اور موجود رہنے کی ایسی اصلاح پسندانہ اور Conservative پالیسی اختیار کی کہ نہ تو حکومت کو زیادہ اشتعال دلائے اور نہ ہی عوامی خواہشات سے زیادہ دور ہوتے۔ یہ پالیسی اس زمانے کی ایرانی ملت کے عینی حالات اور افکار سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔ وہ واحد شخصیت جس نے حالات کا درست تجزیہ کیا اور انقلابی پالیسی کو ایران کی نجات کی واحد راہ قرار دیا امام خمینی کی تھی۔

۱۹۷۸ء کے دوران نہ اس زمانے میں جب عوام کے مبارزے ومقابلے عروج پر پہنچے اور کامرانی کی روشنی کی جھلکیاں نظر آنے لگی تھیں اور نہ ہی اس زمانے میں جب رژیم شاہ کے ہولناک قتل عام نے سانسوں کو سینوں میں بند کردیا تھا اور دل میں نا اُمیدی چھا رہی تھی ان دونوں قسم کے نظریوں میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی۔ عوام کی بھرپور تحریک کے باوجود تمام گروہ حکومت کی شدید سرکوبی سے خوف زدہ تھے اور شہنشاہی آئین کے فریم ورک میں مقابلے کے علاوہ انہیں کوئی چیز نہیں سوجھ رہی تھی۔ وہ نہ تو ایران کے لوگوں کی صحیح طاقت کا اندازہ کرسکے اور نہ ہی شاہ کی کمزوریوں اور بے بنیاد ہونے کا کوئی حقیقت پسندانہ تجزیہ کرسکے۔ وہ تنہا شخص جو ایران کے لوگوں اور اپنے مذہبی طرف داروں کی حمایت سے شاہ کے چلے جانے اور حکومت کی معزولی پر اصرار کررہے تھے وہ امام خمینیؒ ہی تھے۔ یہ ان کی انقلابی سیاست ہی تھی جو ہر گذرتے ہوئے لمحے کے ساتھ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں سڑکوں پر لا رہی تھی اور عوام کے دلوں میں ان کے ہردلعزیزی بڑھا رہی تھی۔ جب وہ عوام کے دلوں کو مسخر کرچکے اور ان کے دل خوف وخطرے سے خالی ہوگئے تو تمام گروہوں کو ان کی اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اس طرح سے امام کی انقلابی سیاست نے دوسرے مبارزوں گروہوں کو بھی اپنی

جانب جذب کیا۔ یہ قدم امام خمینی کی روش کے اوج کمال پر پہنچ جانے اوران کے انقلاب کے غیر متنازعہ رہنما بننے کا آخری مرحلہ شمار ہوتا ہے یعنی یہ کہ اس قسم کا موقف اور انقلابی راہ اختیار کیے بغیر ابتدائی طور پر اُٹھائے گئے اقدام سے اس قسم کا نتیجہ حاصل نہ ہوتا۔ وہ اقدامات ہی تھے جس نے مذہبی قوتوں کو غیر معمولی اعتبار اور حیثیت بخشی اور انہیں ان بائیں بازو مارکیسسٹی قوتوں کی نسبت جن کا دعویٰ اشتراکی انقلاب تھا، بلند ترین مقام دلایا۔ اسی موقف کی بناء پر لبرل اور قوم پرست طاقتیں جو کہ شاہ سے معاملہ کرنے میں آئین کے اندر رہ کر اقدام کرنے کا اصرار کر رہی تھیں گوشہ نشین ہو کر پس منظر میں چلی گئیں اور نہتی ہو گئیں۔"(۴۷)

ہر چند کی مارکیسسٹی قوتیں اپنے دین دشمن اعتقادات کی وجہ سے ایران کے عوام میں بنیادی طور پر کوئی جگہ نہ رکھتی تھیں اور مغرب پرست لبرل قوانین بھی تاریخ کے مختلف ادوار میں چند بار امتحان سے گذر چکی تھیں۔ آخری ایّام میں دین کی نظریاتی طور پر پرورش یافتہ مفاہیم اپنا مطلوبہ مفہوم حاصل کر کے سودمند ثابت ہوئے اور تحریک کے قلب میں جگہ پا کر انہوں نے اپنا کردار ادا کیا۔ انقلابی سیاست نے پہلے تو ضروری تیار شدہ فکری زمین حاصل کر لی تھی امام کی انقلابی تقاریر جو دین کے نظریاتی مفاہیم ومطالب پر سوار تھیں ایران کے معاشرے اور لوگوں کے دلوں میں مکمل نفوذ اور رُسوخ پیدا کر سکیں۔ اس اقدام کی تفہیم ہی تھی جس کی وجہ سے امام خمینیؒ کا نظریہ ولائیت فقیہ سلطنتی رژیم کی جگہ لینے کے لئے سنجیدہ اور کارآمد متبادل کے طور پر ظاہر ہوا۔ خصوصاً جب کہ انقلاب کے آخری دور میں امام خمینیؒ نے حکومت اسلامی کے نعرے کو اسلامی جمہوریہ کے نعرے میں تبدیل کر کے عملاً ولائیت فقیہ کے حکومتی نظام کی شکل وصورت کو بھی واضح کر دیا۔ اس برمحل اصلاح اور کامیاب منصوبے نے امام خمینیؒ کے سابقہ اقدامات کو ایک نوع سے بلا چوں وچرا پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ انہوں نے پہلے ہی سے حکومت کے لئے اپنا منصوبہ تیار کر رکھا تھا۔ یہی امر لوگوں کے مبارزے اور اس کے آئندہ کے لئے روحانی لحاظ سے اطمینان خاطر پیدا کرتا تھا اور مبارزے کی تقاریر کے لئے یہ اُمید اور اطمینان ایک زندگی بخش اور حیاتی عنصر تھا اور کامرانی کے راہ کی روشن ہونے کا ضامن تھا۔

# انقلابی اقدامات

## آئین سازی

انقلاب کے بعد اس کی اسلامی نظریات پر تشکیل کا مرحلہ آیا تو سب سے پہلے آئین سازی کا کام ہوا۔ایران کے آئین کے تحت اسلامی نظامِ حکومت کی بنیادیں تین اُصولوں پر قائم ہوئی ہیں:

۱۔ خدا تعالیٰ کی مکمل حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسلامی شریعت کی برتری کو قائم کیا گیا۔

۲۔ عوامی رائے اور تعاون کو اہمیت دی گئی ہے۔اسلامی قانون ساز اداروں کا قیام عمل میں لایا گیا۔

۳۔ نظامِ حکومت میں اسلامی اُصولوں اور احکامات کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے یعنی ملک میں جو بھی قانون بنے وہ دین کے اُصولوں کے خلاف نہ ہو۔ملک کے تمام مالی، اقتصادی، ثقافتی، فوجی، سیاسی قوانین اسلامی اقدار و اُصولوں کے مطابق ہوں گے۔

## شورائے نگہبان کا قیام

آئین کے تحت ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جو شورائے نگہبان کے نام سے موسوم ہے۔جس کا کام یہ ہے کہ ایران کی پارلیمنٹ کے پاس کردہ قانون کو دیکھنا کہ وہ آیا اسلامی اور دستوری اساس کے مطابق ہیں۔اس کمیٹی میں چھ فقیہ اور چھ قانون دان شامل ہیں۔اس کے علاوہ دستوری اساس کی تشریح کرنا، صدر جمہوریہ کے انتخاب، مجلسِ شوریٰ کے انتخاب کی نگرانی اور صدارتی اُمیدواروں کی صلاحیت کے بارے میں توثیق کرنا بھی اس شورائے نگہبان کے فرائض ہیں۔

## شورائی عالی قضائی

عدالتی نظام کو اسلامی اُصولوں پر استوار کرنے کے لئے کونسل بنائی گئی ہے۔یہ شوریٰ پانچ ارکان پر

مشتمل ہے۔ اس آئینی عدالت کی وجہ سے ایران کا تمام عدالتی نظام اسلام کے مطابق ڈھل گیا ہے اور تمام فیصلے اسلامی قوانین کے تحت ہوئے ہیں۔

## ولایت فقیہ

اسلامی جمہوری آئین میں ایک اہم منصب قیادت ولایت فقیہ ہے۔ آئین کے تحت امام ریاست کا حاکم ہوگا جس کو ملک کی اکثریت اپنی رائے سے منتخب کرے گی۔ ولایت فقیہ کے لئے ایسے شخص کو منتخب کیا جائے گا جو عوام کے لئے قابلِ اعتماد، اسلامی قوانین کا ادراک رکھتا ہو۔ فقیہ کے اختیارات بہت زیادہ ہیں۔ مثلاً: اعلیٰ ترین عہدے دار کا تعین، مسلح افواج کے کمانڈر انچیف کا تعین اور برطرفی، پاسدارانِ انقلاب اسلامی کے کمانڈر انچیف کا تقرر اور برطرفی، قومی ملی دفاعی کونسل کی تشکیل، جنگ کے لئے حکم دینا، صدارت کو معزول کرنا وغیرہ گویا آئین کے تحت اعلیٰ ترین عہدہ ولی فقیہہ ہے۔" (۷۴)

## اسباب انقلاب

ایران میں شاہ ایران کے خلاف سیاسی جدوجہد کے اسباب پر اگر غور کیا جائے تو اس کا اصل سبب شاہ ایران کا ایران کے مذہبی اور ثقافتی احساسات اور ثقافتوں کے خلاف جارحانہ روّیہ معلوم ہوگا۔ جس نے ان کی ساری خدمات اور فوجی، ملکی اور بین الاقوامی سیاست کے میدان میں ان کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ ایران کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ ملک کی ترقی کے سلسلے میں اس کی کتنی ہی خدمات ہوں مقبولیت حاصل نہیں کر سکتی۔

سیاسی جدوجہد میں جو نعرہ سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوا اور جس نے پورے ملک کو شاہ ایران کے خلاف صف آراء کیا وہ نعرہ اسلامی نظام قائم کرنا تھا۔ اس نعرہ کی ضرب شاہی نظام پر اتنی ہی پڑتی تھی جتنی شاہ ایران کی مذہب مخالف سیاست پر اس کی ضرب پڑتی تھی۔ شاہ ایران اور ان کے ہم نشینوں کی مغرب کی غلامی کے نتیجہ میں پیدا ہو رہا تھا۔

ان وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے مشہور تاریخ دان سیّد ابوالحسن ندوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

''دراصل شاہ ایران کی تربیت غیر اسلامی ماحول میں ہوئی تھی ،مغرب کی ثقافت اوراس کے تصوّرِ حیات کو ایران میں رائج کرنا چاہتے تھے اور ایران کو اسی رنگ میں رنگنا چاہتے تھے،انہوں نے اپنے عہد میں ایسے اقدامات کیے جن سے مذہبی رہنماؤں کو اس کا پوری طرح سے اندازہ ہوگیا کہ وہ ایران سے مذہبی رجحان کو پوری طرح سے مٹانا اور اسلامی شخصیت کو ختم کرنا چاہتے ہیں، یہودیوں پر پورا اعتماد کر کے انہوں نے ملک کا نظام اسلام دشمن طاقتوں کے ہاتھوں میں دے دیا تھا.قوم کا اسلام سے رشتہ ختم کرنے کے لیے جس طرح مصر کے حکمرانوں نے اپنا فراعنہ سے انتساب کیا تھا اسی طرح شاہ ایران نے اپنا انتساب اور دیگر قدیم مذاہب سے کیا۔ ایرانی عوام ہمیشہ سے اپنے علماء سے وابستہ رہے ہیں اس لیے شاہ ایران کی ترقی پسندانہ پالیسیوں کی سب سے زیادہ مخالفت کو طرف سے ہوئی۔''

علماء کے اثر کو ختم کرنے کے لیے شاہ ایران نے اوقاف کے نظام میں تبدیلی کی بالآخر علماء کو جلاوطن کر دیا۔ بڑی تعداد میں علماء گرفتار کر لیے گئے اور اسلام کے احیاء کے لیے جدوجہد کرنے والوں کو سزائیں دی گئیں اور ہزاروں کی تعداد میں جانی نقصان ہوا لیکن اس تشدد نے عوام کے جذبات میں اور شدت پیدا کر دی. پھر آیت اللہ خمینی کی قیادت میں جو پیرس میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے تھے، ایرانی عوام نے عظیم قربانی دے کر شاہ ایران کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور یکم مارچ ۱۹۷۹ء کو ایران میں اسلامی حکومت کی بنیاد پڑی۔(۷۵)

## آیت اللہ خمینی کے نظریات

جیسا کہ پہولی دور میں حالات اسلام کے خلاف پیدا ہوئے اور مغربی امپیریلزم (شہنشاہت) اور سیکولرازم نے مل کر ایران میں مسلمانوں کے خلاف صف آرائی کر لی تھی اور شاہ ایران نے ہر جگہ پر مسلمان اور ان کے علماء اور عام لوگوں سے اُلجھنے اور ان کی راہ کو روکنے کی کوشش کی۔ درج بالا سطور سے یہ واضح ہوا کہ امن

وسلامتی کے علم برادارن ایشیا وسط ایشیا غرض ہر جگہ پر اسلامی تحریک کی شکل میں موجود تھے۔

آیت اللہ خمینی جو ایرانی انقلاب کے رُوح رواں تھے، اسلام کے بارے میں نقطۂ نظر رکھتے وہ در اصل سیاسی رہنما ہیں جن کی تحریک کی اساس اسلامی ہے۔ان کا تصوّر دوسرے علماء سے مختلف ہے وہ عبادت سے زیادہ اجتماعی تشکیل کو چاہتے ہیں، عبادات کا تصوّر ان کے نزدیک اسلامی تعلیمات میں موجود ہے اور اسلام کا وہ جزو زندگی میں ہر دور میں جاری ونافذ رہا ہے لیکن زندگی میں انقلاب ان کے نزدیک سیاسی شعور اور اجتماعی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ان کے نزدیک حکمران چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم عبادات کو اسی لیے بے خطر سمجھتے ہیں اس کے مقابلے میں سیاسی شعور کو اپنے لیے خطرناک سمجھتے ہیں۔آیت اللہ خمینی از پنی کتاب اسلامی حکومت میں اس کی وضاحت کرتے ہیں۔کہتے ہیں کہ:

> ''شہنشاہیت یا سامراجیت کی یہ کوشش ہے کہ ہم صرف روزہ نماز کرتے رہیں اور ہماری زندگی میں اسلام صرف عبادات تک محدود رہے تا کہ ہمارا اس سے کبھی سیاسی ٹکراؤ نہ ہو۔یہ امپیریلزم ہم کو دعوت دیتا ہے کہ ہم نماز پڑھتے رہیں جتنا چاہیں صبح شام اور ہمارے پٹرول پر اس کا قبضہ رہے، ہماری نماز سے اس کا کوئی نقصان نہیں ہے اگر ہمارے بازار اس کے مال کے لیے، ہمارا سرمایہ اس کے تاجروں کے لیے اور مصنوعات کے لیے وقف ہو،اسی لیے حملہ آوروں نے اپنے قوانین، اپنا نظام ہم پر تھوپ دیا اور ہم کو یہ بہلا وادیا کہ اسلام زندگی کے لیے ناقابلِ عمل ہے وہ ہمارے سماج کی اصلاح نہیں کرسکتا وہ کوئی حکومت نہیں چلا سکتا۔
>
> چند فقہی مسائل، بیماریاں یا میاں بیوی کے تعلقات جیسے مسائل ہی اسلام حل کرسکا ہے۔ہماری ساری زندگی کے مسائل کا سبب ان کے نزدیک اسلامی تعلیمات ہیں اس لیے کہ ان میں ان کے نزدیک زندگی کے مسائل کا حل نہیں ہے۔اس لیے اسلام سے دستبرداری کے بغیر زندگی کے قافلہ کا ساتھ نہیں دیا جاسکتا۔''(۷۶)

# حواشی وحوالہ جات (باب سوم)

(۱) پروفیسر مظفر حسین ملاٹھوی، پاکستان کے تعاقب میں، طاہر سنز کراچی، ۱۹۹۸ء، ص:۱۵

(۲) ثروت صولت، ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، مارچ ۱۹۸۸ء، ج:۲، ص:۳۹۷

(۳) مریم جمیلہ، اسلام ایک نظریہ ایک تحریک، میٹرو پرنٹرز لاہور، جون ۱۹۸۶ء، ص:۱۹۲

(۴) ایضاً، ص:۹۶

(۵) Muhammad Iqbal, Sir. The construction of religious thoughts in Islam. Lahore. 1960 Pg-9.

(۶) ڈاکٹر معین الدین عقیل، مسلمانوں کی جدوجہد آزادی، مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور، مارچ ۱۹۸۱ء، ص:۱۷

(۷) مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تجدید واحیائے دین، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۷۱ء، ص:۹۰

(۸) مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تفہیمات اسلامک پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۷۰ء، ص:۱۰۱

(۹) ایضاً، محولہ بالا، ص:۲۰۰ تا ۲۰۱

(۱۰) مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تجدید واحیائے دین، ص:۴۵

(۱۱) قمر احمد عثمانی، برصغیر میں دعوت دین کی تحریکیں، دعوہ اکیڈمی اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص:۱۲۰

(۱۲) ایضاً، محولہ بالا، ص:۱۲۳

(۱۳) مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا شاہ ولی اللہؒ اور انکی سیاسی تحریک، سندھ ساگر اکیڈمی لاہور، ۲۰۰۲ء، ص:۳۶

(۱۴) مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، مجلس نشریات اسلام کراچی، ۱۹۸۵ء، ج:۵، ص:۹۸

(۱۵) ثروت صولت، ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، محولہ بالا، ص:۳۹۸

(۱۶) ایضاً، محولہ بالا، ص:۳۹۹

(۱۷) پروفیسر ابصار عالم، تحریک احیائے اسلام، حرا پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۸۹ء، ص:۴۷

(۱۸) مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، ج:۵، ص:۱۳۲

(۱۹) پروفیسر ابصار عالم، تحریک احیائے اسلام، ص:۶۵

(۲۰) القرآن (۳۳:۲۱)

(۲۱) ایضاً (۳:۳۱)

(۲۲) الحدیث: مستدرک حاکم

(۲۳) مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تجدید واحیائے دین، محولہ بالا، ص:۸۹

(۲۴) مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، مکاتب شاہ اسمٰعیل، ص:۵۳ تا ۵۵

(۲۵) مولانا غلام رسول مہر، سیّد احمد شہید، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص:۵۶

(۲۶) قمر احمد عثمانی، برصغیر میں دعوت دین کی تحریکیں، ص:۱۴۰ تا ۱۴۱

(۲۷) امیر الروایات، وقائع احمدی، لاہور پرنٹنگ پریس، ۱۹۵۰ء، ص:۳۱

(۲۸) محمد سلیمان فرخ آبادی، کربلا سے بالاکوٹ تک، مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور، س ن، ص:۱۸۷

(۲۹) قمر احمد عثمانی، برصغیر میں دعوت دین کی تحریکیں، ص:۱۵۱

(۳۰) ایضاً، محولہ بالا، ص:۱۵۹

(۳۱) مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا شاہ ولی اللہؒ اور ان کی سیاسی تحریک، محولہ بالا، ص:۶۳

(۳۲) قمر احمد عثمانی، برصغیر میں دعوت دین کی تحریکیں، ص:۱۶۹

(۳۳) عبدالرشید عراقی، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، نور اسلام اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۹ء، ص:۸۵

(۳۴) محمد اقبال سلیم گاہندری، مقام جمال الدین افغانی، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۴۵ء، ص:۲۵

(۳۵) ایضاً، محولہ بالا، ص:۴۰

(۳۶) القرآن، (۵:۵۴)

(۳۷) ڈاکٹر احمد امین مصری، چند نامور مسلم شخصیات، لاہور، المنار بک سینٹر، ۱۹۹۱ء، ص:۷۸

(۳۸) القرآن (۹:۱۲۲)

(۳۹) ڈاکٹر احمد امین مصری، چند نامور مسلم شخصیات، ص:۸۰

(۴۰) القرآن،(۸:۶۰)

(۴۱) ایضاً،(۱۰:۴۹)

(۴۲) ایضاً،(۲:۱۴۱)

(۴۳) مریم جمیلہ، اسلام ایک نظریہ ایک تحریک، محولہ بالا، ص:۲۳۴

(۴۴) المتنبی شاعر، دیوان متنبی، لاہور پرنٹنگ پریس، س ن، ص:۲۶

(۴۵) القرآن،(۶-۹۴:۵)

(۴۶) ڈاکٹر احمد امین مصری، چند نامور مسلم شخصیات، محولہ بالا، ص:۱۰۰

(۴۷) ایضاً، محولہ بالا، ص:۱۰۵

(۴۸) مریم جمیلہ، اسلام ایک نظریہ ایک تحریک، محولہ بالا، ص:۲۳۶

(۴۹) محمد اقبال سلیم گاہندری، مقام جمال الدین افغانی، ص:۴۵

(۵۰) ڈاکٹر امین مصری، محولہ بالا، ص:۱۰۹

(۵۱) ایضاً، محولہ بالا، ص:۱۱۳

(۵۲) سیّد محمد سلیم، تاریخ نظریہ پاکستان، ادارہ تعلیمی تحقیق و تنظیم اساتذہ پاکستان لاہور، س ن، ص:۵۸

(۵۳) ثروت صولت، ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ج:۳، ص:۹۴-۹۵

(۵۴) مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، دستور جماعت اسلامی پاکستان، ۱۹۵۰ء، ص:۳۳

(۵۵) خلیل احمد حامدی، تحریک اسلامی کے عالمی اثرات، ادارہ معارف اسلامی لاہور، ۱۹۹۰ء، ص:۱۷۵

(۵۶) ایضاً، محولہ بالا، ص:۱۸۲

(۵۷) سیّد محمد سلیم، سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، فاران نشریات لاہور، س ن، ص:۶۰

(۵۸) ہفت روزہ ایشیا، لاہور، ستمبر ۱۹۹۲ء

(۵۹) سیّد محمد سلیم، سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ص:۶۸

(۶۰) سلیم منصور خالد، البدر، ادارہ مطبوعات طلبہ لاہور، ۱۹۸۰ء، ص:۱۲۰

(۶۱) شیخ محمد رفیق، تاریخ پاکستان، لاہور پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۰ء، ص:۶۵

(۶۲) ہفت روزہ فرائیڈے اسپیشل، نومبر ۱۹۸۹ء

(۶۳) ماہنامہ ہمقدم، شہداء نمبر، ادارہ مطبوعات طلبہ لاہور، فروری، مارچ ۱۹۸۹ء

(۶۴) ہفت روزہ فرائیڈے اسپیشل کراچی، نومبر ۱۹۸۹ء

(۶۵) ماہنامہ آئین لاہور، اگست ۱۹۹۴ء

(۶۶) جسارت میگزین کراچی، نومبر ۱۹۹۵ء

(۶۷) ہفت روزہ فرائیڈے اسپیشل کراچی، اپریل ۱۹۹۳ء

(۶۸) سیّد اسعد گیلانی، انقلاب ایران، اسلامک انٹرنیشنل لاہور، ۱۹۸۲ء، ص: ۲۵

(۶۹) سیّد اسعد گیلانی، سفرنامہ ایران، اسلامک انٹرنیشنل لاہور، ۱۹۸۴ء، ص: ۶۲

(۷۰) سیّد اسعد گیلانی، سفرنامہ ایران، ص: ۱۴۰

(۷۱) امام رُوح اللہ خمینی، اسلامی حکومت، اسلامک انٹرنیشنل لاہور، ۱۹۸۵ء، ص: ۲۳

(۷۲) حافظ محمد سجاد، اسلامی تحریکات عہد جدید میں، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص: ۲۸۰

(۷۳) سیّد اسعد گیلانی، انقلاب ایران، ص: ۴۲

(۷۴) سیّد سبط حسن، انقلاب ایران، مکتبہ دانیال کراچی، ۱۹۸۰ء، ص: ۲۱۶

(۷۵) سیّد اسعد گیلانی، سفرنامہ ایران، ص: ۱۱۶

(۷۶) امام رُوح اللہ خمینی، اسلامی حکومت، اسلامک انٹرنیشنل لاہور، ۱۹۸۵ء، ص: ۱۱۲

# باب چہارم

# دیگر ممالک میں اسلامی تحریکیں

## (یورپ، افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ)

فصل اوّل : سوڈان

فصل دوم : ترکی

فصل سوم : الجزائر کی تحریک

فصل چہارم : بوسنیا

فصل پنجم : کوسوہ

فصل ششم : فلسطین

فصل ہفتم : چیچنیا کے مسلمانوں کی جدوجہد

لیبیا
مصر
ریاض
سعودی
عرب
یمن
چاڈ
سوڈان
وادی حلفا
ڈونگولا
بربر
کسلا
خرطوم
عبدالرحمن
الابیض
اسمارا
ایتھوپیا
عدیس ابابا
ہرر
جمہوریہ
وسطی افریقہ
کینیا
نیروبی
کمپالا
موگادیشو
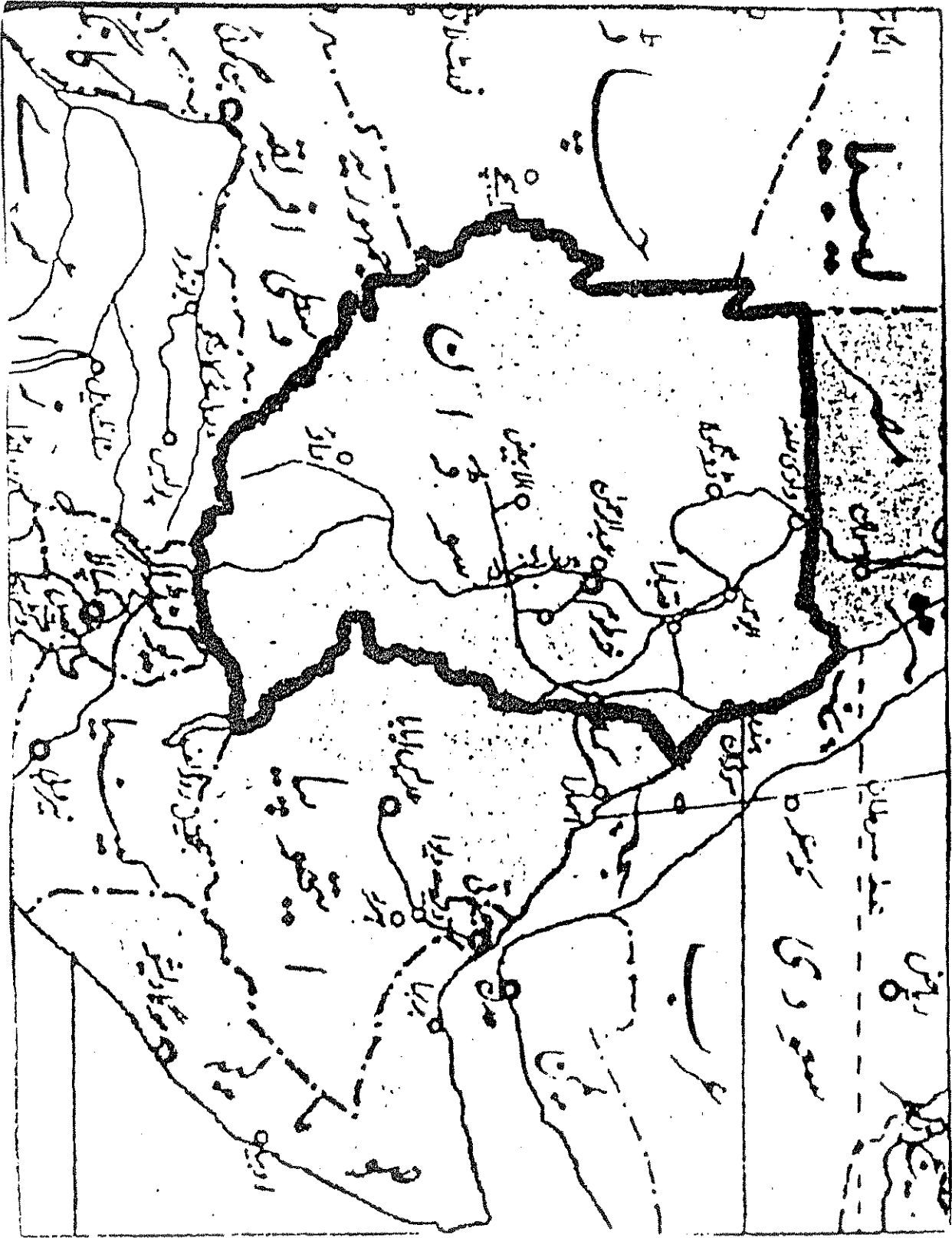
باب چہارم

# دیگر ممالک میں اسلامی تحریکیں

## (یورپ، افریقہ اور مشرق وسطیٰ)

فصل اوّل

## سوڈان

سوڈان دنیا کے قدیم ترین ملکوں میں سے ہے۔ مصر کی طرح سوڈان میں بھی دریائے نیل کی وادی دنیا کی بعض قدیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ رہی ہے۔ سوڈان کا شمالی حصہ عہد قدیم میں نوبیہ کہلاتا تھا اور نوبیہ کی قدیم تہذیب دراصل مصری تہذیب تھی جس کے اثرات شمالی سوڈان میں مصر کی سلطنت قدیم (۲۹۰۰ء ق م تا ۲۵۰۰ء ق م) کے زمانے ہی سے پڑنا شروع ہو گئے تھے۔

اسلامی دور

مسلمانوں نے نوبیہ پر ساتویں صدی عیسوی ہی سے حملے شروع کر دیے تھے۔ یہ خلافت راشدہ کا زمانہ تھا لیکن مسلمان ان حملوں میں نوبیہ پر قابض نہیں ہو سکے۔ آٹھویں صدی میں عرب قبائل بہت بڑی تعداد میں بحیرۂ احمر کے راستے مشرقی سوڈان میں داخل ہونے اور سنار کے علاقے میں آباد ہونا شروع ہو گئے۔ رفتہ رفتہ عربوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ نیگرو باشندوں کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہو گئے اور ایک وقت وہ آ گیا کہ سنار کے علاقے میں عربوں کی اکثریت ہو گئی اور یہاں کے تمام باشندے مسلمان ہو گئے۔ پندرھویں صدی تک مسلمانوں کا اس تمام علاقے پر قبضہ ہو گیا جو بارہ درجے عرض بلد کے شمال میں ہے، اور اب شمالی سوڈان کہلاتا ہے۔ پندرھویں دسی میں یہاں دو طاقتور اسلامی حکومتیں قائم تھی۔ ایک سنار کے سلاطین جو فنج (funj) کہلاتے تھے اور دوسرے مغرب میں دارفور کے شلاطین۔ فنج حکمران عدلان (۱۵۹۶ء تا ۱۶۰۳ء)

کے زمانے میں جو مغل شہنشاہ اکبر کا ہمعصر تھا، سنار کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی اور بغداد اور قاہرہ تک سے اہل علم سنار پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ سنار کی تاریخی جامع مسجد جواب تک موجود ہے، اسی عدلان کے پڑپوتے نے بنوائی تھی۔ فنج خاندان کے عہد میں جسے اٹھارھویں صدی میں زوال ہوا، پورا شمالی سوڈان اسلام قبول کر چکا تھا۔(۱)

مصری حکومت نے سوڈانی باشندوں کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا جس کا سوڈانیوں پر شدید ردّعمل ہوا اور ۱۸۸۳ء میں انہوں نے ایک درویش صفت انسان محمد احمد کی رہنمائی میں جو مہدی سوڈانی ۱۸۴۴ء تا ۱۸۸۵ء کے نام سے مشہور ہیں، علم بغاوت بلند کر دیا۔ مہدی سوڈانی کے پیروؤں نے جو درویش کہلاتے تھے، دو سال کے اندر اندر تقریباً پورے سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مصر پر انگریزوں کا تسلّط قائم ہو چکا تھا۔ چنانچہ مصری حکومت نے بغاوت کچلنے کے لیے ایک انگریز فوجی جنرل گورڈن کی خدمات حاصل کیں۔ لیکن گورڈن کو اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ جنرل گورڈن مارا گیا اور ۲۶ جنوری ۱۸۸۵ء کو خرطوم پر درویشوں کا قبضہ ہو گیا۔ مہدی سوڈانی اب مصر پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔(۲)

مہدی سوڈانی تاریخ اسلام کی ایک ممتاز شخصیت ہیں۔ وہ صرف ایک سیاسی رہنما اور ایک حکومت کے بانی ہی نہیں تھے بلکہ ایک مصلح بھی تھے۔ انہوں نے جامع ازہر میں تعلیم پائی تھی اور کہا جاتا ہے کہ جمال الدین افغانی سے بھی ان کی مصر میں ملاقات ہوئی تھی۔ مصر سے واپس آنے کے بعد انہوں نے تصوف کی منزلیں طے کیں۔ وہ تمام زندگی احکام اسلام کی سختی سے پابندی کرتے رہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے سوڈان کے شہر بربرہ میں اپنے اُستاد کی پیش کیا ہوا کھانا محض اس وجہ سے کھانے سے انکار کر دیا تھا کہ اس میں ظلم کا شائبہ تھا۔ اسی طرح انہوں نے تصوف میں اپنے شیخ سے محض اس وجہ سے قطع تعلق کر لیا کہ شیخ نے اپنے بچوں کے ختنہ کی تقریب میں ناچ گانے کا انتظام کیا تھا۔(۳)

۱۸۸۰ء میں اپنے شیخ کی وفات کے بعد مہدی سوڈانی سلسلہ سمانیہ کے سربراہ ہو گئے۔ انہوں نے کئی سال سے دریائے نیل کے ایک جزیرے آبا (Aba) میں رہائش اختیار کر لی تھی، اور یہیں سے انہوں نے اپنی

تحریک چلائی تھی۔ یہ تحریک ۲۹ جون ۱۸۸۱ء میں اس وقت شروع ہوئی جب مہدی نے سوڈان کے ممتاز لوگوں کو کتاب وسنت کی بالادستی قائم کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس پر زور دیا کہ اس مقصد کے لئے لوگوں کو جانو مال کی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے اور یہ کہ ان کے پیروؤں کو چاہیے کہ وہ جزیرہ آبا میں ہجرت کر کے آجائیں۔ بس اس کے بعد سے سوڈان کے مصری حکام اور مہدی کے حامیوں میں جھڑپیں ہونا شروع ہوگئیں جو بالآخر مہدی کی فتح پر ختم ہوئیں۔

مہدی سوڈانی نے کامیابی حاصل کرنے کے بعد نیل کے مغربی کنارہ پر خرطوم کے بالمقابل ام درماں کے شہر کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ حکومت سنبھالتے ہی انہوں نے اصلاحات نافذ کرنی شروع کردیں۔ نئے سکے ڈھالے گئے اور جن لوگوں کو سابقہ حکومت نے ناجائز طور پر زمینوں سے بے دخل کردیا تھا ان کو ان کی زمینیں واپس کردی گئیں۔ مہدی سوڈانی نے ان رسوم کو ختم کرنے کی کوشش کی جو اسلامی تعلیمات کے خلاف تھیں اور سوڈانی باشندوں میں رائج ہوگئیں تھی۔ شراب اور نشہ آور چیزوں کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا اور عورتوں کو پردہ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ شادی بیاہ پر فضول خرچیوں سے روکا گیا اور جہیز پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ مہدی سوڈانی اپنے پیروؤں سے حسبِ ذیل حلف لیتے تھے۔

''ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا عہد کرتے ہیں اور یہ کہ ہم توحید کی خاطر آپ کی اطاعت کریں گے۔ ہم کسی کو اللہ کا شریک نہیں بنائیں گے۔ ہم چوری نہیں کریں گے۔ زنا نہیں کریں گے اور کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے اور کسی جائز کام میں آپ کے حکم کے خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ ہم آپ کے ہاتھ پر عہد کرتے ہیں کہ دنیا پرستی کو خربا کہہ دیں گے اور اللہ کی خوشنودی کے لیے کام کریں گے اور یہ کہ جہاد سے منہ نہیں موڑیں گے۔'' (۴)

انگریزوں نے مہدی سوڈانی اور ان کے پیروؤں کو اپنے دور میں بدنام کرنے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن اب سوڈان میں یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ مہدی محمد احمد سوڈان کی تحرک بیداری کے پیش رو تھے۔ ان کی ہدیا اگرچہ کچز نے قبر سے نکلوا کر جلا ڈالیں لیکن ام درمان میں ان کا مقبرہ آج سوڈان کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے۔

## آزادی کے بعد

آزادی حاصل کرنے کے بعد اشقہ پارٹی کے رہنما اسمٰعیل ازہری نے پہلی حکومت بنائی۔ یہ بات اگرچہ مصر سے الحاق کے حامیوں کیلئے بڑی حوصلہ افزا تھی لیکن مصر اس وقت صدر ناصر کی قیادت میں قوم پرستی اور آمریت کے جس راستے پر جا رہا تھا اس میں سوڈانیوں کے لیے کوئی کشش نہیں تھی۔ اخوان المسلمون کے ساتھ مصری حکومت کے سلوک نے اس اسلامی رشتہ کو بھی کمزور کر دیا جو وادی نیل کی وحدت قائم رکھنے میں بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد ازہری کی حکومت بھی ٹوٹ گئی اور سوڈانی قوم پرستی کی سب سے بڑی علمبردار جماعت امہ پارٹی کے ایک رہنما عبداللہ خلیل نے ایک نئی حکومت بنائی۔ اب مصر کے ساتھ سوڈان کے الحاق کی ہر اُمید ختم ہو چکی تھی لیکن مصر اب بھی سوڈان میں خفیہ طور پر جوڑ توڑ کرتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نومبر ۱۹۵۸ء میں سوڈان بھی ایک ایسے ہی انقلاب سے دوچار ہوا، جس سے اس زمانے میں اسلامی دنیا کے کئی ملکوں کو سابقہ پڑ رہا تھا۔ سوڈانی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ابراہم عبود نے ۱۷ نومبر کو آئینی اور جمہوری حکومت توڑ کر فوجی حکومت قائم کر دی۔ تمام سیاسی جماعتوں کو توڑ دیا گیا اور جب سیاسی رہنماؤں نے آئینی حکومت بحال کرنے کیلئے زیادہ دباؤ ڈالا تو جولائی ۱۹۶۱ء میں دونوں ممتاز سیاسی رہنماؤں یعنی عبداللہ خلیل اور اسمٰعیل ازہری کو گرفتار کر لیا گیا۔ سیّد عبدالرحمان کو ان کے اثر کی وجہ سے گرفتار نہ کیا جا سکا۔ لیکن اکتوبر ۱۹۶۱ء میں وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جنرل عبود کی آمریت چار سال تک قائم رہی۔ بالآخر حریت پسند عوامی طاقتوں کے آگے ان کو ہتھیار ڈالنا پڑے اور وہ ۱۵ نومبر ۱۹۶۴ء کو مستعفی ہو گئے اور سوڈان میں ایک بار پھر جمہوری نظام قائم ہو گیا۔

پاکستان کی طرح سوڈان میں بھی آزادی کے بعد دستور سازی کے مسئلے کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔ سوڈان میں اسلامی عناصر کافی مضبوط تھے اور آزادی کے بعد سوڈان کو ایک اسلامی دستور ملنے والا تھا لیکن فوجی انقلاب نے منزل دور کر دی۔ عبود کی آمریت کے خاتمے کے بعد مئی ۱۹۶۵ء میں ایک نئی دستور ساز اسمبلی منتخب ہوئی۔ امہ پارٹی نے جس کے رہنما اب امام ہادی المہدی اور صادق المہدی تھے۔ اسمٰعیل ازہری کی حزب الاتحاد الدیمقراطی (Unionist Democratic Party) کے ساتھ اس پر اتفاق کر لیا کہ سوڈان کا دستور اسلامی تعلیمات پر مبنی ہو۔ یہ صورتِ حال کمیونسٹوں کے لیے پریشانی کا موجب بنی جو سوڈان کو ایک

لادینی سوشلسٹ ملک بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ مئی ۱۹۶۹ء میں فوج کے ہم خیال افسروں کی مدد سے ان سوشلسٹ عناصر نے جمہوری حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور سوڈان میں سوشلسٹ آمریت قائم کردی۔ بیشتر سوشلسٹ ممالک کی طرح سوڈان میں بھی تمام سیاسی جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور اخباروں اور خبر رساں ایجنسیوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ ام درمان کی اسلامی یونیورسٹی بند کردی گئی، اخوان المسلمون اور امہ پارٹی کے رہنماؤں کو خاص طور پر انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ جزیرہ آبا پر جو مہدی سوڈانی کے پیروؤں کا سب سے بڑا مرکز تھا، حملہ کیا گیا، اس حملے میں امہ پارٹی کے رہنما اور مہدی سوڈانی کے پوتے حاجی المہدی (۱۹۱۵ء تا ۱۹۷۰ء) سرکاری فوجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔ وہ اپنے بھائی صدیق المہدی کے انتقال کے بعد ۱۹۶۱ء سے انصار اور امہ پارٹی کے رہنما تھے۔ امہ پارٹی کے دوسرے رہنما صادق المہدی کو جو ۱۹۶۶ء تا ۱۹۶۷ء سوڈان کے وزیر اعظم بھی رہ چکے تھے اور صدیق مہدی کے صاحبزادے ہیں کمیونسٹ رہنما عبدالخالق مجوب کے ساتھ جلاوطن کردیا۔ ملک کے بزرگ رہنما اور آزادی کے معمار اسمٰعیل ازہری کو جیل میں ڈال دیا گیا جہاں پر اسرار حالات میں ان کی موت واقع ہوگئی۔ (۵)

## اخوان المسلمون (سوڈان)

امام حسن البناؒ نے مصر میں اخوان المسلمون کی بنیاد ۱۹۲۸ء میں رکھی اور ۱۹۳۰ء کے عشرہ ہی میں ان کی دعوت سے متاثر ہوکر سوڈان میں بھی اخوان منظم ہونا شروع ہوگئے۔ اسلامک لبریشن موومنٹ کے نام سے طلبہ کی تنظیم قائم ہوئی جو اخوان کا مضبوط بازو تھی۔ ۱۹۴۸ء میں اس طلبہ تنظیم نے سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کو شکست دے کر گارڈن میڈیکل کالج بعد ازاں خرطوم یونیورسٹی کے انتخابات واضح اکثریت سے جیت لیے۔

۱۹۵۳ء میں سوڈانی اخوان نے مصری اخوان سے تنظیمی طور پر ایک آزاد ڈھانچہ استوار کیا۔ الرشید الطاہر اس کے امیر مقرر ہوئے اور ۱۹۵۵ء میں اخوان المسلمون نے اسلامی جماعتوں کا ایک ڈھیلا ڈھالا اتحاد بنانے میں کامیابی حاصل کرلی۔ اخوان نے ان جماعتوں کو اس بات پر متفق کرلیا کہ ۱۹۵۶ء میں سوڈان کی متوقع آزادی کے بعد ملک کا دستور اسلامی اُصولوں پر مبنی ہوگا۔ اخوان کے قائم کردہ اس سیاسی اتحاد کا نام

''اسلامی دستور فرنٹ'' تھا اور اخوان کو اس میں مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ سوڈان کی ایک بڑی جماعت صادق المہدی کی نیشنل یونینسٹ پارٹی بھی اس کی ممبر تھی۔ لیکن ملک کی آزادی کے بعد اسلامی دستور کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں جب ملک کے پہلے انتخابات ہوئے تو اخوان نے فیصلہ کیا کہ جو لوگ اسلامی دستور کے لیے حمایت کا اعلان کریں گے ان کے خلاف نمائندے کھڑے نہ کیے جائیں گویا اخوان نے براہِ راست انتخابات میں حصہ لینے کے بجائے ایسے لوگوں کو کامیاب کرنے کی حکمت عملی اختیار کی جو اسلامی دستور کے لیے کام کر سکیں۔

اس دور میں اخوان کی سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ سیاسی حکمت عملی کے طور پر سوڈان کے اخوان نے شروع سے دوسری جماعتوں کے ساتھ وسیع تر سیاسی اتحاد اور اسلامی دستور کے لیے جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔

## اخوان کی سیاسی جدوجہد

اخوان نے شروع سے وسیع تر سیاسی اتحاد کے ذریعے پیش رفت کی حکمت عملی اختیار کی تھی۔ ۱۹۶۴ء میں اخوان نے جو اسلامک چارٹر فرنٹ بنایا، اس میں انصار السنہ، صوفی گروہوں اور علماء کی چھوٹی چھوٹی پارٹیوں نے شمولیت اختیار کی۔ اس فرنٹ نے ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں ۱۰۰ نمائندے نامزد کیے۔ اس میں سے فرنٹ نے سات سیٹیں جیتیں۔

انتخابات کے بعد امہ پارٹی نے حکومت بنائی اور اخوان نے اپوزیشن پارٹی کی حیثیت اختیار کی۔ ۱۹۶۷ء میں پھر انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات میں پارٹی فرنٹ نے ۱۹ نمائندے کھڑے کیے مگر اس مرتبہ صرف پانچ نشستوں پر کامیابی ہوئی۔ ڈاکٹر ترابی بھی اپنی نشست پر ہار گئے۔ یوں محسوس ہونے لگا کہ فرنٹ اپنی مقبولیت کھو رہا ہے۔

۱۹۶۹ء میں جعفر نمیری کے فوجی انقلاب کے بعد فرنٹ نے اس کی مزاحمت کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے لیے امہ پارٹی کے ساتھ مل کر نیشنل فرنٹ بنایا۔ جعفر نمیری نے اس مزاحمت کو کچل دیا، سینکڑوں افراد مارے

گئے۔۱۹۷۳ء، ۱۹۷۵ اور ۱۹۷۶ء کے عرصے میں فرنٹ اس اتحاد میں شامل رہا۔ تاہم فرنٹ اور امہ پارٹی کا اتحاد ۱۹۷۷ء میں ٹوٹ گیا۔

۱۹۸۰ء میں جب جعفر نمیری نے قومی سیاسی جماعتوں سے مصالحت اور تعاون کی اپیل کی تو دائیں بازو کی اسلامی جماعتوں کے اتحاد نے نمیری کی حکومت میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔ ایک طویل عرصہ تک نمیری کی فوجی حکومت کی مخالفت کے بعد اس کے ہاتھ مفاہمت اور اس کی حکومت میں شمولیت کا یہ فیصلہ حکمتِ عملی میں تبدیلی کا مظہر تھا۔ مارچ ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر ترابی کو نمیری پارٹی کے سیاسی بیورو کا ممبر اور اُمورِ خارجہ کا مشیر بنا دیا گیا۔۱۹۸۳ء میں جعفر نمیری نے اسلامی قوانین کے وسیع پیانے پر نفاذ کا اعلان کیا تو فرنٹ نے کھلے بندوں اس کی حمایت کی۔

سوڈان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے ایک سال بعد ۱۹۸۴ء میں فرنٹ نے بین الاقوامی اسلامی کانفرنس برائے نفاذِ شریعت منعقد کی۔ اس میں دنیا بھر سے دوسو نمائندوں نے شرکت کی اور شریعت کے نفاذ کے لیے دس لاکھ افراد نے ڈاکٹر ترابی کی اپیل پر خرطوم کی سڑکوں پر مارچ کیا۔ نمیری کی گورنمنٹ کے ساتھ تعاون کے نتیجے میں اور فرنٹ کے مسلسل رابطہ کے سبب اخوان المسلمون کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ فوج کے جوانوں اور افسروں میں ایک معقول تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہوگئی جو ڈاکٹر ترابی کے اسلامائزیشن کے پروگراموں سے اتفاق رکھتے تھے۔

اپریل ۱۹۸۶ء کے قومی انتخابات میں فرنٹ نے ۶۲ سیٹوں پر مقابلہ کر کے ۵۱ سیٹیں حاصل کر لیں۔ اٹھائیس سیٹیں عمومی حلقوں سے اور تیئیس سیٹیں گریجویٹس کے حلقہ انتخاب سے۔ فرنٹ نے ۱۸٫۴۶ فیصد ووٹ حاصل کیے۔ اسلامی قوانین کے نفاذ کے وعدے پر فرنٹ نے امہ پارٹی کے ساتھ تعاون کیا اور امہ پارٹی نے حکومت بنائی۔

''۱۹۸۹ء میں جنرل حسن بشیر نے فوجی انقلاب برپا کیا۔ حسن بشیر کو اخوان المسلمون کی حمایت حاصل تھی اور وہ بڑی حد تک اخوان کی فکر سے متفق تھے۔ اس لیے جب انہوں نے فرنٹ سے تعاون کی اپیل کی اور اسلامائزیشن کے پروگرام پر عملدرآمد کا وعدہ کیا تو فرنٹ نے ان سے تعاون کا فیصلہ کیا، یہ تعاون تا حال

جاری ہے۔

سوڈان کی اخوان المسلمون نے اپنی تنظیم اور سیاسی حکمت عملی میں اپنے حالات کے لحاظ سے دوررس تبدیلیاں کیں جس کے نتیجہ میں انہوں نے جنرل عمر حسن البشیر کے فوجی انقلاب (۱۹۸۹ء) کے بعد ملک کے نظام حکومت میں کلیدی کردار حاصل کرلیا ہے۔"(٦)

یہ ان کے نزدیک اسلامی انقلاب کی راہ میں ایک اہم پیش رفت ہے۔ انہیں یقین ہے کہ اس طرح وہ بالآخر سوڈان کو ایک اسلامی ریاست بنادیں گے۔ جو تبدیلیاں آئی ہیں اور جو کچھ پیش رفت ہوئی ہے وہ اخوان کے سربراہ ڈاکٹر حسن ترابی کی فکر، حکمتِ عملی اور جدوجہد کی مرہونِ منّت ہے۔ ڈاکٹر ترابی نے ہر شخص میں یہ رُوح پھونکنے کی کوشش کی کہ ہم سب کو انفرادی طور پر اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ شروع میں صرف دو ہزار مستقل ممبران اور پینتالیس ہزار غیر مستقل ممبران تھے۔ ڈاکٹر ترابی نے ہدف طے کیا کہ دو سال کے اندر اندر اس تعداد کو دس گنا کرنا ہے اور وہ اس میں کامیاب ہوئے۔

ڈاکٹر حسن ترابی نے بانی جماعتِ اسلامی سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی فکر سے فیضان حاصل کیا ہے۔ ڈاکٹر ترابی کے اقدامات سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی فکر ہی کی بازگشت ہیں۔ سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے باطل نظام کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے اور حق کو غالب کرنے کے لیے ہر شعبہ ہائے زندگی میں تبدیلی کی دعوت دی اور اسی کا عکس سیّد قطبؒ کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر ترابی نے حکومت کے نظام میں شامل ہو کر اسلامی نظام کے نفاذ کو حقیقت بنادیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کے نتائج برپا ہونا شروع ہوگئے۔

سوڈان ابتداء سے ہی مغربی عناصر کی سازشوں کا شکار رہا ہے۔ سپر پاورز کو اس بات کا ہمیشہ سے خوف رہا ہے کہ خود کفالت کی راہ پر اسلامی نظام کے سائے میں چلنے والا کوئی ملک بھی ان کی دسترس میں نہیں رہ سکتا۔ اور پُرسکون حالات میں کبھی بھی مغرب کے گندے اور بدنام نظام کے لیے گنجائش نہیں نکلتی۔ جس طرح بدکاروں، چوروں کے لیے بدانتظامی کے ماحول میں جگہ ہوتی ہے اس طرح افراتفری ماحول کی خرابی، معاشرتی بربادی اور انتشار ہی مغرب کے ماحول کو راس آتا ہے۔ روزانہ کے بم بلاسٹ، قوم کے اندر افتراق کی کوششیں مغربی فارمولہ کے مطابق ہیں۔ اسلامی تحریک کی کوششیں قوم وملک کی ترقی سے وابستہ ہوتی ہیں۔
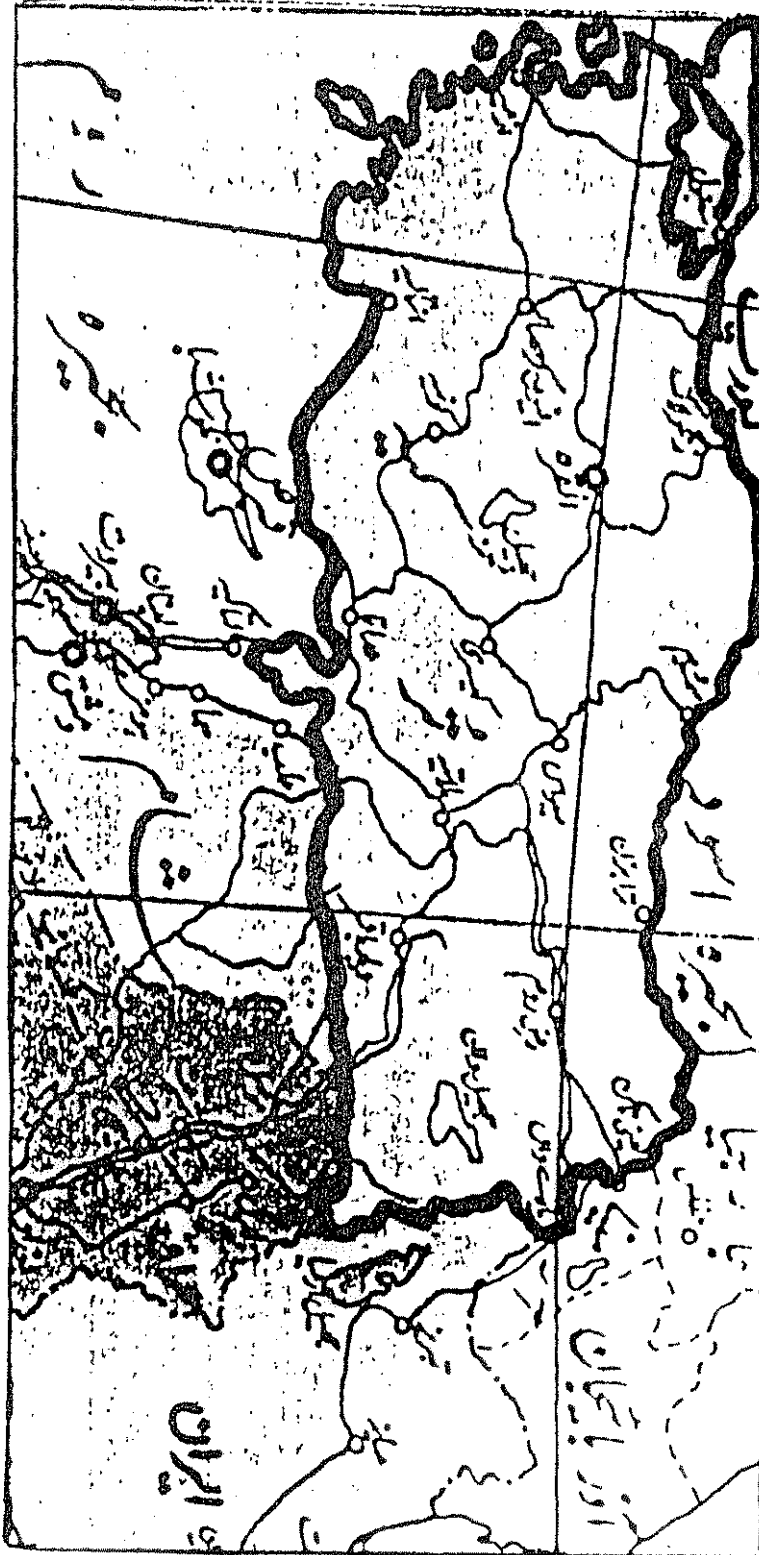
## فصل دوم

# ترکی

### تعارف

''جمہوریہ ترکی مشرق وسطیٰ میں واقع ہے۔ ملک کا پچانوے فیصد علاقہ ایشیا میں اور پانچ فیصد یورپ میں ہے۔ مشرق میں ایران، آرمینیا، آذربائیجان، ترکمانستان اور بخارا، جنوب میں عراق، شام اور بحیرۂ روم، مغرب میں یونان اور بلغاریہ اور شمال میں بحر اسود واقع ہے۔ ایشیائی حصے (اناطولیہ) اور یورپی حصے (تھریس) کے درمیان آبنائے باسفورس ہے۔ یہ دونوں حصے ایک عظیم الشان پل کے ذریعے آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ استنبول ترکی کا سب سے بڑا صنعتی شہر ہے۔

اس کا قدیم نام ''قسطنطنیہ'' ہے۔ عرب مسلمان اسلام کے ابتدائی دور ہی سے قسطنطنیہ شہر کی اہمیت سے واقف تھے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے احادیث میں یہ پیشین گوئی کی تھی کہ ''تم ضرور قسطنطنیہ فتح کرو گے اور وہ فوج بھی خوب ہے اور اس کا امیر بھی خوب'' اور یہ کہ ''میری اُمت کی پہلی فوج جو قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ آور ہوگی اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا۔'' (۷)

چنانچہ بازنطینیوں سے مسلمانوں کا پہلا تصادم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں اناطولیہ اور بحیرۂ روم تک پھیل گیا۔ پھر جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو انہوں نے ۶۶۷ء میں ''قسطنطنیہ'' فتح کرنے کے لیے ایک بڑی فوج روانہ کی جس کی مدد کے لیے پہلی مرتبہ ایک طاقتور بحری بیڑہ بھی تیار کیا گیا۔ اس فوج نے سات سال تک قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے رکھا۔ مشہور صحابی اور میزبانِ رسول ﷺ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے اسی محاصرے کے دوران شہر کی فصیل کے قریب وفات پائی اور یہیں مدفون ہوئے۔ اس محاصرے میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حضرت عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ اور حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے شرکت کی تھی۔

یہ لشکر ۶۷۳ء میں واپس چلا گیا تھا لیکن اس کے بعد بھی مسلمانوں نے قسطنطنیہ فتح کرنے کا خیال کبھی ترک نہیں کیا۔ ۷۱۵ء خلیفہ سلیمان بن عبد الملک اور ۷۸۲ء اور ۷۹۸ء میں دو مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید نے بھی قسطنطنیہ کی فتح کے لیے بھرپور کوششیں کیں جو کامیابی سے ہمکنار تو نہ ہو سکیں لیکن خلیفہ ہارون الرشید کی ان کوششوں کے نتیجے میں عیسائی سالانہ خراج کی بنیاد پر صلح پر رضامند ہو گئے۔

''قسطنطنیہ تو فتح نہ ہو سکا لیکن یہ ایک خوشگوار حقیقت ہے کہ اناطولیہ یا ایشیائے کوچک سے اسلام کا تعلق خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں ہی قائم ہو گیا تھا۔ عراق، شام اور ایران سے متصل ترکی صوبے پہلی صدی ہجری کے اوائل ہی میں اسلامی مملکت کا حصہ بن گئے تھے جس کی وجہ سے جلد ہی یہ شہر اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز بن گئے۔ عظیم مسلمان مؤرخ ابن اثیرؒ، مجدد اعظم امام ابن تیمیہؒ، جلال الدین رومیؒ اور جاء اللہ زمحشریؒ جیسی نابغہ ہستیاں اسی خطے میں پیدا ہوئیں۔ اناطولیہ کے چپے چپے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، اولیاء اللہؒ اور مجاہدین اسلام سے منسوب یادگاروں اور قبروں کی موجودگی بھی اسی بات کا ثبوت ہے کہ ترکی میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے اثرات پہلی صدی ہجری میں پھیلنا شروع ہو گئے تھے اور یہ کہ ترکوں نے اسلام بغیر کسی جبر کے قبول کیا تھا۔ جب وہ رضا کارانہ مسلمان فوج میں شامل ہوئے تو مسلمانوں کے اخلاق و کردار نے ان پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان اثرات کے سبب انہوں نے نہ صرف اسلام قبول کیا بلکہ وہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کو اپنا فرض اوّلین سمجھنے لگے۔''(۸)

خلافتِ عباسیہ کے زوال کے بعد اسلامی دنیا دو سو سال تک چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم رہی لیکن اس کے بعد سلجوقیوں کے ایک خاندان نے ایشیائے کوچک پر حکومت کی جو سلاجقہ روم کے نام سے مشہور ہے۔ یہ حکومت سب سے بڑی اور پائیدار تھی۔ اسی زمانے میں یورپی اقوام نے مل کر بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے صلیبی جنگیں شروع کیں تو سلجوقیوں نے ۱۰۹۲ء سے ۱۱۰۶ء تک ہونے والی پہلی صلیبی یلغار کا پوری قوت سے مقابلہ کیا۔ اس طرح انہوں نے عالم اسلام کے دفاع میں بالعموم اور بیت المقدس کے دفاع میں بالخصوص بڑی مدد کی۔ سلجوقی ترک ۱۰۷۱ء سے ۱۲۴۳ء تک حکمران رہے۔ الپ ارسلان اور ملک شاہ کے عہد میں ان کی سلطنت جارجیا سے لے کر شام اور عراق تک پھیل چکی تھی مگر ان کے زوال کے بعد ترکی بھی چھوٹی چھوٹی

ریاستوں میں تبدیل ہوگیا۔ یہ ریاستیں عثمانی ترکوں کے عروج حاصل کرنے تک تقریباً دوسو سال تک قائم رہیں۔ عربوں کے دور میں ایشیائے کوچک کو مسلمان بنانے کا اور سلجوقیوں کے دور میں مسلمان اور ترک بنانے کا جو عمل شروع ہوا تھا وہ اسی دور میں مکمل ہوا۔

۱۲۹۹ء میں ایشیائے کوچک کے شمال مغربی حصے میں سلطنت عثمانیہ کا قیام ترکوں کی تاریخ کا ایک شاندار اور قابلِ فخر کارنامہ ہے۔ اگرچہ اسلام سے قبل بھی ترکوں نے دنیا میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔ لیکن ترکوں کی تاریخ کا یہ دور یا تو پردۂ تاریکی میں ہے یا پھر قتل وخونریزی سے عبارت ہے اور تعمیر سے زیادہ تخریب کا دور ہے۔

اسلام کے بعد ترکوں نے خاندان غزنوی، سلاجقہ، سلاطینِ دہلی آل تیمور اور سب سے آخر میں عظیم الشان عثمانی سلطنت قائم کی جس کی عظمت اور کارناموں کا کوئی دوسری سلطنت مقابلہ نہیں کرسکتی۔ یہ سلطنت ایک ایسے دور میں قائم ہوئی جب مسلمان ہر جگہ پسپا ہو رہے تھے۔ اندلس میں بھی اور ایشیاء میں بھی، ایک ایسے نازک دور میں عثمانی سلطنت نے یورپ کے جارحانہ حملوں کے مقابلے میں صدیوں تک اسلامی دنیا کے لیے سپر کا کام کیا اور موجودہ صدی کے آغاز تک پورے دوسو سال قدم قدم پر نہ صرف یورپ کے جارحانہ حملوں کا مقابلہ کیا بلکہ وہ یورپ کی سرزمین پر اسلام کی سب سے بڑی قوت اور اس کے علمبردار بن گئے۔ انہوں نے اسلام کی تبلیغ واشاعت کی قدیم روایت کا احیاء کر کے اسے زندہ وجاوید کردیا۔

''عثمانی ترکوں کا سب سے بڑا کارنامہ ''قسطنطنیہ'' کی فتح ہے۔ ایران کے اکاسرہ کی حکومت کا خاتمہ تو خلفائے راشدین ﷺ کے دور میں ہی ہوگیا تھا مگر قیصر روم کے دارالسلطنت (قسطنطنیہ) پر عرب اور ترک کئی مرتبہ حملہ کرنے کے باوجود کامیابی حاصل نہ کرسکے تھے۔ یہ سعادت وفتح مندی سلطان محمد فاتح کا مقدر ٹھہری چنانچہ محمد فاتح نے ۵۴ دن کے محاصرے کے بعد ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو قسطنطنیہ فتح کرلیا اور اس طرح رومیوں کی گیارہ سو سال پرانی سلطنت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ اس فتح کے بعد آنحضرت ﷺ کی وہ پیشین گوئی پوری ہوگئی جو آپ ﷺ نے غزوۂ خندق کے موقع پر ارشاد فرمائی تھی کہ ''اللہ تعالیٰ نے مجھے قیصر وکسریٰ کی چابیاں دے دی ہیں۔''(۹)

قسطنطنیہ کے بعد سلطان محمد فاتح کے دور میں ہی سربیا، بوسنیا، بلغاریہ، البانیہ، اٹلی، کریمیا، یونان اور ہنگری تک کا علاقہ عثمانی سلطنت کا حصہ بن گیا تھا۔۱۵۱۴ء سے ۱۵۱۷ء تک عثمانیوں نے شام، فلسطین اور مصر پر بھی قبضہ کرلیا۔ مصر پر قبضہ کے بعد حجاز کے امیر نے مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کی چابیاں عثمانیوں کے حوالے کر کے ان کی اطاعت کرلی۔ اسی دوران عباسی خلیفہ متوکل نے آنحضرت ﷺ کے تبرکات (یعنی: علم، تلوار، چادرمبارک جوخلفاء کے پاس بطورنشانِ خلافت کے چلے آتے تھے) عثمانی خلیفہ سلیم کے حوالے کردیے۔ اس نے استنبول میں ایک تقریب کے دوران عثمانیوں کے حق میں خلافت سے دستبرداری کا اعلان کیا اس طرح خلافتِ عثمانی ترکوں کو منتقل ہوگئی۔

سلیمان شاہ کے دور ۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۴ء میں عثمانی سلطنت نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ اس نے بلغراد، جزیرہ ہوڈس، عراق، اصفہان، آذربائیجان، آرمینیا، یمن، عدن، لیبیا، الجزائر اور تیونس کی وسیع دنیا کو عثمانی سلطنت کا حصہ بنادیا۔ ان عظیم الشان فتوحات کی وجہ سے سلیمان شاہ کا آل عثمانی میں وہی مقام ہے جو سلجوقی سلطنت میں ملک شاہ کا اور دہلی کی تیموری سلطنت میں اورنگ زیب عالمگیر کا مقام ہے۔ ۱۶۶۹ء عثمانی ترکوں کی فتوحات کا آخری سال ہے۔ اس عرصے میں انہوں نے یوکرائن، جزیرہ کریٹ، پولینڈ، تبریز، مالٹا، قبرص، داغستان اور آسٹریا کا کچھ حصہ اپنی مملکت میں شامل کیا۔ اس پورے مشرقی یورپ، شرق اوسط اور شمالی افریقہ پر عثمانی اقتدار کا پھریرا لہرانے لگا اور سولھویں صدی کے اختتام تک ''عثمانی ترک'' دنیا کی سب سے بڑی قوت بن گئے۔

سلیمان شاہ (سلیمان اعظم) کے بعد سلطنت کے زوال کے اسباب پیدا ہونا شروع ہوگئے۔ ۱۷۱۸ء میں آسٹریا نے ترکوں کو ہنگری سے نکال دیا۔ ۱۷۸۳ء میں روس نے کریمیا چھین لیا۔ انیسویں صدی میں مصر اور بلقان بھی ہاتھ سے نکل گئے۔ جنگِ عظیم اوّل ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۹ء کے بعد ترکی اپنے تمام مقبوضات اور بچے کھچے عرب علاقوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس جنگ میں ترکوں کی شکست عالمِ اسلام کا بہت بڑا سانحہ تھا۔ اس شکست نے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ کردیا۔ عرب مقبوضات برطانیہ اور فرانس کی غلامی میں چلے گئے۔ فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کی تحریک کامیاب ہوگئی اور استنبول پر پہلی مرتبہ غیر ملکی فوجیں قابض ہوگئیں اور آخرکار بات

یہاں تک پہنچی کہ حکومت عثمانیہ معاہدہ سیورے پر دستخط کرنے پر مجبور ہوگئی۔ پوری قوم اس معاہدے کی زبردست مخالف تھی اور ترکی کی قومی حدود کے تحفظ کا مطالبہ کر رہی تھی۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک ملک میں خانہ جنگی اور افراتفری کا عالم رہا۔ حریت پسندوں نے آزادی کے تحفظ کے لیے جدوجہد کا اعلان کر دیا۔ حریت پسندوں کی قوت دیکھ کر جلد ہی فرانس اور اٹلی نے ترکی کی سرزمین سے اپنی فوجیں واپس بلالیں۔ یونانی بھی شکست فاش کے بعد واپسی پر مجبور ہوگئے۔ قوم پرستوں کی ان کامیابیوں کے پیشِ نظر اتحادیوں نے استنبول بھی خالی کر دیا۔ ۲۴ جولائی ۱۹۲۳ء کو لوزان میں ترکی اور اتحادیوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا جس میں ترکی کی قومی حدود اور آزادی کو بڑی حد تک ترکوں کی خواہش کے مطابق تسلیم کرلیا گیا۔ اس طرح آزادی کی پانچ سالہ جدوجہد کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور سلطنتِ عثمانیہ کی جگہ آزاد ترکی جمہوریہ وجود میں آگئی۔ ترکی قوم نے مصطفیٰ کمال پاشا کے اس کارنامے پر اسے ''اتاترک'' یعنی ''ترکوں کا باپ'' کا خطاب دیا۔ نئی تشکیل شدہ اسمبلی نے ترکی کو جمہوریہ بنانے کا اعلان کرتے ہوئے واضح کیا کہ نئی جمہوریہ کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا۔ ترکی جمہوریہ تو بن گیا مگر اسلام سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل نہ کرسکا۔

۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو گرینڈ نیشنل اسمبلی نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا اور عثمانی خاندان کے تمام افراد ملک سے باہر نکال دیے گئے۔ ۱۰ اپریل ۱۹۲۸ء کو اسلام کے حوالے سے ترکی کی شناخت مکمل طور پر ختم کر کے اسے ایک لادین ریاست میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس انتہائی قابلِ مذمت فیصلے کا محرک مصطفیٰ کمال اتاترک تھا۔ اس نے اپنی مقبولیت کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے باطل نظریات ترک قوم پر مسلط کر دیے۔

ترکی چار سو سال خلافتِ عثمانیہ کا مرکز رہا تھا۔ لیکن مصطفیٰ کمال کے روپ میں اسے ایسا حکمران ملا جس نے ترکی سے اس کی شناخت چھین لی، خلافت ختم کی، یورپی پینل کوڈ نافذ کیا، رومن رسم الخط رائج کیا، پردہ زبردستی ختم کروایا، عربی میں اذان دینے کی ممانعت کی۔ غرض ترک معاشرے کی ماہیت قلب ترک کر دینے کی کوشش کی گئی۔ اسے ایک مغربی معاشرہ بنادیا گیا جہاں شراب کھلے عام ملتی ہے، شہروں میں راتیں رنگین ہوتی ہیں اور ساحلوں پر یورپی سیاحوں کی ریل پیل ہوتی ہے۔ اس کے لیے جو ظلم کیا گیا ہوگا اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی وہ اتاترک تھا اور ہم نے اپنی درسی کتابوں میں اس کا تذکرہ ترک قوم

کے حسن اور معمار کی حیثیت سے ہی پڑھا ہے۔ ۵۰ کے عشرے سے ترکی نے اپنی حقیقی شناخت دریافت کرنے کا سفر شروع کیا۔ ترکی دستور اس طرح کا لادینی دستور ہے کہ اسلام کی بنیاد پر کوئی سرگرمی خلافِ قانون اور قابلِ سزا قرار پاتی ہے۔ ان حالات میں وہاں احیائے اسلام کی جدوجہد کا آغاز ہوا جو آج اس مرحلے تک آ پہنچی ہے کہ ہر طرف خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئی ہیں۔

''ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا نے اسلام کو سرزمین خلافت سے اُکھاڑ پھینکنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ قرآنِ کریم کی تعلیم بند، مسجدیں برباد، اذانیں خاموش، اسلامی لٹریچر ممنوع، عربی رسم الخط منسوخ اور علماء قتل کر دیے گئے۔ فرنگی لباس لازمی قرار دے دیا گیا، خلافت پر خطِ تنسیخ پھیر کر لادینی نظام کو ملک و قوم کا نصب العین قرار دے دیا گیا۔ یہ سب کام محض قراردادوں اور قوانین کے ذریعے نہیں کیے گئے بلکہ شمشیر و تفنگ کا سہارا لیا گیا۔ ۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۵۶ء تک یہ ہنگامہ رستاخیز برپا رہا۔ اس دورِ پُرمحن میں ایک مجاہد عالم بدیع الزمان سعید نورسی مرحوم اور ایک نڈر شاعر عاکف بے نے الحاد و لادینیت اور ظلم و استبداد کے خلاف آواز بلند کی، قید و بند کی صعوبتیں بھگتتے رہے مگر شمع ایمان ہاتھ میں لیے طوفانوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ ۱۹۵۶ء میں عدنان مندریس کی ڈیموکریٹک پارٹی نے عصمت انونو کی ریپبلکن پارٹی کو انتخاب میں شکست دی۔ ڈیموکریٹک پارٹی کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ عدنان مندریس نے انتخابی مہم میں ترک عوام سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ وہ کامیاب ہونے کے بعد عربی میں اذان کو بحال اور اسلامی اقدار کا احیاء کرے گا۔ اسی وعدے پر ترکوں نے اپنے باپ (اتاترک) کی پارٹی کو زمین بوس کر دیا۔ عدنان مندریس نے بڑی حد تک وعدہ پورا کر دیا مگر ترکوں کے لادین حلقے یہودی اور سیکولرازم میں مبتلا فوجی جرنیل اسے زیادہ دیر برداشت نہ کر سکے۔ ۱۹۶۰ء میں فوج نے جمال گورسل کی قیادت میں انقلاب برپا کر دیا۔ عدنان کو دستور کی خلاف ورزی پر سزائے موت دے دی گئی۔ ۱۹۶۳ء میں دوبارہ انتخابات ہوئے اور سلیمان ڈیمرل نے اسلامی عناصر سے بے وفائی کی۔ ۱۹۷۳ء میں نجم الدین اربکان نے ''ملی نظام پارٹی'' قائم کی مگر چند ماہ بعد ہی حکومت نے اسے ممنوع قرار دے دیا کیونکہ اس نے اپنے اغراض و مقاصد میں اسلام کا ذکر کر دیا تھا۔ اس کے بجائے ملی سلامت پارٹی عناصر کی نمائندہ بن کر اُبھری۔''(۱۰)

۱۹۸۴ء میں جب سیاسی آزادیاں بحال ہوئیں اور ملکی انتخابات کا اعلان ہوا تو ملی سلامت نے بھی انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کیا۔ انتخابی مہم کے دوران نجم الدین (صدر ملی سلامت) نے قونیہ میں ایک عظیم الشان جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ ترکی حکومت نے اس عوامی مقبولیت سے گھبرا کر اربکان پر ترکی دستور کی خلاف ورزی کا الزام لگایا۔ انہیں گرفتار کرلیا گیا اور ترکی دستور کی خلاف ورزی پر ان کے خلاف مقدمات قائم کیے گئے جن سے وہ آخر کار سرخ رو ہو کر نکلے۔ ۱۹۸۳ء میں رفاہ پارٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ ۱۹۸۷ء کے انتخابات میں بھی اس نے حصہ لیا اور ''متناسب نمائندگی'' کے نظام کی وجہ سے اس کو ووٹوں کا وہ تناسب حاصل نہ ہو سکا جس کی بناء پر وہ کامیاب سمجھی جاتی۔ ۱۹۹۲ء کے انتخابات میں اس نے سہ حزبی اتحاد میں شمولیت کی اور پورے اتحاد نے ۶۲ نشستیں جیت لیں۔ بلدیاتی انتخابات میں بھی رفاہ کو بڑی عظیم کامیابی نصیب ہوئی۔

## ترکی کے بلدیاتی انتخابات

بلدیاتی انتخابات میں رفاہ واضح پروگرام کے ساتھ میدان میں اُتری اور ۱۹۸۹ء کے بلدیاتی انتخابات کے ۹ فیصد کے مقابلے میں دگنے سے زائد تقریباً ۱۹ فیصد ووٹ حاصل کیے۔ لندن کے ماہنامہ ''امپیکٹ'' (مارچ ۹۴ء) نے لکھا تھا کہ اگر رفاہ پارٹی نے ۱۸ فیصد یا زائد ووٹ حاصل کر لیے تو ترکی کی سیاست میں حقیقی تبدیلی آجائے گی۔

ترکی کی آبادی ۶ کروڑ ہے۔ ان انتخابات میں ۳ کروڑ افراد کو ووٹ ڈالنا تھے۔ ترکی میں ووٹ ڈالنا قانوناً لازمی ہے۔ ۶۷ شہروں کے میئر کے ساتھ ساتھ صوبائی اسمبلی، سٹی کونسل، دیہاتوں کے مکھیا اور دیگر نشستوں کے لیے کل ۸۳ ہزار نمائندوں کا انتخاب ہونا تھا۔ ۶۷ میں سے ۲۸ شہروں میں رفاہ پارٹی کے میئر منتخب ہوئے لیکن ان میں زیادہ اہم سیکولر عناصر اور ان کے مغربی سر پرستوں کے لیے ناقابلِ یقین استنبول اور انقرہ کے نتائج تھے۔ مہم کے دوران نجم الدین اربکان کہتے تھے کہ پانچ سو سال بعد اسلام قسطنطنیہ کو دوبارہ فتح کرے گا اور یہ ہو گیا۔ استنبول ترکی کا اہم تجارتی مرکز ہے، آبادی ایک کروڑ ہے، طیب اردگان اس شہر کے میئر منتخب ہوئے۔ فتح کے بعد طیب اردگان نے کہا کہ عوام نے میڈیا کو شکست دے دی۔ مصطفیٰ کمال کے قائم کیے

ہوئے دارالخلافہ انقرہ میں رفاہ کی کامیابی اتنی ناقابلِ یقین تھی کہ برطانیہ کے اخبار گارجین کے مطابق ٹی وی نے کئی گھنٹے انتظار کر کے ''سقوطِ انقرہ'' کا اعلان کیا۔ (۱۲ اپریل ۱۹۹۴ء) امریکی ہفت روزہ نیوز ویک نے اسے سیکولر نظام کے لیے شدید دھچکا قرار دیا اور لکھا کہ ترکی کے اسلام پسند بھی بحیرۂ روم کے مسلمان ساحل پر واقع تمام حکومتوں کو چیلنج کرنے والی سیاسی تحریک کے ہراوّل دستہ میں شامل ہو گئے ہیں۔

ترکی کے سیکولر عناصر اور نام نہاد دانشوروں کو جمہوریت کے دعوؤں کے باوجود یہ گوارا نہیں ہے کہ اگر عوام اپنی زندگی اسلامی اقدار کے مطابق گزارنا چاہیں اور اپنے لیے ایسے ہی نمائندے منتخب کریں تو اس کے لیے جگہ خالی کر دیں۔ گزشتہ ۳۵ سال میں فوج تین دفعہ مداخلت کر چکی ہے۔ رفاہ کی مقبولیت دیکھتے ہوئے اخبارات میں یہ تذکرے آنے لگے کہ انہیں روکنے کے لیے فوج مداخلت کر سکتی ہے اور الجزائر جیسی ''خانہ جنگی'' کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ گویا عوام کو بلیک میل کیا گیا کہ رفاہ کو ووٹ دیا تو ان کو تو حکومت ملے گی نہیں، فوج آکر رہی سہی جمہوریت کو بھی لپیٹ دے گی۔

''رفاہ پارٹی معتدل ہے۔ یہی بات کہ ان کے لیڈر سوٹ پہنتے ہیں اس کی علامت قرار دی جاتی ہے۔ ایک کالم نگار کے مطابق ترکی کو اربکان مل سکتا ہے لیکن ترکی میں خمینی نہیں آسکتا۔ مستقبل کی کشمکش کا اندازہ اناطولیہ نیوز ایجنسی کی اس خبر سے ہو سکتا ہے کہ وزیرِ داخلہ نے انقرہ اور استنبول کے میئروں کو متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے ترکی کے سیکولر دستور کو گزند پہنچانے کی کوشش کی تو ان پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ کچھ اس توقع میں تھے کہ رفاہ اپنے پروگرام پر عمل کرے گی تو لوگ اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس پسِ منظر میں آنے والا دور رفاہ کی قیادت کے فہم و فراست، حکمت و دانش اور ایمان و صبر کی آزمائش کا دور تھا۔ انہیں اپنی حمایت کی بنیادوں کو وسیع سے وسیع تر کرنا تھا۔ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کو بھی اپنا ہمنوا بنانا تھا۔ ملکی اور بین الاقوامی ردِّ عمل کا صحیح صحیح اندازہ کرنا اور پھر اپنے لیے راستہ بنانا تھا۔'' (۱۱)

## ترکی کے انتخابات اور اسلامی تحریک کی کامیابی

چنانچہ ترکی میں نجم الدین اربکان کی اسلامی رفاہ پارٹی (Welfare Party) کی کامیابی پوری ملت کے لیے ایک دل خوش کُن خبر تھی۔ اس واقعے کو احیائے اسلام کی تحریک کا اہم سنگ میل قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۹۹۵ء کے انتخابات کے انعقاد سے پہلے ترک سیکولرازم کے علم برداروں نے بہت شور مچایا:

''اربکان ترکی میں سیاہ دور کا پیامبر ہے، وہ بنیادی آزادیوں کا دشمن ہے، رفاہ پارٹی آئی تو مرد وزن کا آزادانہ اختلاط ختم ہو جائے گا، ٹیلی ویژن پر جنسی مناظر بند کر دیے جائیں گے، عریاں اور فحش لٹریچر پر پابندی لگ جائے گی، پبلک مقامات پر بوس و کنار کی اجازت چھین جائے گی، شراب پر پابندی لگ جائے گی، عورتیں چادر کے بغیر گھوم پھر نہیں سکیں گی۔'' حالانکہ ترک معاشرہ ان نام نہاد آزادیوں سے پہلے ہی اکتا چکا تھا۔ مغربی دنیا کے تمام ٹیلی ویژن نیٹ ورک اور خود ترکی کے نصف درجن سے زیادہ چینل سیکولر قوتوں کی انتخابی مُہم چلاتے رہے۔ بے بنیاد اور زہریلا پروپیگنڈہ کیا گیا۔ انتخابات سے پہلے وزیر اعظم تانسلر چیلر نے ۲۳ ترامیم کے ذریعے پوری کوشش کی کہ انتخابی قواعد ترکی کی واحد اسلامی جماعت کے لیے مشکل بنا دیے جائیں اور اسے کسی قیمت پر کامیابی نہ مل سکے مگر ترکوں نے پروپیگنڈے کے اس طوفان کے باوجود اربکان کی ''رفاہ'' کو سب سے بڑی پارلیمانی جماعت بنا دیا۔

سخت پابندیوں اور مشکلات کے باوجود اسلامی تحریک مسلسل عروج کے زینے چڑھتی رہی اور ترکی کے سیکولر طاقتیں حکومت میں ہونے کے باوجود زوال پذیر رہیں۔ مغرب کی طاغوتی طاقتیں اور تمام وسائل بھی ترک حکمرانوں کی پشت پر رہے مگر وہ مغربی نظام کو منہدم ہونے سے بچانے کے لیے کچھ نہ کر پائے۔

بلدیاتی انتخابات میں کامیاب ہونے والے نمائندوں نے عمدہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ بیسیوں شہر اور قصبوں میں فحاشی اور بے حیائی کے سرعام مناظر ختم ہو کر رہ گئے۔ عوامی مقامات پر شراب نوشی اور آزادانہ اختلاط مرد وزن پر پابندی عائد کر دی گئی، خواتین کے جسم حیاء کے لبادوں میں چھپ گئے۔ خیانت و کرپشن میں بڑی حد تک کمی آ گئی۔ رفاہ پارٹی نے مختلف شہروں میں لوگوں کو سستی ڈبل روٹی مہیا کرنے کے لیے اپنی بیکریاں قائم کیں۔ بے شمار منصوبے تکمیل کو پہنچے۔ لوگوں نے حیرت سے دیکھا کہ رشوت اور خیانت کے بغیر بہت کم قیمت پر کس طرح بڑے بڑے منصوبے مکمل کرائے گئے۔ رفاہ پارٹی کے دشمنوں نے بھی تسلیم کر لیا کہ دیانت اور عدل میں رفاہ کا جواب نہیں!

## رفاہ پارٹی کی حکومت

بلدیاتی انتخابات میں کامیابی کے بعد رفاہ پارٹی نے اپنی بلدیاتی سربراہوں کو یہ ہدف دیا تھا کہ وہ کرپشن کا خاتمہ کر کے ان اداروں کے مالی وسائل میں اضافہ کریں گے اور ان وسائل کو عام آدمی کے مسائل کے حل کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۹۵ء کے عام انتخابات میں رفاہ پارٹی نے بغیر کسی دوسری جماعت کے اشتراک کے اکیس فیصد ووٹ حاصل کیے اور سب سے بڑی پارلیمانی جماعت بن گئی۔ یہ سیکولرازم کے لیے واضح اعلان شکست تھا۔ شروع میں دوسری سیاسی جماعتوں نے رفاہ کو اقتدار میں آنے سے روکنے کے لیے گٹھ جوڑ کیا لیکن نہ تو مسعود یلماز کی حکومت چل سکی اور نہ ہی تانسو چیلر کی حکومت کامیاب ہو سکی۔ آخر کار تانسو چیلر کو رفاہ پارٹی سے معاہدہ کر کے مخلوط حکومت تشکیل دینی پڑی۔ اس طرح رفاہ پارٹی اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہوئی۔ رفاہ نے ترکی کے سیکولر آئین کی چھت تلے ہی اسلامی احیاء کا کام شروع کیا۔ انہوں نے اسلامی نظام کے لیے ''عادلانہ نظام'' کی اصطلاح استعمال کی۔ سیکولر ترک آئین کے تحت اسلام کا نام استعمال کرنا ممکن نہ تھا اس لیے انہوں نے بڑی حکمت اور تدبّر سے معاملات کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کے کام کا آغاز کیا۔

رفاہ پارٹی نے جس طرح بلدیاتی اداروں سے کرپشن کے خاتمے کے لیے اہم اقدامات کیے تھے اسی طرح اس نے حکومت سنبھالنے کے بعد سرکاری اداروں سے بھی کرپشن کے خاتمے کے لیے دوررس اقدامات کیے۔ کرپشن کے خاتمے سے انہیں اتنے وسائل حاصل ہوئے جس سے وہ اپنے اقتصادی پروگرام پر عمل کر سکتے تھے۔ کرپشن کے خاتمے سے حاصل ہونے والی رقم سے شہروں میں سڑکوں اور پلوں کا ایک جال بچھا دیا گیا۔ مثلاً انقرہ کی بلدیہ نے کرپشن پر کنٹرول کر کے اتنی رقم جمع کر لی جس سے شہر میں ایک سال کے دوران دس اوور ہیڈ برج تعمیر کر دیے گئے۔ اس طرح ٹریفک کے خوفناک مسئلے پر قابو پا لیا گیا۔

ترکی میں کرپشن کے کینسر کا اندازہ اربکان کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے کہ ترکی میں چند ہولڈنگ کمپنیوں کو سارے وسائل پر مسلّط کر دیا گیا ہے اور یہ سب لوگ ترکی کو لوٹنے پر لگے ہوئے ہیں۔ حکومت ان سے پھر قرض لیتی ہے۔ وہ اس پر ۱۴۰ فیصد سود حاصل کرتے ہیں۔ اسٹیٹ بینک ان سے مختصر المدت جو قرضہ

لیتا ہے وہ اس پر اسی فیصد سود لیتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے پاس ہارڈ کرنسی ۲۱ ارب ڈالر ہے لیکن اس میں سے ۱۸ ارب ڈالر عالمی ادارہ کی ہدایت پر عالمی بینک کے پاس رکھے ہوئے ہیں جس پر ترکی کو ۲.۱ فیصد منافع ملتا ہے۔ جبکہ ہم اپنی ضرورت کے لیے باہر سے جو قرضہ لیتے ہیں اس پر ہمیں دس فیصد سود دینا پڑتا ہے۔ یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہے جو عالمی اداروں نے ہمارے حکمرانوں کی ملی بھگت سے کیا ہے۔

ترکی میں تین لاکھ سرکاری گاڑیاں ہیں اور ان تین لاکھ گاڑیوں کے استعمال کے لیے ضرورت سے تین گنا زیادہ پیٹرول و ڈیزل خریدا جاتا ہے۔ صرف اس کو کنٹرول کرنے سے ایک سال کے دوران ہمیں تین سو ملین ڈالر کی بچت ہوئی تمام تر وسائل کے باوجود ترکی اقتصادی تباہی کی راہ پر گامزن تھا۔ رفاہ پارٹی نے اقتدار سنبھالتے ہی اس طرف خصوصی توجہ دی۔ اربکان نے حکومت سنبھالنے کے فوراً بعد سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں پچاس فیصد اضافہ کر دیا جس سے پچھتّر لاکھ ملازمین کو فائدہ پہنچا۔ پولیس اور آرمی کی تنخواہوں میں اس سے بھی زیادہ اضافہ کیا گیا تاکہ رشوت کی طرف مائل نہ ہوں۔ اس بات کو بھی یقینی بنایا گیا کہ کم از کم تنخواہ ۲۰۰ ڈالر (یعنی آٹھ ہزار پاکستانی) سے کم نہ ہو، اس کے ساتھ ساتھ غیر سرکاری ملازمین کا بھی تحفظ کیا گیا اس سے ان کا بھی معاشی معیار بلند ہوا۔ یہ سب اقتصادی اصلاحات کرپشن کے خاتمے کے لیے ممکن ہوئیں۔

ملک کے غرباء اور مساکین کے لیے علیحدہ سے ایک ادارہ قائم کیا گیا۔ اس کے ٹیلی فون نمبروں کی تشہیر کی گئی۔ مستحقین سے کہا گیا کہ وہ ان اداروں کے ذمّہ داروں کو اپنی ضروریات بتا کر امداد حاصل کر سکتے ہیں۔

ترکی یورپ کا ایک اہم علاقہ اور منڈی ہے اور گزشتہ کئی عشروں سے یورپ ترکی کے بہت سے معاملات میں براہِ راست شامل ہے۔ نجم الدین اربکان نے حکومت سنبھالتے ہی اسلامی دنیا سے تعلقات کو فروغ دینے کے لیے پروگرام پر عمل کرتے ہوئے آٹھ اسلامی ممالک کا دورہ کیا۔ امریکہ کو جب اربکان کے اس فیصلے کا علم ہوا تو اس نے اربکان کو یہ دھمکی دی کہ وہ یہ دورہ منسوخ کر دے ورنہ اس کے نتائج کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔ اربکان نے اس کا منطقی جواب دیتے ہوئے امریکہ سے کہا کہ یہ ہماری اپنی خارجہ پالیسی کا حصہ ہے اس کے لیے ہم باہر سے مسلّط کیے گئے فیصلوں کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ ترکی اپنے فیصلے کرنے میں خود مختار

ہے۔ امریکہ لی مخالفت کے باوجود انہوں نے پاکستان، ایران، بنگلہ دیش، انڈونیشیا، ملائیشیا، مصر اور لیبیا کا دورہ کیا۔ گروپ آف سیون کے مقابلے میں مسلم ۸ (M8) کے نام سے ایک نیا بلاک بنایا۔ اس کی دو اعلیٰ سطحی کانفرنسیں ترکی میں منعقد ہو چکی ہیں۔

مسلم بلاک (M8) کے قیام کے لیے نجم الدین اربکان نے مسلم ممالک کے دورے کر کے بڑے بڑے معاہدے کیے مثلاً ایران سے ۲۰ سالہ معاہدہ کیا گیا جس کے تحت ایران ترکی کو گیس اور پیٹرول فراہم کرے گا۔ یہ ۲۳ ارب ڈالر کا معاہدہ تھا۔ پاکستان کے ساتھ بھی متعدد فوجی اور اقتصادی معاہدے کیے گئے۔ ملائیشیا اور سنگاپور سے معاہدے ہوئے۔ سنگاپور کے فوجی ترک افواج سے ایف سولہ کی ٹیکنالوجی کی تربیت حاصل کریں گے۔ ملائیشیا سے تجارت چار سو ملین سے بڑھا کر ڈیڑھ بلین ڈالر سالانہ کرنے کا معاہدہ کیا گیا۔ اسی طرح انڈونیشیا، مصر اور نائجیریا سے بھی متعدد معاہدے ہوئے ان معاہدوں کے تحت ترک عوام کی بڑی تعداد کو ان ممالک میں روزگار بھی ملے گا۔

خلیج کی جنگ کے بعد امریکن فوجیں ترکی میں مقیم ہوگئی ہیں اور ان کے ترکی میں قیام کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔ ۱۹۹۷ء میں جب تجدید کا مرحلہ آیا تو رفاہ نے امریکیوں سے کڑی شرائط تسلیم کرانے کے بعد ان کے فوجی قیام کی تجدید کی۔ ان میں یہ شرط بھی تھی کہ امریکہ جلد از جلد ترکی کو وہ اسلحہ فراہم کرے گا جس کی وہ رقم بٹور چکا ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ عراق کے محاصرے سے ہونے والے ترکی کے نقصان کا معاوضہ بھی دے گا اور آئندہ مسلمان ممالک سے ترکی کی تجارت میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔

''امریکہ کی پالیسی اس وقت اس واحد نکتہ کے گرد گھوم رہی ہے کہ کسی طرح اسرائیل کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنایا جائے۔ رفاہ پارٹی کی حکومت سے قبل اسرائیل کے ترکی سے گہرے تعلقات تھے اور ان کے درمیان متعدد معاہدے ہو چکے تھے رفاہ پارٹی نے ان میں سے کسی معاہدے کو نہیں چھیڑا اور ان کی پابندی کا وعدہ کیا۔ تاہم انہوں نے واضح کیا کہ جس طرح ترکی کی گزشتہ حکومتوں کی اپنی ترجیحات تھیں اسی طرح ان کی بھی اپنی ترجیحات ہیں۔ بین الاقوامی طاقتوں خصوصاً امریکہ کی پہلے کی طرح یہ کوشش ہے کہ اسرائیل اور ترکی کے تعلقات مضبوط سے مضبوط تر ہوں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے نجم الدین اربکان کو اسرائیلی وزیر خارجہ

سے ملاقات پر بھی مجبور کرنے کی کوشش کی۔ اسرائیلی وزیر خارجہ کی ۸ اپریل کو ترکی میں اربکان سے ملاقات کرائی گئی۔ نجم الدین اربکان نے اسرائیلی وزیر خارجہ کے سامنے بحیثیت ایک مسلمان کے اپنا اُصولی موقف رکھا۔ انہوں نے فلسطین کی سرزمین پر یہودی بستیوں کے قیام کی مخالفت کی اور فلسطینیوں کے حقوق کی کھل کر حمایت کی۔ انہوں نے اس موقعہ پر اسرائیلی وزیر خارجہ سے ہاتھ ملانے سے بھی انکار کر دیا۔ ملاقات کے موقعہ پر موجود صحافیوں نے اربکان سے اصرار کیا تھا کہ وہ وزیر خارجہ سے ہاتھ ملائیں تا کہ ان کی ایک تصویر کھینچی جائے لیکن اربکان نے اس مطالبے کو تسلیم نہیں کیا۔ اس طرح انہوں نے اسرائیلی وزیر خارجہ کے ذریعے امریکہ پر بھی یہ واضح کر دیا کہ وہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں فلسطینیوں کو ان کے حقوق دے اور قبلہ اوّل پر یہودی قبضے کا ساتھ نہ دے۔''(۱۲)

دوسری طرف اربکان نے ترک معاشرے کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی طرف خصوصی توجہ دی۔ انہوں نے پارلیمنٹ میں ایک قانون پیش کیا جس میں ترک خواتین کو دفاتر اور تعلیمی اداروں میں اسکارف پہننے کی اجازت دینا تھی۔ اس آئینی ترمیم میں یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ چونکہ ایک سیکولر معاشرہ کسی بھی فرد کو اپنے طریقے سے اپنے مذہب پر عمل کرنے کی زیادہ سے زیادہ اجازت دیتا ہے اس لیے مسلم خواتین کو اپنے مذہب کی تعلیمات کے مطابق اسکارف اوڑھنے کی اجازت دی جائے۔ اسی طرح حکومت نے سڑک کے ذریعے حج پر جانے کی اجازت دے دی۔ اس لیے کہ سڑک کے سفر پر ترک حاجیوں کو ہوائی سفر کی نسبت بہت کم خرچ پڑتا ہے۔ خواتین کے پردے اور دینی مدارس سمیت چند بے ضرر اقدامات پر ہی ترک فوج آگ بگولا ہو کر رفاہ حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ترک حکومت دینی مدارس کو بند کرانا چاہتی تھی۔ سڑک کے ذریعے حج کی اجازت پر بھی ناراض ہونے کی منطق یہ تھی کہ اس طرح ترک ایئر لائن کو نقصان پہنچے گا۔ رفاہ پارٹی کی حکومت مسلمانوں کو یہ اجازت بھی دینا چاہتی تھی کہ قربانی کی کھالیں اپنی مرضی سے صرف کر سکتے ہیں کیونکہ ترکی قانون کے مطابق مسلمان قربانی کی کھالیں صرف ترکی ایئر لائن کو دینے کے پابند ہیں اس بات کو بھی فوج نے اُچھالا۔

نجم الدین اربکان نے انقرہ اور استنبول میں دو عظیم الشان مساجد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا اس کے خلاف

بھی فوج نے پروپیگنڈہ شروع کر دیا اور حکومت سے کہا کہ وہ مساجد کی تعمیر کی اجازت نہ دے۔اس طرح کے سطحی الزامات لگا کر فوج نے رفاہ حکومت کے خلاف مُہم شروع کر دی۔

## اربکان کا استعفیٰ

ملک کے حالات بے حد خراب ہوگئے۔فوج نے اربکان کا تختہ اُلٹنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اخبارات مسلسل مارشل لاء کی آمد کی خبریں دینے لگے۔جس کی وجہ سے بالآخر اربکان نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا تا کہ نئے انتخابات کے ذریعے مستحکم جمہوری حکومت قائم ہو سکے۔فوج نے سازش کے ذریعے مسعود یلماز کی اقلیت کو اکثریت میں بدل کر اسے وزیر اعظم کے منصب تک پہنچا دیا۔

## رفاہ پر پابندی

اس کے بعد بھی فوج اور سیکولر قوتوں کا انتقام ختم نہ ہوا۔انہوں نے رفاہ کو سیکولر ترکی کے لیے خطرناک قرار دیتے ہوئے مقدمہ درج کرا دیا۔جس آئینی عدالت نے رفاہ پر پابندی عائد کی اس کی اسلام دشمنی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ رفاہ کا سب سے بڑا جرم احترامِ رمضان کو ٹھہرایا گیا۔دیگر اسلامی اقدامات کو بھی فرد جرم میں بنیادی اہمیت دی گئی۔جس کے نتیجے میں ۱۶ جنوری ۱۹۹۸ء کو رفاہ پر پابندی عائد کر دی گئی اور نجم الدین اربکان اور ان کے پانچ ساتھیوں کو پانچ برس کے لیے سیاست میں حصہ لینے سے روک دیا گیا۔اربکان اور ان کے جرأت مند ساتھیوں نے اس فیصلے کو سیاسی قرار دیا اور اس موقع پر اربکان نے اپنے حامیوں سے کہا:

> ''آپ کسی بھی قسم کے اشتعال کا مظاہرہ نہ کریں،آپ ان تمام کوششوں کے جواب میں پُرسکون رہیں۔اس فیصلے سے ترکی میں اسلامی تحریک کو ختم نہیں کیا جا سکتا نہ اس کی رفتار کو کم کیا جا سکتا ہے اس فیصلے سے ہمارا موقف اور مضبوط ہوگا اور ایک وقت آئے گا جب رفاہ تنہا حکومت بنائے گی۔''(۱۳)

## فضیلت پارٹی

چنانچہ پابندی کے اگلے روز ہی فضیلت پارٹی کے نام سے نئی جماعت وجود میں آ گئی اور رفاہ کی اکثریت اس جماعت کا حصہ بن گئی۔

## فوج کے اقدامات

لیکن فوج اسلام پسند عناصر کے خلاف بڑے کریک ڈاؤن کی متمنی رہی۔ ان کا اصرار تھا کہ اسلام پسندوں کا مکمل صفایا ہونا چاہئے۔

چنانچہ مارچ ۱۹۹۸ء میں سرکاری مدارس اور تعلیمی اداروں میں اسلامی تعلیم پر، اوقاف، اسلامی خیراتی اداروں، اسلامی تحریک میں شمولیت اور نئی مساجد کی تعمیر پر پابندی عائد کر دی گئی۔

اسکولوں اور یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات کو اسلامی طرز کے لباس مثلاً (پردہ، اسکارف وغیرہ) پہن کر یا چہرے پر داڑھی سجا کر یونیورسٹی آنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا گیا۔ حکومت کا موقف تھا کہ یہ سب قرونِ وسطیٰ کی روایات ہیں۔ لیکن طلبہ و طالبات کے وسیع پیمانے پر احتجاج کے بعد حکومت پردے اور داڑھی پر یہ پابندی ختم کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اگر چہ چند دن بعد پھر یہ پابندیاں عائد کر دی گئیں۔'' (۱۴)

ان تمام پابندیوں کی پوری دنیا میں مذمت کی گئی۔ اسلامی دنیا کی تحریکوں، حکومتوں اور شخصیات نے اس فیصلے کو اسلام دشمنی پر مبنی قرار دیا اور امریکہ اور یورپ نے اسے جمہوریت کے قتل سے تعبیر کیا۔ سوال یہ ہے کہ سیکولر، فوج، بیوروکریسی اور جانبدار عدالتیں کب تک سیکولرازم کو بچا سکیں گی؟ اسلام نے تو بالآخر آنا ہی ہے۔ ۱۹۹۵ء میں اسلامی تحریک نے ۱۵۸ نشستیں حاصل کی تھیں۔ اپریل ۱۹۹۹ میں آئندہ انتخابات میں ان کے بڑھنے کی قوی توقع ہے اس وقت اسلام کا راستہ کیسے رکے گا اور کون روکے گا؟
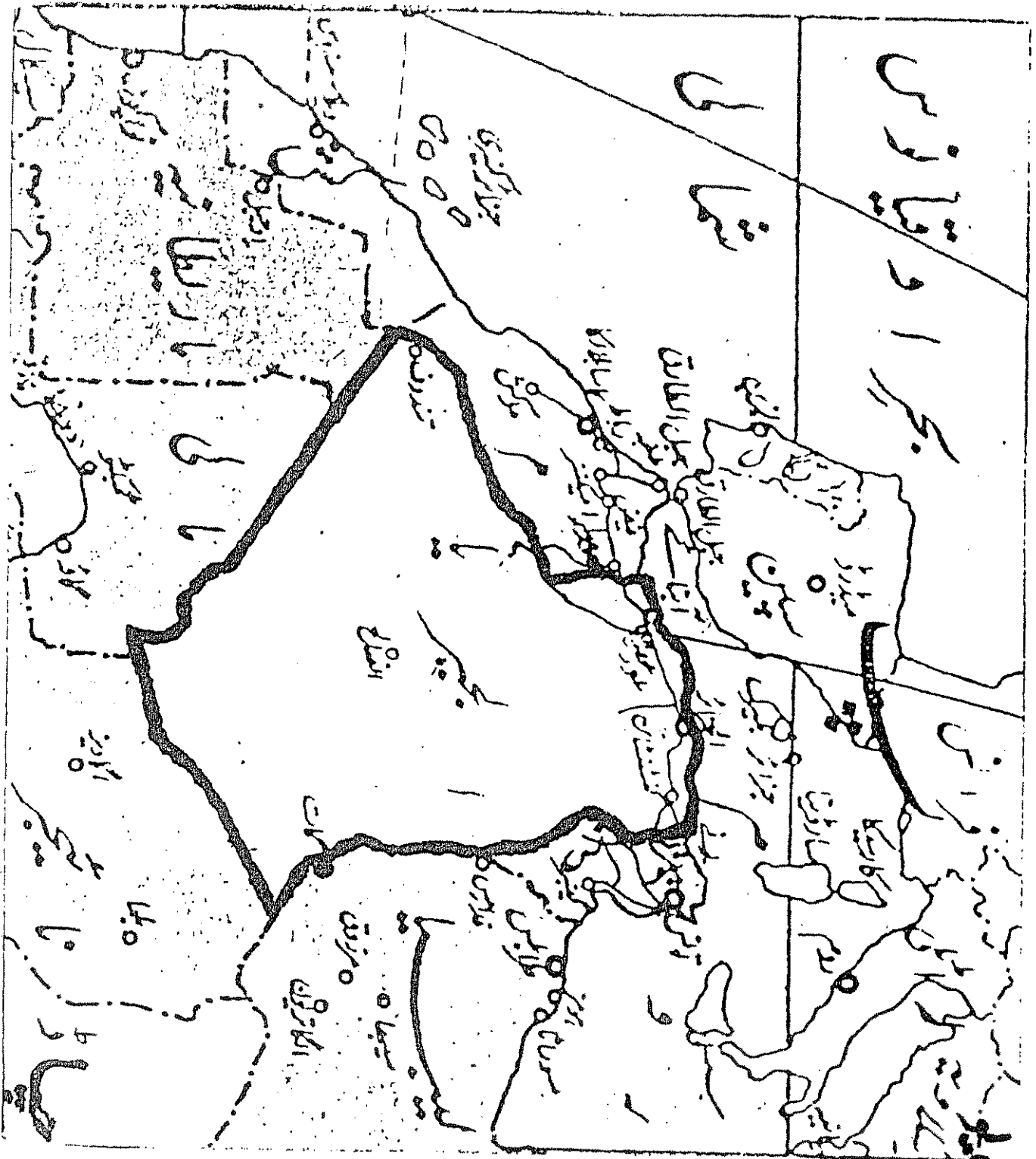
فصل سوم

# الجزائر کی تحریک

## امیر عبدالقادر الجزائری سے لے کر عباسی مدنی تک

### الجزائر کی اسلامی تحریک جہاد کا آغاز

۱۳ جون ۱۸۳۰ء کو فرانس نے الجزائر پر حملہ کر دیا۔ ۱۰۳ بحری جہاز جن پر ۳ ہزار توپیں نصب تھیں، ۳۴ ہزار جنگ آزما سپاہی، ۲۰ ہزار بحریہ کے فوجی اور ۳۸۳ مال بردار بحری جہاز اس حملے میں شریک تھے۔ الجزائری مجاہدین بھی پوری تیاری کے ساتھ مقابلے کے لیے نکلے۔ آغاز میں الجزائری مجاہدین نے فرانسیسی لشکر کو شکست دے دی مگر چونکہ یہ جنگ بڑی غیر مساوی تھی اور الجزائر کی مسلمان حکومت داخلی کمزوریوں سے دوچار تھی چنانچہ ۵ جولائی ۱۸۳۰ء کو فرانسیسی فوج کے سامنے الجزائر شہر (جسے اُردو صحافت الجزیرہ لکھتی ہے، جبکہ اس کا اصل نام الجزائر ہے اور یہی نام پورے ملک کا بھی ہے) کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ فرانسیسی فوج نے جی بھر کر شہر کو لوٹا۔ اس کے بعد فرانسیسی استعمار نے الجزائر کے اندرونی علاقوں میں پیش قدمی شروع کی مگر قدم قدم پر اسے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مزاحمت کا نام ''تحریکِ جہاد'' ہے اور میں اس تحریکِ جہاد کی چند جھلکیاں پیش کرنا چاہتی ہوں۔

### احمد پاشا کی تحریک جہاد

الجزائر کے عثمانی حاکم حسین پاشا کی کمزوری اور بے دانشی دیکھ کر الجزائری قوم میں شدید بے چینی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ الجزائر کے مشرقی صوبے قسطنطنیہ میں صوبے کے گورنر (بے آف قسطنطنیہ) الحاج احمد پاشا کے گرد لوگ جمع ہو گئے۔ ان میں عرب بھی تھے اور ترک بھی۔ انہوں نے ایک منظم فوج تشکیل دے لی اور پھر

فرانسیسیوں کو مشرق کی جانب بڑھنے سے روکنے کے لیے قدم قدم پر شدید معرکہ آرائیاں کیں۔ ہزاروں فرانسیسی ان کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ مگر باہر سے سپلائی نہ ملنے کی وجہ سے یہ مجاہدین آہستہ آہستہ کمزور ہوتے گئے۔ آخر کار ۱۸۳۸ء کو فرانسیسی فوج قسطنطنیہ شہر میں داخل ہوگئی مگر اس کے باشندوں نے گلی گلی اس کا مقابلہ کیا۔ دونوں طرف سے بے پناہ جانی و مالی نقصان ہوا۔

## امیر عبدالقادر الجزائری کا جہاد

صوبہ دہران میں امیر عبدالقادر الجزائری نے تحریک جہاد برپا کردی۔ فرانس نے جب الجزائر میں اپنا قدم رکھا تو امیر عبدالقادر کی عمر اس وقت ۲۳ سال تھی۔ انہوں نے دہران میں مختلف علوم وفنون سیکھے۔ اُونچے پائے کے ادیب وشاعر تھے۔ اہلِ دہران نے پہلے ان کے والد محی الدین بن مصطفیٰ الحسنی کو تحریکِ جہاد کا امیر منتخب کیا مگر وہ اپنی پیرانی سالی کی وجہ سے تحریکِ جہاد کی قیادت سے الگ ہوگئے۔ لوگوں نے ان کے متقی، بہادر اور صاحب علم بیٹے کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ یہ نومبر ۱۸۳۲ء کا واقعہ ہے۔ معسکر نامی قصبہ کی مسجد میں بیعت منعقد ہوئی۔ بیعت کے امیر عبدالقادر الجزائری نے جو خطبہ دیا وہ یہ ہے:

> ''میں نے یہ منصب اپنی خواہش کے برعکس قبول کیا ہے۔ بس اس اُمید پر کہ شاید یہ مسلمانوں کے اتحاد کا ذریعہ بن جائے۔ میں تمہیں اتحاد و یگانگت کی دعوت دیتا ہوں۔ تم سب جان لو کہ میرا اصل مقصود اس دورِ پُرفتن میں ملتِ محمدی ﷺ کی شیرازہ بندی اور احمد مجتبیٰ ﷺ کی شریعت کا قیام ہے۔ اس عظیم مشن کو سرانجام دینے کے لیے میرا اصل بھروسہ صرف ذاتِ خداوندی پر ہے۔'' (۱۵)

امیر عبدالقادر الجزائری نے اپنے علاقے میں امارت اسلامی قائم کردی۔ ''عسکر محمدی'' کے نام سے فوج منظم کی جسے یورپ کے جدید ترین طرز پر تربیت دی۔ اس کی تعداد ۱۵ ہزار تھی۔ امارت اسلامی کا سکہ جاری کیا اور پھر پوری تیاری کے ساتھ فرانسیسیوں کے خلاف اعلانِ جہاد کردیا۔ جہاد شروع کرنے سے پہلے امیر نے یہ فتویٰ جاری کیا کہ:

(بے شک جو شخص فرانسیسیوں کی مدد کرے گا وہ دین سے خارج ہو جائے گا)۔(۱۶)

امیر عبدالقادر الجزائری نے الجزائری عوام کے اندر زبردست رُوحِ جہاد پھونک دی اور پھر بڑی حکمت و جانفشانی کے ساتھ الجزائر کے مغربی علاقوں میں فرانسیسی افواج کے داخلے کو روکے رکھا۔ پورے مغربی الجزائر پر امیر کا قبضہ تھا۔ تلمسان کا عظیم الشان تاریخی شہر بھی ان کی امارت میں تھا۔ اسلامی زندگی کی بھرپور فضا تھی۔ زندگی کے ہر شعبے میں شریعت کے احکام جاری تھے۔ ہر طبقہ کے اندر ایک نیا ولولہ ابھر آیا۔ ۱۸۳۲ء سے لے کر ۱۸۳۹ء تک سات سال ایسے گذرے ہیں کہ امارتِ اسلامی پورے عروج پر تھی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر فرانس نے ۲۹ مئی ۱۸۳۸ء کو امیر کے ساتھ معاہدہ صلح کر لیا جسے تفنا پیکٹ (Tafanh) کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے فرانس نے دہران پر امیر عبدالقادر الجزائری کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔

فرانس نے امیر کی طاقت دیکھ کر نئی حکمتِ عملی تیار کی اور جنرل بوگو کی کمان میں ۲ لاکھ تازہ دم فوج الجزائر بھیج دی اور الجزائر کو راکھ کا ڈھیر بنا دینے کی منصوبہ بندی کی۔ چنانچہ جنرل بوگو نے الجزائر میں جو ظلم و ستم ڈھائے اس کا اندزہ فرانسیسی پارلیمنٹ کے ایک رکن کے ان الفاظ میں کر سکتے ہیں:

''ہم نے الجزائر میں تین ماہ میں اس قدر ظالمانہ کاروائیوں کا ارتکاب کیا ہے جو ترکوں نے وہاں تین سو سالوں میں نہیں کیا۔'' الجزائر کو نذرِ آتش کر دینے کی پالیسی کے نتیجے میں الجزائر کی آبادی ۴۰ لاکھ سے گھٹ کر ۲۰ لاکھ رہ گئی۔ بایں ہمہ امیر عبدالقادر فرانسیسیوں کے خلاف لڑتا رہا۔ مراکش کا سلطان عبدالرحمن بن ہشام امیر کی مدد کر رہا تھا۔ فرانس نے اسے بھی دھمکی دی چنانچہ وہ امیر کی مدد سے دستبردار ہو گیا۔ آخر کار امیر نے لڑتے لڑتے ۱۸۴۷ء میں فرانس کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ امیر پہلے فرانس پہنچا دیا گیا اور پھر وہاں سے وہ شام آ گیا اور زندگی کے بقیہ ایّام دمشق میں گزارے۔

امیر عبدالقادر کی امارات اسلامی کا سقوط گو الجزائری قوم کے لیے انتہائی حوصلہ شکن تھا مگر یہ سخت جان اور مجاہد قوم فرانس کے آگے ڈٹی رہی اور الجزائر کے دیگر علاقوں میں بر بر بغاوت کے شعلے بھڑکتے رہے۔

''الجزائر کے ایک صحرائی علاقہ ''الزعاطشہ'' میں ایک صوفی رہنما بوزیان نے اپنے مریدوں کی مدد سے اپنے علاقے میں حکومت قائم کرلی اور صحرائے الزعاطشہ میں فرانسیسیوں کا داخلہ بند کردیا۔ فرانس نے سات ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک مُہم بھیجی جس کی قیادت جنرل دی ہربیون نے کی۔ اس نے الزعاطشہ کا محاصرہ کرلیا جو چار ماہ تک جاری رہا۔ بوزیان کے مریدوں نے زبردست جانفشانی کا مظاہرہ کیا مگر فرانسیسی جنرل نے پورے علاقے کو جلادینے کے احکام جاری کردیے۔ اس معرکہ میں ایک ہزار پانچ سو مسلمان مجاہدین شہادت پاگئے۔ فرانسیسی فوج نے نومبر ۱۸۴۹ء کو اس علاقے پر قبضہ کرلیا اور بوزیان کو گولی مار کر شہید کردیا۔''(۱۷)

ایک دوسرے صحرائی مقام ورغلہ واغواط میں بھی ایک دینی شخصیت اُٹھی۔ اس کا نام محمد بن عبداللہ تھا۔ اس نے بھی مجاہدین کی ایک جماعت تیار کی چونکہ اس صحرا سے وہ راستہ گزرتا تھا جو بحرِ متوسط اور سوڈان کے درمیان تجارت کا واحد ذریعہ تھا اس لیے فرانس یکبارگی حملہ کر کے اس علاقے کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔

۱۸۶۴ء میں الجزائر کے جنوب میں ولد سیّدی الشیخ نامی قبائل نے باش آغا سلیمان بن حمزہ کی قیادت میں بغاوت کردی۔ پورے پانچ سال بغاوت کی یہ لہر پھیلی رہی۔ اسے فرو کرنے کے لیے جو فرانسیسی کمانڈر فوج کشی کے لیے آیا وہ آغا باش کے ہاتھوں مارا گیا۔ آخرکار فرانسیسی فوج نے ایک زبردست حملے کے بعد ۱۸۶۹ء میں جبال عمور میں اس تحریک کے آخری مورچے پر بھی قبضہ کرلیا۔

۱۸۷۱ء کے آغاز میں جبال جرجرہ میں ایک اور زبردست تحریک جہاد نے سر اُٹھالیا۔ اس کے بانی الجزائر کے روحانی پیشوا الحاج محمد المقرانی اور الشیخ محمد الحداد تھے۔ اوّل الذکر امیر عبدالقادر الجزائری کے مریدوں میں سے تھے۔ یہ تحریک بڑی تیزی کے ساتھ پھیل گئی۔ خود قسطنطنیہ اور الجزائر (صدر مقام) جیسے اہم شہروں تک اس کے اثرات پہنچ گئے۔ اس کی فوری مقبولیت کی اصل وجہ یہ تھی کہ فرانسیسی استعمار کی آمد کے ساتھ عیسائی مشنری بھی ملک میں داخل ہوگئے اور انہوں نے بربر قبائل میں خاص طور پر عیسائیت کی تبلیغ شروع کردی۔ ان کا خیال تھا کہ بربر اسلام سے سطحی تعلق رکھتے ہیں انہیں عیسائی بنانا آسان ہے۔ اس کے ردِّعمل میں الحاج محمد المقرانی نے سلسلہ رحمانیہ کے نام سے ایک روحانی تحریک برپا کردی جو آگ کی طرح قبائل میں

پھیل گئی۔ اس کے پیرو ''اخوان'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ یہی روحانی تحریک پھر تحریکِ جہاد میں تبدیل ہوگئی۔ یہ تحریک دیکھتے ہی دیکھتے الجزائر کے تین چوتھائی حصے تک پھیل گئی اور اس نے فرانس کی تمام فوجی چھاؤنیوں کو ملک سے کاٹ دیا۔

اس تحریک کے وابستگان کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی۔ ان میں ایک لاکھ بیس ہزار رحمانی اخوان تھے۔ قریب تھا کہ محمد المقرانی الجزائر کی آزادی میں کامیاب ہو جاتا مگر جرمنی کے باشاہ بس مارک کے اندر عیسائیت کی رگ پھڑک اُٹھی اور اس نے فرانس پر اپنا دباؤ کم کر دیا اور فرانس کے جنگی قیدیوں کی بہت بڑی تعداد کو (جو اس نے فرانس کے ساتھ جنگوں میں گرفتار کیے تھے) رہا کر دیا تا کہ وہ الجزائر کی انقلابی تحریک کو کچلنے میں مدد دیں۔ مئی ۱۸۷۱ء میں فرانسیسی فوج نے محمد المقرانی کے مجاہدین پر حملہ کر دیا چنانچہ محمد المقرانی اس معرکے میں شہید ہو گئے اور تحریک کی قیادت ان کے بھائی بومرزاق نے سنبھالی۔ بومرزاق بربر قبائل کو ساتھ لے کر جنوری ۱۸۷۲ء تک فرانسیسی فوج سے لڑتا رہا۔ رحمانی اخوان نے اس جنگ میں غیر معمولی جرات و بہادری کا ثبوت دیا۔ فرانسیسی فوج کی سپلائی مسلسل جاری تھی جبکہ رحمانی اخوان کے لیے اسلحہ کا حصول ناممکن ہو رہا تھا۔ آخر کار یہ قبائل لڑتے لڑتے کمزور ہو گئے۔ بومرزاق اپنے ساتھیوں سمیت صحرا کی طرف نکل گیا مگر فرانسیسی فوج نے ان لوگوں کو صحرا سے گرفتار کر لیا۔ اس وقت وہ لوگ صحرا میں مارے مارے پھرنے کی وجہ سے بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو چکے تھے۔ فرانسیسی حکومت نے ان پر مقدمات چلائے ان میں سے ۶ ہزار کو موت کی سزائیں سنائیں، بعض کو فرانس کے جزیرہ کیلڈ ونیا جلاوطن کر دیا جن میں بومرزاق اور اس کا خاندان بھی شامل تھا۔ باقیوں پر ۲۶ ملین فرانک تاوان بھی عائد کیا گیا جو لوگ تاوان نہ دے سکے ان کی زمینیں ضبط کر لی گئیں اور وہ فرانس کے علاقوں الزاس اور لورین سے آنے والے فرانسیسی آباد کاروں کو دے دی گئیں۔ اس طرح یہ تحریک چند سال مزاحمت کے جوہر دکھانے کے بعد ختم ہوگئی۔

''اُوراس'' کے پہاڑی علاقوں کے اندر بھی مجاہدین کی ایک جماعت نے جہاد کا راستہ اختیار کر لیا۔ ۱۸۵۳ء میں اُوراس کے لوگوں نے اپنے تازہ دم نوجوان اس تحریک کے لیے وقف کر دیے جو جگہ جگہ فرانسیسی فوجوں پر حملے کرتے رہے کئی سال تک یہ سلسلہ جاری رہا اُوراس وہی مقام ہے جہاں سے فرانس کے خلاف

آخری بغاوت (۱۹۵۴ء) کا شعلہ بھی پہلی مرتبہ اُٹھا تھا جو ۱۹۶۲ء میں الجزائر کی آزادی تک منتج ہوا۔

''الجزائر کے مشرقی حصے میں جو تیونس سے متصل ہے۔ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء کے درمیان ایک بغاوت برپا ہوئی۔ یہ اس دور کی بات ہے جب محمد المقرانی کی تحریک جہاد اُٹھی تھی۔ مشرقی تحریک کے پیچھے امیر عبدالقادر الجزائری کے صاحبزادے محی الدین الجزائری تھے جو اپنے باپ کی طرح سراپا تقویٰ و جہاد تھے۔ فرانسیسی فوج اور محی الدین کے درمیان کئی معرکے ہوئے جن میں محی الدین کو کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ یہ بغاوت جاری تھی کہ فرانس اور جرمنی کے مابین صلح ہوگئی (جس کا اُوپر ذکر گزر چکا ہے) اور فرانس کی وہ فوجیں جو جرمنی سے لڑ رہی تھیں الجزائر آگئیں اور چاروں طرف بغاوت کو دبانے لگیں۔''(۱۸)

اس زمانے میں الجزائر شہر (صدر مقام) کے مغرب میں قصبہ شرشال میں بھی سید محمد البدوی کی قیادت میں بغاوت نے سر اُٹھایا۔ سیّد محمد البدوی نے اپنے علاقے کی آزادی کا اعلان کر دیا اور اپنے ساتھیوں سے مل کر مقامی انتظامیہ تشکیل دے لی۔ فرانسیسی حکومت نے یہ دیکھ کر ایک زبردست مُہم کے ذریعے سیّد محمد البدوی کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جہاں وہ ۹ سال تک تعذیب وتشدّد کا نشانہ بنے رہے۔

بظاہر ان جہادی تحریکات کے خاتمے کے بعد فرانس نے الجزائر پر مکمل قبضہ کر لیا۔ اس قبضے کے پیچھے صلیبی رُوح کام کر رہی تھی۔ فرانس کے کمانڈر جنرل بورمون نے الجزائر شہر کی جامع مسجد قشادہ کو چرچ میں تبدیل کرنے کے بعد تقریر کرتے ہوئے کہا:

> ''اسلام کے آخری دن آگئے ہیں۔ آئندہ بیس سال کے اندر الجزائر میں مسیح کے سوا کوئی اور نہیں رہے گا۔ ہمیں اس میں تو شک ہوسکتا ہے کہ الجزائر کی زمین فرانس کی ملکیت ہوگی یا نہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہاں سے اسلام ہمیشہ کے لیے مٹ گیا۔''

اس صلیبی رُوح کے تحت الجزائر میں فرانسیسی حکومت کے زیرِ اہتمام جگہ جگہ چرچ تعمیر کیے گئے۔ چنانچہ چند سالوں کے اندر الجزائر میں ۳۲۷ چرچ اور ۴۵ کنشت (یہودیوں کی عبادت گاہ) قائم کر دیے گئے۔ مسجدیں منہدم کر دی گئیں ان کی تعداد پورے ملک میں صرف ۱۲۷ رہ گئی۔ اسلام کا ایک ایک نشان مٹانے کے

لیے متعدد قوانین بنائے گئے۔ ستم وستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ جاہلی روایات کو رواج دیا گیا۔

ان سب کے باوجود الجزائری مسلمانوں نے اپنے سینے میں اسلام کی شمع روشن کیے رکھی۔ اس کی ثابت قدمی اور صبر و ہمت کی تصویر اُستاذ احمد توفیق المدنی الجزائری کے الفاظ میں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

> ''الجزائری قوم پر جو سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور دینی مصیبتیں فرانسیسی فوج کے ہاتھوں ٹوٹی ہیں اگر دنیا کی کسی اور قوم پر یہ ٹوٹتیں تو وہ بے شک احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتی اور نا اُمیدی اور مرگ دوام کے گڑھے میں گر جاتی لیکن تمام مصائب و آلام مل کر بھی الجزائری قوم کے اندر سے حمیت وخودداری کو نہ نکال سکے۔ الجزائری انسان بھوکا تھا، ان پڑھ تھا، چیتھڑوں میں ملبوس تھا، اس کے سامنے اُمید کی کوئی کرن نہ تھی، ہر وقت دشمنوں سے اس کا پالا تھا مگر بایں ہمہ کسی کے آگے نہیں جھکا۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ یہ تمام مصائب عارضی ہیں ایک نہ ایک دن یہ چھٹ جائیں گے اور الجزائر کی سرزمین ازسرِنو زندگی، عزت اور آزادی سے ہمکنار ہوگی۔''(۱۹)

صلیبی تسلّط اور استعماری جنون کے ساتھ فرانس نے الجزائر پر حکمرانی کا آغاز کیا۔ ۱۸۴۸ء میں فرانس کی پارلیمنٹ نے یہ قانون پاس کیا کہ الجزائر فرانس کا ایک قدرتی حصہ ہے۔ اس سے پہلے ۱۸۴۵ء میں الجزائر کی سیاسی تقسیم یوں کر دی گئی تھی کہ شمالی علاقے پر فرانسیسی شہری حاکم ہوں گے اور جنوبی علاقوں پر فرانسیسی فوج حکمرانی کرے گی۔ الجزائر کی زرخیز زمینیں فرانسیسی آبادکاروں کو دے دی گئیں اور اصل مالکان کو جنوب کی طرف صحرا میں دھکیل دیا گیا۔ اوقاف کی زمینیں ضبط کر لی گئیں۔ دینی تعلیم اور دینی اداروں پر پابندی لگادی گئی۔ فرانسیسی زبان کو سرکاری زبان قرار دے دیا گیا۔ اسلامی احکام ختم کر کے فرانسیسی قوانین نافذ کیے گئے (جو اب تک جاری ہیں)۔ الجزائریوں اور فرانسیسیوں کی مخلوط نسل تیار کرنے کے لیے ''انڈیجینا'' قانون نافذ کیا گیا۔ غرض یہ کہ اسلام کا ایک ایک نقش محو کرنے اور الجزائر کو پوری طرح فرانسیسی قالب میں ڈھالنے کے لیے ہر ہتھکنڈہ استعمال کیا گیا مگر الجزائری قوم کے سینوں میں اسلام اور جہاد کی آگ سلگتی رہی۔

فرانسیسی استعمار کے تحت جن لوگوں نے تعلیم و تربیت پائی تھی انہوں نے فرانس کا کل پرزہ بننے کے بجائے سیاسی جدوجہد کا میدان اختیار کر لیا۔ ان میں احمد بن اسمٰعیل، الحاج عمار اور الصادق دندان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے فرانسیسی زبان میں اخبارات نکالے۔ ان اخبارات نے ملک کے اندر ایک فکری اور سیاسی مزاحمت کی لہر پیدا کر دی۔ فرانسیسی زبان جاننے والے لوگ ان افکار سے متاثر ہونے لگے۔ پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) کے بعد فرانس نے مجبوراً الجزائری عوام کو بعض سہولتیں دیں۔ ۱۴ فروری ۱۹۱۹ء کو ایک ایکٹ جاری کیا گیا جس کی رو سے انڈیجینا قوانین ختم کر دیے گئے اور سرکاری ٹیکسوں میں بھی مساوات پیدا کر دی گئی۔ ورنہ الجزائریوں پر فرانسیسیوں سے زیادہ ٹیکس عائد ہوتے تھے۔ ووٹ کا حق بھی بعض طبقوں کو مل گیا۔

## الجزائر میں سیاسی تحریکیں

سیاسی میدان میں الجزائری قوم نے جو سرگرمی دکھائی اس کا خلاصہ یہ ہے:

### ۞ نجم شمالی افریقہ

اس نام سے پیرس میں ۱۹۲۶ء میں ایک تنظیم قائم کی گئی اس کے صدر احمد الحاج مصالی تھے۔ فرانس میں کام کرنے والے الجزائری مزدور اس تنظیم سے وابستہ ہو گئے۔ الجزائر میں قومی پارلیمنٹ کا قیام، الجزائریوں کے لیے ملازمت کے حصول میں سہولت، الجزائر کی کامل آزادی، الجزائریوں کی غصب شدہ اراضی کی واگزاری اور الجزائر سے فرانسیسی فوجوں کا انخلاء اس کا منشور تھا۔ مارچ ۱۹۳۷ء میں حکومت فرانس نے اسے خلاف قانون قرار دے دیا۔

### ۞ الترقی کلب

یہ تنظیم بھی الجزائر میں قائم کی گئی۔ الجزائر میں یہ پہلی مسلم تنظیم ہے۔ اس سے پہلے انڈیجینا قوانین کی وجہ سے الجزائری باشندے تنظیم تو کجا اجتماع بھی نہ کر سکتے تھے۔ اس کلب کے تحت سیاسی اور ملی رہنماؤں کی

تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ گو سیاسی سرگرمیوں کی نہایت محدود پیمانے پر اجازت تھی اس کے باوجود الترقی کلب نے قوم کے اندر ملی جذبہ، اسلامی دعوت اور عربی زبان و ادب کے احیاء میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس کلب کے اندر سے الجزائری مسلمانوں کی وہ عظیم الشان جماعت وجود میں آئی جسے جمعیت علمائے الجزائر کہا جاتا ہے اور جو دراصل الجزائر میں احیائے اسلام کی تحریک تھی۔

## الجزائر کے مجدد عبدالحمید بن بادیس کی علمی تحریک

عبدالحمید بن بادیس ۵ دسمبر ۱۸۸۹ء میں قسطنطنیہ کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اس گھرانے کا خصوصی امتیاز یہ تھا کہ اس کا کوئی فرد فرانسیسی حکومت کی ملازمت میں نہ تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم قسطنطنیہ میں پائی۔ سلسلہ تیجانیہ میں شیخ احمد بوحمدان سے عربی زبان اور اسلامی علوم سیکھے۔ ۱۹۰۸ء میں زیتونہ یونیورسٹی (تونس) چلے گئے اور تونس کے نامور علماء سے تکمیل تعلیم کی۔ ۱۹۱۳ء میں واپس الجزائر آ گئے اور اپنے درسوں کے ذریعے لوگوں کے اندر انقلابی رُوح پھونکنے لگے۔

مختلف مساجد اور مقامات پر انہوں نے نوجوانوں کے لیے عربی زبان کی تعلیم اور بڑے لوگوں کے لیے قرآن کریم کی تفسیر کے حلقے کھول دیے۔ قسطنطنیہ سے نکل کر الجزائر شہر، دہران اور تلمسان تک اپنے تفسیری درسوں کا نظام پھیلا دیا۔ ان درسوں کے اندر وہ قرآن کی اصل دعوت پیش کرتے اور قرآنی ضوابط کی رو سے الجزائر کی موجودہ حالت کا تجزیہ کرتے۔ ان کے یہ درس بڑے مقبول ہو گئے۔ سرکاری مفتیوں اور فرانسیسی استعمار کے پروردہ نام نہاد صوفیاء نے ایک مرتبہ ان کے درسوں پر پابندی لگوادی تھی مگر وہ مختلف طریقوں سے اپنا مشن جاری رکھے رہے۔

شیخ محمد البشیر الابراہیمی ان کی تعلیمی و تربیتی کاوشوں کے نتائج پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''جب میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد تکمیل تعلیم کے بعد واپس الجزائر آیا تو قسطنطنیہ میں بن بادیس سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے وہ ثمرات دیکھے جو بن بادیس کے چند سالہ تعلیمی کوششوں کے ذریعے الجزائری نوجوانوں کے اندر پھیل

چکے تھے۔ میرا یقین ہے کہ بن بادیس کی مبارک علمی تحریک نے دوررس نتائج پیدا کیے ہیں۔ الجزائر میں عربی زبان وادب نشاۃ ثانیہ کا سنگِ بنیاد بن بادیس کی یہی تحریک تھی۔ ان کے شاگرد جن کی تعداد ایک ہزار تھی الجزائر کی آزادی کا ہراوّل دستہ بن گئے۔'' (۲۰)

عبدالحمید بن بادیس نے احیائے اُمت کی جو تحریک برپا کی تھی اس کے آگے اصل رکاوٹ تو خود فرانسیسی استعمار تھا مگر عوام الناس کے دل ودماغ پر نام نہاد صوفیاء نے بھی طرح طرح کے افکار مرتسم کرر کھے تھے جو دین کو ایک جامع نظام کی حیثیت سے قبول کرنے کے راستے کا روڑا بن جاتے تھے اور دین واخلاق کو کمزور کیے جارہے تھے۔ فرانسیسی استعمار بھی یہی چاہتا تھا کہ الجزائری عوام کے اندر مذہب کے نام سے کوئی جاندار آواز نہ اُٹھے۔ عبدالحمید بن بادیس نے ''اصلاح آفات معاشرہ'' کے عنوان سے بدعات وخرافات اور مشرکانہ عقائد کے خلاف مُہم شروع کی اور منتقد کے نام سے ۱۹۲۶ء میں ایک جریدہ جاری کیا۔ اس میں ایک طرف فکر وعقیدہ کی گمراہیوں کے خلاف وہ برسرپیکار ہو گئے اور دوسری طرف غیر ملکی آقاؤں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے قوم کو دعوت پیش کی۔ فرانسیسی حکومت نے جریدے کی تند وتیز تنقید دیکھ کر اسے بند کر دیا۔

بن بادیس نے الشہاب سے ایک اخبار جاری کر دیا۔ فرانس اس بات سے سخت چیں بہ جبیں تھا کہ اس نے الجزائر کے اندر اسلامی رُوح اور عربی تہذیب کو ختم کرنے کے لیے جو طویل کوششیں کی ہیں بن بادیس ان دونوں چیزوں کو پھر زندہ کرر ہے ہیں۔ استعماری حکمرانوں نے عبدالحمید بن بادیس سے چھٹکارا پانے کے لیے خانقاہوں اور گدیوں سے وابستہ نام نہاد پیشواؤں کو متحرک کیا اور عبدالحمید بن بادیس کے خلاف طرح طرح کی الزام تراشیاں کر کے انہیں مشتعل کیا۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں فرقہ علویہ کے ایک شخص نے آدھی رات کے وقت جب وہ درس تفسیر کے بعد واپس گھر آرہے تھے، قاتلانہ حملہ کر دیا مگر مرحوم اس سے بال بال بچ گئے۔ ان کے رفقاء نے حملہ آوروں کو پکڑ لیا مگر شیخ عبدالحمید بن بادیس نے اسے معاف کر دیا۔

الشہاب کے علاوہ انہوں نے اور بھی متعدد اخبارات جاری کیے اور فکری اور سیاسی میدان میں ہر پہلو سے قوم کی تربیت کی، جب ایک پرچہ بند ہو جاتا تو دوسرا نکال لیتے۔ یہ جنگ انہوں نے اپنے آخری ایاّم

(۱۹۴۰ء) تک جاری رہی۔

''شیخ عبدالحمید بن بادیس مفسر قرآن بھی تھے۔انہوں نے قرآن کی تفسیر میں زمانے کے تقاضوں کا لحاظ کیا۔ درجہ اوّل کے محدث تھے، شاعر تھے اور شعر ان کے دل کی گہرائیوں سے پانی کی طرح بہہ کر نکلتے تھے۔ شعلہ نوا خطیب تھے، دلوں پر چھا جاتے تھے، عقل وفکر کو مسحور کر لیتے تھے۔ وہ فقیہہ تھے اور تمام مذاہب پر ان کو گہری نظر حاصل تھی۔ دینی اور معاشرتی مصلح تھے، اندھی تقلید اور بدعات کے خلاف انہوں نے جنگ لڑی۔ انہوں نے اسلامی تہذیب اور بیداری کی دعوت دی۔لوگوں کے اندر سنجیدگی کے بیج بوئے اور اُصول واخلاق کے نقش بٹھائے۔ قادر الکلام صحافی تھے۔عربی اور فرانسیسی زبانوں میں مضامین لکھنے میں شب و روز منہمک رہتے۔ مؤرّخ تھے اور انسانی تہذیب کے عروج و زوال کا تجزیہ کرتے۔ درویش منش صوفی تھے مگر اپنے ہمعصر صوفیوں سے بالکل مختلف۔ امام غزالیؒ سے متاثر تھے۔امام غزالیؒ کی کتاب احیاء العلوم کو علم النفس کی فقہ کہا کرتے۔''(۲۱)

## جمعیت علمائے الجزائر

الترقی کلب کے اندر شیخ عبدالحمید بن بادیس کی تقریروں نے لوگوں کے اندر آزادی کا جذبہ اور احیائے دین کی رُوح بیدار کردی تھی۔ اس رُوح کو عملی جامہ پہنانے کے لیے الترقی کلب میں الجزائر کے چند اہل درد حضرات جمع ہوئے اور انہوں نے جمعیت علمائے مسلمین کے نام سے باقاعدہ ایک تحریک کی داغ بیل ڈال دی۔ عبدالحمید بن بادیس کو جو اس اجتماع میں شریک نہ تھے، صدر منتخب کرلیا گیا۔ یہ ۵ مئی ۱۹۳۱ء کا واقعہ ہے۔ ایک سال کے اندر اس جمعیت کے ساتھ اُونچے پائے کے اہلِ علم منسلک ہو گئے۔ مثلاً شیخ محمد البشیر الابراہیمی، عبدالقادر بن زیان، العربی التبسی، مبارک المیلی، الطیب العقبی، السعید الزہراوی، محمد خیر الدین اور شیخ ابوالیقظان جیسے نامور اہلِ علم وفضل۔

تح عبدالحمید بن بادیس کی قیادت جمعیت علمائے الجزائر نے متعدد محاذوں پر آغاز جہاد کر دیا۔ ایک طرف عقیدہ و اخلاق اور معاشرتی اصلاح کی مُہم چلائی۔ دوسری طرف سیاسی بیداری کا صور پھونکا۔ تیسری طرف اسلامی اور عربی علوم کی تعلیم کے لیے انفرادی و اجتماعی کوششیں جاری کردیں اور چوتھی طرف صحافت کو ذریعہ بنا کر عوامی رابطے کو مستحکم کیا۔

جمعیت کا سب سے بڑا جہاد اسلامی تعلیم کا احیاء تھا۔ فرانسیسی استعمار اسلامی تعلیم کی اہمیت کو سمجھتا تھا۔ چنانچہ فرانسیسی حکومت نے ۱۹۳۸ء میں یہ قانون جاری کر دیا کہ کوئی شخص لائسنس کے بغیر پرائیوٹ طور پر بھی تعلیم نہیں دے سکتا۔ عبدالحمید بن بادیس نے اس پر البصائر میں ایک مضمون لکھا جن کا عنوان تھا: ''۲۰ سال میدان تعلیم میں گزارنے کے بعد ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا ہمارے پاس لائسنس ہے؟'' اس مضمون میں انہوں نے یہ واضح طور پر لکھ دیا کہ ''ہم اسلام اور عربی زبان کے مخالفین سے برملا کہے دیتے ہیں کہ ہم نے اس ظالمانہ قانون کی مخالفت کرنے کا عزم مصمم کرلیا ہے۔ ہم خدائے ذوالجلال کی مدد سے ہر مصیبت کا سامنا کرتے ہوئے اپنے دین اور اپنی زبان کی تعلیم دیتے رہیں گے۔ ہمیں کوئی مائی کا لال اس سے نہیں روک سکتا۔ ہمیں یقین ہے کہ گو عرصۂ آزمائش طویل ہو جائے مگر کامیابی ہماری ہی ہوگی۔'' چنانچہ جمعیت العلماء نے ملک کے اندر مدرسوں کا جال بچھا دیا۔

''جمعیت علمائے الجزائر کے صدر اور دیگر رہنماؤں پر طرح طرح کے مصائب توڑے گئے، گرفتاریوں اور جیلوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جمعیت علمائے الجزائر کے علاوہ اور بھی متعدد تنظیمیں آزادی کی تحریک کو اپنے اپنے رنگ، مزاج اور نظریے کے مطابق آگے بڑھانے کے لیے اُٹھیں مگر ان سب میں جمعیت اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس نے ''آزادی برائے اسلام'' کا شعار اختیار کیا اور اس سے وابستہ علماء اور کارکنوں نے غیر معمولی قربانیاں دے کر مردہ قوم کو زندہ کر دیا۔ ۱۹۵۴ء میں اُوراس کے پہاڑوں سے آزادی الجزائر کی عظیم الشان تحریک کا جو دھماکہ ہوا وہ جمعیت علمائے الجزائر کی صدائے بازگشت تھا۔ یہ دھماکہ ۱۹۵۴ء سے شروع ہوا اور ۱۹۶۲ء میں آٹھ سال کے اندر دس لاکھ انسانوں کی شہادت کے بعد الجزائر کے لیے آزادی و استقلال کا پیام لے آیا۔'' (۲۲)

آزادی کے بعد بلکہ آزادی سے کچھ عرصہ پیشتر الجزائر کے ایسے لیڈر فرانس اور دیگر طاقتوں کی ملی بھگت سے آگے آگئے جنہوں نے آزادی کے بعد الجزائر کو اسلام سے ہمکنار کرنے کے بجائے اسلام سے دور کر دیا۔ آزادی کے بعد سب سے پہلے جس جماعت کو ختم کیا گیا وہ جمعیت علمائے الجزائر تھی اور جس شخصیت کی زبان بندی کی گئی وہ محمد البشیر الابراہیمی صدر جمعیت تھے۔

۱۹۶۲ء سے لے کر ۱۹۸۸ء تک الجزائر اشتراکیت کی ناکام تجربہ گاہ بنا رہا۔ عباس فرات سے لے کر بن بیلا اور ہواری بومدین تک تمام حکمرانوں نے اسلام کے نام لیواؤں پر عرصہ حیات تنگ کیے رکھا۔ الجزائری معیشت ایک پارٹی (نیشنل لبریشن فرنٹ) کے تصرف میں رہی۔ پارٹی کے لیڈروں اور فوج کے جرنیلوں نے مل کر آمریت قائم کر لی اور پھر خوب ملک کو لوٹا۔ ۲۶ سال کے عرصہ میں الجزائر زرعی ملک اور تیل کی دولت سے مالا مال ہو جانے کے باوجود غربت وافلاس اور بیرونی قرضوں سے چکنا چور ہو گیا۔

جمعیت علمائے الجزائر کے زیر اثر حلقے اشتراکیت کی خونی آندھیوں کے اندر بھی چپکے چپکے کام کرتے رہے۔ جمعیت کے صدر محمد خیر الدین فوت ہو گئے تو شیخ احمد سحنون نے (اللہ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے) اس کی قیادت سنبھالی اور یونیورسٹی کے نوجوانوں کے اندر دھیرے دھیرے دعوتی سرگرمیاں جاری رکھتے رہے۔ جو شخص اُونچی آواز سے اسلام کا نام لیتا یا حکمران پر تنقید کرتا اسے حوالہ زندان کر دیا جاتا۔ جمعیت علمائے الجزائر کی دعوت کے تین وارث ہیں:

- اسلامک سالویشن فرنٹ (محاذ نجات اسلامی): صدر ڈاکٹر عباسی مدنی۔
- حرکت مجتمع اسلامی: صدر محفوظ نحناح۔
- حرکت نہضت اسلامی: صدر عبداللہ جاب اللہ۔

ان سب میں الجزائری عوام کے اندر سب سے زیادہ مقبول نجات اسلامی محاذ ہے۔

اسلامک سالوشن فرنٹ کو الجزائر کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کی خرابی نے جنم دیا ہے۔ اس کی تشکیل کے پیچھے ۲۶ سال کا ریاستی ظلم وستم اور اسلام دشمن کوششوں کے عوامل کارفرما ہیں۔ ۳ جولائی ۱۹۶۲ء کو الجزائر کی آزادی کا اعلان ہوا۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۶۲ء کو مجلس ملی کے ذریعہ فرحت عباس صدر اور بن بلا وزیر اعظم منتخب

پیے ئے۔ پھر ایک سال بعد ہی ستمبر۱۹۶۳ء کو بن بلا عوامی جمہوریہ الجزائر کا صدر بن گیا۔ بن بلا نے خون شہیداں سے غداری کرتے ہوئے الجزائر کو سیکولر ریاست بنا کر رکھ دیا۔ جون ۱۹۶۵ء کو الجزائر کے وزیر دفاع ہواری بومدین نے بن بلا کا تختہ اُلٹ دیا اور فوجی افسروں کی کونسل تشکیل دے کر خود عنانِ صدارت سنبھال لی. اس نے ملک میں اشتراکیت کو فوج کی طاقت سے جاری کیا اور ملکی معیشت اور قومی اخلاق کا جنازہ نکال دیا۔ دسمبر ۱۹۷۸ء میں ایک انتہائی غلیظ بیماری کے ذریعہ اس کی موت واقع ہوگئی۔ جنوری ۱۹۷۹ء کو قومی محاذ آزادی کی سینٹرل کمیٹی نے دہران کے ملٹری کمانڈر کرنل شاذلی بن جدید کو اپنا سربراہ منتخب کرلیا۔ فروری ۱۹۷۹ء میں صدر کا ریفرنڈم کرایا گیا اور شاذلی بن جدید ملک کا صدر بن گیا۔

۱۱ جون ۱۹۹۲ء تک وہ الجزائر کا صدر منتخب ہوتا رہا۔ اس کا ۱۲ سالہ دور کئی لحاظ سے پہلے ادوار کی نسبت مختلف ہے۔ اس کے دور میں الجزائر کے دستور سے اشتراکیت کا لفظ نکال دیا گیا۔ نیز یک حزبی نظام ختم کر کے کثیر الجماعتی نظام کی اجازت دے دی گئی۔

۱۹۸۸ء میں شاذلی بن جدید کے دورِ صدارت ہی میں الجزائر کی معاشی حالت بہت بگڑ گئی۔ ملک ہوشربا گرانی کے چنگل میں آ گیا۔ اکتوبر کے آغاز میں صدر مقام الجزائر اور عنابہ اور دہران میں گرانی کے خلاف خوفناک ہنگامے ہوئے۔ یہ ہنگامے اس قدر بڑھے کہ ملک خانہ جنگی کے دھانے تک پہنچ گیا۔ الجزائر کی فوج نے جس کی پشت پر قومی محاذ آزادی بھی تھا، بڑے بے رحمی سے ان فسادات کو دبا دیا۔ تقریباً ۵۰۰ افراد ملٹری ایکشن میں جاں بحق ہوئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو گرانی کے خلاف مظاہرے کر رہے تھے۔ ڈاکٹر عباسی مدنی کی قیادت میں اسلام پسند نوجوانوں نے اس مشکل مرحلے پر قوم کی قیادت سنبھال لی اور معاشی اصلاحات کے ساتھ اسلام کے نفاذ کا مطالبہ کیا۔

فسادات پر قابو پانے کے لیے شاذلی بن جدید نے عوام کے سامنے دوررس اصلاحات کے ساتھ اسلام کے نفاذ کا مطالبہ کیا۔

فسادات پر قابو پانے کے لیے شاذلی بن جدید نے عوام کے سامنے دوررس اصلاحات کا اعلان کیا۔ ان میں یہ وعدہ بھی شامل تھا کہ قومی محاذ آزادی کے بجائے آئندہ حکومت منتخب اسمبلی کے سامنے جواب دہ

ہوگی۔ نیز دستور میں اشتراکیت کے بجائے اسلام کو ماخذ قانون بنایا جائے گا۔صدر کی اعلان کردہ اصلاحات پر ۳ نومبر ۱۹۸۸ء کو ایک ریفرنڈم ہوا جس میں ۹۲ فیصد نے اصلاحات کے حق میں رائے دی۔

## اسلامک سالویشن فرنٹ

ان حالات کے نتیجے میں مسلم عوام کی قیادت کے لیے الجزائر کے اسلام پسند گروہ نے جو پہلے مساجد میں قرآنی حلقات کے ذریعہ اور تعلیمی اداروں میں دعوتی پروگراموں کے ذریعہ بچ بچا کر کام کر رہا تھا، ''جبهة الانقاذ الاسلامیة'' (اسلامی محاذ نجات) کی تشکیل دے دی۔ ڈاکٹر عباسی مدنی کو اس محاذ کا صدر منتخب کرلیا گیا۔ انہوں نے ۱۷ستمبر ۱۹۸۹ء کو باقاعدہ اعلان کر دیا کہ حکومت نے ان کی پارٹی کو تسلیم کرلیا ہے۔ یہ محاذ دراصل اس اسلامی تحریک کا تسلسل ہے جو دورِ استعمار اور پھر دورِ آزادی میں مختلف ناموں اور مختلف مناہج کے ساتھ کام کرتی رہی ہے۔

۲۰ اپریل ۱۹۹۰ء کو اسلامی محاذ نجات نے دارالحکومت میں صدارتی محل کے سامنے ایک مظاہرے کا اہتمام کیا جس میں لاکھوں نوجوانوں نے شرکت کی۔ انہوں نے بڑے بڑے بینر اُٹھا رکھے تھے جن پر تحریر تھا: ''اسلام ہمارے تمام مسائل کا حل ہے'' ریلی کے اختتام پر اسلامی محاذ نجات کے صدر ڈاکٹر عباسی مدنی نے اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کیا۔ اسلامی محاذ نجات نے الجزائری عوام کے احساسات کو واضح کرنے کے لیے مظاہروں کا انتظام کیا۔ ایک مظاہرے میں پانچ لاکھ افراد نے شرکت کی جن میں ایک لاکھ باپردہ خواتین تھیں۔ مظاہرین نے سروں پر قرآن اُٹھا رکھے تھے۔

۱۲ جون ۱۹۹۰ء کو صوبائی اور بلدیاتی کونسلوں کے انتخابات ہوئے۔ یہ آزادی کے پہلے کثیر جماعتی انتخابات تھے۔ اس میں اسلامی محاذ نجات نے حکمران جماعت قومی محاذ آزادی کے مقابلے میں زیادہ سیٹیں لے لیں۔ ملک کے چار بڑے شہروں الجزائر (صدر مقام)، دہران، قسطنطنیہ اور عنابہ میں اسلامی محاذ کے نامزد ارکان زیادہ سے زیادہ ووٹ لے کر جیتے۔ سرکاری نتائج اس طرح تھے۔

## اسلامی محاذ نجات

۴۸ صوبوں میں سے ۳۲ میں کامیاب رہا۔ کامیابی کا تناسب ۶۶ فیصد رہا۔ ۱۵۳۹ لوکل کونسلوں میں سے ۸۳۵ میں جیتا۔ کامیابی کا تناسب ۴۲، ۵۵ فیصد رہا۔

## حکمران پارٹی

۶۵، ۱۳۱ نشستیں حاصل کیں۔ ووٹ ڈالنے والے رجسٹرڈ ووٹروں کا تناسب ۱۵ء ۵۷ فیصد تھا۔

''صوبائی اور بلدیاتی اداروں میں محدود اختیارات کے باوجود اسلامی محاذ نے متعدد اصلاحات نافذ کیں۔ عریاں وڈیو فلموں، پاپ میوزک اور برسرِ عام شراب نوشی پر پابندی لگادی۔ ساحل سمندر پر مخلوط اور عریاں محفلیں بند کرادیں۔ رمضان کے روزوں کا تقدس بحال کیا۔ پہلی بار بلدیاتی اداروں میں اجتماعی افطاریوں کا اہتمام کیا گیا۔ تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم ختم کردی گئی۔ دارالحکومت الجزائر میں ایک بین الاقوامی ہوٹل کو گاف کا میدان دینے کی بجائے وہاں ایک ہاؤسنگ کالونی بنانے کی سفارش کی گئی اور الجزائر کی دولت لوٹنے والوں کو بے نقاب کیا۔ اس قسم کی رپورٹیں منظرِ عام پر آئیں کہ اعلیٰ حکام نے پچھلے عرصے میں ۱۶ ارب پونڈ رشوت اور کمیشن کے طور پر وصول کیے ہیں۔ ان ہلکی پھلکی اصلاحات کے خلاف فوج کے بدعنوان جرنیل، بیوروکریسی، لادین عناصر اور مغربی ممالک شدید ردّعمل کا اظہار کر رہے تھے اور اسلامی محاذ نجات کو راستے سے ہٹانے کی بھرپور کوششیں شروع ہوگئیں۔'' (۲۳)

جولائی ۱۹۹۰ء کے آخر میں صدر شاذلی بن جدید نے پارلیمانی انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔ اس کے لیے ۲ جون ۱۹۹۱ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔ اسلامی محاذ نجات عام کے اندر انتہائی مقبول ہو رہا تھا مگر ساتھ ہی یہ اشارے بھی مل رہے تھے کہ فوج کے جرنیل اسلامی اصلاحات کے حق میں نہیں ہیں۔ انہیں ڈر تھا کہ آج تک انہوں نے جو لوٹ کھسوٹ کی ہے اس کا حساب چکانا تھا۔ فوج کا کمانڈر انچیف خالد نزار اس گروہ کا اصل قائد تھا۔ مغربی ممالک اور خاص طور پر فرانس اسلامی محاذ کی پیش قدمی پر سخت پریشان ہوا اور اس کے خلاف پروپیگنڈہ کا طوفان برپا کردیا۔ فرانس نے فوجی جرنیلوں کی بھی پشت پناہی کی تاکہ وہ اس سیلاب کو آگے

بڑھنے سے روکیں مگر اسلامی محاذ نجات کے پاس عوام کی طاقت کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

۲۷ مئی ۱۹۹۱ء کو اسلامی محاذ نجات کی اپیل پر ۳۵ ہزار کے قریب مظاہرین نے صدارتی محل اور سرکاری ٹی وی اسٹیشن کی طرف مارچ کیا جنہیں پولیس نے آگے جانے سے روک دیا۔ دوسرے دن اسلامی محاذ کی اپیل پر ملک بھر میں عام ہڑتال ہوئی۔ تمام شہروں میں کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ دارالحکومت میں اسلامی تحریک کے ۴۰ ہزار کارکنوں نے مظاہرہ کیا۔ انہوں نے ہاتھوں میں قرآنِ کریم اُٹھا رکھے تھے۔

۵ جون ۱۹۹۱ء کو شاذلی بن جدید نے پورے ملک میں ایمرجنسی لگا دی۔ کابینہ سے استعفیٰ لے لیا گیا اور انتخابات ملتوی کر دیے گئے جو ۲۱ جون ۱۹۹۱ء کو منعقد ہونے والے تھے۔ ملک کے اہم شہروں میں فوج بھیج دی گئی۔ دارالحکومت کے چوکوں میں بھی ٹینک لگا دیے گئے۔ کرنل مولود حمروش کی بجائے احمد غزالی کو وزیر اعظم بنا دیا گیا۔

۶ جون ۱۹۹۱ء کو وزیر اعظم احمد غزالی نے اسلامی محاذ نجات اور دیگر اپوزیشن پارٹیوں سے مذاکرات کیے۔ ۲ جون کو ڈاکٹر عباسی مدنی نے نمازِ جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کے ساتھ ایک سمجھوتہ طے پا گیا ہے۔ اس سمجھوتے کی تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں۔ یہ ایک عارضی صلح تھی۔ اس کے نتیجے میں دارالحکومت کی اہم شاہراہوں سے ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں ہٹالی گئیں اور اسلامی محاذ نجات نے بھی ہڑتال کا سلسلہ ختم کر دیا اور حکومت کی طرف سے یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ سالِ رواں کے اختتام سے پہلے پہلے صدارتی اور پارلیمانی انتخابات منعقد ہوں گے۔

جون کا پورا مہینہ حکومت اور اسلامی محاذ کے مابین تصادم میں گزرا۔ حکومت اسلامی محاذ کے کارکنوں کو گرفتار کرتی وہ لوگ احتجاج کرتے تو انہیں گرفتار کر لیا جاتا۔ دراصل حکومت کی کوشش تھی کہ اسلامی محاذ صوبوں اور بلدیات میں اپنی اسلامی اصلاحات کو کامیاب نہ کر سکے۔ اس غرض کے لیے حکومت نے طرح طرح سے اسلامی محاذ کے عام کارکنوں کو مشتعل کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ آخر کار ۳۰ جون ۱۹۹۱ء کو دارالحکومت الجزائر میں واقع اسلامی محاذ کے مرکزی دفتر کا گھیراؤ کر کے محاذ کے ۶۰ سالہ صدر ڈاکٹر عباسی مدنی اور ان کے ایک نوجوان ساتھی اور نائب علی بالحاج کو گرفتار کر لیا گیا اور انہیں بلیدہ کی جیل میں نظر بند کر دیا اور محاذ کے دونوں

اخبار ''المنقد'' (عربی) اور ''الفرقان'' (فرانسیسی) بند کر دیے۔

گرفتاریوں کی ایک لہر شروع ہوگئی۔ ایک ہی رات میں ۷۰۰ سو کارکن گرفتار کر لیے گئے۔ دو دن میں ۲۵۰۰ افراد پکڑے گئے۔ چند دن بعد یہ تعداد ۸۵۰۰ تک پہنچ گئی۔ یکم جولائی کو فوج کی جانب سے بیان آیا کہ ہنگامی حالات کے نفاذ کے بعد اب تک کم از کم ۱۳۱ افراد ہلاک اور ۲۸۵ زخمی ہو چکے ہیں۔ (مرنے والوں کی اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی)۔ ۷ جولائی کو اسلامی محاذ کے ترجمان محمد سعید اس وقت گرفتار کر لیے گئے جب وہ ٹاؤن ہال میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے۔ ۱۲ جولائی کو دارالحکومت الجزائر میں پولیس نے جمعہ کی نماز کے لیے آنے والوں پر گولی چلا دی۔ ایک آدمی ہلاک اور ۱۱ زخمی ہوئے۔

۱۴ جولائی کے بعد سڑکوں پر پھر ٹینک آ گئے مگر بایں ہمہ اسلامی محاذ کے کارکن اسلامی نظام کی راہ ہموار کرنے کے لیے اپنے مطالبات منوانے پر تلے رہے۔

''اب ڈاکٹر عباسی مدنی ان کے نائب علی بالحاج اور خصوصی ترجمان محمد سعید اور دیگر تمام اہم افراد نظر بند تھے۔ اسی دوران حکومت نے انتخابی حلقوں میں بنیادی تبدیلیاں شروع کر دیں تاکہ اسلامی محاذ کی کسی ایک حلقے میں طاقت مجتمع نہ رہے۔ اسلامی محاذ نے انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ کر دیا۔ صدر شاذلی بن جدید نے محاذ کے کارکنوں کو نرم کرنے کے لیے اپنے ایک بیان میں یہ اشارہ کر دیا کہ عدالتی فیصلے کے بعد نظر بندوں کو رہا کر دیا جائے گا۔'' (۲۴)

حکومت کی طرف سے اشتعال انگیزی مسلسل جاری رہی۔ دسمبر ۱۹۹۱ء تک مختلف حیلوں، بہانوں سے حکومت اسلامی محاذ کے کارکنوں کو گولیوں سے بھونتی رہی اور ہزارہا کی تعداد میں انہیں نظر بند کیا جاتا رہا۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۹۱ء انتخابات کی تاریخ تھی۔ گو اسلامی محاذ کے تمام اہم افراد نظر بند تھے مگر بایں ہمہ اسلامی محاذ نے نئے قائد عبدالقادر حشانی کی قیادت میں انعقاد انتخاب سے ۱۵ روز پہلے انتخابی مقاطعہ ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سرکاری ایجنسیوں کا دباؤ تھا کہ یہ مقاطعہ جاری رہے مگر عبدالقادر حشانی کی دور اندیش شخصیت نے کارکنوں کو انتخابات میں شمولیت پر راضی کر لیا۔

اسلامی محاذ نے فوری طور پر انتخابات میں اترنے کے لیے اپنا جو منشور عوام کے سامنے پیش کیا اس کے

اہم نکات یہ ہیں:

- اصلاح معاشرہ کو اوّلیت دی جائے گی۔
- شرعی قوانین نافذ کیے جائیں گے۔
- سود اور اجارہ داری کا خاتمہ کیا جائے گا۔
- زکوٰۃ کا نظام نافذ کیا جائے گا۔
- سودی بینکاری کا خاتمہ کر کے اسلامی بینکاری جاری کی جائے گی۔
- مخلوط تعلیم ختم کر دی جائے گی اور نصاب کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالا جائے گا۔
- مطلقہ اور بیوہ عورتوں کی کفالت کی جائے گی۔
- ملکی کرنسی (الجزائری دینار) کی قیمت از سرِ نو متعین کی جائے گی۔

اسلامی محاذ کا آخری انتخابی جلسہ الجزائر کے اولمپک اسٹیڈیم میں ہوا۔ اس میں ایک لاکھ سے زائد افراد نے شرکت کی۔

۲۶ دسمبر ۱۹۹۱ء کو ۴۳۰ نشستوں کی قانون ساز اسمبلی کے لیے کثیر جماعتی انتخابات ہوئے۔ اس میں ۴۹ جماعتوں کے ۵۷۱۲ اُمیدواروں نے حصہ لیا۔ رجسٹرڈ ووٹروں کی تعداد ایک کروڑ ۳۲ لاکھ تھی۔ ووٹ ڈالنے کا تناسب ۵۸ فیصد رہا۔ یہ انتخابات کا پہلا راؤنڈ تھا۔ دوسرا راؤنڈ ۱۶ جنوری ۱۹۹۲ء کو ہونا تھا۔

پہلے راؤنڈ میں محاذ نجات اسلامی ۱۸۸ نشستیں جیت کر صفِ اوّل میں رہا۔ یہ ایک زبردست جمہوری مینڈیٹ تھا جو محاذ اسلامی کو حاصل ہوا۔ اس کا کریڈٹ عام کارکنوں کے علاوہ تحریک کے عبوری رہنما عبدالقادر حشانی کو جاتا ہے جنہوں نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے کام لے کر کارکنوں کو انتخابات میں شمولیت پر رضامند کر لیا۔ نیز انہوں نے کارکنوں کو ہر طرح کے ظلم وستم اور چیرہ دستی کو صبر وتحمل سے برداشت کرتے رہنے کی تلقین کی۔

نجات اسلامی محاذ کی اس حیرت انگیز کامیابی سے نہ صرف مغربی دنیا انگشت بدنداں رہ گئی اور اس نے واویلا شروع کر دیا بلکہ متعدد اسلامی اور عربی ممالک اور بالخصوص پڑوسی ممالک تیونس، مراکش، مصر اور لیبیا تو

سراسیمگی میں مبتلا ہوئے اور وہ پھر مل کر منصوبہ بندی کرنے لگے کہ کس طرح اس محاذ کا راستہ روکا جائے؟ ایک اسرائیلی اخبار ''حیدوت اہروت'' نے لکھا کہ:

''اسلامی محاذ برسراقتدار آ گیا تو الجزائر کی فوجی طاقت ہمارے ان بدترین دشمنوں کے ہاتھ لگ جائے گی جن کا مقصد اسرائیل کی تباہی ہے۔'' (۲۵)

۱۱ جنوری ۱۹۹۲ء کو ایک محلاتی بغاوت (جس کے پیچھے ایک فوجی جرنیل خالد نزار تھا) کے بعد شاذلی بن جدید سے استعفیٰ لے لیا گیا۔ الجزائر کی سڑکوں پر ٹینک آئے۔ انتخابات کا اگلا راؤنڈ (جو ۱۶ جنوری ۱۹۹۲ء کو تھا) معطل کر دیا گیا۔ ۵ رکنی کونسل نے اقتدار سنبھال لیا۔

۱۶ جنوری ۱۹۹۲ء کو فوج کی دعوت پر ایک پرانے اشتراکی لیڈر بوضیاف کو جو مراکش میں جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا، لایا گیا اور اسے صدارت سونپ دی گئی۔ عرب ممالک کے تمام حکمرانوں نے (جن میں شاہ فہد اور حسنی مبارک اور حسن ثانی سرِفہرست ہیں) نئی حکومت کو مبارک باد دی اور اپنی امداد کا پورا پورا یقین دلایا۔

یوں الجزائر سے جمہوریت کے راستے سے آنے والے اسلامی انقلاب کا عارضی طور پر راستہ روک دیا گیا مگر مغرب کی جمہوریت پسندی کا بھی پول کھول دیا گیا جو جمہوریت کا دعویدار ہونے کے باوجود جمہوری تبدیلی سے گھبرا اُٹھا اور فوجی آمریت کی حمایت کی۔ اس روز سے اب تک الجزائر کی فوجی حکومت نجات اسلامی محاذ کے کارکنوں کو ہر لحاظ سے ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ ہزارہا افراد جیلوں میں ہیں۔ موت کی سزائیں بھی سنائی جا رہی ہیں مگر یہ سب کچھ ایک عارضی ابال ہے۔ الجزائر کی سرزمین اور الجزائری عوام کی نجات اسلامی محاذ سے وفاداری بتا رہی ہے کہ الجزائر میں لازماً تبدیلی آ کر رہے گی۔

آسٹریا
ہنگری
سلووینیا
زاغرب
کروشیا
ویووودینا
رومانیہ
بوسنیا
ہرزیگووینا
سربیا
۵۵۹۶۸ مربع کم
مانٹی نیگرو
البانیہ
بلغاریہ
مکدونیہ
یونان
بحر ایڈریاٹک
بوسنیا مسلمان
سنی مسلمان
البانی مسلمان
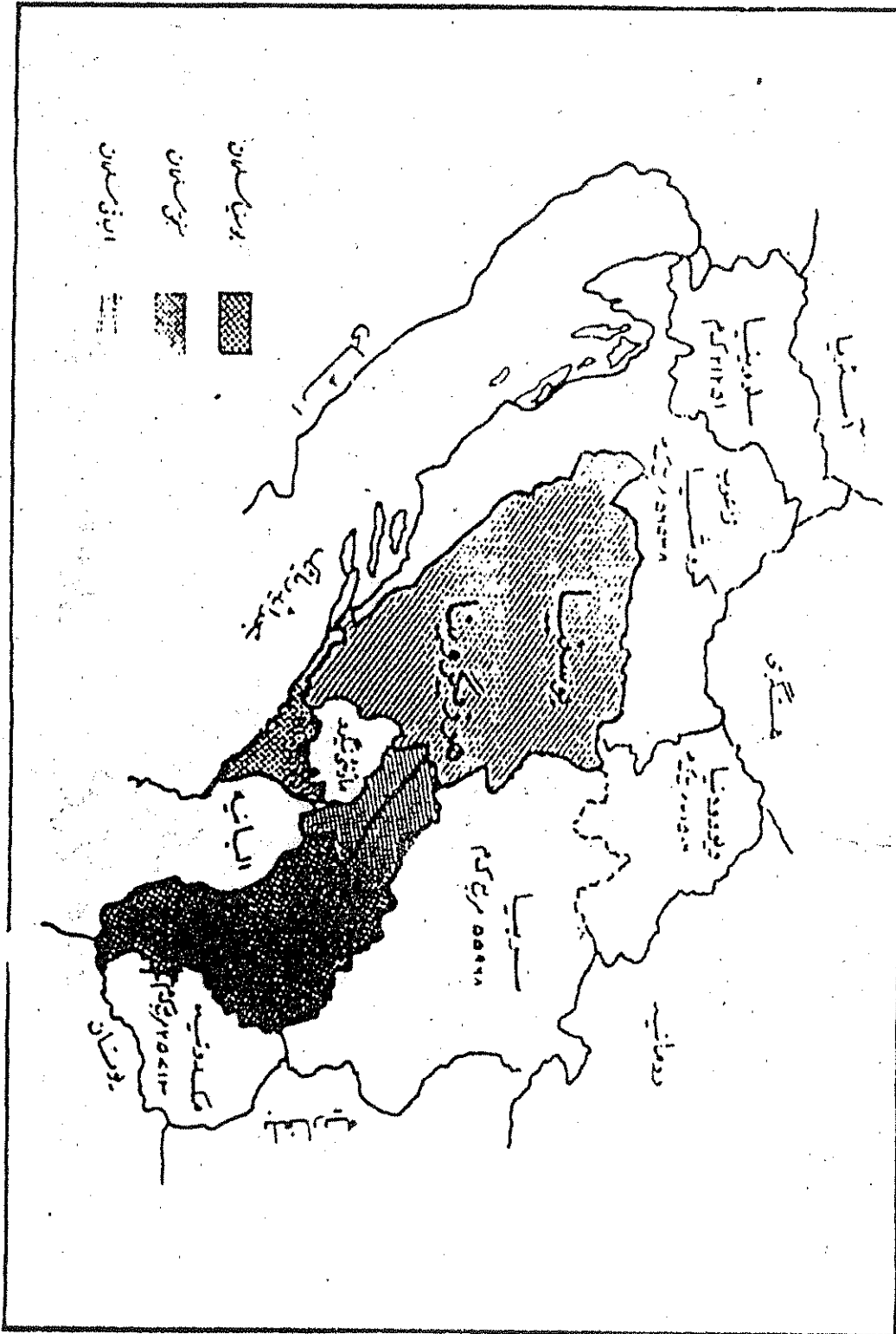
## فصل چہارم

# بوسنیا

### مختصر تاریخ

بوسنیا کی ریاست دسویں صدی عیسوی میں وجود میں آئی تھی۔ بارہویں سے سترھویں صدی عیسوی تک یہاں ایک آزاد اور خود مختار مضبوط حکومت قائم رہی۔ پندرھویں صدی کے وسط میں ترکوں نے جزیرہ بلقان کے اِردگرد واقع چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر چڑھائی کی۔ صدی کے اختتام تک یہ تمام ریاستیں سلطنت عثمانیہ کا حصہ بن گئی تھیں۔ ان میں بوسنیا ہرزیگوینا، سربیا مقدونیا اور کروشیا شامل تھیں۔ اس وجہ سے بوسنیا میں بسنے والے مسلمانوں کا ثقافتی اور روحانی تعلق ترکی کے مسلمانوں سے ہے۔ ترک علماء نے اس علاقے میں جا کر اسلام کی دعوت لوگوں تک پہنچائی اور ان کی تبلیغ کی وجہ سے وہاں اسلام کی روشنی پھیلی۔ اس خطے کے مسلمان ترکی کے مدارس میں علم حاصل کرتے تھے۔ اس وجہ سے یہاں کے مدارس اور مساجد پر ترکی علماء کے گہرے اثرات محسوس ہوتے ہیں۔

سلطنت عثمانیہ کے زوال کے ساتھ ہی ان ریاستوں پر بھی اس کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ ۱۸۷۸ء میں یہ ریاستیں آسٹریا اور ہنگری کے زیرنگیں آگئیں۔ ۱۹۱۸ء میں یوگوسلاویہ فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا۔ جس میں کروشیا اور سربیا کو باقاعدہ ریاستوں کی حیثیت حاصل تھی۔ اس دور میں مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر ترکی کی طرف ہجرت کی۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے مہاجرین کی تعداد ستر لاکھ کے قریب ہے۔ سرب اور کروٹس نے ایک خاص منصوبے کے تحت اس علاقے کی پیداوار اور ذرائع آمدنی پر اپنا قبضہ جمائے رکھا۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کا سلوک انتہائی ہتک آمیز اور ظالمانہ تھا۔

۱۹۴۵ء سے ۱۹۸۰ء تک ٹیٹو کے دور میں مسلمانوں کو بدترین مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کو مسلمانوں کے نام تک رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ مساجد اور مدارس کے قیام اور نماز پڑھنے سے بھی روکا جاتا تھا۔ سراجیو جو مسلمانوں کا قلعہ تصوّر کیا جاتا تھا، وہاں بھی ایک کے سوا ساری مساجد کو تالے لگا دیئے

لئے تھے۔ یہ ایک مسجد بھی دوسرے ممالک کے وفود کو دکھانے کے لیے کھلی رکھی گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بوسنیا کے شہروں اور دیہات میں مسلمانوں نے زیرِ زمین اسلام کو زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ وہ حکومتی اہل کاروں کی نظروں سے چھپ کر اسلامی تعلیمات اور عبادات کے ذریعے اپنے سینے ٹھنڈے کرتے تھے۔ اسلام سے اس محبت کے نتیجے میں آج بھی ہمیں اس دور کے علماء اور دین سے محبت کرنے والے مسلمان مل جاتے ہیں۔

## مسلمانوں کی اسلام سے ناواقفیت

مختلف حکومتوں کے حربوں اور مسلسل جبر نے یوگوسلاویہ میں بسنے والے ۸۵ فیصد مسلمانوں کو اسلام سے اتنا دور کر دیا کہ اب وہ مسلمان نہیں بلکہ بوسنیائی یا ترک کہلانے لگے۔ بڑے منظم طریقے سے اسلام کے تشخص کو مٹایا اور نسلی پہچان کو اُجاگر کیا جاتا رہا۔ مسلمان علماء کے اثرات اتنے پختہ نہیں تھے کہ وہ لادینیت کی اس منظم سازش کا مقابلہ کر سکیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان مذہب کو بھول کر کروٹوں اور سربوں میں گھل مل گئے۔ ان کے درمیان شادیاں ہونے لگیں۔ وہ اِکٹھے بیٹھ کر مے نوشی کرتے اور اِکٹھے ہی ناچ گانے کی تقریبات میں شریک ہوتے تھے۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ۱۹۸۵ تک یوگوسلاویہ کے مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کے درمیان کوئی فرق محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غیر مسلم سرب خواتین مسلمانوں جیسے نام رکھنے لگیں اور بوسنیائی مسلم خواتین سربوں جیسے۔ اسی طرح مسلمان مرد بھی سربوں جیسے نام رکھنے لگے تھے۔ اس طرح رنگ، نام اور مذہب کے سارے فرق زمانے کی گرد نے مٹا دیئے۔

مارشل ٹیٹو نے اپنے ملک کی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے کے ایک بڑے منصوبے پر عمل شروع کیا تو سب سے زیادہ سربوں کی ثقافت کا پرچار کیا گیا۔ اس کے بعد کروشین ثقافت کو فروغ دیا گیا۔ مسلمانوں کو سرے سے نظر انداز کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمان اپنی ثقافت کو بھول کر دوسروں کی ثقافت کو قبول کر چکے تھے۔ لیکن ٹیٹو کے انتقال نے یوگوسلاویہ میں ایک بدترین دور کا آغاز کر دیا۔ کرپشن عام ہوگئی اور یوگوسلاویہ کی سب سے بڑی جمہوریہ سربیا نے چھوٹی ریاستوں کے حقوق غصب کرنے شروع کر دیئے۔

سارا معاشرہ معاشی بدحالی اور سیاسی بحران کا شکار ہوگیا۔ حالات اس قدر خراب ہوئے کہ فوج طلب

[illegible] ں نے حالات کو سنبھالا دینے کے لیے کرفیو کا نفاذ کردیا۔ ۱۹۸۹ میں سربیا میں پہلے پارلیمانی انتخابات میں سرب سوشلسٹ پارٹی نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ صدر میلاسوچ نے امریکہ سے ہی وطن آکر انتخابات میں شرکت کی۔ یہ شخص اپنے ملک بالکل مقبول نہیں تھا۔ لیکن وہ بڑی آسانی سے سرب جمہوریہ کا صدر منتخب ہوگیا۔ ان انتخابات سے دوسری جمہوریاؤں میں ایک ردّعمل پیدا ہوا۔ اسی ردّعمل کے نتیجے میں کروشیا میں ہونے والے عام انتخابات میں نیشنل ڈیموکریٹک الائنس نے کامیابی حاصل کی۔

اکتوبر ۱۹۹۱ میں بوسنیا میں عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات میں ڈیموکریٹک ایکشن پارٹی نے کامیابی حاصل کی۔ اس پارٹی کے سربراہ مشہور اسلامی مفکر اور قانون دان علی جاہ عزت بیگووچ تھے۔ بوسنیا میں اسلام کے احیاء کی خاطر انہوں نے غیر معمولی کوششیں کیں۔ اسلامی تشخص کی بحالی کے ''جرم'' میں وہ ۱۹۴۹ سے ۱۹۸۳ تک مختلف جیلوں میں رہے۔

## ڈاکٹر علی جاہ عزت بیگووچ

ڈاکٹر علی جاہ عزت بیگووچ کے انتخابات نے کروشیا اور سربیا میں ہلچل مچادی۔ ان کے بے داغ ماضی اور اسلام سے گہرے تعلق کو سامنے رکھ کر سب کا یہی خیال تھا کہ وہ بوسنیا میں ایک اسلامی حکومت کے قیام سے باز نہیں آئیں گے، تاہم صدر بیگووچ نے بڑی احتیاط سے کام شروع کیا۔ ان کی پارلیمنٹ نے بھی کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا جس سے مسلمان دشمن قوتوں کو ان کے خلاف ہرزہ سرائی یا سازشوں کا موقع مل سکے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کسی اسلامی حکومت کے قیام کی نفی کی تاہم اتنا ضرور کہا کہ وہ جمہوری راستے سے اسلامی تشخص کی بحالی اور احیاء کی جدوجہد ضرور کریں گے۔ انہوں نے یہ بھی وضاحت کی کہ چونکہ یہ مسلمان اکثریت کا علاقہ ہے، اس لیے یہاں مسلمانوں ہی کی ثقافت اور تہذیب کو پنپنے کا موقع دیا جائے گا۔

لیکن یورپ میں سخت پروپیگنڈہ کیا گیا کہ بوسنیا میں ایک بنیاد پرست اسلامی ریاست کا قیام عمل میں لایا جارہا ہے۔ صدر علی جاہ عزت بیگووچ صدر ہونے سے قبل بھی بہت سی اسلامی کتابوں کے مصنف اور عالم دین رہ چکے ہیں۔ ان کا ایک اسلامی تشخص ہے اور ان کی اس پہچان سے انکار ممکن نہیں۔ ۱۹۴۱ میں اخوان

المسلمون کے مین ارکان نے بوسنیا میں ینگ مسلم موومنٹ قائم کی۔جس کا مقصد اسلامی عقائد اور اقدار کا تحفظ تھا تو علی جاہ عزت بیگوویچ فوراً اس کے رکن بن گئے۔۱۹۴۶ میں پہلی مرتبہ گرفتار ہوئے اور تین سال تک قید و بند کی سختیاں اور تشدد برداشت کرتے رہے۔۱۹۵۱ میں جامعہ الازہر چلے گئے۔دوران قیام اخوان المسلمون کے تمام پروگرامات میں ضرور شریک ہوتے۔۱۹۸۳ میں آپ کو نوے سال قید کی سزا سنائی گئی۔لیکن ۱۹۸۹ میں رہا ہو گئے۔یورپ نے ان کے حوالے سے کہا کہ وہ ایک بنیاد پرست ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں جو خود مغرب اور مغربی حکومتوں کے لیے خطرے کا باعث ہے۔نام نہاد خدشات نے امریکہ اور اس کے حواری مغربی ممالک کی نیندیں حرام کر دیں۔ان کا خیال تھا کہ اگر اسلامی اقدار کے احیاء سے بوسنیا ایک اسلامی ریاست کا روپ دھار گیا تو اس سے البانیہ، مقدونیا، اور کوسووہ سمیت دوسرے علاقوں میں بھی اسلام ایک زندہ حقیقت کی شکل میں اُبھر آئے گا۔

بوسنیا میں اسلامی ریاست کے قیام سے عیسائی اور یہودی خوفزدہ تھے۔اس لیے انہوں نے اس کا راستہ روکنے کے لیے پیش بندی کی۔حقیقت یہ ہے کہ اس نوزائیدہ مسلم ریاست میں کسی کے بنیادی حقوق سلب ہونے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ملک میں غیر مسلموں کو بھی وہ حقوق حاصل ہیں جو مسلمانوں کو ہیں۔یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو نسلاً مسلمان تھے لیکن عملاً ان میں اسلام کی کوئی علامت نہ تھی۔ان کو بھی اسلام کی راہ پر چلانے کے لیے کسی طرح کا قانون نہیں بنایا گیا۔بوسنیا میں ہر شخص کو مذہبی آزادی ہے۔کسی پر کوئی جبر نہیں۔لیکن اس کے باوجود امریکہ اور یورپ نے ہمسایہ ممالک کروشیا اور سربیا کو جو پہلے ہی مسلمانوں کے خلاف تعصب میں بھرے ہوئے تھے، بوسنیا کے خلاف صف آراء کر دیا۔

## سرب درندگی

ایک محتاط اندازے کے مطابق ۱۹ لاکھ مسلمانوں میں سے ۹ لاکھ بوسنیا سے باہر نکال دیئے گئے اور ۸ لاکھ خود بوسنیا میں بے گھر ہو گئے۔کیمپوں میں بند یا در بدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور تین لاکھ کے قریب لوگ ہلاک کر دیے گئے۔فو کا شہر میں ۷۵ فیصد مسلمان تھے۔آج ایک بھی نہیں، بوسنیا میں سینکڑوں مساجد گولہ باری

سے منہدم ہوگئیں۔ بوسنیا کی معیشت کی تباہی کا اندازہ ۵ سو ارب ڈالر کے مساوی ہے۔ یہ سب کچھ مہذب یورپ کے قلب میں ہوتا رہا۔

وحشت و بربریت اور درندگی کے جو کام کیے گئے، وہ سب عینی شواہد سے ثابت ہیں اور لرزہ خیز اور ناقابل یقین ہیں۔ جس رات برطانوی ٹی وی کے پردہ پر اومارسکا، اور ملیا کا کے کیمپوں کے انسانی ڈھانچے نمودار ہوئے، سنگ دلوں کے بھی دل دہل گئے، آنکھیں نم ہوگئیں۔ اومارسکا کے بلیک ہول میں ۲۵۰۰ انسان اس طرح بند کیے گئے کہ کئی دم گھٹنے سے مر گئے۔ فرینکفرٹ کے انٹرنیشنل سوسائٹی فار ہیومن رائٹس کے پاس ایسے ۱۱ کیمپوں کے بارے میں عینی شواہد موجود تھے جہاں قیدیوں کو منظم طریقہ سے باقاعدہ ہلاک کیا گیا۔ صرف فوکا اور پریڈور کے دو کیمپوں میں ہزاروں کو موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔ ایک نامہ نگار نے فوکا کیمپ میں ایک کلومیٹر فاصلہ میں ۲۰ لاشیں شمار کیں۔

۱۹۴۱-۴۵ کے دوران بھی ایک لاکھ ۲۰ ہزار مسلمان ہلاک کیے گئے تھے۔ حجاب کا مذاق اُڑانے کے لیے عورتوں کے چہروں کی کھالیں کھینچ کر اُتار دی گئی تھیں، وضو اور نماز کا تمسخر بنانے کے لیے مردوں کے ہاتھوں، پیشانیوں کی کھالیں چھیل دی گئیں تھیں۔ آج کی درندگی بھی کچھ کم نہیں۔ ایک سرب عورت نے کانچ کے ٹکڑے سے مردہ اور زندہ مسلمانوں کی آنکھیں نکال دیں، اعضا کاٹ دیے اور اپنے اس فعل پر بڑے فخر اور خوشی کا اظہار کیا۔ بھاری ہتھوڑوں سے سر پھاڑ دیئے گئے اور رپورٹروں نے راستوں میں بکھرے ہوئے انسانی بھیجے دیکھے۔ بچوں کی تدفین ہو رہی تھی تو قبرستان پر گولہ باری کی گئی، پوتے کو دفن کرنے آیا تھا مگر دادا خود اپنے اعضا کھو بیٹھا۔ سنگ دل رپورٹر بھی رو پڑے۔ بے دردی سے مارا پیٹا جاتا تو نہ زخمی، نہ بیمار، نہ عورت، نہ بچہ، کوئی نہ بچتا تھا۔

ظلم و ستم کی آندھیوں نے بے شک مسلمانوں کو بے پناہ نقصانات پہنچائے مگر ان واقعات کا ایک تعمیری اور مثبت پہلو یہ ہے کہ بوسنیا کے مسلمانوں نے خود کو پہچان لیا ہے اور بوسنیا کے سیاسی قائدین، مجاہدین، مہاجرین اور عورتیں تک مصائب اور مشکلات کے باوجود اس بات پر مطمئن ہیں کہ حالات نے انہیں صحیح معنوں میں مسلمان بنادیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم نے اسلام کو چھوڑ دیا تھا۔ لیکن سربوں نے مار مار کر ہمیں

احساس دلا دیا کہ ہم مسلمان ہیں۔ بوسنیا میں جو سرب اور کروٹ بستے ہیں، ان دونوں نے ہم پر ظلم روا رکھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہم مسلمان ہیں۔ اب تو ہم ایک دوسرے کا تعارف کرتے ہوئے بھی بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ''ہم مسلمان ہیں۔''

اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں ایک ثقافتی تبدیلی کا احساس بھی اُجاگر ہوا ہے۔ ان کی اسلامی تعلیمات سے رغبت بڑھی ہے اور ان کے ملی شعور میں اضافہ ہوا ہے اور اب وہ اپنے آپ کو سیکولر مسلمان کے بجائے راسخ العقیدہ مسلمان کہتے ہیں۔ بوسنیا میں اس نوعیت کی تبدیلی مغرب کے جعلی منصوبوں کے لیے ضرور خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

ان حالات میں مسلمانوں نے ۱۲۶ بندوقوں سے مسلح جہاد کا آغاز کیا۔ یہ جہاد اس جذبے اور جوش و خروش سے کیا گیا کہ اس کے آغاز کے بعد سربوں کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ پھر انہوں نے سربوں کے قدم کہیں بھی نہ جمنے دیئے۔ بیہاج اور سرائیوو کے ۴،۴ سال طویل محاصرے اس کی زندہ مثال ہیں۔ سرائیوو کے چاروں طرف سربوں کی قوت مرکوز تھی۔ ان کی وجہ سے کوئی گلی اور کوئی سڑک محفوظ نہ تھی۔ مگر محاصرے کی مزاحمت کا حق جس طرح سرائیوو نے ادا کیا وہ تاریخ جہاد و عزیت کی بہت بڑی مثال ہے۔

صدر علی جاہ عزت بیگووچ اُستاد، مصنف اور فلسفی ہیں۔ لیکن انہوں نے نہایت حکمت اور جرأت کے ساتھ اس جہاد کو آگے بڑھایا۔ وہ چار سال تک سرائیوو سے باہر نہیں نکلے۔ ۲۰ منفی درجے کی سردی تھی اور سرائیوو گیس، بجلی اور پانی سے محروم تھا۔ ان حالات میں علی بیگ کی قیادت میں بوسنیائی مسلمانوں نے بچوں کے کھلونے اور مکانات کا سامان جلا جلا کر مزاحمت کو زندہ رکھا۔ ان حالات میں ترقی یافتہ یورپ نے مظلوموں کا ساتھ نہیں دیا۔ یہ اس وقت ترکی اور ایران تھے، جو بوسنیائی مسلمانوں کی مدد کو پہنچے اور انہیں اسلحہ پہنچایا۔

اس کے بعد بوسنیا کے مکاہدین نے اپنے چھنے ہوئے علاقے واپس لینے شروع کر دیے۔ پاکستانی فوج نے وہاں ان مٹ نقوش چھوڑے۔ کرنل رشید بیگ اور دوسرے پاکستانی فوجی افسروں نے دینی مدارس قائم کیے۔ جہاں بچوں کو خود آ کر لے جاتے۔ انہیں قرآن حفظ کرواتے اور ان کے درمیان مقابلے کرواتے۔ وہاں پاکستانی فوج کی تعمیر کردہ ایک مسجد بھی موجود ہے۔ پاکستان کے یہ فوجی اقوام متحدہ کی فورس

۱۴ (آئی فور) میں شامل تھے۔ یہ کل ۴۰۰ مجاہدین تھے۔ لیکن UNO کو ہماری فوج کا یہ کردار کھٹکنے لگا۔ چنانچہ آئی فور ہٹا کر ناٹو کی افواج متعین کر دی گئیں۔

## مسلمانوں کی تحریکِ آزادی

۱۹۸۰ء میں یوگوسلاویہ کا مارشل جوزف بروز ٹیٹو فوت ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۸۰ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک کا زمانہ یوگوسلاویہ کے اندر انتہائی خلفشار، ابتری، معاشی لوٹ کھسوٹ، تشدد، دہشت گردی اور معاشرتی انحطاط کی کاروائیوں اور داستانوں کا زمانہ ہے۔ مارشل ٹیٹو کی موت سے اس ملک کی تاریخ نے نیا رُخ اختیار کر لیا۔

کوسوو میں البانوی مسلمان بستے ہیں جن کی مجموعی طور پر بھاری اکثریت ہے۔ یوگوسلاویہ اس وقت شدید اقتصادی بحران میں تھا اور اس کا سب سے زیادہ اثر کوسوو پر پڑ رہا تھا۔ چنانچہ البانوی قوم نے ان حالات کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ یہ بغاوت بڑے بڑے مظاہروں، ہڑتالوں اور تخریبی کاروائیوں کی صورت اختیار کر گئی۔ اسے کچلنے کے لیے یوگوسلاویہ کی فوج استعمال کی گئی، ایمرجنسی کا اعلان کر دیا گیا، لیکن اس کے باوجود تحریک بغاوت جاری رہی۔

یہ لاوا جو سالوں سے پک رہا تھا رکنے والا نہ تھا۔ کوسوو کے بعد ملک کے دوسرے حصوں میں بھی احتجاجی شعلے بھڑک اُٹھے۔ پورے ملک میں عوامی غیض و غضب کی لہر دوڑ گئی اور اب پورا یوگوسلاویہ سراپا احتجاج بن گیا۔ صرف ۱۹۸۷ء میں یوگوسلاویہ کے اندر جو ہڑتالیں ہوئیں ان کی تعداد ۱۵۷۰ تھی۔ (۲۶)

کمیونزم سے لوگ بیزار ہو گئے اور قومی تحریکوں کے اندر بڑی قوت اور تیزی کے ساتھ نئی زندگی دوڑ گئی۔ خود سرب کمیونسٹوں نے کمیونزم کا لبادہ اُتار کر پھینک دیا اور متعصب قوم پرست بن گئے اور انہوں نے خود ٹیٹو کے قائم کردہ سسٹم پر حملے شروع کر دیے۔ جمہوریہ سربیہ کے مقابلے میں دوسری پانچ جمہوریتوں کی مخالفت بھی شروع کر دی۔ ان کے خیال میں قیادت صرف جمہوریہ سربیا کے پاس ہونی چاہیے جبکہ دوسری پانچ جمہوریتیں اب حقوق و اختیارات میں جمہوریہ سربیا کے ہم پلہ تھیں اور یہ صورت سربوں کو گوارا نہ تھی۔ سربوں نے اپنے قدیم نظریات کو زندہ کرنا شروع کر دیا اور سرب قوم کی قیادت میں ''عظیم تر سربیا'' کی بحالی کا نصب

آئین اختیار کرلیا۔ سربوں کے ان عزائم کا اندازہ اس یادداشت سے لگایا جاسکتا ہے جو ''سرب اکیڈمی برائے سائنس و آرٹ'' نے ۱۹۸۶ء کو حکومت کو پیش کی تھی۔ اس یادداشت میں اکیڈمی نے ''وفاق یوگوسلاویہ'' میں سربوں کی قیادت کو مستحکم کرنے کا تفصیلی پروگرام پیش کیا ہے۔

سرب نیشنلزم کو بڑے زور وشور سے زندہ کیا گیا اور ۱۹۸۹ء میں ایک متعصب اور نیشنلسٹ لیڈر سلوبودان میلوسوک (SLOBODAN MILOSVIC) کو سربیا کا سربراہ منتخب کیا گیا۔ یہ شخص ایک نہایت مضبوط مرکزی حکومت کے علمبرداروں میں سے ہے۔ یہ دیکھ کر دوسری جمہوریتوں کے اندر سرب تسلّط کے خدشات مزید بڑھ گئے۔ خاص طور پر آزادی پسند سلووینیا اور کروشیا نے اس کا سخت نوٹس لیا۔ سلوبودان کا انتخاب اور اس کی قیادت دیکھ کر کروشیا کے اندر سخت ردّعمل ہوا اور جب مارچ ۱۹۹۰ء میں کمیونزم کے سقوط کے بعد کروشیا میں پہلی مرتبہ انتخاب ہوا تو کروشیا کی ''نیشنل ڈیموکریٹک کروشین یونین'' دوتہائی اکثریت سے جیتی۔

سیاسی میدان میں سربیا اور کروشیا کے اندر برق رفتار تبدیلیاں برپا ہوگئیں۔ ان کا یوگوسلاویہ کے مسلمانوں پر بہت بڑا اثر پڑا اور مسلمانوں نے ضرورت محسوس کی کہ سیاسی طور پر انہیں بھی اپنے آپ کو منظم کرنا چاہئے۔ بوسنیا و ہرزیگوینا میں یہ احساس خاص طور پر شدت سے پیدا ہوا کہ بوسنیا و ہرزیگوینا کی بقا واستحکام کا دار مدار وہاں کی غالب مسلم اکثریت کی یک جہتی کی بنیاد پر ہے۔ اس صورتِ حال کا احساس کرتے ہوئے ڈاکٹر علی عزت بیگووچ نے مارچ ۱۹۹۰ء میں اسلامی پارٹی تشکیل دی جس کا نام ڈیموکریٹک ایکشن پارٹی رکھا۔ اسے بوسنیا کی زبان میں (STRANKA DEMOKRATSKE AKCIJE) کہتے ہیں اور اس کا مخفف SDA ہے۔ پارٹی مسلم آبادی کے اندر بڑی مقبول ہوئی۔ ایک تو بوسنیا و ہرزیگوینا اور سنجق و کوسوو (سربیا) اور مقدونیا کے مسلمان اپنی طاقت کو منظم کرنے کی شدید ضرورت محسوس کر رہے تھے اور دوسرے اس کے بانی اور سربراہ ڈاکٹر علی عزت بیگووچ بذاتِ خود بڑی ہر دلعزیز مجاہد شخصیت تھے اور عوام کے اندر ان کا بڑا احترام و وقار تھا۔ موصوف قانون دان اور اسلامی مفکر ہیں اور کمیونسٹ دور میں دو مرتبہ جیل جاچکے ہیں۔ پہلی مرتبہ ۱۹۴۹ء میں جب ینگ مسلم موومنٹ کو خلاف قانون قرار دیا گیا اور دوسری مرتبہ ۱۹۸۳ء میں مارشل ٹیٹو کی

موت کے تین سال بعد جب ملک کے اندر عام بے چینی پیدا ہوئی اور عوامی مظاہرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ SDA مارچ ۱۹۹۰ء میں قائم ہوئی اور جب اکتوبر ۱۹۹۰ء میں بوسنیا و ہرزگوینا میں سقوط اشتراکیت کے بعد پہلی مرتبہ ملکی انتخابات ہوئے تو یہ پارٹی اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوئی اور علی عزت بیگ جمہوریہ بوسنیا و ہرزیگوینا کے منصب پر فائز ہو گئے۔

اب سابق یوگوسلاویہ میں تین شخصیتیں سیاسی میدان میں نمایاں طور پر اور پوری سرگرمی کے ساتھ اُتر آئیں۔ ایک آرتھوڈکس سرب لیڈر سلوبودان صدر جمہوریہ سربیا اور دوسرا کیتھولک کرواٹ لیڈر توجمان صدر کروشیا اور تیسرے مسلم لیڈر علی عزت بیگ صدر بوسنیا۔ ۱۹۹۱ء اور ۱۹۹۲ء میں یوگوسلاویہ کے اندر جو بحرانی کیفیت پیدا ہوئی ہے وہ ان تینوں لیڈروں کے اپنے اپنے نظریے کے مطابق تمام مسائل حیات میں نا قابل تغیر موقف کی پیدکردہ ہے۔ کیونکہ یہ تینوں سابق یوگوسلاویہ کے تین سب سے بڑے نسلی اور مذہبی گروہوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ (۲۷)

## مسلمانوں کی تنظیم

بوسنیا اور ہرزیگوینا اور یوگوسلاویہ کی دوسری مسلم آبادیوں پر آسٹیا، ہنگری کے اقتدار کا پورا عرصہ (۱۸۷۸ء تا ۱۹۱۴ء) مسلمانوں کے لیے شدید آزمائش کا زمانہ تھا۔ آسٹریا و ہنگری کے حکمران اور دینی وسیاسی رہنما مسلمانوں سے سابقہ جنگوں کا انتقام لیتے رہے اور انہوں نے مذہبی لحاظ سے مسلمانوں کو سر اُٹھانے کا موقع نہیں دیا۔ ۱۹۰۹ء میں جب دستوری طور پر بھی ہنگری والوں نے یوگوسلاویہ کے تمام علاقوں کو اپنی ریاست میں مدغم کرلیا تو مسلمانوں کو اپنے مذہبی مراسم کی ادائیگی کے لیے محدود پیمانے پر ایک ادارہ حکومت کی نگرانی میں قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ مذہبی ادارہ دوسری عالمی جنگ تک قائم رہا مگر عملاً یہ غیر مؤثر رہا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب ان کا تسلّط ختم ہوا اور اسلامی نسل کی حکومت قائم ہوئی تو پہلے مسلمانوں نے خوشی منائی مگر پھر ان کی ساری خوشی یوں ہوا ہوگئی کہ اس نئی مملکت پر آرتھوڈکس سربوں نے غلبہ پالیا اور مسلمانوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ حالانکہ آسٹیا، ہنگری کے جور و ستم سے نجات پانے کے لیے مسلمانوں نے سربوں

کا پورا ساتھ دیا تھا۔ سلانی مملکت نے ۱۹۲۱ء میں جو دستور نافذ کیا تھا وہ گو تمام مذہبی گروپوں کو یکساں حقوق دیتا تھا مگر عملاً سارے حقوق آرتھوڈکس عیسائیوں کو حاصل تھے۔ باقی مذہبی گروپ مذہبی آزادی سے بڑی حد تک محروم رہے حتیٰ کہ کیتھولک فرقے کے پیرو بھی سربوں کے ہاتھوں نالاں رہے۔ ۱۹۳۱ء کے دستور کا بھی یہی حال تھا۔ مسلمان اس گروہی امتیاز کے خلاف مسلسل جدوجہد کرتے رہے اور اپنے تشخص کی حفاظت کے لیے جانیں لڑاتے رہے۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمے (۱۹۴۵ء) کے بعد مارشل ٹیٹو کا دور آیا اور کمیونزم کی لہر دوڑ گئی جس کے نتیجے میں مذہب مجموعی طور پر نفرت و کراہت کا نشانہ بن گیا۔ اس کی زیادہ زد اسلام پر پڑی۔ مسلمانوں کی اوقاف کی زمینیں اور جائداد بھی نیشنلائزیشن کے قانون کے تحت حکومت نے اپنے قبضے میں لے لیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کے مذہبی اداروں کو شدید ضرب لگی۔

۱۹۵۹ء کے دستور میں مسلمانوں کی طویل جدوجہد اور لاتعداد قربانیوں کے نتیجے میں مسلمانوں کے مذہبی اداروں اور مذہبی مراسم کا نظام بحال کرنے کی چند دفعات رکھی گئیں۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء کے دستور کی دفعہ ۳ میں یہ کہا گیا ہے:

> ''اسلامی مذہبی گروہ اپنے مذہبی شعائر ادا کر سکے گا اور اپنے مذہبی فرائض اور اسلامی احکام کی تعلیم علانیہ دے سکے گا۔ اسے یہ حق ہوگا کہ وہ اپنے دینی، تعلیمی اور مالی اُمور کا انتظام کرے۔'' (۲۸)

مالی اُمور کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے یوں مشکل ہوگیا کہ مسلمانوں کے عظیم الشان اوقاف جو زرعی زمینوں اور بھاری بھرکم عمارتوں کی صورت میں تھے اور علی الخصوص غازی خسرو بک نے جو بہت سے اموال دینی تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر دیے تھے وہ کمیونسٹ حکومت نے اپنے قبضے میں لے لیے تھے۔ چنانچہ مذکورہ دستور کی دفعہ ۱۴ میں مالی ذرائع کی مندرجہ ذیل نشاندہی کی گئی:

- مسلم گروہوں کے اداروں کی املاک اور ان کی آمدنی (اس میں وقف شامل نہیں)۔
- چندے جو مسلم گروہ کی طرف سے جمع کیے جائیں۔
- چندوں سے ہونے والی آمدنی۔

- تحائف اور وصیتیں۔
- مذہبی خدمت کی خاطر جمع ہونے والا ٹیکس۔
- حکومت کی امداد۔
- دیگر آمدنی جس کا ذریعہ واضح ہو۔

مذکورہ تمام مالی ذرائع ناکافی تھے۔ مسلمانوں کا بڑا ذریعۂ آمدنی زراعت تھا اور جب ان کی زمینیں حکومت نے ہتھیا لیں تو وہ مفلوک الحال ہو گئے۔ ٹیٹو حکومت نے ۱۴ اپریل ۱۹۶۰ء کو نیا معاہدہ جاری کیا جسے ''مسلم کمیونٹی کا سوشل سیکیورٹی سسٹم'' کا نام دیا گیا۔ مسلمانوں کی طرف سے اس معاہدے پر مسلمان فرقے کے رئیس العلماء شیخ سلیمان مکورانے اور حکومت کی طرف سے ''وفاقی اسٹیبلشمنٹ برائے سوشل سیکیورٹی'' کے ڈائریکٹر نے دستخط کیے۔ (اس طرح معاہدہ اپریل ۱۹۵۲ء اور دسمبر ۱۹۵۸ء میں ہوا تھا مگر مسلمانوں نے اسے کمیونسٹوں کی طرف سے مسلمانوں کے لیے ''دل بہلاوا'' قرار دے کر مسترد کر دیا)۔ ۱۹۶۰ء کے معاہدے کی رو سے مسلم مذہبی گروہ کی تنظیم کے ملازمین (امام، مدرس، مفتی، موذن اور دیگر خدام) کے لیے تنخواہوں اور مالی وظیفوں اور علاج کے لیے کچھ سہولتوں کا انتظام کیا گیا۔

> ''یوگوسلاویہ میں مسلمانوں کی مذہبی تنظیم کے ملازمین کا مالی تحفظ علی الخصوص بیماری، بڑھاپے، قوت کار کے فقدان اور وفات کے حالات میں ہمیشہ سے پریشان کن مسئلہ بنا رہا ہے۔ اس مسئلے کو زیادہ پیچیدہ اس بات نے بنا رکھا تھا کہ علماء و ائمہ کی گذر اوقات شروع سے صدقات اور چندوں پر ہوتی تھی جو مسلمانوں کی طرف سے پیش کیے جاتے تھے۔ اوقاف کی آمدنی سے تنخواہیں لینے والے بہت کم افراد ہوتے تھے۔ اب ان کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ اگر کوئی فوت ہو جاتا ہے تو اس تھوڑی بہت آمدنی بھی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بیوی بچے غربت اور کسمپرسی کا لقمہ بن جاتے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد تک یہی حالات رہے اور اس مشکل کا کوئی علاج نہ نکالا گیا۔ جب معاملہ انتہائی سنگین صورت اختیار کر گیا تو کچھ ذمہ دار لوگوں

ے مذہبی ملازمین کے لیے مالی ذرائع کی تلاش شروع کی جن سے کچھ نہ کچھ اس خدمت کو سرانجام دینے والوں کی مدد کی جا سکے۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے کوشش بسیار کے بعد دینی مدرسوں کے اساتذہ اور کچھ اماموں کے لیے جزوی طور پر سیکیورٹی کا انتظام کیا گیا مگر یہ انتظام صرف دس بارہ فیصد ملازمین کی اشک شوئی کر سکا۔ یہی صورتِ حال تھی کہ دوسری جنگ کے تاریک سائے چھا گئے اور یہ معمولی سی اصلاح بھی ختم ہو گئی۔ اہلِ دین غربت و بے روزگاری سے تنگ آ کر ان دینی وظائف کو خیر باد کہہ گئے اور دوسری سول اور فوجی ملازمتوں کی طرف نکل گئے۔ ان میں بڑے باصلاحیت اور اعلیٰ قابلیتوں کے مالک افراد بھی تھے۔ دینی مناصب خالی ہو گئے اور پھر ان مناصب کو بعد میں ان لوگوں نے پُر کیا جو ان کے اہل نہ تھے۔ نہ علمی لحاظ سے اور نہ اخلاق و کردار کے لحاظ سے۔''

مسلم مذہبی گروہ کا نظام مشکلات و صعوبات میں مبتلا ہو گیا جن پر قابو پانا آسان نہ رہا۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء کا معاہدہ ڈوبے ہوئے دلوں کے لیے کسی قدر خوشخبری لگے کر آیا اور ۲۵ فیصد افراد تک اس کے اثرات پہنچے۔ اس معاہدے کی رو سے ماہانہ تنخواہوں کے علاوہ پنشن کا انتظام بھی کیا گیا۔ مگر اس میں بھی بہت سے نقائص باقی رہ گئے جو ۱۹۶۰ء کے معاہدے میں دور کیے گئے اور تمام ملازمین کے لیے مذکورہ سہولتیں جن میں تعلیم اور علاج بھی شامل ہے، فراہم کر دی گئیں۔

دینی تنظیم کے ملازمین کی رائے ہے کہ یہ نیا معاہدہ یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ لیکن یہ بھی واضح رہے کہ حکومت نے ''اسلامی تنظیم'' کو اس لیے تسلیم کیا ہے کہ معاشرے کے اندر اس تنظیم کے بڑے اثرات تھے اور ان اثرات کے آگے جھک کر حکومت نے ۳۳ دفعات پر مشتمل وہ عہد نامہ جاری کیا جو اپریل ۱۹۶۰ء میں وجود میں آیا ہے۔

مسلمانوں کی ''دینی تنظیم'' کا ڈھانچہ یہ تھا:

علاقائی کمیٹی جو علاقے کے مسلمانوں میں سے چیدہ افراد پر مشتمل ہوتی تھی۔ چند علاقوں کو ملا کر

جس نیابت اسلامی تشکیل دی جاتی تھی جس کی تابع ان علاقوں کے اندر پائی جانے والی کمیٹیاں ہوتی تھیں اور پورے صوبے یا جمہوریہ پر مشتمل ایک ''مذہبی کونسل'' ہوتی تھی۔ اس طرح کی مذہبی کونسلیں چار تھیں: ایک جمہوریہ بوسنیا میں (اس کے تحت جمہوریہ، کروشیا اور جمہوریہ سلووینیا کا بھی مذہبی نظام تھا)۔ دوسری سربیا میں، تیسری مقدونیا میں اور چوتھی ماؤنٹی نیگرو میں۔ ہر مذہبی کونسل کے ساتھ ایک ایگزیکیوٹو باڈی ہوتی تھی جس کا صدر ایک عالم دین ہوتا تھا اور پھر پورے یوگوسلاویہ کی سطح پر ایک ''سپریم مذہبی کونسل'' تھی جس کے دستوری لحاظ سے ۳۵ ارکان ہوتے تھے جن کو مذہبی کونسلیں منتخب کرتی تھیں اور پھر پورے وفاق یوگوسلاویہ کا ایک رئیس العلماء یا مفتی اعظم ہوتا تھا جو اس پورے مذہبی نظام کا سب سے بڑا نگران ہوتا تھا۔ پھر ہر جمہوریہ کا الگ دینی سربراہ ہوتا ہے جسے مفتی کہا جاتا ہے۔ یہ پورا نظام مسلمانوں کی مذہبی ضروریات پورا کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ مثلاً مسجدوں کی امامت وخطابت اور دیکھ بھال، قبرستانوں کا انتظام، نکاح اور طلاق کا معاملہ سیکولر کورٹ میں دولہا اور دلہن کی رجسٹریشن کرانے اور باہمی رضامندی کی شہادت دینے کے بعد مذہبی کمیٹی میں آ کر شرعی طریقے سے نکاح کرتے تھے۔ (۲۹)

## آزادی اور جدوجہد

یوگوسلاویہ ٹوٹا تو تمام جمہوریاؤں نے اپنی آزادی اور خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ جمہوریہ بوسنیا و ہرزیگوینا کے صدر علی عزت بیگ کی حکومت نے بھی یہ اعلان کر دیا۔ دوسری جمہوریاؤں (جمہوریہ کروشیا، جمہوریہ سلووینیا، جمہوریہ مقدونیا) کے اعلان کو اقوام متحدہ نے تسلیم کر لیا اور انہیں اقوام متحدہ کا ممبر بنالیا۔ جمہوریہ بوسنیا و ہرزیگوینا کی حکومت کے اعلان کو تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ اس سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ پہلے اپنے ملک میں ریفرنڈم کرائے کہ جمہوریہ کے عوام آزادی وخودمختاری چاہتے ہیں۔ اقوام متحدہ کا یہ امتیازی روّیہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ تاہم علی عزت بیگ نے اپریل ۱۹۹۲ء کو ملک میں ریفرنڈم کرالیا۔ جمہوریہ کی سرب آبادی نے اس کا مقاطعہ کیا۔ ریفرنڈم کا نتیجہ ۶۴ فیصدر ہا یعنی ملک کی ۶۴ فیصد آبادی نے خودمختاری کے حق میں رائے دی۔ ۱۱۶ اپریل ۱۹۹۲ء کو اقوام متحدہ اور دنیا کے ممالک نے اس نئی ریاست کو تسلیم کر لیا۔ جمہوریہ سربیا کے صلیبی صدر

سلوبودان میلوس دک نے بوسنیا کی آزادی کو مسترد کر دیا۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ سابق یوگوسلاویہ کی اصل وارث سرب قوم ہے۔ اس لیے بوسنیا کی ''بغاوت'' کو ہم قبول نہیں کریں گے۔

یہ بوسنیا ہرزیگوینا کے موجودہ سربراہ ڈاکٹر علی عزت بیگووچ ہیں کہ جنہوں نے ۱۹۴۶ء میں اکنامکس میں سراجیوو یونیورسٹی سے گریجویشن کی۔ موصوف ۶ مضامین میں پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں ازہر سے فراغت کی (۳)۔ اس سے پہلے بوسنیا کی تین اہم شخصیتیں ازہر سے فارغ ہو چکی تھیں۔ جن سے علی عزت بیگووچ متاثر ہوئے: ایک محمد خانجی مصنف ''الجوہر الاسنی فی تراجم علماء وشعراء بوسنہ'' اور دوسرے قاسم دوبروچا اور تیسرے حسین جوزدجو بوسنیا کا نہایت صالح نوجوان تھا، جو کچھ عرصے کے لیے پورے یوگوسلاویہ کا رئیس العلماء بھی مقرر کیا گیا اور اس نے ''غلاسنیق'' (احیائے نو) کے نام سے ایک مجلّہ بھی جاری کر لیا تھا۔ یوگوسلاویہ کی کمیونسٹ حکومت نے اس کی انقلابی سرگرمیوں کو دیکھ کر اسے رئیس العلماء کے منصب سے برطرف کر دیا۔ یہ تینوں حضرات بوسنیا کی نہایت ممتاز اسلامی شخصیتیں شمار ہوتی ہیں۔ دورِ حاضر میں اسلام احیاء کی جو تحریک بوسنیا سے اُٹھی ہے وہ ان عظیم المرتبت مجاہدوں کی کوششوں کا ثمر ہے۔ ازہر میں تعلیم کے دوران یہ لوگ امام حسن البنا کی تحریک اخوان المسلمون سے متاثر ہو گئے تھے اور اسی فکر کو انہوں نے بوسنیا کی نئی نسل کے اندر پھیلایا۔ انہوں نے بوسنیا میں ینگ مسلم ایسوسی ایشن قائم کی جس نے بظاہر ایک رفاہی ادارے کا روپ دھارا لیکن اس کا اصل نصب العین احیائے اسلام تھا۔ علی عزت بیگووچ نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز اپنے مذکورہ شیوخ کے نقشِ قدم پر چل کر کیا اور بوسنیا کے اندر اسلامی فکر کی اشاعت اور اسلام کے احیاء کو زندگی کا مشن بنا لیا اور پھر ایک مومن ومجاہد کی طرح کمیونسٹ آمریت کا مقابلہ کیا۔ ۱۹۴۹ء میں جب ینگ مسلم ایسوسی ایشن کو ''باغیانہ'' سرگرمیوں کی وجہ سے خلافِ قانون قرار دے دیا گیا تو علی عزت بیگووچ کو گرفتار کر لیا گیا۔ موصوف ۱۵ سال تک جیل میں رہے جہاں ان کے ایمان میں مزید تازگی، اسلامی فکر میں مزید پختگی اور انقلابی عزائم میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔ دوسری مرتبہ ۱۹۸۳ء میں ان کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ پہلے ان کو ۱۴ سال کی قید سنائی گئی جسے کم کر کے ۱۲ سال اور پھر ۹ سال کر دیا گیا مگر وہ پانچ سال اور آٹھ ماہ تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد رہا ہو گئے اور جیل سے نکلے تو ''سوشلسٹ ری پبلک یوگوسلاویہ'' زندگی کے آخری

سانس لے رہی تھی۔ علی عزت بیگ نے اپنے ہم خیال نوجوانوں کے تعاون سے مارچ ۱۹۹۰ء میں ڈیموکریٹک ایکشن پارٹی قائم کرلی جو اسلامی تحریک کا تسلسل ثابت ہوئی اور اب تک یہ تحریک قائم ہے اور اب وہ بوسنیا و ہرزیگوینا میں اسلامی جہاد کا نشان بن چکی ہے۔ (۳۰)

یوگوسلاویہ میں دو بڑے اسلامی گروپ ہیں۔ کوسووہ میں البانی اور بوسنیا ہرزیگوینا میں بوسنیائی۔ کوسوو میں وہ جمہوری رابطہ پارٹی اور بوسنیا میں ڈیموکریٹک ایکشن پارٹی کی قیادت میں منظم ہیں۔ دونوں پارٹیوں کے ارکان کی وفاداری کے اسباب سمجھنے کے لیے دونوں علاقوں میں مسلمانوں کے مسائل پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

البانیوں کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ نسلی طور پر وہ الیری (Illirs) قبائل سے تعلق رکھتے ہیں، جو موجودہ البانیہ اور کوسوو پر مشتمل ایک مملکت میں سلاویوں کے اس علاقے میں آنے سے بہت پہلے سے آباد تھے۔ یہی وہ بنیادی عامل ہے جو آج ان کی معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہے اور انہیں اس علاقے میں رہنے والی دوسری قوموں کے لوگوں سے مختلف رکھتا ہے۔ وہ ابھی تک قبائلی طرز کی زندگی گذارتے ہیں اور زیادہ تر ایک سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے رہے ہیں۔ جب بھی البانیوں کے اتحاد کی بات ہوگی اس بنیادی عامل کو نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا۔ اب یہ فطری بات ہے کہ چونکہ البانی انفرادی اور اجتماعی طور پر قومی سرگرمیوں سے دور رہتے ہیں اس لیے ان کا سیاسی مؤقف بھی محدود ہے اور اسی وجہ سے ان کی دینی حیثیت کی کوئی اہمیت نہیں حالانکہ وہ اس بات پر قادر ہیں کہ کوشش کریں تو نمایاں مقام حاصل کرسکتے ہیں۔

البانیوں کے سامنے دو راستے ہیں: دینی یا قومی۔ وہ قومی راستہ اختیار کریں یعنی انہیں اگر سیاسی سطح پر یہ اختیار دیا جائے کہ وہ البانیہ یا بوسنیا ہرزیگوینا میں سے کسی ایک سے اتحاد کرلیں تو بلاشبہ وہ اپنے مادر وطن البانیا کا انتخاب کریں گے۔ بوسنیا ہرزیگوینا سے سیاسی اتحاد کے لیے ان کی شرائط مان لی جائیں تو توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی موجودہ سرگرمیوں میں کوئی تبدیلی کرلیں لیکن دھونس یا زبردستی سے ان پر کوئی شرط مسلّط نہیں کی جاسکتی۔

البانیوں کے قومی سرگرمیوں سے دور رہنے سے ایک اور خرابی نے جنم لیا ہے۔ ان کے علاقوں سے

اسلامی تہذیب و تمدن کے آثار ایک منظّم پروگرام کے تحت مٹائے جا رہے ہیں۔ ان آثار سے البانیوں کی مسلم تہذیب سے گہری وابستگی کا اظہار ہوتا تھا یہ اقدامات خاصے کامیاب دکھائی دیتے ہیں کیونکہ کوسوو کے دور دراز علاقوں بلکہ یوگوسلاویہ کے ان علاقوں میں بھی دین کو اپنانا سخت دشوار ہو گیا ہے جو بظاہر کافی لبرل دکھائی دیتے ہیں۔

بوسنیا کے مسلمان اپنی قومی حیثیت کی نسبت اپنے اسلامی تشخص پر زیادہ زور دیتے ہیں اور یہ مسلمان ایک مرکزی قیادت کے تحت منظّم ہیں۔ عزت بیگ اس قیادت کے اہم رہنما ہیں۔ اسلامی مفکر اور ممتاز ادیب ہیں۔ اسلامی جماعتوں سے مضبوط ترین جماعت ڈیموکریٹک ایکشن پارٹی (SDA) کے صدر ہیں۔ اپنی اسلامی سرگرمیوں کی وجہ سے دو مرتبہ پابندِ سلاسل رہ چکے ہیں۔

بوسنیائی مسلمانوں کی اسلامی حیثیت کا اعتراف ۱۹۷۴ء تک نہیں کیا گیا تھا لیکن اس اعتراف کے بعد بھی اسلامی زندگی کے عملی پہلوؤں پر عمل اس لیے نظر نہیں آتا کہ نہ ایسے ادارے ہیں جہاں مسلمان اپنے دین کے مطابق تربیت حاصل کر سکیں اور نہ مسلمانوں میں اسلامی شعور بیدار کرنے کے ذرائع اطلاعات ہیں۔ وہ اپنے تاریخی اور ثقافتی پس منظر سے بھی پوری طرح آگاہ نہیں ہیں اور یہ صورتِ حال نتیجہ ہے اس ظالمانہ مُہم کا جو مسلمانوں کو ان کے دینی اور ثقافتی پس منظر سے الگ کرنے کے لیے شروع کی گئی تھی۔ اس مُہم سے صرف وہ محدود تعداد محفوظ رہ سکی جو اپنے اسلامی مراکز، مسجدوں اور مدرسوں میں محدود ہو کر اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے رہے۔ (۳۱)

ان تمام حقائق کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ موجودہ قیادت کے تحت مسلمانوں کی دینی حیثیت یا ان کا قومی تشخص کوئی ایسا عامل نہیں جو انہیں متحد کرنے میں اہم کردار ادا کر سکے البتہ سربی اور کروشیائی انتہا پسندوں کی زیادتیوں کے ردّ عمل کے طور پر مسلمانوں نے دفاعی اقدامات اختیار کیے ہیں اور اپنے مخالفوں کی عصبیت اور نفرت نے انہیں یکجا کر دیا ہے۔ جبکہ سربیائی، کروشیائی اور البانی اپنی اسی قومی عصبیت کو اپنی ترقی اور سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر اتحاد کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

حالیہ کشمکش نے پچھلے چند سالوں میں مسلمانوں کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور بوسنیائی

مسلمان اب ہر معاملے میں دین کی طرف رجوع کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے اسلامی طرزِ زندگی اختیار کرنا شروع کیا ہے حالانکہ موجودہ بحران کے آغاز میں اسلام ایسی قوت نہیں تھی جو انہیں جدوجہد یا قتال پر اُبھارتی۔ بہرحال اب ان کی دینی بیداری ان کے قومی شعور کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بوسنیائی مسلمانوں کی دینی حیثیت کا دستوری اعتراف اور علاقے میں ان کا سیاسی وجود صرف اور صرف اسلامی بنیادوں ہی پر ہے اور ان کی قومیت یا نسلی حیثیت نے اس معاملے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ وہ دوسری قومیتوں کے لوگوں سے اگر مختلف ہیں تو صرف اسلام کی وجہ سے اور ان مظاہر کی وجہ سے جو دینِ اسلام شخصی اور اجتماعی زندگی میں رائج کرتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بوسنیا ہرزیگوینا کے مسلمانوں کے دین اور قومیت میں کوئی فرق نہیں اور اس کے باوجود کہ بوسنیائی مسلمانوں کی اکثریت اپنی قومیت کو دینِ اسلام ہی کے ساتھ مربوط رکھتی ہے۔ شعائرِ اسلام اور اسلامی مظاہر سے دوری بوسنیا کے بڑے بڑے شہروں میں نمایاں نظر آتی ہے اور اسی وجہ سے ان کی دینی اور سیاسی قیادت میں فاصلے بڑھنے کا خدشہ موجود ہے۔ اگر ایسا ہوا تو بوسنیا کے مسلمانوں پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔

اس سب کچھ کے علاوہ البانیہ اور بوسنیا ہرزیگوینا کی جغرافیائی حالت یعنی یورپ کے عین وسط میں واقع ہونے اور کسی اسلامی ملک سے جغرافیائی طور پر ملحق نہ ہونے کی وجہ سے وہ عالمِ اسلام سے کٹے ہوئے ہیں اور اس کی وجہ سے وہاں کے مسلمانوں کو اپنی عملی زندگیاں اسلام کے مطابق ڈھالنے میں کافی مشکلات پیش آسکتی ہیں۔

یوگوسلاویہ
مونٹینگرو
پرسٹینا
کوسووہ
البانیہ
مقدونیہ
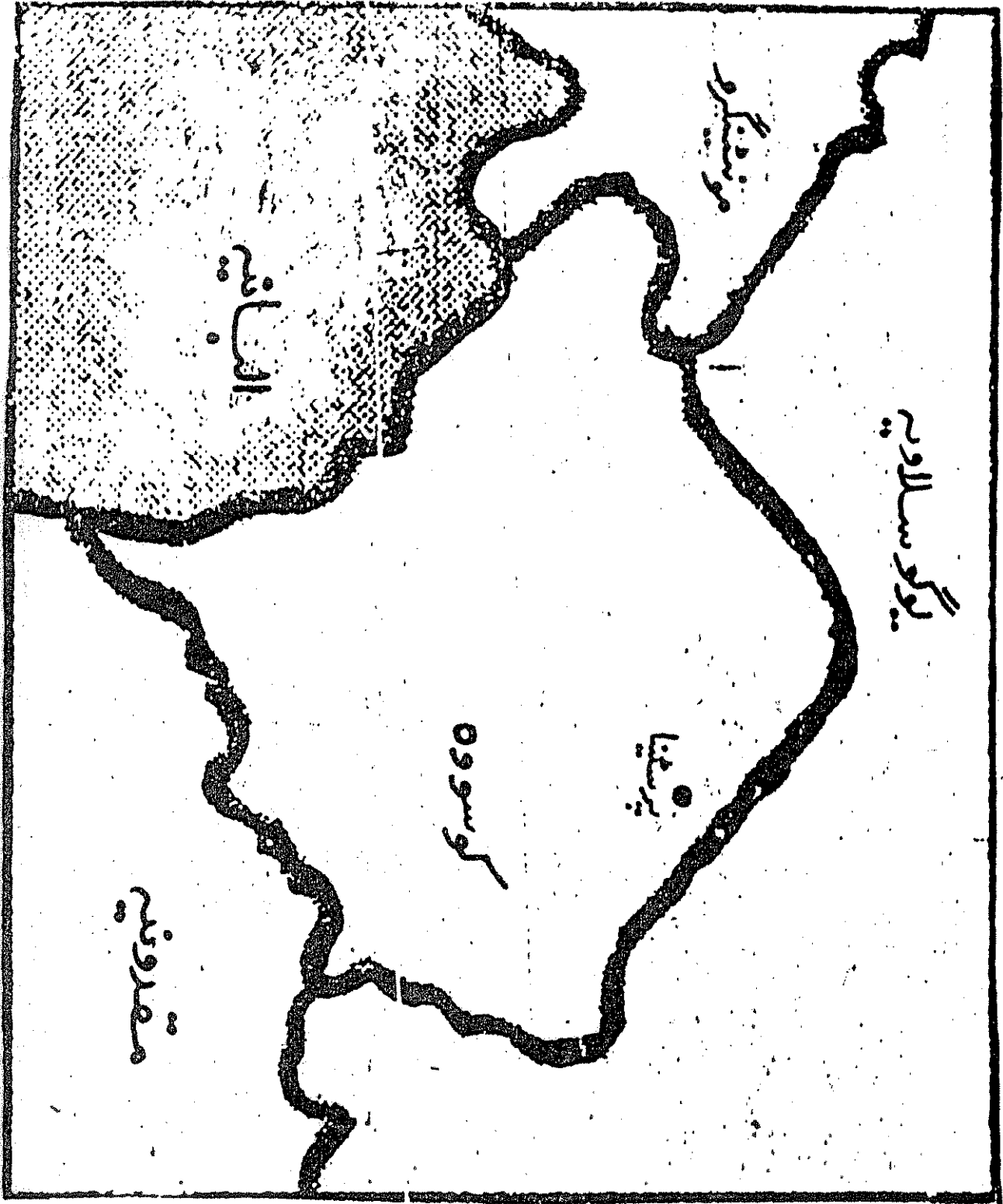
## فصل پنجم

# کوسووہ

### مختصر تاریخ

کوسووہ قدیم زمانے سے ایک خودمختار ریاست رہا ہے۔عثمانی ترکوں نے بھی اسے اپنی سلطنت میں شامل کرتے ہوئے اس کی شناخت اور خودمختار حیثیت برقرار رکھی تھی۔عثمانی ترکوں سے متاثر ہوکر یہاں کی عیسائی اکثریت نے اسلام قبول کرلیا تھا۔کوسووہ کے مسلمان البانوی کہلاتے ہیں کیونکہ جس دور میں عیسائیوں نے اسپین،روم اور مقدونیہ پر دوبارہ قبضے کے بعد البانیہ میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کیا تھا،مسلمان البانیہ سے ہجرت کرکے کوسووہ میں آباد ہوگئے تھے۔ترکوں کے عہد میں کوسووہ کو ایک صوبے کی حیثیت حاصل تھی جہاں مرکز کی طرف سے باقاعدہ گورنر کا تقرر کیا جاتا تھا۔

یوگوسلاویہ نے اپنے قیام کے ساتھ ہی کوسووہ پر قبضہ کرکے اسے اپنا صوبہ بنالیا تھا۔لیکن جب کمیونسٹ ممالک میں شکست وریخت کا عمل شروع ہوا اور کروشیا،سلوانیا،بوسنیا اور مقدونیہ نے آزادی حاصل کرلی تو کوسووہ کے مسلمانوں نے بھی اپنے لیے ایک الگ اور خودمختار مسلم ریاست کا مطالبہ کردیا۔

بوسنیا میں سربوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر ٹوٹنے والی قیامت نے کوسووہ کے مسلمانوں پر واضح کردیا تھا کہ عنقریب سربیا(سابق یوگوسلاویہ)کوسووہ میں مسلمانوں کی نسل کشی اور انخلاء کا منصوبہ عمل میں لائے گا۔چنانچہ مارچ ۱۹۹۸ء میں یہ آتش فشاں اچانک پھٹ پڑا۔سربوں نے نہ صرف نسل کشی کی کاروائیوں کا آغاز کردیا بلکہ فلسطین میں یہودی آبادکاری کی طرز پر کوسووہ میں سربوں کی آبادکاری کے متعدد اقدامات کیے۔سربوں کو مفت مکان اور آسان قرضوں کی سہولتیں فراہم کی گئیں اور مسلمانوں کے ہاتھ جائیداد فروخت کرنے پر پابندیاں عائد کردی گئیں جبکہ مسلمانوں کو مختلف لالچ اور وظائف کے ذریعہ جائیداد فروخت کرنے پر آمادہ کیا جاتا رہا۔

کوسووہ سے مسلمانوں کو بے دخل کرنے کا منصوبہ بھی ایک مدت سے جاری ہے۔۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۸ء

تک چار لاکھ افراد نے کوسووہ سے ہجرت کی۔ ۱۹۹۵ء میں تقریباً ایک ہزار مسلمان خاندانوں کو ان کے گھروں سے زبردستی بے دخل کر کے ان کی جگہ کراٹنا سے آنے والے سربوں کو بسا دیا گیا۔

کوسووہ میں مسلمان اکثریت کا علاقہ ہے۔ اس لیے قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود یورپ کا سب سے غریب ترین خطہ شمار کیا جاتا ہے۔ بجلی کی سہولتیں سب سے کم ہیں، بے روزگاری کی شرح بچاس فیصد سے بھی زیادہ ہے۔ اس کے باوجود ڈیڑھ لاکھ افراد کو ملازمتوں سے نکال دیا گیا۔ فیکٹریاں اور کارخانے نجکاری کے ذریعہ مسلمانوں سے چھین کر سربوں کو دے دیے گئے۔ اس طرح مسلمانوں کو اقتصادی طور پر مفلوج کرنے کا عمل تیزی سے جاری رکھا گیا۔ مسلمانوں کی تہذیبی شناخت ختم کرنے کے لیے البانوی زبان میں ریڈیو اور ٹی وی کی نشریات اور اخبارات کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ تعلیمی اداروں پر سرب انتظامیہ مسلّط کر دی گئی اور البانوی زبان کے تعلیمی ادارے بند کر دیے گئے۔ تاہم بعد میں زبردست احتجاج کے نتیجہ میں ایلیمینٹری کی سطح پر البانوی زبان میں تعلیم کا حق بحال کر دیا گیا۔

کوسووہ میں ۱۹۸۱ء سے نسلی کشمکش جاری ہے۔ مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں اس کشمکش کو بخوبی سمجھا سکتا ہے۔ سرب وزندگی وسفاکی کے ساتھ کوسووہ کو ''عظیم سرب مملکت'' کا حصہ بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ سربیا نے ۱۹۹۰ء میں کوسووہ پارلیمنٹ کو کریک ڈاؤن کے ذریعے ختم کر دیا تھا۔ جس کے بعد کوسووہ کے سیاسی رہنما مجبور ہو کر ہمسایہ ریاست مقدونیہ چلے گئے تھے۔ جہاں انہوں نے جلاوطن حکومت قائم کر کے کوسووہ کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۹۱ء کے ایک بھرپور عوامی ریفرنڈم کے ذریعے آزادی کے اس اعلان کی توثیق کی گئی جبکہ ۱۹۹۲ء میں انہوں نے اپنی پارلیمنٹ بنا کر ابراہیم روجووا کو صدر بنانے کا اعلان کر دیا جسے سربیا نے قبول نہیں کیا اور اس کے برعکس فوج بھیج کر کوسووہ کے صوبائی اختیارات ختم کر کے اس پر مکمل فوجی کنٹرول حاصل کر لیا۔ دوسری طرف مقدونیہ کے حکام نے کوسووہ پارلیمنٹ کے بیس ارکان کو گرفتار کر کے کوسووہ واپس بھیج دیا۔ (۳۲)

ان حالات کے باوجود وہ پُرامن جمہوری جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھے۔ (لیکن پورے مغرب اور دنیائے اسلام میں سے کسی نے ان کی مدد نہیں کی) کیونکہ انہیں اپنا سیاسی اور اقتصادی مستقبل انتہائی تاریک

دکھائی دے رہا تھا۔ اس لیے وہ مطالبہ کر رہے تھے کہ یا تو انہیں مکمل آزادی دی جائے یا پھر ہمسایہ ریاست البانیہ میں شامل کر دیا جائے۔ اس جدوجہد کے جواب میں سربیا کے اخبارات اور ٹیلی ویژن نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ کوسووہ کے مسلمان ماضی میں عیسائیوں کے قتلِ عام میں ملوث رہے ہیں اور اب کوسووہ میں آباد دس فیصد عیسائی سربوں کے قتلِ عام کا پروگرام بنا رہے ہیں تا کہ غیر مسلموں کو ختم کر کے وہاں آزاد ریاست قائم کی جا سکے۔ اس پروپیگنڈے کا مقصد عیسائیوں کو البانوی مسلمانوں کے خلاف اُبھار کر ان کے قتلِ عام اور نسل کشی کو تاریخ کا جائز انتقام قرار دینا ہے۔

## سربیا کی مداخلت

سربیا نے اس پروپیگنڈے کی آڑ میں ۲۷ نومبر ۱۹۹۷ء کو اپنی فوجیں کوسووہ میں داخل کر دیں۔ جس نے پرسٹینا سمیت تمام علاقے کو گھیرے میں لے کر مسلمانوں کا سرِ عام قتل شروع کر دیا۔ کوسووہ کے گاؤں لاؤسا کے مسلمانوں کو سب سے خطرناک صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا اور وہاں حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے۔ چار پولیس اہلکاروں کے قتل کے جھوٹے الزام میں شہریوں کو بے پناہ مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ یہاں تک کہ مسلمان جنگلوں اور دوسرے علاقوں کا رُخ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ صرف اس چھوٹے سے گاؤں میں ایک دن میں تقریباً سو افراد شہید کر دیے گئے اور ان کی لاشیں ایک گڑھے میں دفنا دی گئیں۔ حالات قدرے بہتر ہونے کے بعد مسلمانوں نے انہیں گڑھے سے نکال کر باقاعدہ قبروں میں دفن کیا تو مغربی اخبارات نے اس درندگی پر نہیں بلکہ قبروں میں قبلہ رُخ دفنانے پر اعتراضات کیے۔ سرب پولیس جگہ جگہ مسلمان بستیوں پر حملے کرتی رہی اور سینکڑوں مسلمان شہید کر دیے گئے۔ بہت سے قصبات اور دیہات سے مسلمانوں کو جبراً بے دخل کر دیا گیا۔ فوج اور پولیس کی تمام تر کاروائیاں عام شہریوں کے خلاف تھیں۔ خاص طور پر ''پریکاز'' کے کریک ڈاؤن میں بے شمار مسلمان شہید، زخمی اور گرفتار ہوئے۔ شہر اور ملحقہ علاقوں پر آگ لگانے والے بموں کی بارش برسا دی گئی جس سے بے شمار بستیاں نذرِ آتش ہو گئیں اور عام لوگ جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے بعد گھروں پر طیارہ شکن توپوں اور مارٹر گنوں کی مدد سے گولہ باری کی گئی اور گھروں

سے باہر نکلنے والوں کو دور مار سنا ئپرز رائفلوں سے فائرنگ کر کے شہید کر دیا گیا۔ بین الاقوامی صحافیوں نے دیکھا کہ کئی دن تک بے شمار لاشیں سڑکوں اور گلیوں میں بکھری پڑی ہیں۔

## کوسووہ لبریشن آرمی (K.L.A)

''پریکاز'' کوسووہ لبریشن آرمی کے کمانڈر آدم یاسری کی وجہ سے اس عتاب کا نشانہ بنا جسے ایک خبر کے مطابق فوج نے اس کے تیس ساتھیوں سمیت شہید کر دیا جبکہ سرب ٹی وی نے آدم یاسری کے گھر پر توپ خانے کی بمباری دکھاتے ہوئے دعویٰ کیا کہ انہیں اہل خانہ سمیت زندہ جلا دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی شہید ہونے والوں کی لاشیں بھی ٹی وی پر دکھائی گئیں۔ اس واقعے میں اسّی مسلمان شہید ہو گئے تھے جن کے عظیم الشان جنازے نے گویا اس بات کا اعلان کر دیا کہ کوسووہ کے مسلمان آزادی سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوں گے۔ اس کے بعد پورے علاقے میں آزادی کے لیے بڑے بڑے مظاہرے شروع ہو گئے۔ کوسووہ کے عوام نے کوسووہ لبریشن آرمی کا بھرپور ساتھ دینے کا اعلان کر دیا اور کوسووہ کے عوام دھڑا دھڑ کوسووہ لبریشن آرمی (K.L.A) میں شامل ہونے لگے اور یہ تحریک مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔

کوسووہ لبریشن آرمی اور سرب فوجیوں کے درمیان جھڑپوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور ۱۹۹۸ء کے وسط سے ہر رات جھڑپیں ہو رہی ہیں جن میں دونوں جانب سے اسلحے کا زبردست استعمال کیا جاتا ہے۔ درجنوں دیہات خالی ہو گئے ہیں اور ان میں بسنے والے مسلمان مقدونیہ یا البانیہ ہجرت کر گئے ہیں۔ سرب فوجیں پہاڑوں پر چڑھ کر مسلمانوں کے مضبوط مراکز خالی کرانے اور ان پر قبضہ کرنے کی کئی کوششیں کر چکی ہیں۔ لیکن سخت مزاحمت کی وجہ سے انہیں ہر بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ خاص طور پر دارالحکومت سے صرف ۱۵ کلومیٹر کے فاصلے پر مجاہدین کا انتہائی مضبوط مرکز ہر وقت بھاری ہتھیاروں کی گولہ باری اور میزائلوں کے استعمال سے سربوں کی جارحیت کا جواب دیتا رہتا ہے۔

مجاہدین کی تعداد فی الحال سینکڑوں میں ہے۔ لیکن اضافے کی رفتار انتہائی حوصلہ حوصلہ افزاء ہے۔ بوسنیا پر حملے کے وقت وہاں مجاہدین کا نام تک نہ تھا۔ ساری مجاہد تنظیمیں بعد میں وجود میں آئیں اور باقاعدہ فوج

تو بہت بعد میں بنائی گئی۔ اس لیے جب مغربی یہ کہہ کر کوسووہ کی مسلم قیادت کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اگر جنگ کا آغاز ہو گیا تو یہاں کے حالات بوسنیا سے بھی زیادہ بدتر ہو جائیں گے تو کوسووہ کے مجاہدین اور شہری اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے اور اس موازنے کو غیر حقیقت پسندانہ قرار دیتے ہوئے یہ واضح کرتے ہیں کہ بوسنیا میں تین بڑی قومیں تھیں جبکہ کوسووہ میں نوے فیصد مسلمان ہی سب سے بڑی اکثریت ہیں۔ اس کے علاوہ مقدونیہ، البانیہ اور یونان بھی اس کے ہم نسل ہمسائے ہیں اور بوسنیا کو یہ برتری حاصل نہیں تھی۔

لاس اینجلس ٹائمز نے بھی اپنے تجزیئے میں یہی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

''بوسنیا کے برعکس کوسووہ کے رضا کار اور مجاہد کمانڈوز زیادہ تیار حالت میں ہیں۔ ان کی فوجی ٹریننگ زیادہ مکمل ہے اور ان کے پاس خودکار اسلحہ بھی زیادہ مقدار میں اور جدید ہے۔ یہ مجاہد ہر گاؤں اور ہر پہاڑی پر موجود ہیں اور اگر سرب فوج حملہ آور ہوئی تو انہیں سخت ترین مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ (۳۳)

## متوقع امکانات

اگرچہ سربیا نے روس کی شہہ پر بوسنیا کی طرز پر کوسووہ میں آپریشن اور کریک ڈاؤن کا عندیہ دیا ہے۔ لیکن عالمی برادری کے تقریباً تمام ہی ممالک سربیا کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ کوسووہ سے اپنی فوجیں واپس بلالے۔ سربیا نے بظاہر اس اپیل پر کسی ردّعمل کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن داخلی حالات اور بین الاقوامی دباؤ سے مجبور ہو کر سربیا کوسووہ کی مسلمان قیادت سے مذاکرات کی کوشش کر رہا ہے۔ مجاہدین بھی مذاکرات کے حق میں ہیں لیکن ان کی شرط یہ ہے کہ مذاکرات کے ایجنڈے میں آزادی کی شق شامل کی جائے۔ صدر جمہوریہ کوسووہ ابراہیم روجووا نے کہا کہ اس شق کی شمولیت کے بعد ہی مذاکرات ہو سکتے ہیں۔

اس عرصہ میں ترکی نے خبردار کیا کہ کوسووہ میں تشدد دوسرے علاقوں تک پھیل سکتا ہے۔ اس اعلان کی بازگشت دور تک سنی گئی۔ یورپ اور امریکہ نے خیال کیا کہ ترکی کے ملوث ہونے سے یہ سارا علاقہ بحران کی زد میں آجائے گا۔ کیونکہ سربوں کے مظالم کے بعد البانوی مسلمان بھی کثیر تعداد میں ہتھیار خرید کر کوسووہ پہنچ رہے ہیں۔ البانیہ میں ہتھیاروں کی تجارت خوب پھل پھول رہی ہے۔ لیکن البانوی حکومت نے اس تجارت کو روکنے

کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ وہ عملاً کوسووہ کی تحریکِ آزادی کا ساتھ دے رہی ہے۔ یہ بالکل اسی قسم کی کیفیت ہے جو جہاد افغانستان کے زمانے میں پاکستان کو حاصل تھی اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ معاملہ بڑھا تو البانیہ بطور مملکت کوسووہ کا ساتھ دے گا۔ مہاجرین کے زیادہ تر کیمپ بھی البانیہ کے علاقے میں ہیں جہاں ان کی ضروریات کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ مغرب یہ سمجھتا ہے کہ کوسووہ آزادی حاصل کر کے بالآخر البانیہ کا حصہ بن جائے گا اور ایک عظیم تر البانیہ وجود میں آجائے گا اور دوسری طرف عظیم سربیا کسی ایسے انجام سے دوچار ہو جائے گا جس سے عظیم روس دوچار ہو چکا ہے۔

اس سے پہلے کہ یہ خدشات حقیقت کا روپ دھار لیں، بڑی طاقتیں کوئی درمیانی راستہ تلاش کرنا چاہتی ہیں۔ یہ درمیانی راستہ کیا ہوگا؟ اس کا نقشہ آنے والے دنوں میں واضح ہو جائے گا۔
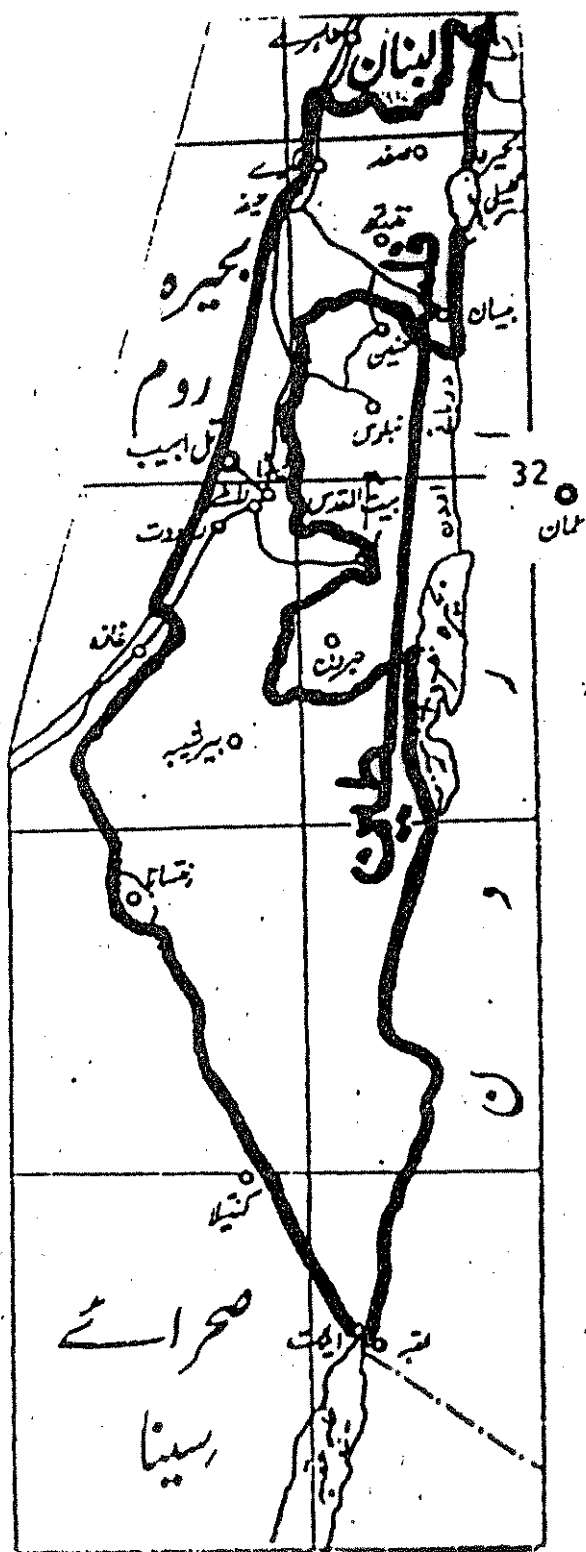
لبنان
صفد
حیفہ
بحیرہ روم
بیسان
نابلس
تل ابیب
32
بیت المقدس
عمان
غزہ
بیر شیبہ
صحرائے سینا
ایلات
عقبہ

## فصل ششم

# فلسطین

### تاریخی پس منظر

مشرقی بحیرہ روم کا وہ خطہ جس پر اسرائیلی ریاست قائم ہے قدیم زمانے سے فلسطین کے نام سے معروف ہے۔ اسے عبرانی میں Pleshet کہا جاتا تھا جس کا مطلب تھا فلسطینیوں کی سرزمین۔ فلسطین کی سرحدیں مختلف زمانوں میں مختلف رہی ہیں، فلسطین وہ خطہ ہے جس پر مشرق قریب کی تقریباً تمام اقوام وقتاً فوقتاً قابض رہی ہیں۔ یہ علاقہ سرزمین انبیاء کے نام سے معروف ہے۔

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق ؓ کے دور میں (۱۶ تا ۱۷ھ) بیت المقدس فتح ہوا تو پورا خطہ فکر و عمل کی اسلامی قدروں سے آشنا ہوا۔ بندہ و آقا کے درمیان امتیازات مٹ گئے۔ مسلمانوں نے نہ صرف علاقے بلکہ لوگوں کے دل بھی تسخیر کر لیے۔ حضرت امیر المؤمنین ؓ کے دور میں فتح عسقلان کے ساتھ ہی فتح فلسطین کی تکمیل ہوگئی۔ نویں صدی عیسوی میں عباسی سلطنت رو بہ زوال ہوئی تو کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں خود مختار ہوگئیں۔ مصر کے طولونی (۹۰۵ء تا ۸۶۸ء) شام اور فلسطین کے ساتھ عباسی سلطنت سے علیحدہ ہو گئے۔ ۹۶۹ء میں مصر میں فاطمی برسر اقتدار آئے اور انہوں نے دس برس کے اندر شام اور فلسطین اپنے قبضے میں لے لیے۔

فلسطین صلیبی جنگوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ ۱۰۹۹ء میں یورپی صلیبیوں نے فاطمیوں سے بیت المقدس چھین لیا۔ کچھ عرصے تک یہاں عیسائیوں کی حکومت قائم رہی بالآخر سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۴ جولائی ۱۱۸۷ء کو حطین کی فیصلہ کن جنگ کے بعد بیت المقدس آزاد کرا لیا۔

فلسطین صدیوں تک ایوبیوں اور مملوکوں کی سلطنت کا حصہ رہا۔ ۱۵۱۴ء میں سلیم اوّل کے دور میں اسے عثمانی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ مسلسل چار صدیوں تک یہ خلافت عثمانی کا جز بنا رہا۔ ترکی کمزور ہوا تو یورپ کی مفاد پرست طاقتوں نے اس کا فائدہ اُٹھایا۔ بیت المقدس میں انہوں نے کئی قونصلیٹ قائم کیے۔ فرانسیسی، روسی اور جرمن آباد کاروں نے جن کی اکثریت یہودیوں پر مشتمل تھی یہاں کئی بستیاں بسائیں۔

سوال یہ ہے کہ:

فلسطین کے خلاف یہود کی سازش کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ اسرائیل کے قیام کا اصل منصوبہ کیا تھا؟

دراصل صیہونیت (Zionism) کی تنظیم یہود نے گزشتہ صدی کے آخر میں شروع کی تھی۔ اس مقصد کے لیے عالم گیر یہود کانفرنس ۱۸۹۷ء میں پال شہر میں ہوئی۔ اس کانفرنس نے جو اہم فیصلے کیے وہ کچھ اس طرح تھے:

۱- دنیا بھر سے یہودیوں کو جمع کر کے فلسطین میں لا کر بسایا جائے۔ نئی یہودی ریاست کا صدر مقام یروشلم ہوگا۔ مسلمانوں کا قبلہ اور مسجد اقصیٰ بھی اس میں شامل ہوگا۔ یہ سارا کام پچاس سال میں مکمل ہو جائے گا۔ اس منصوبے کے مطابق اسرائیل کا قیام ۱۹۴۷ء تک عمل میں آنا تھا۔

۲- اس موقع پر فیصلہ کیا گیا کہ ۱۹۹۷ء تک (یعنی اسرائیل کے قیام کے پچاس برس بعد تک) عظیم تر اسرائیل قائم ہو جائے گا۔ عظیم تر اسرائیل کی حدود نیل سے فرات تک ہوں گی۔ اس منصوبے میں سعودی عرب کا شمالی حصہ بھی شامل دکھایا گیا، مسلمانوں کے مقدس ترین مقامات مکہ اور مدینہ پر قبضہ بھی اس منصوبے میں شامل ہوگا۔ اسرائیل کی پارلیمنٹ کی عمارت پر اس منصوبے کا خاکہ جلی الفاظ میں درج کیا گیا ہے:

"اے اسرائیل! تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں"

۳ اس کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسجدِ اقصیٰ کو گرا کر ہیکل تعمیر کیا جائے گا۔

۴ یروشلم اسرائیلی ریاست کا مستقل دارالحکومت ہوگا۔

۵ مسلمانوں اور اسلام کو دنیا بھر میں ذلیل کیا جائے گا۔ (۳۴)

۱۸۹۷ء میں یہودی کانفرنس کے فیصلوں کے بعد اپنے سازشی مقاصد کے لیے یہودی قوم نے مذموم کوششوں کا سلسلہ شروع کر دیا اور عظیم تر اسرائیل کے لیے یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اس زمانے میں جب ان کوششوں کا آغاز ہوا، فلسطین کا علاقہ سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ایک با اختیار یہودی وفد سلطان ترکی عبدالحمید دوم سے ملنے گیا۔ سلطان کو بھاری رقم، زر و جواہر اور سونے چاندی کی پیشکش کر کے

سرزمینِ فلسطین خریدنے کی کوشش کی گئی۔لیکن عثمانی خلیفہ نے یہودیوں کی پیشکش حقارت سے ٹھکرادی۔انھوں نے اس موقعے پر یہودیوں سے کہا سرزمینِ فلسطین پوری اُمت کی امانت ہے وہ اس میں خیانت نہیں کرینگے ترکوں سے مایوس ہوکر یہود نے انگریزوں سے مل کرنئی سازش تیار کی۔ پہلے جنگِ عظیم میں ترکوں کوشکست ہوئی اور برطانوی فوج نے 1918ء میں فلسطین میں قبضہ کرلیا۔اس کے ساتھ ہی طے شدہ منصوبہ کے مطابق یہودیوں کوفلسطین آنے کی اجازت دے دی گئی۔ان یہودیوں کو رقم ،ہتھیار،اور ہر طرح کی سہولیات دی گئیں اس وقت تک اس خطے میں یہود کی آبادی محض ایک فیصد تھی برطانیہ کی پالیسی اور یہود کے ساتھ گٹھ جوڑ کے نتیجے میں 1937ء تک یہودی آبادی کا تناسب 28.2 فیصد تک پہنچ گئی ان یہودیوں نے سرزمین فلسطین کے 78 فیصد علاقے پر زبردستی قبضہ کرلیا۔5 مئی 1948ء اسرائیل کی ناجائز ریاست کے قیام کا اعلان کردیا گیا۔ اس کے بعد لاکھوں فلسطینیوں کو مجبور کردیا گیا کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر چلے جائیں عظیم تر اسرائیل کے منصوبے کے مطابق ہی اسرائیلی ریاست قائم کی بلکہ اپنی سرحدوں پر ایسی ریاستیں قائم کرنے پر بھی کامیاب ہوگئے جو کمزور بھی تھیں اور سیکولر اور قوم پرست ذہن کی حامل تھی ان ریاستوں کا قیام سلطنت عثمانیہ کہ اختتام کے نتیجے میں ہی ممکن ہوسکا۔نئی قائم ہونے والی ریاستوں میں عراق،سعودیہ،شام،اور اردن قابل ذکر ہیں۔ یہ ریاستیں اپنے وجود کی بقا کے لیے مغربی قوتوں پر انحصار کرتی تھیں۔ یہ یہودی سازش کی کامیابی ہے کہ 1948ء میں اسرائیل قائم ہوگیا۔1967ء اس نے عربوں کوشکست سے دوچار کردیا۔

1967ء میں عربوں کی شکست کے نتیجے میں یہودیوں نے ان سے بہت سے نئے علاقے چھین لیے۔ان علاقوں میں اردن سے دریائے اردن کا مغربی کنارہ چھین لیا۔اس کے ساتھ یروشلم اور القدس شریف بھی شامل تھے مصر سے صحرائے سینا لے لیا گیا اور شام کی جولان پہاڑیوں پر قبضہ کرلیا گیا۔1982ء میں اسرائیل نے لبنان کے جنوبی حصے پر قبضہ کرلیا مزید عرب علاقے ہتھیانے کے لیے یہودی سازشیں جاری ہیں اور وہ اپنی ہدف کی طرف پہلے سے تیار کردہ پلان کے مطابق قدم بہ قدم بڑھ رہے ہیں۔حالیہ پیش رفت سے یاسرعرفات کے ساتھ اسرائیل کا معاہدہ شامل ہے۔(۳۵)

عربوں اور اسرائیل کے درمیان اب تک پانچ جنگیں ہوچکی ہیں ان سب کی بنیاد مسئلہ فلسطین تھا

عربوں کا موقف تھا کہ اسرائیل کو فلسطین میں اپنا وطن قائم کرنے کا ہرگز کوئی حق نہیں کیونکہ فلسطین اُصولاً فلسطینی عربوں کی زمین ہے۔ یہودیوں کو اس سرزمین سے نکلے ہوئے ہزارہا سال ہو چکے ہیں اس سرزمین پر اب ان کا کیا حق ہے لیکن یہ دردناک حقیقت ہے کہ عرب حق موقف رکھتے ہوئے بھی اپنی بات نہ منوا سکے ان کے پاس افرادی قوت تھی، پیسہ تھا، دولت تھی، وسائل تھے۔ اس کے باوجود وہ اپنے حریف کے مقابلے میں ہمیشہ مار کھاتے رہے۔ ہر جنگ کے بعد اسرائیل وسیع تر ہوتا اور عرب سکڑتے چلے گئے۔ یہ تعجب خیز ہے کہ اسرائیل کم آبادی کے باوجود اپنے سے کئی گنا بڑے مقابل کے مقابلے میں کامیابی حاصل کرتا رہا۔ بیت المقدس کے اس حصے پر عربوں کا قبضہ تھا جہاں مقدس مقامات واقع ہیں۔ لیکن عربوں نے جون 67ء کی لڑائی میں ایک گولی چلائے بغیر یہ علاقہ اسرائیل کے حوالے کر دیا۔ یہ صرف عربوں ہی کی نہیں پورے عالم اسلام کی بدنصیبی تھی کہ ان کا قبلہ اوّل اسلام دشمنوں کے قبضے میں چلا گیا۔

عرب ممالک اسرائیل کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ ان کی مجموعی فوج 36 لاکھ ہیں جو اسرائیل کی کل آبادی کے برابر ہے لیکن عرب اسرائیل کا کبھی بھی جم کر مقابلہ نہ کر سکے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ بیان کرتے ہوئے دل دکھتا ہے۔ عربوں میں نہ جذبہ رہا ہے نہ یکجہتی۔ پورے عالم عرب میں کہیں بھی منتخب حکومت نہیں ہے۔ جون 67ء کی جنگ کے بعد مصر میں ایمرجنسی نافذ کی گئی جو اب تک جاری ہے۔ حالانکہ مصر اسرائیل کو تسلیم کر کے اس سے معاہدہ امن بھی کر سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسرائیل کی قومی یکجہتی کا یہ عالم تھا کہ جون 67ء کی جنگ پانچ روز چلی۔ ان پانچ دنوں میں ایک روز بھی پارلیمنٹ کے اجلاس کا ناغہ نہ ہوا۔ اسرائیل کی باضابطہ فوج تین لاکھ ہے لیکن اس کے چار لاکھ رضا کار ہیں جو صرف ریڈیو پر اعلان سن کر میدانِ جنگ میں پہنچ جاتے ہیں۔

## یاسر عرفات کا کردار

یاسر عرفات ابتدا سے ہی سیکولر مزاج کے آدمی تھے۔ 1965ء میں انہوں نے آزادی فلسطین کے لیے فلسطین نیشنل لبریشن موومنٹ کی بنیاد رکھی اور اس تنظیم نے مختصر مدت میں اسرائیل کے خلاف ایسی

کاروائیاں میں بن لی وجہ سے ان لی مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا اچھے خاصے مذہبی رجحان کے حامل لوگ جہاد کے جذبے سے اس تنظیم میں شامل ہوگئے۔ اس مقبولیت کی بناء پر انہوں نے 1969ء میں صدر جمال عبدالناصر سے ملاقات کی۔ اس موقع پر دونوں میں جو خفیہ مذاکرات ہوئے، ان میں طے پایا کہ آئندہ یاسر عرفات اسرائیل کے خاتمے اور سرزمینِ فلسطین کی مکمل بازیابی کے بجائے 1967ء کی جنگ میں چھینے ہوئے علاقوں کی واپسی کے لیے جدوجہد کرینگے اسی بنیاد پر یاسر عرفات کو پی ایل او میں شامل کر لیا گیا۔ اس بات کا انکشاف اکیس برس بعد (30 دسمبر 1985ء کو) یاسر عرفات کے قریبی ساتھی حسن ثانی نے کیا۔ 1974ء میں جب یاسر عرفات نے شاخ زیتون اُٹھائی تو ابوندال نے اپنے ساتھیوں سمیت ان سے علیحدگی اختیار کر لی۔ جنوری 82ء نے جنوبی لبنان پر حملہ کیا تو عرفات نے فلسطینیوں کو دوسرے ممالک میں جانے اور اسرائیل کے خلاف لڑائی بند کرنے کا حکم دیا۔ اس پر کچھ فوجی افسروں نے ان کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور ان کے خلاف ہوگئے۔ ان لوگوں کو خفیہ طریقے سے مار دیا گیا۔ اس طرح یاسر عرفات کا فتح گروپ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ایک یاسر عرفات کے ساتھ رہا تو دوسرے نے ابوموسیٰ کی قیادت میں فتح انتفاضہ کے نام سے تنظیم قائم کر لی۔

یاسر عرفات اندر ہی اندر 86-1985ء میں اقوام متحدہ کی قرارداد، 242 کو قبول کر چکے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے اسرائیل کو براہِ راست قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ 86ء میں الفتح کے خفیہ محکمہ کے سربراہ بریگیڈیئر عطاء اللہ تھے۔ 1988ء میں یاسر عرفات کے روّیے سے تنگ آ کر الگ ہوگئے اس طرح الفتح ایک بار پھر دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ 1988ء میں یاسر عرفات نے اسرائیل کو خفیہ طور پر تسلیم کر لیا اور وعدہ کر لیا تھا کہ وہ فلسطین سے باہر یہودیوں سے نہیں لڑیں گے۔ 1991ء میں یاسر عرفات میڈرڈ اسپین میں بات چیت کے لیے تیار ہوئے اور مختصر مذاکرات میں انہوں نے جو معاہدہ کیا اس میں فلسطین کے لیے کچھ حاصل نہیں کیا۔ اس کے علاوہ یاسر عرفات کا مشکوک کردار متعدد مواقع پر سامنے آیا۔ یاسر عرفات نیویارک میں واقع اقوام متحدہ کے دفتر گئے تو ان کے ہاتھ میں زیتون کی شاخ تھی۔ وہ اسرائیل کو تسلیم کر چکے تھے۔ اس بات نے فلسطینیوں میں ان کی شہرت کو سخت نقصان پہنچایا۔ پی ایل او کی بدنامی کا اثر یہ ہوا کہ اس سے باہر حماس گروپ اُبھرا اور 87ء سے جہاد کے عمل میں باقاعدہ شریک ہوا۔ حماس کی بنیاد نظریاتی تھی۔ اس لیے چند سالوں کے اندر اندر یہ

فلسطینیوں کا سب سے اہم گروپ بن گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ حماس مقبول ہو رہا ہے۔ حماس ہی نے بالآخر یاسر عرفات کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ یاسر عرفات کے اسرائیل کے ساتھ معاہدے کی بدترین بات یہ ہے کہ اس میں قبلہ اوّل کو قطعی طور پر فراموش کر دیا گیا جو مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ ہے۔ یہ مجرمانہ غفلت ہے۔ خصوصاً اس حال میں کہ جب صیہونی منصوبے کے مطابق انہوں نے 1997ء تک خاکم بدہن مدینہ منورہ پر قبضہ کرنا تھا جبکہ قبلہ اوّل کو یہودی اپنا دائمی مرکز سمجھتے ہیں۔ اس معاہدے کی دوسری شرمناک بات یہ ہے کہ اس کے ذریعے یاسر عرفات نے یہود کے سرزمینِ فلسطین اور القدس شریف کے ناجائز قبضے کو جائز اور دائمی حق کے طور پر تسلیم کر لیا یہی نہیں بلکہ یہودیوں کو باہر سے لا کر آباد کرنے اور ان کی نئی بستیاں بسانے کا حق بھی تسلیم کیا گیا۔ لیکن فلسطینی مسلمانوں کے اپنی زمین کے ملکیتی حق کو نہیں مانا گیا۔ چنانچہ صیہونی جریدے ''معاریف'' کی رپورٹ کے مطابق یہودیوں کی عالمی تنظیم ''نمائندگان اسرائیل نے 50 ہزار یہودیوں کی اسرائیل منتقلی کے پروگرام کا باقاعدہ آغاز کر دیا ہے جنہیں دو سال کے مختصر عرصے میں یوکرائن سے اسرائیل منتقل کر دیا جائے گا۔ جریدے کے مطابق یہودیوں کی یہ تنظیم منتقلی کے تمام اخراجات اسرائیلی حکومت کی وزارت کے تعاون سے برداشت کرے گی۔ یہ تنظیم اس سے پہلے 20 ہزار یہودیوں کو یوکرائن اور سابق سوویت یونین سے اسرائیلی منتقلی کے اخراجات برداشت کر چکی ہے اور اب اسرائیل کے قیام کے پچاس سال مکمل ہونے پر مزید پچاس ہزار یہودیوں کو اسرائیل منتقل کر کے اسرائیلی حکومت کو گولڈن جوبلی کا تحفہ دینا چاہتی ہے۔'' (۳۶)

اس معاہدے میں چالیس لاکھ سے زیادہ ان بے گھر فلسطینیوں کے اپنے وطن واپسی کے حق کو تسلیم نہیں کیا گیا جو دوسرے ملکوں میں کسمپرسی کے عالم میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس معاہدے میں 1948ء کے بعد کے مقبوضہ علاقوں کا ذکر تک نہیں کیا گیا جو فلسطین کے کل رقبے کا 78 فیصد حصہ ہیں۔ یاسر عرفات اور اسرائیل کے مابین یہ ایک غیر مفید اور ناقابلِ عمل معاہدہ ہے۔

ایسے معاہدے تادیر نہیں چل سکتے۔ جس معاہدے میں فلسطینیوں کے بنیادی حقوق کا خیال نہیں رکھا گیا جس کی بنیاد پر مستقبل میں کچھ حاصل نہیں ہو سکتا اور جس کے ذریعے وہ اپنے وطن واپس نہیں جا سکتے، اس معاہدے کو فلسطین قوم کبھی تسلیم نہیں کر سکتی۔ وہ اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے اس معاہدے کے بعد مقبوضہ

علاقوں میں میئر کا جو الیکشن ہوا اس میں حماس کو زبردست اکثریت حاصل ہوئی۔اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ فلسطینیوں نے یاسر عرفات اور یہود کا گٹھ جوڑ مسترد کر دیا ہے۔بعد کے معاملات سے مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات مزید خراب ہوئے ہیں اس سے ان کے درمیان تنازعہ مزید شدید ہوگا ایسا لگتا ہے کہ مستقبل قریب میں مسلمانوں اور یہودیوں میں ایک مکمل اور کھلی جنگ ہوگی اور اس کی وجوہ یہ ہیں۔

- یہودیوں اور یاسر عرفات کا معاہدہ فلسطینیوں کے مقاصد پورے نہیں کرتا اس لیے جدوجہد جاری رہے گی آئندہ جدوجہد کی نوعیت بھی بدل جائے گی،اس لیے کہ حماس فلسطینیوں کی نمائندہ جماعت بن گئی ہے۔
- مغربی ممالک کی تحقیق وشہادت اس بات کی گواہ ہے کہ اسلامی تحریک مشرق وسطیٰ میں ایک بڑی قوت بن کر اُبھر رہی ہے۔اسلامی تحریک اسرائیل کے ساتھ سمجھوتے کرنے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہیں اس لیے اندرونی طور پر مزید تنازعے اور فساد کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام یہودیوں کو موقع دیا جارہا ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں سے یہودی آ کر جمع ہو جائیں۔پھر اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو سزا دینے کا وعدہ فرماتا ہے اس لیے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وعید کے عین مطابق سرزمینِ فلسطین پر ہر طرح کا فساد مچا رکھا ہے۔اس میں معاشی،معاشرتی،اور عسکری فساد کی ہر شکل شامل ہیں۔اس لیے اللہ کے وعدے کے مطابق انہیں لازماً سزا دی جائے گی اور وہ بُری طرح شکست کھائیں گے۔مسلمان مجاہدین انشاء اللہ بیت المقدس کو اس طرح آزاد کروائیں گے جس طرح فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور میں فلسطین آزاد ہوا تھا۔اسرائیل کی تمام تنصیبات تباہ ہو جائیں گی۔ یہ حقیقت قرآن شریف سے ثابت ہے اور تمام مشاہدات اس کی گواہی دے رہے ہیں۔دوسری طرح عرب ممالک کا موجودہ سیاسی نظام اس خطے کے عوام کے لیے نا قابل قبول ہے،جو نیشنلسٹ ،سوشلسٹ اور امریکی رجحان کا حامل ہے۔

## اسرائیل کو تسلیم کرنے کا مؤقف؟

بعض ممالک اسرائیل کو تسلیم کرنا اپنی سلامتی کے لیے ضروری خیال کر رہے ہیں۔

یہ مضحکہ خیز بات ہے کہ کوئی شخص تباہی سے بچنے کے لیے اسے اپنے گھر بلا لے یا کوئی کنویں میں گرنے کے ڈر سے کنویں میں چھلانگ لگا دے۔ یہود کا تو ریکارڈ یہ ہے کہ وہ جہاں گئے تباہی مچائی، فساد پھیلایا، اس فتنہ انگیزی کی پاداش میں وہ دنیا بھر میں کئی ممالک سے نکالے گئے ہیں۔ اس صدی کے آغاز میں انہوں نے پہلی جنگِ عظیم کے لیے ایندھن جمع کیا اور پھر جرمنوں کی بربادی کا سبب بنے۔ ہٹلر نے یہود سے بدلہ لیا۔ اس کا بدلہ یہودیوں نے دوسری جنگ میں اس کی تباہی کی صورت میں لے لیا۔ پھر اتحادیوں سے مل کر انہوں نے فلسطینیوں سے ان کی سرزمین ہتھیالی۔ پھر یہ یہودی ہی تھے جنہوں نے دنیا پر اشتراکیت جیسا ایک دشمن خدا نظام مسلّط کیا۔ مغربی دنیا میں جتنی بھی خرابیاں داخل ہوگئی ہیں ان میں یہود کی کارفرمائی صاف نظر آتی ہے۔ پوری دنیا میں شراب اور جوئے کے اڈّے یہودی چلا رہے ہیں۔ ہم جنس پرست، ایڈز، بدکاری اور قوم لوط کا عمل دنیا بھر میں ان کے دم قدم سے پھیل رہا ہے۔ یہ اسلامی دنیا میں بھی جراثیموں کی طرح داخل ہو چکے ہیں۔ ان سے بچنا ہے تو ان کے خلاف جہاد اور اتحاد کرنا ہوگا ورنہ یہ اسلامی دنیا کو بھی معاشی، معاشرتی، تعلیمی اور ثقافتی طور پر تباہ کر کے رکھ دیں گے۔

اس لیے ہمارا بہترین تحفظ اسرائیل کو تسلیم کرنے میں نہیں بلکہ کلمہ طیبہ کے نظام کو قائم کرنے اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کام کرنے میں ہے۔ یہ کام ہم نے نہ کیا تو ہم انتشار کا شکار ہو کر ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ (۳۷)

## تحریکِ حماس، اسرائیل کے لیے چیلنج

تحریکِ حماس کی تاریخ مقبوضہ فلسطین میں الاخوان المسلمون کی تاریخ سے وابستہ ہے۔ ۱۹۲۸ء میں مصر میں حسن البناء کے ہاتھوں قائم کی جانے والی اس اسلامی تحریک کا مقبوضہ علاقوں میں پہلا دفتر القدس ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو قائم ہوا تھا۔ اگلے ایک سال کے عرصے میں الاخوان المسلمون کی شاخیں تقریباً پورے فلسطین

ین پیس پی یس اور الاحوان سے وابستہ افراد اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ان کے ممبران کی تعداد ۲۰ ہزار تک پہنچ رہی ہے۔ لیکن جلد ہی اس تحریک کو نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے تو یہودی غاصبوں نے فلسطینی عربوں کو ان کے گھروں سے بزور بے دخل کرنا شروع کر دیا اور پھر جب اس کی مزاحمت کی گئی تو اسرائیلی یہودیوں نے برطانیہ اور فرانس جیسے ممالک کی پشت پناہی میں باقاعدہ جنگ چھیڑ دی۔ یہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے جب کہ اخوان سے وابستہ والنٹیئر ز کی ایک کثیر تعداد اپنے مال ومتاع اور عزت وناموس کے تحفظ کی خاطر اس جنگ میں مجاہدانہ وار شریک ہوئی لیکن کچھ تو شومئی قسمت اور کچھ عرب حکمرانوں کی بے حسی کی وجہ سے جنگ بندی کا نتیجہ ایک ایسی صورتِ حال پر منتج ہوا کہ ارض فلسطین کے کئی ٹکڑے کر دیے گئے اور اس طرح اخوانی قوت منتشر ہوگئی۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۷ء تک کا درمیانی عرصہ فلسطینیوں کی سرگرمیوں کا سرد ترین دور تھا۔ چنانچہ پورا آٹھواں عشرہ بلکہ ۹ویں کے ابتدائی سال بھی اخلاقی تربیت اور سماجی مسائل کے ازالے میں گزر گئے۔ اخوانی قیادت کے نزدیک یہ دور مردم خیزی اور سماجی تنظیم کا دور تھا چنانچہ اس دور میں جہاں اخوان کی تعلیمات کو عام کیا گیا وہیں بدعنوانیوں، رشوت ستانیوں اور اوقاف کی بدنظمیوں کے خلاف آواز اُٹھائی گئی اور سماجی فلاح و بہبود کے متعدد منصوبے شروع کیے گئے۔ اخوان کی ان کارگزاریوں کو بعض حلقوں میں شک وشبہ کی نظروں سے بھی دیکھا گیا۔ کیونکہ یہی وہ عرصہ تھا جب تنظیم آزادی فلسطین کی گرم بازاریاں شروع ہوئی تھیں اور کئی فلسطینی جنگجو گروپ وجود میں آچکے تھے جبکہ اخوان اس بارے میں مہر بہ لب تھے۔ دراصل اخوانی قیادت یہ سمجھ رہی تھی کہ یہ ساری فتنہ انگیزی یہودی حکمرانوں کی طے شدہ پالیسی کے مطابق ہے جو تحریکِ فلسطین کو گروہ در گروہ تقسیم شدہ دیکھنا اور پھر مطلوبہ تعداد میں صالح افراد کی تیاری کے بغیر کوئی اسلامی جہاد چھیڑ ا بھی کیسا جاتا؟

حقیقت یہ ہے کہ حماس کی پیدائش ''اخوان المسلمون فلسطین'' سے ہوئی۔ ۱۹۶۸ء میں قومیت اور دوسرے درآمد شدہ نظریات کی ذلت آمیز شکست کے بعد اخوان المسلمون عوام کی ایک مقبول جماعت بن کر اُبھری۔ اسلامی تحریک نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں اپنی تمام کوششوں کو عوام کے لیے رفاہی کاموں کی تنظیموں کا جال بچھانے اور اسلامی اقدار کے احیاء پر لگا دیا تھا۔ ۲۰ سال کے عرصہ میں اخوان نو جوان مردوں اور عورتوں

لی ایک ایسی نئی نسل تیار کرنے کے قابل ہو گئے جو مکمل طور پر مسلمان تھی اور جس نے اسلام کو بطور نظریہ اور نظامِ حیات کے مکمل طور پر قبول کیا۔ قدرتی طور پر اسلامی تحریک سیکولر عناصر کے لیے ایک چیلنج بن کر اُبھری۔ سیکولر عناصر آہستہ آہستہ عوام میں غیر مقبول ہوتے چلے گئے۔ اس عرصہ کے دوران میں اخوان نے حکام سے عدم تصادم کی پالیسی کو اپنائے رکھا۔(۳۸)

## تحریکِ جہاد

بہر حال ۹ویں عشرے کے وسط تک آتے آتے الاخوان المسلمون میں اتنی سکت پیدا ہوگئی کہ وہ میدان سیاست میں آسکیں۔ حماس انہی کوششوں کا نتیجہ تھی جو ۱۹۸۷ء میں وجود میں آئی۔ حماس کی سرگرمیاں صرف اس حد تک سیاسی ہیں کہ وہ فلسطینی عوام میں سیاسی شعور بیدار کرنے اور ان کی سیاسی تربیت و رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ فروری ۱۹۸۸ء میں جاری حماس کے پہلے اعلانیہ میں یہ بات بہت وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے کہ: ''حرکۃ المقاومۃ الاسلامیہ (ح م اس) (HAMAS) الاخوان المسلمون کے فلسطینی شعبہ کی ایک شاخ ہے اور الاخوان المسلمون ایک بین الاقوامی تنظیم ہے جو زندگی کے جملہ گوشوں میں اسلامی تعلیمات کے نفاذ کے لیے کوشاں ہے''۔ حماس نے بھی وہی شعار اپنا فاھف جو الاخوان المسلمون نے اپنایا یعنی......

اللہ ہمارا مقصود ہے، رسول اللہ ﷺ ہمارے قائد ہیں، قرآن ہمارا دستور ہے، جہاد ہمارا راستہ ہے اور شہادت ہماری تمنا ہے۔ یہودی حکمران اس طرزِ حیات کو دہشت گردی بتاتے ہیں۔

حماس اوّل روز سے غاصب یہودیوں کے خلاف فلسطینی آراء مجتمع کرنے میں سرگرم رہی ہے۔ اسرائیل کے ظالم جاسوس گروہ شن بتھ (SHIN BET) کے خلاف سب سے پہلے حماس نے ہی آواز بلند کی تھی اور ان کی اس سازش کو بے نقاب کیا تھا کہ یہ سفاک پولیس اندرونی سلامتی کے نام پر دراصل فلسطینی نوجوانوں کو اپنا آلہ کار بنانے کی خاطر دھونس دھمکی سے لے کر شراب و شباب تک ہر حیلہ استعمال کر رہی ہے۔

دراصل تحریکِ حماس کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ ''ارضِ فلسطین تمام مسلمانوں کا مشترکہ ورثہ ہے۔ یہودی اور عیسائی یہاں پر رہنے بسنے کے لیے تو آزاد ہیں۔ لیکن انہیں ایک اسلامی ریاست کے اندر ہی رہنا

ہوگا''۔ حماس کے اعلامیہ نمبر ۴۹ میں مسلم عیسائی تعلقات کے بارے میں قرآنِ کریم کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ ''اور اہلِ ایمان سے انس رکھنے میں قریب تر جو لوگ ہوں گے وہ تجھے ان لوگوں میں ملیں گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔'' تعجب ہے کہ عالمی میڈیا میں حماس کی اس وسعت نظری کی توصیف کی بجائے ان کے خلاف دہشت گردی کے الزامات شائع ہوتے ہیں حالانکہ دہشت گرد تو غاصب یہودی حکمران اور ان کے حمایتی ہیں جو فلسطینیوں کے سیاسی و معاشی حتیٰ کہ دینی حقوق تک سلب کیے ہوئے ہیں اور بریں بناء حماس کے جانباز نوجوان ایک جائز اور واجب جہاد میں مصروف کار ہیں۔

تحریکِ انتفاضہ سے پہلے اسرائیلی حکام پی ایل او کے کسی عہدیدار سے بات کرنا تو کجا اس کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہ تھے۔ فلسطین کے اسلام پسند حلقوں کی طرف سے انتفاضہ کا آغاز ہوا تو شروع میں اسرائیل نے اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی۔

اسرائیلی حکام کا خیال تھا کہ اسرائیلی پولیس اس پر جلد قابو پالے گی۔ انتفاضہ غیر متوقع طور پر نہ صرف فلسطینی عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گئی بلکہ اس کی رفتار میں بھی روز بروز اضافہ ہوا اور اس نے پوری دنیا کی توجہ اپنی طرف مرکوز کروالی۔ جنگِ خلیج کے بعد امریکہ پر عالمی رائے عامّہ کا دباؤ بڑھا۔ امریکی دباؤ کی اتنی اہمیت نہیں تھی جتنی تحریکِ انتفاضہ کی کیونکہ اسرائیل جانتا تھا کہ امریکی دباؤ محض دکھاوا ہے۔ لیکن اس بہانے وہ انتفاضہ کا دباؤ کم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے پی ایل او کے ساتھ مذاکرات کا آغاز کردیا۔ اسرائیلی حکام اس سے بے خبر نہیں تھے کہ انتفاضہ میں پی ایل او کا کوئی خاص کردار نہیں لیکن وہ آسان سے مشکل کی طرف مذاکرات کا سفر کرنا چاہتے تھے۔ انتفاضہ کی رُوحِ رواں حماس اور دوسری اسلام پسند تنظیمیں کسی صورت بھی اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۹۳ء کو واشنگٹن میں اسرائیل نے اپنی مرضی کے معاہدے پر پی ایل او کے بوڑھے سربراہ یاسر عرفات سے دستخط کروالیے۔ فلسطینیوں نے اس معاہدے پر شدید احتجاج کیا۔

یاسر عرفات اسرائیلی حکام کے اندازوں سے فلسطینیوں میں کہیں زیادہ غیر مقبول ثابت ہوئے ہیں اور اسرائیل نے یہ بات سمجھ لی کہ حماس کی موجودگی میں کوئی امن معاہدہ، اسرائیل میں امن نہیں لا سکتا۔ اب اسرائیلی حکام کی کوشش ہے کہ کسی طرح حماس کو بھی مذاکرات کی میز پر لا کر انتفاضہ کو غیر مؤثر کیا جائے۔ اس

سلسلہ میں وہ عرب ممالک کے اثر ورُسوخ کو بھی پوری طرح استعمال میں لا رہا ہے۔ جیلوں میں قید حماس کے مختلف رہنماؤں کو بھی پیشکشیں کر رہا ہے، سازشوں کا بھی سہارا لے رہا ہے۔ حماس اسرائیل کے خلاف جہادی کاروائیاں کر رہی ہے اور یاسر عرفات صاحب حماس کو کچلنے کے لیے اسرائیل کی مدد کر رہے ہیں۔

حماس نے شروع دن سے PALESTINIAN NATIONAL AUTHORITY (PNA) کو مسترد کیا ہے۔ حماس کے مطابق یہ اتھارٹی فلسطینی عوام کی اس جدوجہد کی عکاسی نہیں کرتی جو وہ ۱۹۲۰ء سے کر رہے ہیں یعنی آزادی، خودمختاری اور اقتدارِ اعلیٰ کی بحالی، تاہم حماس یہ بات واضح کر چکی ہے کہ فلسطین کی نیشنل اتھارٹی (PNA) کی مخالفت میں جدوجہد پر امن ہوگی جبکہ اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ کے خلاف ہم اپنی کاروائیاں جاری رکھیں گے۔

## رفتارکار

لیکن اس جہاد میں بھی براہِ راست حماس کے تمام افراد شریک نہیں بلکہ حماس کے کچھ حوصلہ مند نوجوانوں نے جہاد کے لیے ایک ذیلی فورم تشکیل دیا ہے جو عزم الدین قسام بریگیڈ کے نام سے معروف ہے اور وہی تمام عسکری کاروائیاں کرتا ہے۔ عزالدین قسام وہ پہلے اسلامی رہنما ہیں جن کی قیادت میں فلسطینیوں نے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۹ء کے مختصر عرصہ میں برطانوی سامراج سے ٹکر لی تھی۔ سامراج آج بھی سرگرم ہے۔

غیر ملکی غاصبانہ تسلّط اس علاقہ پر اب بھی موجود ہے اور جب تک یہ ختم نہیں ہوگا جہادی کاروائیاں جاری رہیں گی۔ اس لیے یہ کوئی دہشت گردی کی کاروائیاں نہیں ہیں جیسا کہ انہیں دہشت گردی کی کاروائیاں کہا جا رہا ہے۔ فلسطینیوں، عربوں اور دیگر مسلمانوں کی اکثریت فلسطینی جہاد کی حمایت کرتی ہے اور وہ واحد زبان (عسکری کاروائیاں) ہے جو دشمن سمجھتا ہے اور زمین کے اس خطہ میں انصاف اور آزادی کے لیے دنیا کو بیدار کرنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔

حماس کی پوزیشن آئینے کی طرح صاف ہے۔ اسرائیل کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ فلسطینی قیدیوں کو رہا کرے اور ۱۹۶۷ء میں جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا، انہیں خالی کر کے واپس چلا جائے۔ اس

کا مطلب یہ ہے کہ تمام یہودی آبادکاروں کو بھی یہاں سے نکلنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی حماس جنگ بندی کے بارے میں غور کرے گی، ہر حالت میں واپسی پہلے ہوگی اگرچہ ابھی دباؤ اپنے عروج پر نہیں ہے۔ لیکن حماس کی کاروائیاں ایک دن اسرائیل کو علاقے خالی کرنے پر مجبور کر دیں گی۔

## خالد مشعل پر قاتلانہ حملہ

اسرائیل حماس کی کاروائیوں سے خوفزدہ ہو چکا ہے۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۹۷ء کو اردن میں حماس کے سیاسی بیورو چیف خالد مشعل کو موساد کے چھ ایجنٹوں نے قتل کرنے کی کوشش کی۔ اس قتل کے ذریعے نیتن یاہو یہودیوں میں ہیرو بننا چاہتا تھا۔ لیکن دہشت گردی کی یہ مُہم اس کے گلے پڑ گئی اور حماس کو بے نظیر کامیابی ملی۔ خالد مشعل کی زندگی ہوشیار اور چوکنے ڈرائیور کی وجہ سے بچ گئی۔ موساد کے ایجنٹ کینیڈا کے پاسپورٹ پر آئے تھے جنہیں خالد مشعل کے محافظوں نے پکڑ لیا۔ اس واقعہ سے اسرائیل کی دنیا بھر میں بدنامی ہوئی جس کی وجہ سے اسرائیلی وزیراعظم کو اردن آنا پڑا اور اپنے دوست سے موساد کے ایجنٹوں کے معاملات طے کیے اور ایک خفیہ معاہدہ ہوا جس کے تحت حماس کے سربراہ شیخ احمد یاسین کی رہائی کے بدلے میں شاہ حسین نے موساد کے چھ ایجنٹوں کو رہا کر دیا۔

شیخ احمد یاسین کی رہائی سے انتہا پسند یہودیوں کا مورال ڈاؤن ہوا اور جہاد کے حامی فلسطینیوں کا جوش و خروش بہت بڑھ گیا۔ شیخ احمد یاسین کی غزہ آمد پر ان کا شاندار استقبال کیا گیا اور حماس نے بڑی بڑی ریلیاں منعقد کیں۔ ان حالات میں نہ صرف فلسطین بلکہ دنیا بھر میں شیخ احمد یاسین کے انٹرویوز اور سرگرمیوں کا تذکرہ رہا۔ شیخ یاسین کے دوٹوک موقف سے اسرائیل اور مغرب میں مایوسی کے بادل چھا گئے۔ انہوں نے حماس کے حوالہ سے واضح کیا کہ: ''ہم کبھی بھی فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ تسلیم نہیں کریں گے۔ اگر اسرائیل غزہ اور مغربی کنارے سے اپنی فوجیں واپس بلا لے، فلسطینی قیدیوں کو واپس رہا کر دے، ۱۹۶۷ء کے بعد کی تمام آبادکاریوں کو ڈھا دے، فلسطینی پناہ گزینوں کو واپسی کی اجازت دے دے تو حماس ایک خاص وقت تک اسرائیل سے عارضی جنگ بندی کر سکتی ہے، تاہم بعد ازاں وہ فلسطین کی مکمل آزادی کے لیے جدوجہد کا حق

حو ظ رسی ہے۔''(۳۹)

شیخ احمد یاسین کی اس پیشکش سے ان کے سیاسی تدّبر کا اظہار ہوتا ہے کہ اسرائیل دنیا بھر میں پروپیگنڈہ کرتا ہے کہ ہم امن چاہتے ہیں کہ لیکن حماس امن پسند نہیں۔اب اگر اسرائیل امن کا خواہش مند ہے تو وہ سارے تنازعات کا مذاکرات کے ذریعے حل تلاش کرے اگر نہیں تو پھر مسلح جدوجہد کا راستہ تو کہیں نہیں گیا۔

## اسرائیلی افسروں کا اعتراف

حماس کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے پیشِ نظر اسرائیلی افسران کہتے ہیں کہ ہم حماس اور اسرائیل کے درمیان براہِ راست گفتگو کا چینل چاہتے ہیں۔ہم ایسی لڑائی جاری رکھنا نہیں چاہتے جس کے انجام کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ہم یہ بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم حماس کے ساتھ ہونے والی جنگ میں تھکے نہیں ہیں اور ہم اسے جاری رکھنے کی قوت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ہم ''فتح'' (یاسر عرفات کی پارٹی) کے ساتھ ۲۵ سال تک لڑے ہیں اور ہم حماس کے ساتھ بھی ایسی جنگ لڑنے کو تیار ہیں مگر اس وقت معاملہ جنگی نوعیت کا نہیں بلکہ سیاسی ہے اور ہم اسرائیلی عوام کو امن کے لیے قائل کر رہے ہیں مگر حماس کی سرگرمیاں ہمیں پریشان کر رہی ہیں۔مزید حماس کے ساتھ لڑائی نے ہم دونوں (حماس اور اسرائیلی حکومت) کو متاثر کیا ہے۔اس لڑائی میں دونوں کا بے تحاشا نقصان ہوا ہے۔ہم آپ کو آپ کی آزادی کا یقین دلاتے ہیں۔اس کی گارنٹی ہم بین الاقوامی تنظیموں اور غیر ملکی سفیروں کی موجودگی میں دینے کو تیار ہیں۔بالکل ویسی ہی گارنٹی جیسے ۶ سال قبل ڈاکٹر احمد اطبی کو دی تھی۔ہماری یہ پیشکش کسی خوف کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ہم آپ کے ساتھ ہمیشہ کے لیے امن کے ساتھ رہنے کے لیے کر رہے ہیں۔

مذاکرات کا آغاز کرنے کے بعد پہلے قدم کے طور پر ہم حماس کے تمام قیدیوں کو رہا کر سکتے ہیں۔جن میں عمر قید کے قیدی بھی شامل ہوں گے۔ہم تمام بند مساجد کو کھول دیں گے۔۱۹۶۷ء میں جن گھروں پر قبضہ کیا تھا، وہ بھی واپس کرنے کو تیار ہیں۔اس کے بدلے میں ہم حماس سے یہ چاہیں گے کہ وہ فوجی کاروائیاں بند

کردیں۔آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مشکل ہوگا یا ناممکن ہے شاید آپ یہ بھی کہیں کہ حماس کے نام سے کوئی دوسرا فرد یا گروپ فوجی کاروائی کرسکتا ہے۔ہم ان تمام امکانات سے آگاہ ہیں۔ہم حماس سے رابطہ چاہتے ہیں اور حماس کے رہنماؤں کی طرف سے فوجی کاروائیاں بند کرنے کا اعلان، ہم مستقل جنگ بندی چاہتے ہیں۔لیکن محدود وقت کی جنگ بندی کے لیے بھی غور ہوسکتا ہے۔اگر مستقبل میں حماس کے نام سے فوجی کاروائی ہوتی ہے تو ہم چاہیں گے کہ حماس اس کی مذمت کرے جس طرح ''فتح'' مذمت کرتی ہے۔

ہم چاہیں گے کہ حماس کے چھاپہ مار گرفتاری دے دیں۔ہم چند گھنٹوں کے لیے ان سے تفتیش کریں گے اس کے بعد ہم انہیں رہا کردیں گے بالکل اسی طرح جس طرح فتح کے افراد کو رہا کیا تھا۔اس کے علاوہ بھی ایک مسئلہ ہے جو مشکل بھی ہے اور وقت چاہتا ہے۔وہ یہ ہے کہ حماس اپنے زیر قبضہ تمام ہتھیار واپس کردے اور وہ یہ ہتھیار ہمیں واپس کرنا پسند نہ کرے تو فلسطینی حکام کو واپس کردے۔

ہم موسیٰ ابومرزوق اور حماس کے رہنماؤں سے رابطہ چاہتے ہیں، ہم رابطے کا چینل چاہتے ہیں۔ہم نے شیخ یاسین کو متعدد بار رہا کرنے کی کوشش کی ہے، ہم نے انہیں کافی پیشکشیں کی ہیں۔حال ہی میں ہم نے انہیں پیشکش کی کہ وہ صرف اس عبارت پر دستخط کردیں کہ ان کی رہائی معاہدۂ امن کے نتیجہ میں ہوئی ہے مگر انہوں نے انکار کردیا۔

RUSSIA
Caspian Sea
Mozdok
Chechnya
Dagestan
Ingushetia
North Ossetia
Grozny
Makhachkala
Caucasus Mountains
GEORGIA
Roads
Oil pipelines
Railroads
20 mi.
20 km
RUSSIA
IRAN
TIME Map by Steve Hart
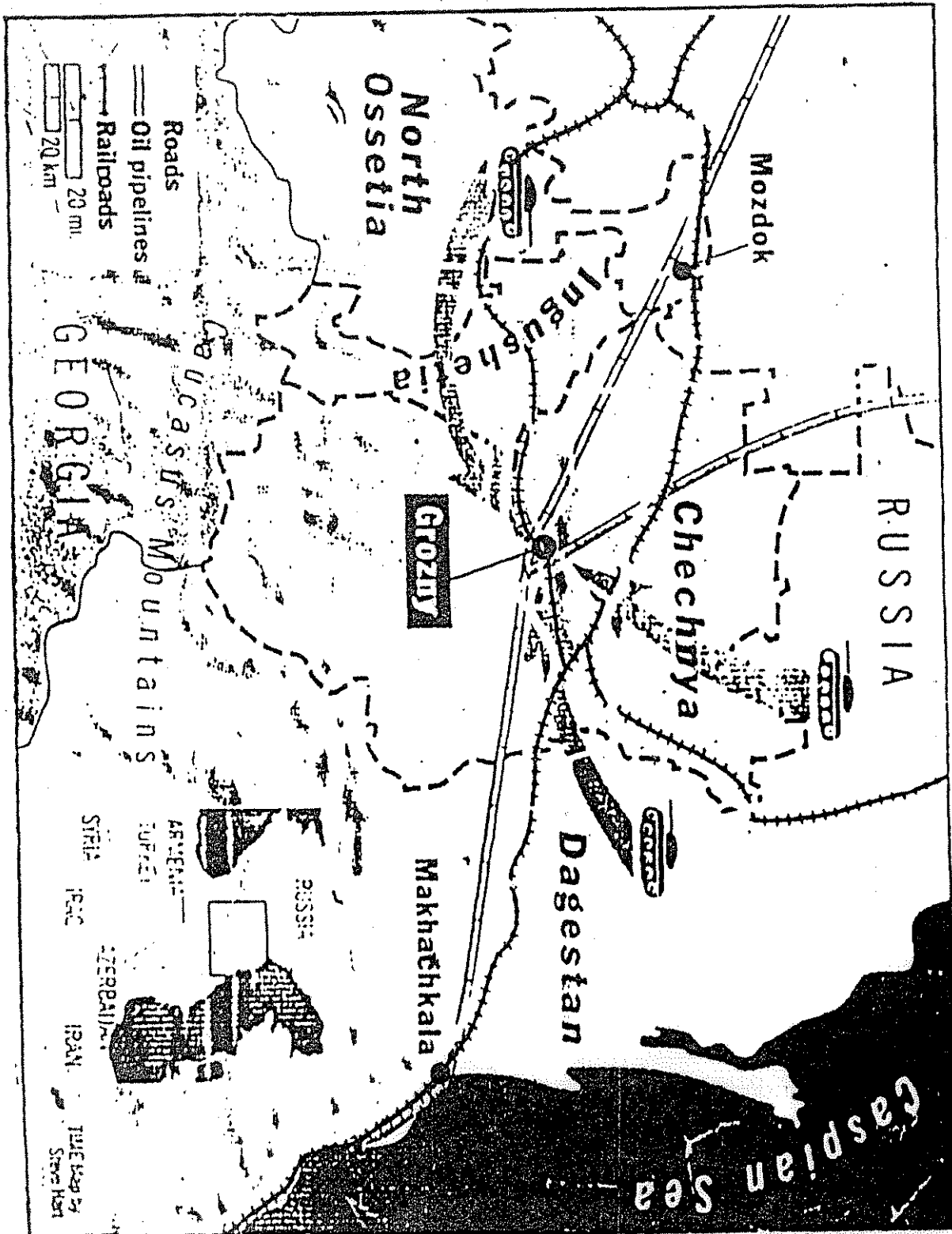
فصل ہفتم

# چیچنیا کے مسلمانوں کی جدوجہد

مسلمان یہاں سب سے پہلے خلیفہ ہشام (۷۲۴ءتا۷۴۳ء) کے زمانے میں داخل ہوئے مگر شمالی قفقاز کے مغربی حصوں میں مسلمانوں کی تعداد میں زیادہ اضافہ فتح قسطنطنیہ کے بعد ہوا۔ بعض تاریخی روایات کے مطابق چیچنیا میں اسلام کی روشنی حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں پہنچ گئی تھی۔

۱۹۲۱ء میں چیچنیا رشین فیڈریشن کا حصہ بنا اور ۱۹۲۴ء میں سوویت یونین کا۔ ۵ دسمبر ۱۹۳۶ء کو چیچن اور انگوش کے علاقے کو ملا کر اسے چیچن انگوشیا کا نام دے کر خود مختار جمہوریہ بنا دیا گیا۔ ۱۹۴۲ء میں جب جرمن فوجیں دامن کوہ قاف تک پہنچ گئیں تو یہاں کے لوگوں نے اپنی آزادی کے لیے جرمنوں سے بھرپور تعاون کیا۔ بدقسمتی سے جرمنوں کو شکست ہوگئی اور روس اس علاقے میں اپنا اقتدار بحال کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جمہوریہ توڑ دی گئی اور جرمنوں کی مدد کا بدلہ روس نے یہاں کی آبادی سے اس طرح لیا کہ چیچنیا کے لاکھوں باشندوں کو سنٹرل ایشیا اور دوسرے علاقوں میں جلاوطن کر دیا۔ بے شمار افراد راستے ہی میں بھوک، سردی اور بیماریوں سے دم توڑ گئے۔ جنوری ۱۹۵۷ء کو جلاوطن باشندوں کو وطن واپس آنے کی اجازت ملی اور جمہوریہ دوبارہ قائم کی گئی۔ یکم نومبر ۱۹۹۱ء کو چیچنیا نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ ۱۹۹۲ء میں انگوش قبائل نے چیچن انگوشیا سے الگ ہو کر رشین فیڈریشن میں شمولیت اختیار کر لی۔ چیچنیا کی آبادی تیرہ لاکھ ہے۔ ۹۸ فیصد حنفی مسلمان ہیں۔ (۴۰)

## چیچنیا میں روسی مداخلت

یکم نومبر ۱۹۹۱ء کو چیچنیا نے آزادی کا اعلان کیا۔ یہ پہلی ریاست تھی جس نے سابق سوویت یونین میں آزادی کا اعلان کیا۔ اس اعلانِ آزادی میں چیچنیا کی ساری آبادی شامل تھی۔ کئی مہینے جلسے ہوتے اور جلوس

سے رہے اور ہر شاہراہ پر ذکر کی صفیں قائم ہوئیں۔ ذکر باللہ اعلانیہ کیا گیا اور گروزنی میں قائم کمیونسٹ ہیڈ کوارٹر کے سامنے علمائے دین اور ان کے پیروکار دھرنا مار کر بیٹھے رہے۔ ذکر اور نماز کی محفلیں قائم کی گئیں اور تحریک کو کامیاب بنانے کی اجتماعی دعائیں اور صدقات کی تقسیم کی رسومات بھی ادا کی گئیں۔ یہی رسومات گروزنی ایئر پورٹ پر بھی ادا کی گئیں۔ روس نے فوج کشی کی کوشش کی۔ ٹینکوں کی کئی یونٹیں بھیجی گئیں لیکن خانہ جنگی کے خطرے اور چیچنیا کے عوام کے عزم کو دیکھ کر گورباچوف نے ارادہ ترک کر دیا۔ چنانچہ یکم نومبر کو چیچنیا کی آزاد ریاست کا وجود عمل میں آیا جس کا سرکاری نام چیچن ری پبلک آف اچکرایہ ہے اور گروزنی صدر مقام ہے۔ روسی ایئر فورس کے سابق جنرل جوہر داؤد کو اس کا متفقہ صدر چنا گیا جنہوں نے قرآن پر حلف اُٹھا کر ایک نئے اسلامی ملک کی بنیاد رکھی۔

اس ریاست کا اپنا ایک آئین ہے جو جمہوریت اور شرکتِ اقتدار پر قائم ہے۔ تمام قوانین کی بنیاد اسلامی شریعت ہے۔ اسلام سرکاری مذہب ہے۔ جہاد ریاست کی سرکاری پالیسی ہے۔ مسلمانوں کا وجود جہاں خطرے میں ہو وہاں چیچنیا حکومت کی ذمّہ داری ہے کہ وہ ریاست کے وسائل مسلمانوں کے تحفظ کے لیے استعمال کرے۔ (۴۱)

## مسلم ممالک کا شرمناک روّیہ

شیشان (چیچنیا) کے اعلانِ آزادی کے بعد مسلم ممالک نے اس سے شرمناک روّیہ روا رکھا۔ حالانکہ روس سے آزاد ہونے والی وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں کے علاوہ عیسائی ریاستوں کو بھی اسلامی ممالک کے حکمرانوں نے ایک ہی سانس میں تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ امریکہ اور یورپ نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ شیشان کی آزادی کو تسلیم کرنے کی ہمت کوئی نہ کر سکا۔ اس لیے کہ شیشانی قیادت نے دوسری ریاستوں کی طرح روس کے پٹھو اور ایجنٹ کا کردار ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ عیسائی ریاست جارجیا کے صدر شیورڈ نادزے نے اسرائیل سے روابط بڑھائے۔ فوجی نوعیت کے معاہدے کیے۔ نو آزاد مسلم ریاستوں میں بھی اسرائیل نے نفوذ حاصل کر لیا۔ یہاں تک کہ قازقستان نے اپنا تمام ایٹمی سرمایہ امریکہ کے حوالے کر دیا

یہی وجہ ہے کہ وسط ایشیا کے حکمران اسلامی ممالک کے دورے کرتے ہیں تو انہیں خوش آمدید کہا جاتا ہے لیکن اسلام کے نام پر آزادی حاصل کرنے والی ریاست کے سربراہ کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دینا تو درکنار، اسلامی ممالک ان کے ملک کو تسلیم کرنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ صدر بننے کے بعد جوہر داؤد صرف ایک بار مکہ معظّمہ گئے جہاں انہوں نے عمرہ ادا کیا۔ یہ بھی ان کا غیر سرکاری دورہ تھا۔

## شیشان (چیچنیا) کا ایمان افروز کردار

عالم اسلام نے جس شیشان کے ساتھ بے حسی کا یہ روّیہ رکھا آزادی کے مختصر عرصے میں اب تک اس کا کردار بے حد شاندار رہا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

- آرمینیا کی عیسائی ریاست نے روسی فوجوں کی مدد سے آذربائی جان پر چڑھائی کی اور نگورنو کاراباخ پر قبضہ کرلیا تو آذری فوج کی کمر ٹوٹ گئی۔ اس وقت روسی فوجوں کو جو آرمینیا کی مدد کے لیے آئی ہوئی تھیں پیچھے دھکیلنے کے لیے افغان مجاہدین کے علاوہ شیشانی باشندوں نے آذربائی جان کے مسلمانوں کا ساتھ دیا اور نگورنو کاراباخ کے زیادہ تر علاقے پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔
- بوسنیا پر سرب جارحیت کے بعد شیشان کے صدر جوہر داؤد اور وزیر خارجہ یوسف شمس الدین نے سرائیوو کا دورہ کیا۔ ان کے ہمراہ ادویات سے بھرا ہوا ایک جہاز بھی تھا۔ یو این او نے اس جہاز کو اپنی تحویل میں لے لیا اور ادویات بوسنیائی عوام تک نہ پہنچنے دیں۔ اس پر صدر داؤد نے دھمکی دی کہ اگر یو این او نے ادویات بوسنیائی مسلمانوں کے حوالے نہ کیں تو اس کے نتائج خطرناک ہوں گے اور اگلی بار شیشان کے مجاہدین کو بوسنیا میں اتارا جائے گا۔ اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور یو این او نے ادویات بوسنیائی حکام کے حوالے کریں۔ (۴۲)

## تین سال تک روس کی خاموشی کے اسباب

جمہوریہ شیشان نے یکم نومبر ۱۹۹۱ء کو آزادی کا اعلان کیا تھا تب روس کی پارلیمنٹ نے یلسن کو مذاکرات اور ''پرامن ذرائع'' کو بروئے کار لاتے ہوئے معاملات طے کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کا یہ مطلب

ہیں کہ روسی قیادت قوت کا استعمال نہ کر کے اعلیٰ اخلاق کی مثال قائم کرنا چاہتی تھی۔ روس کے خیال میں قوت کے استعمال کے لیے وہ موقع اس کے لیے مناسب نہ تھا کہ اگر روسی فوجیں شیشان میں داخل ہو جاتیں تو قفقاز کی دوسری ریاستوں کے مسلمان بھی اُٹھ کھڑے ہوتے۔ بورس یلسن نے اس موقع پر کہا تھا:

''اگر ہم نے شیشان میں فوجی مداخلت کی تو پورا خطہ قفقاز ہمارے خلاف اُٹھ کھڑا ہوگا اور اتنی خون ریزی ہوگی کہ اس کے لیے کوئی بھی ہمیں معاف نہیں کرے گا۔''(۴۳)

اس خون ریزی سے بورس یلسن کی مراد صرف قفقازی مسلمانوں کا خون نہ تھا بلکہ روسی افواج کا بھی بے پناہ خون بہتا۔ ۱۸۷۷ء میں ایک بغاوت کو کچلنے کے لیے روس کے تین لاکھ فوجی قفقاز میں موت کے گھاٹ اُتر گئے تھے۔

روس کے مختلف شہروں میں قفقاز کے اڑھائی لاکھ مسلمانوں نے شیشان کی آزادی کی حمایت کی اور ہر قسم کے تعاون کے لیے آمادگی کا اظہار کر دیا تھا۔ اس وقت شیشان کے صدر جوہر داؤد نے روس کو دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا:

''اگر روس نے شیشان کے خلاف جنگ چھیڑی تو ہم اس جنگ کو ماسکو اور روس کے دوسرے شہروں کے اندر تک منتقل کر دیں گے جہاں حکومت کے وفادار ایک لاکھ تیس ہزار شیشانی باشندے موجود ہیں۔''

شیشان کے سوا قفقاز کی دوسری ریاستیں ابھی تک روس کے تسلّط میں ہیں۔ شیشان کو دیکھ کر وہاں بھی آزادی کی جدوجہد زور پکڑنے لگی تھی۔ انہیں شیشان کے صدر جوہر موسیٰ داؤد کی مکمل آشیر باد حاصل تھی۔ ۱۹۹۳ء میں ان تمام ممالک کے سر کردہ مسلم رہنماؤں نے شیشان کے صدر مقام گروزنی میں صدر داؤد کی دعوت پر ایک مجلس منعقد کی جس میں طے پایا کہ شمالی قفقاز کی تمام ریاستوں کا ہیڈ کوارٹر شیشان کا دارالحکومت گروزنی ہوگا۔ اس مجلس میں شمالی قفقاز کی ان مسلم ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک اعلیٰ سطحی تنظیمی ڈھانچے کا قیام بھی عمل میں لایا گیا تھا۔

یہ کوششیں رنگ لا رہی تھیں اور ان مسلم ریاستوں کے باشندے بھی شیشان کی راہ پر چلنے کے لیے

قدم بڑھا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ حالات روس کی گرفت سے باہر ہو جاتے اور گروزنی روس سے آزادی حاصل کرنے والوں کا مرکز بن جاتا، شیشان پر حملہ کر کے اس خطرے کی جڑ ہی کاٹ دینے کی کوشش کی گئی۔

روس کی یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی کہ اندرونی خلفشار کے نتیجے میں شیشان خود بخود ہی پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آ گرے گا اس نے شیشانی حکومت کے باغیوں کو بے پناہ مالی وسائل مہیا کیے تا کہ وہ داؤد انتظامیہ کو گرا سکیں لیکن روس کو نظر آ رہا تھا کہ یہ باغی رہنما ایسی گڑ بڑ پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے جس سے صدر داؤد کی حکومت ختم کی جا سکے اور نہ لوگوں کو دوبارہ روسی فیڈریشن میں شمولیت کے لیے آمادہ کر سکیں گے۔ اس طریقے سے شیشان پر قبضہ کے منصوبے ناکام ہوتا دیکھ کر براہِ راست فوجی کاروائی کا فیصلہ کر لیا گیا۔

بحر اسود کی بندرگاہ ابخازیہ بھی شیشان کے قبضے میں تھی۔ اس بندرگاہ کے ذریعے ترکی اور یورپ تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ روس کو اس اہم بندرگاہ سے محروم ہونا کسی طرح بھی گوارا نہ تھا۔

سوویت یونین کے ٹوٹنے سے قبل روس تیل کے معاملے میں خود کفیل تصور کیا جاتا تھا لیکن تیل کی یہ دولت ۹۰ فیصد شیشان کی سرزمین سے حاصل کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ تیل کی صفائی کے بڑے کارخانے بھی شیشان ہی میں واقع ہیں۔ اس لیے روس کے دوسرے علاقوں سے نکلنے والے تیل کی صفائی بھی شیشان میں ہوتی تھی۔ اس حوالے سے اگر شیشان کو وسط ایشیا اور مشرقی یورپ کا ''کویت'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

شیشان کے اعلانِ آزادی کے بعد بھی روس اپنے تیل کی صفائی شیشان سے ہی کرواتا تھا۔ حکومتِ شیشان اس کے بدلے روس سے بھاری رقوم وصول کرتی تھی۔ ایک بار روس نے حکومت شیشان کو دھمکی دی کہ اگر اس نے روس سے آزادی کے فیصلے پر نظر ثانی نہ کی تو معاشی پابندی کے طور پر حکومتِ روس شیشان کے بجائے دوسری ریفائنریوں سے تیل صاف کرائے گی جس سے شیشان کو بھاری مالی نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ اس دھمکی کے بعد جوہر داؤد نے اینٹ کا جواب پتھر کے مصداق کہا کہ اگر روس ایسا کرے گا تو ہم روس کو کم قیمت پر اپنا تیل دینے کے بجائے عالمی منڈی میں مہنگے داموں فروخت کریں گے۔

یہ نقصانات روس کے لیے کچھ کم اہمیت کے حامل نہ تھے چنانچہ روس نے سونے کی چڑیا کو دوبارہ زیر

دام لانے کا فیصلہ کرلیا۔

مندرجہ بالا تمام وجوہ کے پیش نظر روس نے شیشان پر حملہ کر کے اس پر دوبارہ قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا۔
اب روس کی فوجیں شیشان پر حملہ آور ہوئیں تو اپنی سابقہ تاریخ اور روایات کے مطابق صدر داؤد کے مخالفین بھی روسی جارحیت کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے اس کے شانہ بشانہ کھڑے ہوئے اور یہ متحدہ قوت روسی فوجوں کا مقابلہ کرنے لگی۔ انیسویں صدی میں روس نے قفقاز پر حملہ کیا تو مختلف قبائل باہم دست و گریباں تھے لیکن جونہی بیرونی قوت نے ان کی آزادی پر شب خون مارا وہ متحد ہوگئے تھے اب بھی ایسا ہی ہوا۔
اطلاعات کے مطابق جب روسی افواج شیشان کی سرحد سے آگے بڑھیں تو نہتے عوام نے ٹینکوں کا راستہ روک کر آگے بڑھتی ہوئی افواج کو روک لیا۔ روس اپنی فضائی قوت کے اندھے استعمال کے ذریعے دارالحکومت گروزنی پر بمباری کر رہا تھا۔ صدارتی محل اس کا خصوصی ہدف تھا۔ کئی عمارتیں تہس نہس ہوگئی تھیں۔ سینکڑوں لوگ شہید ہوگئے تھے لیکن شیشانی عوام اور اس کے صدر جوہر داؤد کے عزم و حوصلے کی دیوار میں دراڑیں نہیں ڈالی جاسکیں۔

وزیر خارجہ یوسف شمس الدین نے اس عزم کا اظہار کیا کہ ہم اپنے آخری آدمی تک جدوجہد جاری رکھیں گے اور کبھی ہتھیار نہیں پھینکیں گے فتح کامل تک لڑیں گے۔

## روس معاہدہ

نصف برس تک مسلسل جنگ اور سخت خون خرابے کے بعد شیشان میں عارضی جنگ بندی ہوگئی. مذاکرات کے نتیجے میں معاہدہ عمل میں آیا جس کے تحت روس نے شیشان میں ریفرنڈم کرانے کی حامی بھرلی کہ استصواب میں عوام سے پوچھا جائے گا کہ آیا وہ روس کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا آزادی کے حق میں ہیں۔
شیشان کی مجاہد قیادت کے ساتھ ہونے والے روس کے معاہدے سے کمانڈر اسلام اور ان کے ساتھی خاصے مطمئن تھے۔ اس معاہدے کے نتیجے میں جنگ بندی ہوگئی اور اُجڑے ہوئے لوگ اپنے گھروں میں واپس آگئے اور روس نے پہلی بار شیشانی مجاہد قیادت کو تسلیم کیا۔ اس سے قبل تو وہ انہیں ''دہشت گرد'' اور ''چیچن

مافیا" کا نام دیتا تھا۔اس کے نتیجے میں مجاہدین کا مورال بلند ہوا اور ان کی یہ سوچ پختہ ہوئی کہ وہ مسلسل جدوجہد کے ذریعے اپنے اوپر کامیابیوں کے دروازے کھول سکتے ہیں اور روس کو جھکا کر اپنی شرائط منوا سکتے ہیں۔اس کے علاوہ روس کی زبردست یورش کے نتیجے میں مجاہد بکھر گئے تھے، جنگ بندی نے انہیں دوبارہ منظّم ہونے کا موقع فراہم کیا اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ منظّم ہو گئے۔شیشانی قیادت اس کامیابی کو عوام اور دین اسلام کی فتح قرار دیتی ہے۔(۴۴)

## جدوجہد آزادی

روس کی حکومت اور سیاسی قیادت کے لیے سر دست آزادی جیسی تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا مشکل تھا۔شمالی قفقاز جتنا بھی ہے، داغستان سے لے کر کرغیزیہ تک (داغستان، شیشان، انگوشیا، شمالی ایسٹونیا، ابخازیہ اور کرغیزیہ) یہ سب ریاستیں مسلمان ہیں۔شمالی ایسٹونیا کے علاوہ باقی تمام آبادی میں مسلمان ۸۰ سے ۹۰ فیصد تک ہیں۔ان مسلمانوں میں تہذیبی اعتبار سے بھی کوئی زیادہ فرق نہیں۔اس بات کے بہت ہی روشن امکانات موجود ہیں کہ جس طرح افغانستان کے جہاد کے نتیجے میں روس چودہ حصوں میں تقسیم ہوا اور مسلم امہ کا بہت بڑا علاقہ اور کروڑوں مسلمان آزادی کی فضا میں سانس لینے لگے اسی طرح جہاد شیشان کے نتیجے میں ان شاء اللہ قفقاز اور پھر تاتارستان کی ساری ریاستیں آزادی کی نعمت سے ہمکنار ہوں گی۔پھر روس کے لیے ممکن نہیں رہے گا کہ وہ آزادی اور بیداری کی لہر کے آگے بند باندھ سکے۔

آزادی کی اس جنگ میں شیشان کے عوام نے بے پناہ قربانیاں پیش کیں اور ابھی تک پیش کر رہے ہیں۔حالیہ معاہدے کے مطابق جولائی ۹۵ء سے جنگ بندی نافذ تھی لیکن شیشانی وزیر خارجہ جناب یوسف شمس الدین کے مطابق تین ماہ (جولائی تا ستمبر) کے عرصے میں جنگ بندی کے دوران بھی روسی کاروائیوں کے نتیجے میں مزید دس ہزار افراد شہید ہوئے۔چھ ستمبر کو جس طرح ہمارا یومِ دفاع ہوتا ہے اسی طرح شیشان کے لوگ بھی چھ ستمبر کو قومی دن مناتے ہیں۔۱۹۹۵ء میں ایک قصبے میں چھ ستمبر کی تقریب کے اجتماع پر روسی طیاروں نے بمباری کی جس میں کیمیائی ہتھیار بھی استعمال کیے گئے۔

عوام کی نسل کشی کا سلسلہ دوسرے علاقوں میں بھی جاری رہا۔ اس وحشیانہ بمباری سے گھر، بازار اور کارخانے تباہ و برباد ہو گئے۔ تعلیمی اداروں کو خصوصی طور پر نشانہ بنایا گیا۔ آزادی کے تین برسوں میں شیشانی حکومت نے دینی مدارس کا جال دیہات تک بچھا دیا تھا۔ گروزنی میں اسلامی یونیورسٹی قائم کر دی گئی جس میں قفقاز کی دوسری ریاستوں کے طلبہ کو بھی داخلہ دیا جاتا تھا۔ یہ یونیورسٹی اور دینی مدارس بھی جہازوں اور ٹینکوں کی بمباری سے پوری طرح تباہ ہو گئے۔

شیشان کے محاذ جہاد کا معاملہ افغانستان سے مختلف تھا۔ افغانستان میں باقاعدہ خط اوّل اور خط دوم تھا، دشمن فوجیں الگ الگ خطوط میں مقیم تھیں جب کہ یہاں ہر آبادی کے باہر روسیوں کی پوسٹیں قائم تھیں۔ مقامی لوگ اپنی آبادی میں ان کو داخل ہونے نہیں دیتے تھے۔ مسلمان اپنے گھروں میں مورچہ بند اور روسی ان سے چند سو میٹر دور اپنے مورچوں میں بیٹھے ہوتے تھے۔ روسیوں کے پاس بکتر بند گاڑیاں بھی تھیں اور جدید ترین اسلحہ بھی لیکن مجاہدین کے سامنے ان کی پیش نہیں جاتی تھی۔ وہ جب بھی آبادی کے اندر جانے کی کوشش کرتے شیشانیوں کی مزاحمت کے سامنے بے بس ہو کر لوٹ جاتے۔ مقامی لوگ روسی فوج سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہوتے تھے پوری جنگ کے دوران روسی افواج شیشان کے دو شہروں گروزنی اور گرمز کے علاوہ کسی شہر یا قصبے میں داخل ہونے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ تاہم بمباری کے ذریعے بے گناہ لوگوں کو انتقام کا نشانہ بنانے کا سلسلہ جاری رہا۔

اس شہر کی آبادی چار لاکھ تھی جس میں روسی آبادی بھی شامل تھی لیکن جنگ بندی کے وقت ایک لاکھ سے بھی کم افراد گروزنی شہر میں رہ رہے تھے۔ یہ بھی جنگ بندی کے بعد واپس آئے تھے۔ ۳۱ دسمبر یکم جنوری ۱۹۹۴ء کی درمیانی رات روسی فوج نے گروزنی شہر پر حملہ کیا تو بہت بڑی فوج کے علاوہ ۱۵۰۰ ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں اس حملے میں شامل تھیں۔ حملہ آوروں کو کتنی بڑی تباہی کا سامنا کرنا پڑا، اس کا حملہ سے پہلے انہوں نے تصور نہیں کیا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ بہت کم ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں بچ کر جا سکیں جب ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں شہر میں داخل ہو گئیں تو مجاہدین نے شہروں کو چاروں طرف سے بند کر دیا اور ان کے نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہ چھوڑا۔ گروزنی شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں ٹینک اور بھاری بھرکم بکتر بند گاڑیاں آسانی سے حرکت نہیں کر سکتی تھیں۔ اس طرح مجاہدین بڑی آسانی سے ان کو شکار کرتے رہے۔

طویل جنگ کے بعد روسی فوجیوں نے گروزنی پر کنٹرول حاصل کر لیا تو اپنی تباہ شدہ گاڑیوں اور ٹینکوں پر بھیڑیئے کے نشان بنائے، ان پر ''چیچن آرمی'' کے الفاظ لکھے اور انہیں واپس روس لے گئے۔ ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کے سامنے ان کو پیش کر کے دعویٰ کیا کہ یہ وہ شیشانیوں سے چھین کر لائے ہیں۔ اس پر ایک صحافی نے سوال کیا:

> ''اگر اتنی گاڑیاں اور ٹینک شیشانیوں کے پاس تھے تو پھر وہ روس سے بھی بڑی عسکری قوت کے مالک ہوئے پھر آپ نے گروزنی پر قبضہ کیسے کر لیا؟''

اس کا کوئی جواب ان کے سامنے نہ تھا۔(۴۵)

## نئی حکمتِ عملی

اہل شیشان نے جنگ آزادی کے لیے ایک بالکل نیا راستہ تلاش کیا۔ شیشانی کہتے تھے کہ اگر روس نے ان کی آزادی میں رکاوٹ ڈالی تو پھر وہ آزادی کی جنگ روس کے اندر جا کر لڑیں گے۔ ایک مغربی صحافی نے کمانڈر شامل سے سوال کیا: آپ لوگ کبھی روس کے اندر جا کر کاروائی کر پائیں گے؟ تو اس نے کہا: کیوں نہیں! ہم اب بھی یہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ صحافی نے پوچھا کہ: اب بھی فوج لے کر جاؤ گے اس میں پکڑے جانے کا امکان ہے۔ اس پر شامل نے کہا: ''اب فوج لے کر جانے کی ضرورت نہیں اب اگر روس نے ہمارے مطالبات تسلیم نہ کیے اور ہمیں آزادی نہ دی تو ہمارا صرف ایک آدمی ماسکو جائے گا۔ اس کے پاس آدھے کلو یورنیم کا بم ہوگا جو روسی دارالحکومت میں ایٹمی دھماکہ کرے گا۔ اس طرح ہمارا صرف ایک شخص اپنی قربانی دے گا اور پورے ماسکو کو ملبے کا ڈھیر بنا دے گا۔'' عام شیشانی بھی یہ کہتے سنائی دیتے تھے کہ اگر روس ہماری نسل کشی جاری رکھے گا اور ہمیں آزادی نہیں دے گا تو ہم ختم ہونے سے پہلے اسے بھی جینے کے قابل نہیں چھوڑیں گے۔''

۱۹۹۵ء میں سینٹ پیٹرز برگ کا ایک روسی جج شیشان آیا تو وائس آف امریکہ نے اس کا انٹرویو کیا۔ اپنے انٹرویو میں جج نے کہا: میں نے شیشانیوں سے زیادہ کسی قوم کو منظم بہادر اور مضبوط عقائد والا نہیں دیکھا۔

یہ بس طرح اپنی آسمانی کتاب (قرآن مجید) سے عقیدت رکھتے اور اس کے مطابق فیصلے کرتے ہیں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی جج نے ایک واقعہ سنایا جس سے وہ متاثر ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ شیشانی شخص پر منشیات کے جرم میں حد نافذ کی گئی اور اس کو کوڑے لگائے گئے۔ کوڑے لگائے جا چکے تو اس نے اُٹھ کر کوڑے لگانے والے سے معانقہ کیا اور اس کا شکر ادا کیا کہ تم نے سزا دے کر مجھے پاک کر دیا ہے۔ (۴۶)

روسی معاشرے میں شراب پانی کی طرح بہتی ہے اور قمار بازی معاشرت کا جزو لا ینفک ہے مگر شیشانی مجاہدین کے زیرِ کنٹرول علاقوں میں شراب کا نام ونشان تک نہیں، روسی بے حیائی میں یورپ سے کہیں آگے ہیں، سرزمینِ شیشان مدتوں سے روس کا حصہ ہے لیکن یہ حیا کا جزیرہ معلوم ہوتا ہے۔ روسی عورتیں نیم عریاں لباس اپنا چکی ہیں جبکہ شیشانی خواتین لمبی اسکرٹ پہنتی اور سر پر اسکارف باندھتی ہیں۔ مسلمان خواتین کی یہی نشانی ہے۔ اگر چہ چہرے کا پردہ اس طرح رائج نہیں جیسا کہ ہمارے ہاں تصوّر ہے لیکن ہمارے ہاں لباس کے حوالے سے بے حیائی کے جو مناظر دکھائی دیتے ہیں وہاں ناپید ہیں۔

پورے شیشان میں مساجد بکثرت ہیں جب کہ آذربائی جان میں مساجد خال خال ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم نے دورِ غلامی میں بھی اپنے دین وایمان کی شدت کے ساتھ حفاظت کی ہے۔ روس نے جب اپنے مقبوضہ اسلامی علاقوں میں اسلام کی تعلیم اور تبلیغ پر سخت پابندی لگا رکھی تھی تب بھی شیشانی اپنے بچوں کو اسلام کی خفیہ طور پر تعلیم دیتے رہے۔ حالانکہ تب جبر کا یہ عالم تھا کہ الف ب لکھا مل جاتا تو پورے گھرانے کو پکڑ لیا جاتا تھا لیکن شیشانیوں نے اپنے دین کو آنے والی نسلوں میں منتقل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ آج وہاں مساجد آباد ہیں، ان میں پانچ وقت اذان اور نماز ہوتی ہے۔ دینی مدارس ومکاتب موجود ہیں چونکہ روس میں تعلیم لازمی ہے اس لیے شیشان میں سو فیصد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔

شیشانی مسلمان مسلک کے اعتبار سے حنفی ہیں۔ اکثر لوگ تصوّف کے دو معروف سلسلوں نقشبندیہ اور قادریہ سے منسلک ہیں۔

جس طرح شیشانی مسلمان خواتین کی پہچان ان کے مخصوص لباس سے ہے، شیشانی مردوں کی پہچان ان کی داڑھیوں سے ہوتی ہے۔ مردوں کی اکثریت نے چھوٹی چھوٹی داڑھیاں رکھی ہوئی ہیں اور باقاعدگی

سے نماز پڑھتے ہیں۔ آزادی کے فوراً بعد انہوں نے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ پورے شیشان میں دینی مدارس کا جال بچھا دیا۔ گروزنی میں اعلیٰ درجے کی اسلامی یونیورسٹی بھی قائم ہوگئی۔ بدقسمتی سے بمباری اور جنگ سے یہ نظام متاثر ہوا لیکن دین کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔

## انوکھا جہاد

گوریلا جہاد کا جو تصور ہمارے ذہنوں میں ہے وہ یا تو افغانستان کا بنا ہوا ہے یا پھر کشمیر کے جہاد سے اخذ کیا ہوا ہے۔ اب اس میں کچھ پختگی آئی ہے۔ تاجکستان کی قدرے مختلف مثال بھی موجود ہے۔ لیکن شیشان کی سرزمین اور لوگ تینوں مختلف ہیں۔ یہ نئی حکمت عملی اپنانیوالی، نئے تجربے کرنے والی اور نئی روایات قائم کرنے والی قوم ہے۔

گوریلا جہاد کی عملی فیلڈ میں بھی ان کے انداز و اطوار ہمارے لیے اجنبی ہیں۔ مثلاً جب گروزنی پر ڈیڑھ لاکھ روسی فوج نے ۱۵۰۰ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کی مدد سے حملہ کیا تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ گروزنی میں موجود پانچ چھ ہزار مجاہدین اس وقت شہر خالی کر دیتے اور پہاڑوں میں جا کر گوریلا وار شروع کر دیتے لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ دس دس مجاہدین کے گروپ بنالیے اور روسی فوج اور ان کے ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں سے بھڑ گئے اور اتنی بڑی قوت کا وہ حال کر دیا کہ دنیا حیران رہ گئی۔

## ''ہم اللہ کے شیر ہیں''

شیشانیوں کا ترانہ ان کی دینی ذہنیت اور عزائم کا عکاس ہے۔

''ہم اللہ کے شیر ہیں، جہاد کریں گے، اللہ کے دین کو ساری دنیا میں پھیلا دیں گے'' ان کے ترانے میں ''لا الٰہ الا اللہ'' ایک بند کے طور پر شامل ہے۔ شیشان میں شریعت نافذ ہے۔ سب لوگ جہاد کے اسلامی جذبے سے سرشار ہیں۔ اس علاقے کو یورپ کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ پورے قفقاز کی یہ چابی ہے اس لیے مغرب کو شیشان کے مجاہدین سے پریشانی ہے اور یورپ کا مسیحی تمدن بھی ان سے خوفزدہ ہے۔ خوف یہ ہے کہ شیشان کے راسخ العقیدہ لوگوں کی ریاست ان کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ بنے گی۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ

شیشان روس کا اندرونی معاملہ ہے اور سارا مغرب اور سیکولر دنیا اہل شیشان کے قتل عام پر روس کی پیٹھ ٹھونکتے رہے ہیں۔ بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ اسلامی ممالک بھی مغرب اور امریکہ کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں ہیں۔

روسی صدر یلسن نے شیشان کے غیور، بہادر، بے خوف اور فولادی عزم رکھنے والے مجاہدین کے حوصلے پست کرنے اور ان کے جذبے ٹھنڈے کرنے کی کوششیں کیں اور مجاہدین کے اس ننگی جارحیت کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے مسلسل انکار پر جنگ بند کرنے کا حکم دے دیا مگر ان کے اس حکم کی جس طرح فوجی قیادت نے حکمِ عدولی کی وہ انتہائی شرمناک قرار دی جاسکتی ہے اور اس سے اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ صدر یلسن کا اپنے ہی فوجیوں پر کتنا کنٹرول ہے؟ مگر صدر یلسن نے اس بے عزتی کو برداشت کرلیا اور اپنی ''طاقت'' کے اظہار کا نیا طریقہ اختیار کیا کہ وزیر دفاع کی چھٹی کرادی اور مسلح افواج کی کمان خود سنبھال لی۔ (۴۷)

چیچنیا جسے روس کے صدر نے اپنے لیے تر نوالہ سمجھا وہ ان کے گلے میں کانٹے کی طرح پھنس گیا۔ پوری دنیا نے دیکھا کہ گروزنی پر جنگی حکمت عملی کے جدید ترین حربے اور اسلحے کی مدد سے قبضے کا دعویٰ ذلت اور رسوائی کا باعث ہی نہ بنا بلکہ گروزنی چونڈہ کے بعد ٹینکوں کا دوسرا بڑا قبرستان بن گیا۔ روسی فوجیوں کی نعشیں گروزنی کی سڑکوں پر اس طرح بکھر گئیں کہ مجاہدین کو انہیں روند کر ہی سڑکیں عبور کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

روسی فوج کی کوئی حکمت عملی کامیاب نہیں ہوئی۔ اقوامِ متحدہ، سلامتی کونسل اور انسانی حقوق کے علمبردار گونگے اور بہرے بنے رہے۔ اسی اثناء میں صدر جعفر داؤد نے تمام اسلامی ممالک سے مدد کی اپیل کی جس کا جواب انہیں یہ ملا ''ہم چیچنیا میں متحارب فریقوں کے درمیان جنگ کو روس کا اندرونی معاملہ سمجھتے ہیں۔''

مسلم ممالک کے اس افسوسناک روّیے اور مظاہرے کے باوجود صدر جعفر داؤد اور چیچن مجاہدین کے جذبۂ آزادی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ چنانچہ صدر جعفر داؤد نے روسیوں کے خلاف اپنی فیصلہ کن جنگ جاری رکھی اور ادھر روسی افواج ہر روز ایک نئے حربے اور طریقے سے چیچن مجاہدین پر حملہ آور ہوتی رہیں یہاں تک کہ شہری آبادی کو گولہ باری کا نشانہ بنایا گیا جس کے نتیجے میں سینکڑوں چیچن باشندے ہلاک ہوئے ایک ایسے ہی حملے کے نتیجے میں صدر جعفر داؤد بھی شہید ہو گئے۔ بعد کی رپورٹس میں بتایا گیا کہ صدر جعفر داؤد کو ایک

سازش کے تحت شہید کر دیا گیا جبکہ وہ اپنے مورچے میں مصروف جہاد تھے۔ صدر جعفر داؤد کی شہادت کے بعد سلیم خان کو ان کا جانشین مقرر کیا گیا جو پہلے ہی سے تحریک آزادی کے ہراول دستے میں شامل تھے۔ صدر بورس یلسن کا خیال تھا کہ اپنے قائد کے مارے جانے پر چیچن آزادی پسندوں کا جوش ماند پڑ جائے گا لیکن نئے لیڈر سلیم خان نے چیچن مجاہدین میں ایک نئی رُوح پھونک دی اور چیچن مجاہدین ایک نئے ولولے اور اُمنگ کے ساتھ پھر سے روسی افواج سے برسرِ پیکار ہو گئے۔ جب اس سے بھی تحریک آزادی کا زور کم ہوتا نظر نہ آیا تو بالآخر صدر بورس یلسن نے ہر ممکن طریقے سے بغاوت کچل دینے کا اعلان کر دیا۔

ایک بار پھر پوری طاقت اور بھرپور طریقے سے دارالحکومت گروزنی پر حملہ کیا گیا۔ بھاری توپ خانے سے شدید گولہ باری کی گئی یہاں تک کہ گروزنی کسی تباہ حال شہر میں تبدیل ہو گیا۔ جہاں مجاہدین کو اپنے بچاؤ کے لیے پہاڑوں میں جانا پڑا۔ روسیوں کی اس وحشیانہ بمباری کے باعث شہری آبادی کا تقریباً صفایا ہو گیا، مالی نقصان اس کے علاوہ تھا۔ دارالحکومت گروزنی میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ ذرائع ابلاغ اس پر چیخ اُٹھے لیکن اس کا اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کا ڈھنڈورہ پیٹنے والے امریکہ یا برطانیہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ رہے اسلامی مما لک تو وہ پہلے ہی اس طرف سے آنکھیں بند کیے پڑے تھے۔

اپنی اس وحشیانہ کاروائی اور طاقت کے بل بوتے پر روس نے جولائی ۱۹۹۶ء میں گروزنی پر قبضہ کر لیا۔ شہریوں کی ایک بڑی تعداد ہجرت کر گئی۔ مجاہدین کی طرف سے کچھ عرصے کے لیے خاموشی چھا گئی لیکن یہ خاموشی شکست کے غم میں نہ تھی بلکہ ان کی ایک نئی اور حیران کُن پیش قدمی کا پیش خیمہ تھی اور پھر ۶ اگست ۱۹۹۶ء کو مجاہدین نے ایک حیران کُن کاروائی کرتے ہوئے مقبوضہ گروزنی میں دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ہزاروں روسی فوجی مجاہدین کے محاصرے میں آ گئے اور تقریباً ۴۰۰ سے زائد ہلاک ہوئے۔ روسی فوجیوں کا ڈھیروں اسلحہ مجاہدین کے ہاتھ لگا جس سے مجاہدین نے مزید پیش رفت کی اور دارالحکومت گروزنی پر عملاً اور مستقل قبضہ کر لیا۔ روسی افواج کو گروزنی چھوڑ کر بھاگ جانا پڑا۔ اس شکست کے نتیجے میں صدر بورس یلسن کو سخت خفت اُٹھانی پڑی اور شدید تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔ بالآخر صدر بورس یلسن پر یہ واضح ہو گیا کہ طاقت اور اسلحہ کے بل بوتے پر چیچنیا کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور چیچنیا روس کے لیے ایک رستا ہوا ناسور ہے جس کا جتنا جلد ہو سکے حل

تلاش کیا جائے اور اس خونریز جنگ کا خاتمہ کیا جائے جس کے نتیجے میں ۸۰ ہزار سے زائد جانیں ہلاک ہو چکی ہیں۔

چنانچہ اس سلسلے میں روسی اور چیچن نمائندوں کے درمیان صلح کے بارے میں کئی ایک ملاقاتیں ہوئیں اور بالآخر ۲۰ ماہ کی خون ریزی اور جنگ وجدل کے بعد چیچن راہنما سلیم خان چیچن افواج کے کمانڈر ارسلان مسخادوف اور بورس یلسن کی سیکیورٹی کونسل کے سربراہ الیگزینڈر رلیبڈ کے درمیان صلح کے ایک سمجھوتے پر دستخط ہو گئے۔ جس کے مطابق اوّلاً جنگ بندی، دوم گروزنی شہر سے روسی افواج اور چیچن جانبازوں کا انخلا، سوم نئی علاقائی حکومت کے قیام کے لیے انتخابات، چہارم پانچ برس تک چیچنیا کی روس کے اندر خصوصی حیثیت اور پنجم پانچ سال بعد یعنی ۲۰۰۰ء میں چیچنیا کی کھلی آزادی کے بارے میں ریفرنڈم کا فیصلہ کیا گیا۔(۴۸)

## اسلامی حکومت کا قیام

ایک نئے معاہدے کے تحت جنگ بندی ہو گئی۔ شہر سے روسی افواج اور چیچن جانبازوں کا انخلاء مکمل ہو گیا اور انتخابات کا مرحلہ بھی طے ہو گیا جس میں سلیم خان، شامل بالسیوف اور ارسلان مسخادوف صدارتی اُمیدوار تھے۔ مسخادوف 68 فیصد سے بھی زیادہ ووٹ لے کر صدر منتخب ہو گئے۔ ۱۹۹۲ء میں انہوں نے روسی فوج سے استعفیٰ دے کر چیچن فوج میں شمولیت کا اعلان کیا تھا اور جلد ہی وہ ڈپٹی کمانڈر انچیف بن گئے تھے۔ روسی حملے کے بعد ساری جنگ مسخادوف کی زیرِ قیادت لڑی گئی۔ ارسلان مسخادوف کو چیچن عوام بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ روس سے آزادی کی ۲۰ ماہ پر مشتمل خونریز جنگ میں انہوں نے اپنی بے مثال جنگی اور گوریلا صلاحیتوں کا لوہا منوایا یہاں تک کہ دشمنوں سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا۔

ارسلان مسخادوف نے حلف کی تقریب کے دوران اللہ اکبر کے نعروں کی گونج میں کہا ہم اپنی ریاست کو آزاد کرا کے دم لیں گے اور ملک میں نظامِ حکمرانی اسلام کے اُصولوں کے مطابق ہوگا۔ انہوں نے روایات کے مطابق قرآنِ کریم پر حلف اُٹھایا۔ اس اعتبار سے چیچنیا یورپ کی پہلی اسلامی جمہوری ریاست قرار پائی ہے۔

# حواشی و حوالہ جات (باب چہارم)

(۱) محمد شفیق ملک، عصرِ حاضر کی جہادی تحریکیں، میٹرو پرنٹرز لاہور، ۱۹۹۸ء، ص: ۳۰۶

(۲) ایضاً، ص: ۳۰۸

(۳) ثروت صولت، ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۸ء، حصہ دوم، ص: ۵۲۰

(۴) سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، قوموں کے عروج و زوال پر علمی تحقیقات کے اثرات، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، ۱۹۹۲ء، ص: ۶۳

(۵) ایضاً، ص: ۸۸

(۶) افتخار احمد، اخوان المسلمون، المیزان پبلشرز، فیصل آباد، ۱۹۹۰ء، ص: ۳۰۶

(۷) امام محمد ابوعبداللہ اسمٰعیل البخاریؒ، بخاری شریف، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۱۹۷۵ء، کتاب الجہاد، ص: ۲۰۷

(۸) ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، حصہ دوم، ص: ۴۴۲

(۹) ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی، جدید ترکی میں اسلامی بیداری، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۹ء، ص: ۱۵۰

(۱۰) عصرِ حاضر کی جہادی تحریکیں، ص: ۳۴۴

(۱۱) جدید ترکی میں اسلامی بیداری، ص: ۱۶۵

(۱۲) سیّد اسعد گیلانی، اسلامی تحریکیں، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص: ۳۰

(۱۳) ثروت صولت، ترک اور ترکی، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص: ۲۸

(۱۴) تحریکِ اسلامی کے عالمی اثرات، خلیل احمد حامدی، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص: ۶۲

(۱۵) عصرِ حاضر کی جہادی تحریکیں، ص: ۳۲۰

(۱۶) ایضاً، ص: ۳۲۶

(۱۷) مرزا محمد الیاس، انقلابات الجزائر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص: ۴۰

(۱۸) مختصر تاریخ ملتِ اسلامیہ، حصہ چہارم، ص: ۱۹۸

(۱۹) مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، مجلس نشریات اسلام کراچی، ۱۹۸۰ء، ص: ۱۹۹

(۲۰) عصرِ حاضر کی جہادی تحریکیں، ص: ۳۳۵

(۲۱) انقلابات الجزائر، ص: ۳۶

(۲۲) ایضاً، ص: ۴۵

(۲۳) اسلامی تحریکیں، ص: ۱۸۰

(۲۴) انقلابات الجزائر، ص: ۵۶

(۲۵) ایضاً، ص: ۶۰

(۲۶) خلیل احمد حامدی، بوسنیا، جغرافیہ، تاریخ، داستان جہاد، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص: ۲۳۱

(۲۷) ایضاً، ص: ۲۳۴

(۲۸) ایضاً، ص: ۲۴۰

(۲۹) عصرِ حاضر کی جہادی تحریکیں، ص: ۲۳۵

(۳۰) ایضاً، ص: ۲۴۳

(۳۱) ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، حصہ دوم، ص: ۲۱۳

(۳۲) افتخار احمد، اخوان المسلمون، ص: ۳۱۲

(۳۳) ایضاً، ص: ۳۲۰

(۳۴) ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، حصہ سوم، ص: ۲۲۵

(۳۵) فیض احمد شہابی، مسلم دنیا، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص: ۱۸۵

(۳۶) عصرِ حاضر کی جہادی تحریکیں، ص: ۱۹۸

(۳۷) ایضاً،ص:۲۰۰

(۳۸) افتخار احمد، اخوان المسلمون، ص:۳۲۲

(۳۹) ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، حصہ سوم، ص:۲۳۵

(۴۰) عصرِ حاضر کی جہادی تحریکیں، ص:۲۵۴

(۴۱) ایضاً، ص:۲۵۵

(۴۲) ڈاکٹر سیّد محمد یونس، چیچنیا میں اسلام اور مسلمان، ایچ وائی پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص:۶۶

(۴۳) عصرِ حاضر کی جہادی تحریکیں، ص:۲۵۷

(۴۴) ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، حصہ سوم، ص:۲۵۰

(۴۵) چیچنیا میں اسلام اور مسلمان، ص:۱۰۴

(۴۶) ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، حصہ دوم، ص:۲۰۶

(۴۷) فیض احمد شہابی، مشرقی یورپ میں مسلمانوں کا عروج و زوال، ادارہ معارف اسلامی، لاہور ۱۹۸۷ء، ص:۱۳۷

(۴۸) عصرِ حاضر کی جہادی تحریکیں، ص:۲۶۷

# باب پنجم

# نامور قائدین اور ان کی داعیانہ جدوجہد کے اثرات

فصل اوّل : ڈاکٹر حسن ترابی

فصل دوم : شیخ حسن البناء

فصل سوم : ڈاکٹر اسمٰعیل راجی الفاروقی

فصل چہارم : عبدالقادر عودہ شہید

فصل پنجم : مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

فصل ششم : سیّد قطب شہیدؒ

فصل ہفتم : شیخ احمد یٰسین

فصل ہشتم : ڈاکٹر نجم الدین اربکان

فصل نہم : عالیجاہ علی عزت بیگوبج

ضمیمہ ۔ تحریکات دیوبند و بریلوی اور انکے نامور قائدین۔

## باب پنجم

# نامور قائدین اور ان کی داعیانہ جدوجہد کے اثرات

## فصل اوّل

## ڈاکٹر حسن عبداللہ الترابی

حسن عبداللہ الترابی ۱۹۳۲ء میں مشرقی سوڈان کے ایک علاقہ کسالہ کے ایک نہایت ہی معزز دین دار علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یہ گھرانہ پورے علاقہ میں اپنی خاندانی شرافت، وضع داری، قدامت پسندی اور دینی معاملات میں اپنے ٹھوس اور پائیدار موقف کے سبب نہایت ممتاز گنا جاتا تھا۔ علاقہ کے عوام میں آپ کا خاندان مفتیوں اور صوفیوں کے نام سے مشہور تھا۔ آپ کے والد شیخ عبداللہ الترابی اسلامی قانون اور فقہ کے ممتاز عالم اور صوبے کی سب سے بڑی عدالت کے جج تھے۔ رزق حلال، حق گوئی و بیباکی آپ کی شخصیت کا خاص وصف تھا۔ جس کے اثرات حسن الترابی کی شخصیت پر بھی پڑے اور جنہیں آج بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ عبداللہ نے اپنے بیٹے کی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ ابتداء میں خود علومِ دینیہ پڑھاتے تھے لیکن جیسے ہی عدلیہ میں آپ کی ذمّہ داریوں میں اضافہ ہوا اور مصروفیات بڑھیں آپ نے حسن کو وقت دینا چھوڑ دیا۔ اس کمی کو آپ نے مختلف اساتذہ کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کی البتہ چھٹیوں میں آپ اپنے بیٹے کی تربیت پر خاص توجہ دیتے۔ گھر پر حسن الترابی نے عربی ادب، فقہ، علم الکلام، تفسیر اور حدیث وغیرہ علوم پڑھے جبکہ زمانے کے رواج کے مطابق آپ نے مغربی علوم کی تعلیم مختلف سرکاری اداروں سے حاصل کی۔ فارغ اوقات میں آپ کی والدہ بھی آپ کی تربیت میں حصہ لیتی رہیں۔ آپ کی شخصیت میں جو گہرا دینی رنگ نظر آتا ہے یہ والدین کی کوششوں کا ثمر ہے۔ ۱۹۵۳ء میں آپ خرطوم یونیورسٹی کے شعبہ قانون کے طالب علم تھے کہ اخوانی لیڈروں حسن البناء شہید، سیّد قطب اور عبدالقادر عودہ کی تحریریں نظر سے گزریں۔ ان دانشوروں کی تحریروں کا آپ نے

گہرا اثر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی شخصیت بنانے میں والدین کے علاوہ پہلے مرحلے پر اخوانی لٹریچر نے اور بعد میں مولانا مودودیؒ کی تحریروں نے مرکزی کردار ادا کیا۔ اس بات کا اعتراف آپ متعدد مرتبہ اپنے انٹرویوز میں بھی کر چکے ہیں۔ جس زمانے میں آپ اخوانی دانشوروں کی تحریریں پڑھ رہے تھے اس وقت مصر میں اخوان جمال عبدالناصر چپقلش کا آغاز ہو چکا تھا۔

سوڈان کے اخوانی لیڈران حالات سے کافی برگشتہ نظر آ رہے تھے۔ ۱۹۵۵ء میں آپ نے قانون کا امتحان پاس کیا، اسی سال آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے برطانیہ چلے گئے۔ برطانیہ میں قیام کے دوران آپ نے ''سوڈانی سٹوڈنٹس یونین'' نامی ایک تنظیم کی بنیاد رکھی۔ آپ اس تنظیم کے جنرل سیکریٹری چنے گئے۔ یونین کے پلیٹ فارم پر آپ نے سوڈانی طالب علموں میں سیاسی شعور بیدار کرنے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ برطانوی تعلیمی اداروں میں آپ کا وسیع پیمانے پر تعارف ہوا بلکہ سوڈانی نیشنلزم کے فروغ کے لیے مضبوط بنیادیں بھی فراہم ہوئیں۔ ۱۹۵۷ء میں آپ برطانیہ سے ایل ایل بی کی ڈگری لے کر واپس لوٹے اور خرطوم یونیورسٹی کے شعبۂ قانون سے وابستہ ہو گئے۔ دو سال بعد آپ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے فرانس چلے گئے۔ فرانس کی سویورن یونیورسٹی سے ۱۹۶۳ء میں آپ نے دستوری قانون کے ایک شعبہ (Comparative Public Law) میں ''ہنگامی قانون سازی'' پر مقالہ تحریر کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور وطن واپس لوٹے۔ حکومت نے آپ کی غیر معمولی صلاحیتوں اور اعلیٰ تعلیم کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اسی شعبہ کا ڈین مقرر کر دیا۔ سوڈان میں ان دنوں جنرل ابراہیم عبود کی حکومت تھی جو وزیر اعظم عبداللہ الخلیل کے ساتھ سازش کر کے اقتدار پر آیا تھا۔ عوام میں اس کے خلاف نفرت کے جذبات پائے جاتے تھے۔ جنرل عبود کی پشت پر اگرچہ فوج کی مجرد طاقت موجود تھی اور یوں نظر آتا تھا کہ شاید اس سفید ہاتھی کو کوئی چت نہ کر سکے۔ حسن الترابی اخوان المسلمون سے ذہنی اور فکری وابستگی کے باوجود ابھی عملی سیاست میں سرگرم نہیں ہوئے تھے۔ آپ کی توجہ طلبہ کو منظّم کرنے پر لگی ہوئی تھی۔ جس بات نے آپ کو یونیورسٹی کی پُرسکون علمی ماحول سے نکال کر سیاست کی ہنگامہ خیز زندگی میں دھکیلا وہ جنوبی سوڈان کا مسئلہ تھا۔ جو حکمرانوں کی حماقتوں کے سبب بتدریج اُلجھتا جا رہا تھا۔ جنوبی سوڈان کے عیسائی بار بار صوبئی خودمختاری جیسے نازک مسئلہ کو اُٹھا رہے تھے۔

حکومت اس مسئلے کا سیاسی حل ڈھونڈنے کے بجائے تحریک کو تشدد سے دبانا چاہتی تھی۔ جنرل ابراہیم عبود اگرچہ جنوبی سوڈان کے مسئلہ کے حل کے لیے نت نئی تجاویز پر عمل کر رہا تھا لیکن حالات بتدریج خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ حالات کی بہتری کے لیے حکومت نے ایک مذاکرے کا انتظام کیا جس میں سوڈانی دانشوروں اور سیاست دانوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ حسن الترابی کو شعبہ قانون کے ڈین ہونے کی حیثیت سے مذاکرے میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ حکومت کا خیال تھا کہ یونیورسٹی کا اساتذہ اور دیگر دانشور جنوبی سوڈان ایک مسئلہ پر حکومت کے موقف کی تائید کریں گے لیکن یہاں تو بساط ہی اُلٹ گئی۔ حسن الترابی نے اپنی تقریر میں سوڈان میں خانہ جنگی ختم کرانے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ اگر چند ایک اصلاحات نافذ کر دی جائیں تو جنوبی سوڈان کا مسئلہ بخوبی حل ہو سکتا ہے۔ یہ اصلاحات یوں تھی:

- عوام کے بنیادی حقوق بحال کیے جائیں۔
- تحریر و تقریر پر ناروا پابندیاں ختم کی جائیں۔
- سیاسی مقدمات واپس لیے جائیں اور فوجی عقوبت خانوں میں تفتیش کا طریقہ ختم کیا جائے۔
- منتخب پارلیمنٹ کا قیام عمل میں لایا جائے۔
- جنوبی سوڈان کو خود مختاری دی جائے. صوبوں کے پاس تعلیم، صحت، پولیس اور سماجی بہبود کے محکمے ہوں۔
- جنوبی سوڈان کو مزید فنڈز مہیا کیے جائیں۔

تقریر کے آخر میں آپ نے جنوبی سوڈان کے مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ:

> ”جنوبی سوڈان کا مسئلہ بحران (Crises) سے کسی طرح بھی جدا نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ اُٹھانا چاہیے کہ فوج اقتدار سے الگ ہو جائے۔“(۱)

آپ کی تقریر جنرل ابراہیم عبود کے خلاف بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی۔ اس سے ان عناصر کو تقویت ملی جو فوجی حکومت کو ملک کے مفاد کے لیے زہر قاتل سمجھتے تھے۔ جنرل عبود کی ”بدقسمتی“ قوم نے اسی سال اسے

حکومت چھوڑنے پر مجبور کردیا اور یوں سوڈان میں پارلیمانی زندگی کا دوبارہ آغاز ہوا۔ انہی دنوں آپ کی کوششوں سے دائیں بازو کی اسلامی تحریکوں کا ایک نیا محاذ ''اسلامک چارٹر پارٹی'' کے نام سے وجود میں آیا۔ محاذ کے قیام کا مقصد سوڈان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے منظم انداز سے جدوجہد کرتا تھا۔ عبود کے حکومت چھوڑنے پر عبوری دور کے لیے خاتم الحلیفہ کو صدر بنایا گیا۔ خاتم الحلیفہ نے وعدے کے مطابق انتخابات منعقد کرا کے اقتدار یونینسٹ اور امہ پارٹی کے نمائندوں محمد احمد المحجوب (وزیر اعظم) اور اسماعیل الازہری (صدر) کے سپرد کیا۔ حسن الترابی ان انتخابات میں گریجویٹس کی نشست پر دو سال کے لیے دستور ساز اسمبلی کے لیے رکن منتخب ہوئے۔ دستوریہ کی کارکردگی غیر تسلی بخش ہونے کے سبب اس کی مدت میں مزید ایک سال کا اضافہ کردیا گیا۔ اس طرح آپ تین سال تک دستوریہ کے رکن رہے۔ ۱۹۶۹ء میں جعفر النمیری کے انقلاب سے پہلے درمیانی مدت کے انتخابات میں آپ نے حصہ لیا۔ لیکن شکست کھا گئے۔ چند ماہ کے بعد جعفر النمیری نے ماسکو نواز کمیونسٹوں کے ساتھ مل کر اسماعیل الازہری کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔ دیگر بڑے بڑے لیڈروں کے ہمراہ آپ کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ ۱۹۶۹ء کے سوشلسٹ سے لے کر لیفٹیننٹ جنرل عمر حسن احمد البشیر کے انقلاب تک آپ پانچ مرتبہ گرفتار کیے گئے۔ مارچ ۱۹۷۶ء میں آپ کو جیل میں دل کا دورہ پڑا اس سے آپ کی صحت اس حد تک گر گئی کہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں یہ دورہ جان لیوا ہی ثابت نہ ہو۔ جیل میں آپ کی بیماری کا سن کر اندرون اور بیرونِ ملک آپ کے پرستاروں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ مراکش کے مشہور عالم دین، دانشور اور سیاسی لیڈر علامہ علال الفاسی نے جعفر النمیری کو ایک خط تحریر کیا جس میں اس پر زور دیا گیا کہ حسن الترابی کی صحت کی حفاظت کی جائے۔ ادھر خرطوم یونیورسٹی کے طلبہ نے آپ کے حق میں مظاہرے شروع کردیے جو دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک میں پھیل گئے۔ نتیجتاً حکومت آپ کو بہتر سہولتیں فراہم کرنے پر مجبور ہوگئی جیل جانے سے پہلے آپ انگریزی، عربی اور فرانسیسی زبانیں جانتے تھے۔ قید کے دوران آپ نے قرآن مجید حفظ کرنے کے علاوہ جرمن زبان پر بھی عبور حاصل کیا۔ آپ آٹھ کتب کے مصنف ہیں۔ آپ کی کتاب ''تجدید اُصول فقہ'' ماہرین قانون سے خراجِ تحسین وصول کرچکی ہے۔ آپ کی خانگی زندگی کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ آپ کے کٹر مخالف صادق المہدی کی بہن آپ کی بیوی ہے۔ ۱۹۷۶ء میں کمیونسٹوں نے

نمیری کا تختہ الٹنے کی ناکام کوشش کی تو نمیری اس نتیجہ پر پہنچا کہ بڑی طاقتوں روس اور امریکہ کی طرف جھکاؤ سے سیاسی بے چینی ختم نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے عوام کے حقیقی نمائندوں کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ جعفر النمیری نے ''الانصار'' اور ''اسلامک چارٹر پارٹی'' سے مصالحت کرنے کا فیصلہ کیا۔ فوراً ہی صادق المہدی اور حسن الترابی کو جیل سے نکال کر مذاکرات کی دعوت دی۔ مذاکرات سے پہلے حسن الترابی، صادق المہدی اور دیگر اپوزیشن لیڈروں نے باہمی مشاورت سے ''سوڈانی نیشنل فرنٹ'' تشکیل دیا اور یہ طے پایا کہ اگر جعفر النمیری ان کے چند ایک مطالبات تسلیم کرلے تو اس کے ساتھ تعاون کیا جاسکتا ہے۔ یہ مطالبات کچھ یوں تھے:

- ۱۹۶۵ء کے دستور کے اصل کردار کو بحال کر کے شریعت کو ملک کا قانون قرار دیا جائے۔
- سوڈان کو بتدریج اسلامی مملکت بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔
- نمائندہ اداروں کو تشکیل دیا جائے۔
- بنیادی حقوق بحال کیے جائیں۔
- تحریر و تقریر کی آزادی دی جائے۔

طویل مذاکرات کے بعد جعفر النمیری نے سوڈانی نیشنل فرنٹ کے مطالبات مان لیے۔ نتیجتاً فرنٹ نے جعفر النمیری کی حمایت کا اعلان کر دیا اس اعلان کے بعد جعفر النمیری نے فرنٹ کے متعدد ارکان کو اپنی کابینہ میں شامل کیا۔ ڈاکٹر حسن الترابی وزیر قانون بنائے گئے۔ مارچ ۱۹۸۰ء میں انہیں سیاسی بیورو کا ممبر اور مشیر اُمور خارجہ بنا دیا گیا۔ اس کے علاوہ ملکی قوانین کو اسلامی قوانین میں ڈھالنے کے لیے تین اخوانیوں ڈاکٹر حسن عبداللہ المغربی، ڈاکٹر غفار شیخ اور شیخ علی عبدالرحمٰن کو نفاذ شریعت کمیٹی کے رُکن نامزد کیا گیا۔ تین سال سے زائد عرصہ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر شب و روز محنت کر کے ملکی قوانین کو اسلامی قوانین کے قالب میں ڈھالتے رہے۔

مولانا خلیل احمد حامدی کے الفاظ میں:

''ڈاکٹر حسن الترابی نے تاریخ جدید کا یہ عظیم الشان کارنامہ سرانجام دینے کے لیے

اٹارنی جنرل کے دفتر میں علماء اور قانون دانوں کی ایک ٹیم بھرتی کی۔ جنھوں نے تمام مذاہب کی فقہی کتابوں کو لفظ بہ لفظ پڑھا، جدید سوڈانی قوانین کا مطالعہ کیا اور پھر ترمیمی مسوّدے تیار کیے اور آخر کار اپنے حاصل مطالعہ اور حاصل محنت کو قانونی دفعات کی شکل میں ڈھال کر نمیری صاحب کو پیش کر دیا۔ ڈاکٹر حسن الترابی کو یہ خوب معلوم تھا کہ اگر قوانین مجلس الشعبؑ (پیپلز کونسل) کو پیش کیے جائیں گے تو وہ اسے مسترد کر دے گی۔"(۲)

یاد رہے کہ سوڈان میں نفاذ اسلام کے عمل سے پہلے (۱۹۸۲ء) ہر چھ گھنٹے بعد ڈاکہ پڑتا تھا اور ہر ۲ گھنٹے بعد بدکاری کا ایک کیس رجسٹر ہوتا تھا۔ ہر ۶۲ منٹ پر ایک قتل یا قاتلانہ حملہ ہوتا تھا۔ ہر ۶۶ منٹ بعد ٹھگی کا ایک کیس ہوتا تھا، عدالتوں میں پچاس ہزار مقدمات زیر سماعت تھے اور تیرہ ہزار اپیلیں سماعت طلب تھیں۔ تیرہ ہزار قیدیوں میں چار ہزار عادی مجرم تھے۔ نفاذ اسلام (۲۲ ستمبر ۱۹۸۳ء) کے بعد ان تمام قیدیوں کو رہا کر دیا گیا تھا اس کے بعد کے سالوں میں سوڈان میں جرائم میں چالیس فیصد کمی واقع ہوئی۔ اخوان المسلمون کا جعفر النمیری کے ساتھ تعاون جاری تھا کہ اچانک ۱۹۸۵ء کے اوائل میں ڈاکٹر حسن الترابی سمیت اخوان المسلمون کے متعدد رہنما گرفتار کر لیے گئے۔ اسلامک چارٹر پارٹی پر پابندی لگا دی گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ اخوان المسلمون نے حکومت سے تعاون کے وقت حکمتِ عملی یہ تیار کی کہ جعفر النمیری کے نفاذ اسلام کے پروگرام کی اتنی بھرپور انداز سے حوصلہ افزائی کی جائے کہ اس کے لیے واپسی کے تمام راستے بند ہو جائیں اور وہ اس پر مستحکم طریقہ سے کاربند ہو سکے اور اگر کسی وجہ سے اخوان کی موجودہ ٹیم حکومت میں نہ بھی رہے تو کم از کم بہتر تعلقات کو برقرار ضرور رکھا جائے۔ ۱۹۸۳ء میں جعفر النمیری نے ڈاکٹر حسن الترابی کے مشورے سے اسلامی قوانین کے نفاذ کا اعلان کیا۔ ڈاکٹر حسن الترابی نے انہی دنوں حکومت کی مرضی اور تعاون سے خرطوم میں اسلامی کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس میں بارہ لاکھ افراد نے شرکت کی۔ اتنی بڑی تعداد میں عوام کی شرکت حسن الترابی اور ان کے ساتھیوں کے لیے امتحان گاہ بن گئی۔ اسلام دشمن طاقتوں نے ڈاکٹر حسن الترابی کے قدم آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر جعفر النمیری کے کان بھرنے شروع کر دیے اور آزادانہ یہ کہنا شروع کیا کہ

احوان دوسری بڑی طاقت بنتے جا رہے ہیں، اس سے النمیری کے اندر کا ڈکٹیٹر جاگ اُٹھا۔ چنانچہ کانفرنس کے کچھ عرصہ بعد النمیری نے ایک مرحلہ وار پروگرام کے تحت اخوان کو اہم مناصب سے الگ کرنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر حسن الترابی پہلے مشیر دفاع بنائے گئے اور پھر ایک غیر معروف عہدے پر فائز کیا گیا۔ آپ نے اس نئے عہدے پر آ کر سرکاری ملازمین کے لیے نئے پے اسکیل مرتب کر کے ان میں پائی جانے والی بے چینی کو دور کیا۔ اچانک ۱۰ مارچ ۱۹۸۵ء کو آپ کو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تمام عہدوں سے الگ کر کے پابند سلاسل کر دیا گیا۔ یہ گرفتاریاں نہ ہی تو اچانک تھیں اور نہ ہی غیر متوقع۔ آپ بہت پہلے اس جانب اشارہ کر چکے تھے۔ نفاذ اسلام کے پروگرام کے اعلان کے بعد صحافیوں کے ایک گروپ سے باتیں کرتے ہوئے آپ نے کہا تھا کہ:

> ''ہوسکتا ہے کہ کسی روز آپ آئیں اور مجھے اس سرکاری دفتر میں نہ پائیں لیکن اگر میں حکومت میں نہ بھی رہا تب بھی اخوان اور حکومت کے درمیان تعلقات میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ ہم نے اس حکومت سے بہت سوچ سمجھ کر تعاون کا فیصلہ کیا ہے اگر حکومت کو باہر سے گرانے کی کوشش کی گئی تو ملک شدید انتشار اور طوائف الملوکی کا شکار ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کے خلاف جب بھی کوئی تحریک اُٹھتی ہے تو ہم اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ صدر صاحب ہماری پالیسی خوب سمجھتے ہیں جب تک ہم حکومت کے ساتھ ہیں حکومت کو کوئی نہیں ہلا سکتا۔ سوڈان میں کوئی تغیر اخوان کی مرضی کے بغیر نہیں آ سکتا۔'' (۳)

حسن الترابی نے ۱۹۸۳ء میں صحافیوں کے سامنے جن خدشات کا اظہار کیا ہے وہ حرف بحرف درست ثابت ہوئے ادھر حکومت سے نکالے گئے۔ ادھر جنرل عبدالرحمٰن سوار الذہب نے جعفر النمیری کا تختہ اُلٹ دیا۔ النمیری اس وقت امریکہ کے دورے پر تھا، نئے سربراہ نے ڈاکٹر حسن الترابی سمیت تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا اور انتخابات کے انعقاد کے بعد اقتدار منتخب نمائندوں کے سپرد کرنے کا اعلان کیا۔ ڈاکٹر حسن الترابی نے جیل سے باہر آتے ہی دائیں بازو کی دینی عناصر کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کا کام شروع کیا۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۸۵ء میں آپ نے خرطوم میں ایک بہت بڑی کانفرنس منعقد کی۔ جس میں دو ہزار سے زائد نمائندوں

نے شرکت کی۔ کانفرنس کے اختتام پر دائیں بازو کے عناصر پر مشتمل نیشنل اسلامک فرنٹ (National Islamic Front) کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ آپ کو متفقہ طور پر فرنٹ کا سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے آپ نے ۱۴ تا ۱۶ جنوری ۱۹۸۸ء خرطوم میں فرنٹ کی دوسری کانفرنس بلائی۔ جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ جنوبی سوڈان سے پہلی مرتبہ تین سو ستر خواتین اور مردوں پر مشتمل ایک نمائندہ وفد بھی کانفرنس میں شریک ہوا۔ جبکہ آپ کی خصوصی دعوت پر سعودی عرب، متحدہ عرب جمہوریہ، عراق، کویت، الجزائر، شام، چاڈ، شمالی یمن، مارلیشش، نائیجریا، تیونس، ملائشیا، اردن اور پاکستان کے دو سو سے زائد مندوبین نے شرکت کی۔ ڈاکٹر حسن الترابی نے کانفرنس کے کھلے اجلاس میں ایک سالہ کارکردگی کا جائزہ پیش کیا۔ اس میں مرکزی انتظامیہ اور صوبائی شاخوں کی کارکردگی، سوڈان کی خارجہ پالیسی کے بارے میں فرنٹ کا موقف، قومی سلامتی اور ملکی اقتصادیات پر بعض وضاحتیں شامل تھیں۔

کانفرنس کے اختتام پر نئے سیکرٹری جنرل اور تین سو اکسٹھ ارکان پر مشتمل مجلس شوریٰ کے انتخابات منعقد ہوئے۔ آپ دوبارہ تین سال کے لیے سیکرٹری جنرل منتخب کر لیے گئے۔ ۱۹۸۶ء میں جنرل سوار الذہب نے وعدے کے مطابق انتخابات منعقد کرائے۔ ڈاکٹر حسن الترابی ان انتخابات میں شکست کھا گئے۔ آپ کی شکست کا واحد سبب مخالف سیاسی عناصر کا ایک اُمیدوار پر متفق ہونا تھا۔ نیشنل اسلامک فرنٹ نے مجموعی طور پر ۵۳ نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ ۳۰۱ کے ایوان میں سی بھی سیاسی جماعت کے پاس حکومت بنانے کے لیے مطلوبہ تعداد نہیں تھی۔

اس لیے مخلوط حکومت کے قیام کا امکان تھا۔ ڈاکٹر حسن الترابی نے انتخابات کے فوراً ہی بعد یہ اعلان کیا کہ جس حکومت میں کمیونسٹ شریک ہوں گے اخوان اس میں شامل نہیں ہوں گے اور جو پارٹی اسلامی قوانین ختم کرنا چاہے گی اس کے ساتھ ہمارا تعاون ممکن نہیں ہوگا۔ امہ پارٹی کے لیڈر صادق المہدی نے ابتداء میں ڈیموکریٹک یونینسٹ پارٹی کے تعاون سے مخلوط حکومت تشکیل دی لیکن یہ حکومت زیادہ دیر نہ چل سکی۔ صادق المہدی نے اب کی دفعہ تینوں بڑی جماعتوں یعنی امہ یونینسٹ اور فرنٹ پر مشتمل مخلوط حکومت تشکیل دی۔ ڈاکٹر حسن الترابی وزیر عدل بنائے گئے۔ فرنٹ کی طرف سے شمولیت اسی ایک وعدے پر کی گئی تھی کہ

جعفر النمیری کے دور میں نفاذ اسلام کے لیے جو قوانین بنائے گئے تھے انہیں ختم نہیں کیا جائے گا بلکہ انہیں مزید بہتر بنایا جائے گا۔ صادق المہدی حکومت بنانے کے بعد اپنے وعدے سے منحرف ہوتا نظر آرہا تھا کہ ڈاکٹر حسن الترابی نے ترکی میں اسلامک کونسل کی کانفرنس کے موقع پر غیر ملکی مندوبین کی موجودگی میں صادق المہدی سے مذاکرات کیے چنانچہ دونوں رہنما اس بات پر متفق ہو گئے کہ نفاذ اسلام کے عمل کو جاری رکھا جائے گا اس سلسلے میں مسلم ممالک کے دانشوروں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو ۱۹۸۳ء کے اسلامائزیشن کے پروگرام کا جائزہ لے کر اس میں ترامیم (اگر کوئی ہوئیں) تجویز کرے گی۔ اتفاق رائے سے پروفیسر خورشید احمد (پاکستان)، ڈاکٹر مصطفیٰ زرقا (اردن)، ڈاکٹر سلیم العوّا (متحدہ عرب جمہوریہ) کمیٹی کے رکن نامزد کیے گئے۔ تین رکنی کمیٹی نے نومبر ۱۹۸۶ء میں سوڈان کا دورہ کیا اور ۱۹۸۳ء کے قوانین کا شق وار جائزہ لیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے متعدد سیاست دانوں سے ملاقاتیں بھی کیں۔ ۱۹۸۷ء میں دوبارہ کمیٹی کے ارکان نے سوڈان کا دورہ کیا اور صادق المہدی کو رپورٹ پیش کی۔ رپورٹ میں ۱۹۸۳ء کے بعض قوانین پر سخت تنقید کی گئی اور انہیں مزید بہتر بنانے پر زور دیا گیا۔ مجموعی طور پر نفاذ اسلام کے لیے کی جانے والی کوششوں کو سراہا گیا اور انہیں اتنی دیر جاری رکھنے کو کہا گیا جتنی دیر نئے قوانین ان کی جگہ نہیں لے لیتے۔ کمیٹی کی رپورٹ کے بعد آپ نے تین مرحلوں میں اسلامی قوانین کا مسوّدہ وزراء کی کونسل کے سامنے پیش کیا۔ ان نئے قوانین نے جعفر النمیری کے نافذ کردہ ستمبر ۱۹۸۳ء کے کرمنل لاء اور ۱۹۸۵ء کے قوانین کی جگہ لینا تھی۔ یہ قوانین سات شرعی حدود یعنی شراب، بدکاری، قذف، مرتد کی سزا، قصاص، سرقہ اور رہزنی کے بارے میں تھے۔ ڈاکٹر حسن الترابی کے پیش کردہ مسوّدہ قوانین کو پارلیمنٹ نے بھاری اکثریت سے منظور کر لیا۔ لیکن سوڈان کی بدقسمتی ملاحظہ فرمایئے۔ ڈیموکریٹک یونینسٹ پارٹی کے لیڈر محمد عثمان المیرغنی نے ان قوانین کو بہانہ بنا کر مخلوط حکومت سے علیحدگی اختیار کر لی اور جنوبی سوڈان کے بھگوڑے لیڈر جان گرینگ سے ایتھوپیا جا کر سوڈان کی سلامتی کے خلاف معاہدہ کیا۔ ایتھوپیا سے واپس آ کر المیرغنی نے وزیر اعظم صادق المہدی سے مطالبہ کیا کہ وہ نفاذ اسلام کا پروگرام ختم کر دے۔ لیبیا اور متحدہ جمہوریہ سے فوجی معاہدہ ختم کرے اور جان گرینگ جی گوریلا تنظیم ''سوڈانی پیپلز لبریشن آرمی'' کے عسکری شعبہ کو باقاعدہ فوج کا حصہ بنائے اور یہ کہ تمام سیاسی جماعتوں پر

مشتمل ایک قومی کمیٹی قائم کی جائے جو دستوری کانفرنس کی تشکیل تجویز کرے۔ مجوزہ دستوریہ کا اجلاس بلاتے ہی پارلیمنٹ توڑ دی جائے اور قومی حکومت قائم کی جائے جو نئے انتخابات تک برقرار رہے۔ ڈاکٹر حسن الترابی نے المیر غنی کے ان مطالبات سے پہلے ہی ۲۹ اگست ۱۹۸۷ء کو ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے قومی حکومت کی تجویز کو بعض شرائط کے ساتھ قابلِ عمل قرار دیا تھا۔ آپ کے الفاظ میں ''فرنٹ قومی حکومت میں ایک تحریری معاہدے کے تحت شامل ہوسکتا ہے۔ یہ تحریری معاہدہ سیاسی، قانون سازی، اقتصادی اُمور، جنوبی سوڈان کا تحفظ، قومی دفاع، خارجہ پالیسی اور حکومتی ڈھانچہ کے بارے میں ہونا چاہئے۔ آپ نے کہا کہ فرنٹ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ سربراہِ مملکت قومی اتحاد کی نشانی ہونا چاہئے۔ اس طرح دستوریہ کا یہ سربراہ ایسی شخصیت کو ہونا چاہئے جو مجلس قانون ساز کو انتظامیہ کے دباؤ سے آزاد رکھے۔'' پریس کانفرنس کے اختتام پر سوالات کے جوابات دیتے ہوئے آپ نے تجویز پیش کی کہ مجوزہ قومی حکومت کی تشکیل سے پہلے ضروری ہے کہ قومی حکومت میں شامل کیے جانے والے ایسے تمام افراد جو دستوری اور انتظامی حیثیتوں میں کام کر رہے ہیں، مستعفی ہو جائیں۔ ہنگامی حالت ختم کی جائے اور دستوریہ کا اجلاس فوراً بلایا جائے۔ (۴)

محمد عثمان المیر غنی کو بعض فوجی افسروں اور صادق المہدی کی درپردہ حمایت حاصل تھی چنانچہ جیسے ہی اس نے صادق المہدی کے سامنے ان مطالبات کی فہرست رکھی، صادق المہدی نے انہیں فوراً ہی منظور کرلیا۔ ڈاکٹر حسن الترابی نے وزارت سے استعفیٰ دے کر امہ پارٹی کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ نتیجتاً ملک ایک نئے سیاسی بحران کا شکار ہوگیا۔ ابھی یہ بحران جاری تھا کہ لیفٹیننٹ جنرل عمر حسن احمد البشیر نے صادق المہدی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔ (۳۰ جون ۱۹۸۹ء) دیگر لیڈروں کے ہمراہ آپ بھی گرفتار کر لیے گئے۔ انقلاب کے تقریباً چھ ماہ بعد آپ کو جیل سے گھر بھیج دیا گیا اور پھر ۱۹۹۰ء کسی وقت رہا کر دیا گیا۔ رہائی پاتے ہی آپ نے فوجی حکومت کو نفاذِ اسلام اور دیگر قومی مسائل کے حل کے لیے اپنا ہر قسم کا تعاون پیش کیا۔ چنانچہ جنرل عمر حسن احمد البشیر نے ماضی میں سوڈان کے لیے آپ کی خدمات اور اخوان المسلمون کے اثرات دیکھتے ہوئے آپ کی پیشکش قبول کرلی اور نفاذِ اسلام کا جو کام صادق المہدی کے ساتھ مل کر آپ سرانجام دے رہے تھے اسی کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ بہت جلد ہی اس تعاون کے مثبت نتائج قوم کے سامنے آنے لگے۔ اسلامی

قوانین کا نفاذ، خود کفالت اور جنوبی سوڈان کے مسئلہ کے حل کے لیے جو کوششیں آپ کر رہے تھے اندرونِ ملک ایک مختصر سی اقلیت کے علاوہ امریکہ، اسرائیل، روس اور مغربی ممالک کی نظروں میں بری طرح کھٹکنے لگیں۔ مئی ۱۹۹۲ء میں آپ کو حکومت کینیڈا نے پارلیمنٹ کے ارکان سے خطاب کی دعوت دی۔ کینیڈا جانے سے پہلے آپ نے امریکہ میں ٹمپل، فلوریڈا، شکاگو، نیویارک، واشنگٹن اور لندن میں مختلف اجتماعات سے خطاب کیا۔ مئی کے آخری ہفتے آپ لندن سے اٹاوہ پہنچے۔ اٹاوہ سے ۲۵ مئی کو ٹورنٹو جانے کے لیے دو دوستوں احمد عثمان مکی اور سعد ذکی کے ہمراہ ایئرپورٹ سیکیورٹی زون سے نکل کر لاؤنج میں پہنچے ہی تھے کہ ایک سوڈانی بھگوڑے ہاشم بدرالدین (ملٹری کا سابقہ کراٹے انسٹرکٹر اور بلیک بیلٹ برادر) نے دیگر دو افراد کے ساتھ پہلے آپ کے ساتھیوں پر اور پھر پلک جھپکتے ہی آپ پر حملہ کر دیا۔ ہاشم بدرالدین نے کراٹے کے پانچ ہاتھ آپ کی گردن اور سر پر مارے جس سے آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے اور کئی دن بے ہوش رہے۔ حملے سے آپ کا اعصابی نظام بُری طرح متاثر ہوا۔ آپ اپنی مادری زبان (عربی) بھول گئے۔ صرف انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں بات کر سکتے تھے۔ حملہ کے دوسرے دن سوڈانی کونسلر سراج الدین نے نیویارک میں آئمہ کی مجلس شوریٰ کو بتایا کہ مغربی طاقتوں کا ہاتھ تھا۔ برٹش انٹیلی جنس، سی آئی اے اور کینیڈین حکومت ہاشم بدرالدین کی پشت پر محسوس ہوتی ہے۔'' ڈاکٹر حسن الترابی نے بعض عرب ریاستوں کو اس حملے کے لیے ذمّہ دار گردانا۔ اگرچہ آپ نے کسی ملک کا نام نہیں لیا لیکن آپ کے خیال میں مغربی ممالک کو اسلام پسندوں کے خلاف برانگیخت کرنے میں عرب حکمرانوں کا ہاتھ ہے۔ حکومت کینیڈا نے جس کے آپ مہمان تھے، اسے ذاتی تنازعہ قرار دے کر ہاشم بدرالدین کو رہا کر دیا۔ آج کل آپ جنرل حسن احمد البشیر کے ساتھ مل کر نفاذِ اسلام اور خود کفالت کے بقیہ پروگرام کو عملی شکل دینے میں مصروف ہیں۔

## فصل دوم

# شیخ حسن البناء شہید

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جن نادر روزگار شخصیتوں نے مشرق وسطیٰ بالخصوص مصر میں تجدید احیائے دین کا بیڑہ اُٹھایا۔ ان میں امام حسن البناء کی عہد ساز شخصیت سرفہرست ہے جو نہایت کم مدت میں حیرت انگیز طریقے سے اُبھرے اور دیکھتے ہی دیکھتے مصر کے روایتی دینی اور سیاسی حلقوں پر سبقت لے گئے۔ آپ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں محمودیہ کے ایک مایۂ ناز علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد احمد بن عبدالرحمٰن البناء اپنے بیٹے کے بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ایک عرصہ میرے یہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ مجھے بچہ کی تمنا ہونے لگی تب میں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے ایک فرزند صالح عطا فرمائے۔ اس زمانے میں میری نظر ایک چھوٹے سے بچے پر پڑی جو نماز پڑھ رہا تھا وہ مجھے بہت ہی بھلا معلوم ہوا۔ تب میں نے مزید عرض کیا کہ وہ ایسے ہی نماز پڑھنے والا ہو جیسے یہ بچہ نماز پڑھ رہا ہے اور ہر لحاظ سے بہت ہی اچھا (حسن) ہو۔ میری دعا قبول ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بچہ عنایت فرمایا اور میں نے اس کا نام حسن رکھا۔ اس لیے کہ جب میری شادی ہوئی تو میری والدہ نے میری بیوی کو "ام حسن" کہہ کر پکارا تھا۔ یہ بچہ جب چار سال کا ہوا تو میں نے اس کو کتاب شروع کرادی۔ وہ برابر ترقی کرتا گیا یہاں تک کہ تین سپاروں کے علاوہ باقی تمام قرآن مجید حفظ کرلیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ اس کو دمنہور کے ابتدائی اسکول مدرسۃ المعلمین میں داخل کرادوں لیکن یہ مدرسہ صرف ان بچوں کو داخل کرتا تھا جو حافظ قرآن ہوں۔ میں نے ایک دن حسن کو بلایا وہ بڑا ہی سعید اور فرمانبردار بچہ تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ بیٹا میں

چاہتا ہوں کہ تم کو مدرسۃ المعلمین میں داخل کرادوں لیکن تمہارا حفظ قرآن ابھی پورا نہیں ہوا تب کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا ابا جان! جو آپ کی مرضی ہو میں اس کے لیے تیار ہوں۔ میں نے کہا ایک تختی لے آؤ اور پھر میں اس پر قرآن کا کچھ حصہ لکھ کر دے دیتا تھا اور وہ یاد کر لیتا تھا۔ یہاں تک کہ بہت تھوڑے عرصہ میں اس کے بقیہ تینوں پارے بھی یاد ہو گئے اور مدرسہ میں داخل ہو گیا۔ وہ بچپن ہی سے عبادت کی طرف مائل تھا۔ سال میں تین مہینے رجب، شعبان اور رمضان کے روزے رکھتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ بیٹا تم تو ابھی نابالغ ہو اور اللہ نے تم پر روزہ فرض نہیں کیا پھر تم کیوں اتنی مشقت اُٹھاتے ہو؟ اس نے کہا ابا جان مجھے روزے سے طبعی رغبت ہے اور اس میں مجھے مشقت معلوم نہیں ہوتی۔ تب میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ اسی زمانے سے مسجد میں میرے درس میں بھی شریک ہوتا تھا اور عبادت گزاری میں بہت ادھیڑ عمر والوں اور بوڑھوں سے زیادہ چست اور جفاکش تھا۔ اس کو شروع ہی سے نصیحت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا بھی شوق تھا۔ (۵)

ایک مرتبہ کا واقعہ تو بڑا ہی عجیب ہے۔ ایک دن وہ محمودیہ میں نہر کے کنارے تفریح کے لیے گیا وہاں اس نے ایک جہاز میں دیکھا کہ ننگی عورت کا مجسمہ ہے تو سیدھا پولیس افسر کے پاس پہنچا اور کہا کہ یہاں ایسے مجسموں کا نصب ہونا کسی طرح مناسب نہیں۔ بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں یہاں تفریح کے لیے آتے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ اس کو توڑا جائے۔ اس پر وہ افسر ہنسنے لگا اور ٹالنے کے لیے اس نے ایک سپاہی کو ساتھ کر دیا اور کہہ دیا کہ اگر وہ مجسمہ والا راضی ہو تو بھی تم اس کو توڑ دینا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کبھی راضی نہ ہوگا۔ بہر حال حسن اس سپاہی کو ساتھ لے کر گیا اور مجسمہ والے کو سمجھا بجھا کر قائل کر لیا کہ یہ حرام ہے اور نہایت نامناسب چیز ہے اور پھر توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا۔ شیخ نے مزید فرمایا کہ یہاں ہمارے ہاں مشائخ صوفیاء و علماء میں سے ایک بزرگ تھے میں نے حسن کو نصیحت کی کہ ان کی خدمت میں حاضری دیا کرے۔ چنانچہ وہ جانے لگا حتیٰ کہ اسے

ان سے غیر معمولی تعلق ہو گیا اور ان کی صحبت سے اس نے بہت فائدہ اُٹھایا۔ وہ جب اپنے مدرسہ کے آخری سال میں تھا تو قاہرہ میں دار العلوم کی نئی تنظیم ہوئی اور اس میں علوم عربیہ کے علاوہ جن میں دار العلوم امتیازی شان رکھتا تھا علوم عصریہ بھی داخل کئے گئے۔ میں نے دار العلوم کی علمی شان وشہرت کی وجہ سے سوچا کہ اس کو یہاں سے وہاں منتقل کر دو۔ چنانچہ میں نے اس سے مشورہ کیا تو پھر آخری رائے یہ ہوئی کہ یہ سال یہیں پورا کر لیا جائے اور دار العلوم میں داخلہ کے لیے تیاری کر لی جائے۔ اس کے لیے اس نے کہا کہ ابا جان علوم نقلیہ یعنی حدیث فقہ وغیرہ میں تیاری کرانا آپ کے ذمہ ہے اور علوم ریاضیہ حساب اقلیدس وغیرہ میں خود ہی تیار کرلوں گا چنانچہ ایسا ہی ہوا اور پھر وہ قاہرہ چلا گیا۔ قاہرہ پہنچ کر اسے امتحان کے دن سے پہلے والی شب میں الجبرا کے متعلق بہت فکر و پریشانی لاحق ہوئی۔ اس مضمون میں وہ خود کو کمزور سمجھتا تھا اور ڈرتا تھا کہ امتحان میں فیل ہو جاؤں گا۔ اسی فکر و پریشانی میں اسے نیند آ گئی۔ دیکھا کہ ایک بزرگ فرمار ہے ہیں: حسن! پریشان نہ ہو، تمہیں جگہ بتلائے دیتا ہوں جو امتحان میں آئے گی یہ کہہ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور نہر کی طرف لے گئے پھر نہر عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچے اور کتاب کا صفحہ بتلا کر کہا کہ اس کو خوب سمجھ لو اور یاد کر لو۔ شیخ احمد بن عبد الرحمن البناء کہتے ہیں کہ میرا بیٹا حسن قسم کھا کر کہتا ہے کہ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے محسوس کیا کہ وہ سبق یاد ہو گیا ہے پس وہ امتحان کے لیے گیا اور وہی سبق امتحان میں آیا چنانچہ وہ نہایت آسانی سے پاس ہو گیا۔ پھر وہ ہر امتحان میں امتیاز کے ساتھ پاس ہوتا گیا یہاں تک کہ اس کا ایک ہم وطن ساتھی جو اس سے دس برس بڑا تھا اس سے بُری طرح جلنے لگا اور اس نے حسن کو زہر کھلانے اور اس کی آنکھوں میں تیزاب ڈالنے کی کوشش کی لیکن اس کا ہاتھ خطا ہو گیا چنانچہ زہر تو منہ میں پہنچا ہی نہیں اور تیزاب آنکھوں کی بجائے چہرہ پر پڑ گیا اور حسن تلملا کر اُٹھ پڑا بعد میں پتہ چل گیا کہ یہ حرکت اس کے فلاں ساتھی کی تھی اور معاملہ پولیس میں گیا۔ لیکن بعض اساتذہ نے مجرم کی سفارش کی اس لیے حسن نے معاف کر دیا اور کہا میں چاہتا ہوں کہ اس کا اجر اللہ پر چھوڑ دوں اور اپنی جان بچانے کے لیے شکرانے کے طور پر مجرم کو معاف کر دوں۔

دار العلوم کے آخری سال ۱۹۲۷ء آپ کو جو مقالہ دیا گیا اس کا عنوان تھا: ''تکمیلِ تعلیم کے بعد تری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟'' حسن البناء نے جوابی مقالہ میں اپنے مستقبل کا نقشہ پیش کیا۔ آپ کی تحریر کا

انداز اور مقالہ کا ایک ایک لفظ یہاں سخن کے لیے لمحہ فکریہ تھا وہاں اس بات کی چغلی بھی کھا رہا تھا کہ نوجوانوں کے عزائم کیا ہیں۔آپ کے الفاظ میں:

''میرا عقیدہ ہے کہ نفوس انسانی میں سب سے بہتر وہ نیک سرشت انسان ہے جو اپنی سعادت انسانوں کی فلاح و رہنمائی میں تلاش کرتا ہے اور اپنی مسرت وشادمانی اس میں پاتا ہے کہ انسانوں کو مسرت سے ہمکنار کرے اور ان کی تکالیف دور کرے اور اصلاح خلق کی راہ میں قربانی کو وہ نفع اور غنیمت شمار کرتا ہے اور حق و ہدایت کے راستے میں یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ راستہ پرخار ہے اور صعوبتوں اور آزمائشوں میں سے گزرتا ہے۔ جہاد کو اپنے لیے لذت اور راحت سمجھتا ہے اور معاشرہ کے مظاہرہ میں سرایت کرکے وہ ان اُمور سے آگاہی حاصل کرتا ہے جو انسانی زندگی کے چشمہ صافی کو مکدر اور انسان کی سیرت کو متبدل بہ الم کردیتے ہیں جو پاکیزگی میں اضافہ اور مسرت کو دوچند کرتے ہیں.........''

''میرا عقیدہ ہے کہ وہ کام جس کا اثر کارکن کی ذات سے آگے نہ رہے اور جس کا فائدہ دوسروں تک تجاوز نہ کرے وہ ناقص، نارسا اور ہیچ ہے سب سے بہتر اور عظیم عمل وہ ہے جس کے نتائج سے صاحب عمل بھی متمتع ہو اور اس کے رشتہ دار، ہم قوم اور ہم جنس بھی۔ کام کی افادیت جتنی زیادہ ہمہ گیر ہوگی وہ اسی قدر عظیم و گراں بہا ہوگا۔ اپنے اسی عقیدہ ونظریہ کی بناء پر میں نے معلّمین کا راستہ اختیار کیا ہے میرے نزدیک یہ معلّمین ایسا فروزاں چراغ ہیں جس سے خلق کثیر اکتساب نور کرتی ہے اور انسانی بھیڑ کے اندر وہ اپنے راستوں کے سراغ پاتی ہیں۔ گویہ معلّمین اس شمع کی مانند ہیں جو خود جل جاتی ہے مگر انسانوں کے لیے روشنی فراہم کرتی ہے۔''(۶)

دارالعلوم سے فارغ ہوکر آپ گورنمنٹ پرائمری اسکول اسماعیلیہ میں عربی ادب کے مدرس مقرر ہوئے۔ اسماعیلیہ میں قیام کے دوران آپ انجمن شبان المسلمین میں شامل ہوگئے۔اس انجمن کے قیام کا

مقصد مصر میں مجلسی، ثقافتی، مذہبی اور جسمانی نشونما تھا۔ دار العلوم سے فراغت اور الاخوان المسلمون کی تشکیل کا درمیانی عرصہ آپ کے لیے نہایت کربناک تھا۔ سوسائٹی میں بگاڑ انتہا کو پہنچ چکا تھا، قوم پر افسردگی اور مردنی چھائی ہوئی تھی، کمیونسٹ اور وفدئی نسل کے جذبات سے کھیل رہے تھے، بھلائی اور بُرائی کا فرق مٹ چکا تھا، سیاسی جماعتیں ایک دوسرے پر الزام تراشیوں اور دست طرازیوں میں سبقت لے جانے میں لگی ہوئی تھیں، قوم کا قیمتی وقت گھٹیا نعرے بازی، الزام تراشی اور ناقابلِ عمل پروگراموں میں ضائع ہو رہا تھا، لیڈروں کی شب وروز کی لڑائی نے مصری قوم میں اتحاد اور یگانگت کے رشتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا تھا۔ عوام میں علاقائیت کے جذبات پروان چڑھنے لگے تھے۔ سیاست دانوں کا مقصد عہدوں کا حصول اور بدیشی آقاؤں کی خوشنودی رہ گیا تھا قومی مفاد از کار رفتہ نظریہ بن گیا تھا۔ سیاسی لیڈروں کی ان بے اعتدالیوں کے باعث ادیب اور شعراء اتنے نڈر اور بے باک ہوگئے تھے کہ آزادانہ اسلام پر تنقید اور اعتراضات کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ان ظالموں نے اسلامی عبادات تک کا بھی مذاق اُڑایا۔

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ اس دور کی مصری صحافت اور ادب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''جو لوگ مصر کی صحافت اور ادب سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اس ملک میں دین کے خلاف ایک منظّم سازش اور کوشش تھی۔ مصر کے ادیبوں، صحافیوں، مصنّفین وباحثین سب نے دین کے خلاف ایک محاذ بنا رکھا تھا اور انقلاب فرانس کے علمبرداروں کی طرح پوری مصری سوسائٹی کو اپنے ترقی پسند ادب، اپنے رشک آفریں خیالات وتحقیقات، اپنے طنز وتمسخر سے ڈائنا میٹ کر رہے تھے۔ دین سے بے رخی اور جہاد کے اسپرٹ کا خاتمہ یہ دو کام اتنے منظّم طریقے سے ہو رہے تھے کہ ادب، ثقافت، معاشرت اور معیشت غرضیکہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جہاں غیر اسلامی رجحانات غالب نہ آرہے ہوں اور تو اور اس کے اثرات جامعہ الازہر اور علماء کے دوسرے طبقات تک بھی پہنچ چکے تھے۔ الازہر کے علماء اس پر آشوب دور میں روایتی تنگ نظری اور فرقہ وارانہ اختلافات کو جس طرح ہوا دے رہے تھے وہ

ایک الگ داستان ہے۔''

حسن البناء اپنی ان دنوں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم نے کتنی راتیں قوم کی عام حالت اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کی موجودہ پستی پر غور فکر میں گزاریں۔ امراض و علل کی تشخیص کی، علاج کی تدبیریں سوچیں اور شدت و تاثر سے رو دیئے۔''(۷)

ان پر آشوب حالات میں آپ خاموش نہیں بیٹھے رہے بلکہ تقریروں اور ملاقاتوں کے ذریعے عوام اور خواص کو وقت کی نزاکت سے آگاہ کرتے رہے اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ الاخوان المسلمون کے قیام سے قبل آپ ۳۵ ہزار اجتماعات سے خطاب کر چکے تھے۔ ملاقاتوں کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔ ۱۹۲۸ء میں حالات جو رُخ اختیار کر چکے تھے آپ نے ان کو دیکھ کر محسوس کر لیا تھا کہ مصر کی دینی اور سیاسی جماعتیں بجانب اصلاح نہیں اور کوئی بھی جماعت اپنے مقاصد میں تبدیلی کرنے کو تیار نہیں چنانچہ آپ نے چھ ساتھیوں کے ساتھ مل کر ''الاخوان المسلمون'' کے قیام کا اعلان کر دیا۔ آپ کے ساتھیوں نے اتفاق رائے سے آپ کو اخوان المسلمون کا پہلا مرشد عام چنا۔

آپ الاخوان المسلمون کے مقاصد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ ایک ہمہ گیر تحریک ہے جس میں اصلاح کے تمام پہلو موجود ہیں۔ یہ سلفی دعوت ہے کہ کتاب وسنت کو اپنا مرکز بنائے۔ یہ سنی مذہب ہے کیونکہ اخوان کی کوشش ہے کہ ہر شے میں سنت مطہرہ پر عمل کریں۔ یہ ایع صوفیانہ حقیقت ہے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ خیر و خلاح کی بنیاد پاکیزگی نفس، صفائی قلب، للہی محبت اور تعاون علی الخیر پر ہے۔ یہ ایک سیاسی تنظیم ہے کیونکہ ہم حکومت کی داخلی اور خارجی اصلاح کے داعی ہیں غرضیکہ اُمت کو ہر بُرائی سے نکالنے کا عزم رکھتے ہیں۔''

الاخوان المسلمون کا کام شروع کئے بمشکل دو برس ہی گزرے تھے کہ حکومت آپ کے خلاف حرکت میں آگئی۔ یہ اسماعیل صدیق پاشا کے دور وزارت (۱۹۳۰ء) کا واقعہ ہے کہ وزارت تعلیم نے آپ پر چند

الزامات لگا کر تفتیش شروع کردی۔ الزامات کی فہرست کچھ اس طرح تھی:

- حسن البناء کمیونسٹ ہے اور اشترا کی ممالک سے بڑی بڑی رقومات وصول کر کے اخوان المسلمون کے اخراجات چلاتا ہے۔
- حسن البناء کا تعلق وفد سے ہے اور یہی وجہ ہے کہ حسن البناء اسماعیل صدیق کے خلاف محاذ بنائے ہوئے ہے۔
- حسن البناء مصر سے بادشاہت ختم کر کے ری پبلک قائم کرنا چاہتا ہے۔
- حسن البناء سرکاری ملازم ہو کر فنڈ اِکٹھا کرتا ہے اور اسے ناجائز خرچ کرتا ہے۔ تحقیقاتی کمیٹی نے آپ کو تمام الزامات سے بری قرار دے دیا۔ (۸)
- ۱۹۳۳ء میں آپ کی شادی الحاج حسین الصومی کی صاجبزادی سے کردی گئی۔ جس سے پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا۔

۱۹۳۳ء تک الاخوان المسلمون پر عوامی رنگ چڑھ چکا تھا۔ ملک میں پچاس سے زائد شاخیں دن رات سرگرم عمل تھیں۔ حکومت کی تشویش بتدریج بڑھتی جارہی تھی۔ حسن البناء کو تحریکِ اسلامی کے کام سے روکنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی جارہی تھی چنانچہ پہلے اقدام کے طور پر آپ کو اسماعیلیہ سے قاہرہ تبدیل کردیا گیا۔ قاہرہ آکر آپ کی سرگرمیاں ایک نیا رُخ اختیار کر گئیں اور آپ پہلے سے زیادہ سرگرمی سے اخوان المسلمون کے کارکنوں کی تربیت اور تبلیغِ اسلام میں مصروف ہوگئے۔ قاہرہ میں آپ کا پروگرام دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کس طرح آپ نے اپنی زندگی دینِ اسلام کی داعی اس تحریک کے لیے وقف کی ہوئی تھی۔

> ''اُستاد حسن البناء کا یہ دستور تھا کہ صبح سویرے مرکز آتے یہاں کچھ تحریریں چھوڑ جاتے تھے جن میں فوری کاموں کے متعلق ہدایتیں ہوتیں اس کے بعد مدرسے جاتے اگر سفر کا پروگرام ہوتا تو مدرسے سے سیدھے اسٹیشن چلے جاتے اور اگر نہیں تو دوبارہ مرکز آتے، ملاقاتیں کرتے، ہدایات دیتے، جو کام باقی ہوتا اس کی تکمیل

کرتے۔ پھر شب بھر میں تیسری بار مرکز آتے اور یہ وقت مختلف وفود اور آنے والوں سے ملاقات یا کمیٹیوں میں شرکت یا پھر تقریر میں گزرتا۔ یہ سب مصروفیات سالانہ چھٹیوں میں ان کے دیہات کے سفر میں مانع نہ ہوتیں۔''(۹)

قاہرہ کے قیام کے ابتدائی دنوں میں آپ نے کارکنوں کی تربیت کے علاوہ کئی ایک تجارتی کمپنیاں قائم کیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے تعلیمی ادارے قائم کئے۔ اخبارات اور جرائد جاری کئے اور متعدد ایشیائی اور افریقی ممالک میں تحریک کا پیغام پہنچایا اس کے علاوہ شاہ فاروق، محمد محمود پاشا، مصطفیٰ نحاس پاشا، اسماعیل صدیق پاشا، عبدالفتح اور علی ماہر جیسے وزراء اور سیاسی شخصیتوں کو خطوط لکھے۔ ان خطوط میں آپ لیڈروں کو تلقین کرتے کہ:

- نیکی اور پرہیز گاری کی زندگی بسر کریں۔
- ام الخبائث سے پرہیز کریں، اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو مخلوط محفلوں میں جانے سے روکیں۔
- حرام اور حلال میں تمیز کریں۔(۱۰)

ملکی سیاست انتہائی پراگندہ ماحول میں داخل ہو چکی تھی سیاسی جماعتیں آزادی کی جنگ کے نام پر محلاتی سازشوں میں مصروف تھیں۔ وفد کا لیڈر مصطفیٰ نحاس پایا، جس سے لوگ اُمیدیں وابستہ کیے بیٹھے تھے کہ انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے میں اہم کردار ادا کرے گا، ''دوستی اور رفاقت'' کا معاہدہ کرکے برطانوی سامراجیت کے سامنے دوزانو ہو گیا تھا۔ لوگ وفد کے اس کردار کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کمیونسٹ پہلے ہی زیرزمین جا چکے تھے۔ باقی سیاسی جماعتیں فاروق اور اس کے بدیسی حکمرانوں کی خوشامد میں مصروف تھیں۔ گویا کہ جنگِ عظیم دوم سے ایک برس پہلے تک مصر کی سیاسی جماعتوں میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ وہ آزادی وطن کے لیے قربانی دیتیں۔ لوگوں کی نظریں بار بار حسن البناء اور ''اخوان المسلمون'' پر اُٹھتی تھیں۔ شیخ اپنی تقریروں میں مصر کی سیاسی جماعتوں کے چہرہ سے مصنوعی نقاب اُٹھاتے تو کافی مایوس نظر آتے۔ چنانچہ آپ نے اسی سال سیاست میں حصہ لینے کا اعلان فرمایا۔ آپ کے الفاظ میں:

''سیاست اسلام کا لازمی جزو اور اخوان کا پروگرام ہے ہم تمہیں اسلام کی طرف

بلاتے ہیں۔ اگر اس کا مطلب تمہارے نزدیک سیاست ہے تو یہی ہماری سیاست ہے۔''

مزید فرماتے ہیں:

''یہ ایک سلفی تحریک ہے اور قدیم طرزِ زندگی بسر کرنے کا طریقہ، یہ ایک سائنسی اور ثقافتی سوسائٹی اور ایک معاشرتی فکر ہے اس تحریک نے لوگوں کو یہ پیغام دیا کہ قرآن ایک آفاقی سچائی ہے اس نے جدید دنیا کو اس زمانے میں اور آنے والے زمانے کو روشن کیا، اس نے مصریوں اور تمام مسلمانوں کو اسلامی قوانین کے تحت اِکٹھا کیا اور اس نے پوری قوم میں معاشی انصاف وعدل کے اُصولوں کو اُجاگر کیا۔ جہالت اور بیماریوں کے خلاف جنگ لڑی اور وادی نیل سے تمام اجنبی غاصبوں کو نکالا ہے، اس نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ خلافتِ راشدہ کا نظام قائم کرنے کی ضرورت ہے اگرچہ اس نظام کو بتدریج قائم کیا جاسکتا ہے اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے مسلمانوں میں اتحاد، ایمان اور قوت پر بھروسہ کرنا پڑے گا اور اگر ان سے کام نہ چلا تو آخری چارہ کار کے طور پر اسلحہ سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔''(۱۱)

۱۹۳۹ء میں دنیا ایک دفعہ پھر جنگ میں اُلجھ گئی۔ علی ماہر پاشا ہنگامی حالات کا اعلان کر کے فوجی گورنر بن گیا اس نے مصر کے ذرائع مواصلات ''دوستی اور رفاقت'' کے معاہدے کے تحت برطانیہ کے سپرد کر دیے۔ قوم ذہنی اور عملی طور پر برطانیہ کے خلاف جنگ میں شرکت کے لیے بے تاب تھی ادھر حکومت مسلسل اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر رہی تھی۔ حسن البناء نے حکومت کی اس غیر جانبداری کو ایک بہت بڑا فراڈ قرار دیا اور اخوان المسلمون کی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

''جہاں انگلستان نے مصر اور فلسطین میں جارحیت کا ارتکاب کیا ہے وہاں فرانس نے شام اور شمالی افریقہ میں، اٹلی نے تراپولی میں، اب تو اعلانِ جہاد بہت ضروری

ہے۔ آزادی اب ان سے چھین لینا چاہیے خواہ اس میں خون ہی کیوں نہ بہانا پڑے کیونکہ غلامی اور ذلت کی زندگی سے موت افضل ہے۔'' (۱۲)

جنگِ عظیم دوم کی ابتداء سے شہادت تک آپ کو کئی دفعہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ آپ کی سرگرمیاں دن بدن برطانوی حکومت کے لیے پریشانی کا باعث بن رہی تھیں۔ پہلی دفعہ آپ کو حسین سری پاشا کے دورِ وزارت میں سیکرٹری جنرل عبدالحلیم عابدین کے ہمراہ گرفتار کیا گیا لیکن عوامی دباؤ اور احتجاجات سے تنگ آ کر بہت جلد رہا کر دیا گیا۔ دوسری مرتبہ اسماعیل صدیقی کے زمانہ میں محمود پاشا کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا لیکن عدم ثبوت کی بناء پر رہا کر دیے گئے۔ حسین سری پاشا جب دوبارہ وزیرِاعظم بنائے گئے تو آپ کو نائب صدر احمد شقیری کے ہمراہ گرفتار کر کے شہر بدر کر دیا گیا۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں ایک دفعہ پھر آپ کو جج احمد الخفند ار کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ عدالت نے آپ کو باعزت بری کر دیا۔ آخری مرتبہ نومبر ۱۹۴۸ء میں حج سے واپسی پر ناجائز اسلحہ رکھنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ حکومت عدالت میں الزام ثابت نہ کر سکی لہٰذا آپ رہا کر دیے گئے۔ ان گرفتاریوں کا مقصد ملکی سیاست میں اخوان المسلمون اور اس کے مرشد عام کے اثر و رسوخ کو کم کرنا تھا اور جب ان گرفتاریوں سے کام نہ چلا تو آپ کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

مشہور محقق سڈنی نتھلین فشر کے الفاظ میں:

''جنگِ فلسطین کے زمانہ میں یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ شیخ حسن البناء حکومت کریں گے لیکن انہوں نے اس زمانہ میں شاہی خاندان کی مخالفت شروع کر دی اور جب شیخ حسن البناء اور حکومت کا ٹکراؤ ناگزیر ہو گیا اور حکومت ان سے زیادہ پریشان رہنے لگی تو اس وقت ان کے قتل کا فیصلہ کر لیا گیا۔'' (۱۳)

۱۹۴۸ء میں جہاد فلسطین شروع ہوا۔ اخوان نے مادر وطن کے لیے عظیم قربانیاں دیں۔ برطانوی حکومت نے یہودیوں کو خوش کرنے کے لیے مصری حکمرانوں سے سازش کر کے نہ صرف یہ کہ اخوانیوں ناقص ہتھیار سپلائی کیے بلکہ محاذ جنگ سے مجاہدین کو واپس بلا کر جیلوں میں ٹھونسنا شروع کر دیا۔ اچانک ایک دن

پولیس کمانڈر سلیم ذکی کو کسی نے بم پھینک کر ہلاک کر دیا۔ پہلے کی طرح قتل کی ذمہ داری اخوان پر ڈالی گئی۔ اخوان کی تمام جائداد بحق سرکار ضبط کر لی گئی، کام کرنے سے روک دیا گیا۔ ابھی اس واقعہ کو ہوئے تین دن ہی ہوئے تھے کہ وزیر اعظم نقراشی پاشا کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ذمہ داری ایک دفعہ پھر اخوان پر ڈالی گئی۔ حسن البناء شاہ فاروق اور برطانیہ کے مشترکہ دشمن پر ہاتھ نہیں ڈالا جاتا۔ ادھر شیخ بار بار اپنے ساتھیوں سے کہہ رہے تھے کہ اس دفعہ مجھے ان کی نیت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔

نقراشی پاشا کے قتل کے دو ماہ بعد بھی مصر کے سیاسی حالات صحیح سمت کروٹ نہ لے سکے۔ ابراہیم الہادی نیا وزیر اعظم اخوان المسلمون پر سختیوں میں ایک نمبر آگے نکلا۔ الہادی نے وزیر اعظم بنتے ہی ایسے اقدام شروع کر دیے جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ حکومت اخوان کے بارے میں سازش میں مصروف ہے۔ پہلے مرحلے پر مرشد عام حسن البناء سے لائسنس یافتہ اسلحہ چھین لیا گیا اور بیرونی ممالک کے سفر پر پابندی لگا کر پاسپورٹ ضبط کر لیا گیا۔ دوسرے مرحلے پر آپ کی اندرونِ ملک حرکات وسکنات پر پابندی لگا دی گئی۔ حکم میں یہ کہا گیا کہ پیشگی اطلاع دیے بغیر آپ اپنی رہائش گاہ نہیں چھوڑ سکتے۔

شوقی ذکی بیان کرتے ہیں:

> ''جمعیۃ الشبان المسلمین'' کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر ناغی نے شعبہ نوجوانان کے صدر محمد لیثی سے کہا کہ وہ حسن البناء کو جا کر یہ پیغام پہنچا دیں کہ ۱۲ فروری ۱۹۴۹ء ہفتہ کی شام کو مجھ سے یہاں ایسوسی ایشن میں مل لیں تا کہ ان کو جماعت اخوان المسلمون کے حل طلب مسائل سے متعلق بعض اہم اور خوش کن فیصلوں کی اطلاع دی جا سکے۔ جس کے لیے ان کے عزیز ابراہیم الہادی وزیر اعظم نے انہیں ذمہ دار بنایا ہے چنانچہ دو بجے محمد لیثی نے حسن البناء کے گھر جا کر یہ خبر ان کو پہنچائی۔

اُستاذ البناء نے ان سے کہا کہ:

> ''ان لوگوں کی نیتیں ٹھیک معلوم نہیں ہوتیں اور کوئی سمجھوتہ کرنا نہیں چاہتے ابھی ابھی مجھے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے اس بے چارے بوڑھے شخص کو گرفتار کر لیا ہے جس

کے متعلق حکومت کو اطلاع دی تھی کہ ایک دو روز میں ان کے یہاں سفر پر جاؤں گا۔

بہر حال میں اُستاد ناغی سے ملاقات کے لیے آؤں گا۔''(۱۴)

آپ وقت مقررہ پر اپنے بہنوئی عبدالکریم منصور ایڈووکیٹ کے ہمراہ ''جمعیت الشبان المسلمین'' کے دفتر تشریف لے گئے۔ محمد لیثی جس وزیر سے آپ کی ملاقات کرنا چاہتے تھے وہ قصداً وہاں نہ آیا۔ طویل انتظار کے بعد آپ اُستاد محمد لیثی اور عبدالکریم منصور ایڈووکیٹ کے ہمراہ عمارت سے باہر آئے اور ایک ٹیکسی کو روکنے کا اشارہ کیا۔ اسی دوران اُستاد لیثی کو نوکر نے کسی ضروری ٹیلی فون سننے کے لیے اندر بلا لیا۔ ٹیکسی ڈرائیور جان بوجھ کر ٹیکسی چلانے میں دیر کرتا ہے جیسے اسے کسی کا انتظار ہو، اچانک پورے علاقے کی بجلی غائب ہو جاتی ہے اسی دوران دو تین افراد نے جو قریب ہی چھپے ہوئے تھے ٹیکسی کو گھیرے میں لے کر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی ہے۔ مرشد عام اور ان کے بہنوئی زخمی حالت میں واپس جمعیت کے دفتر گئے حسن البناء نے زخمی ہونے کے باوجود ٹیلی فون کر کے ایمبولینس منگوائی۔ کسی قسم کی فرسٹ ایڈ دیے بغیر آپ کو قصر العینی ہسپتال لے جایا گیا۔ ہسپتال میں پہلے ہی احکام آ چکے تھے کہ زخمی کے علاج میں تاخیر کی جائے اور اسے مرنے دیا جائے۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں آپ کی رُوح قفص عنصری سے پرواز کر گئی۔ اسی دوران قاہرہ ریڈیو سے بار بار یہ اعلان کیا جاتا رہا کہ کسی جنونی اخوانی نے حسن البناء پر حملہ کر دیا۔

شوقی ذکی اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ:

''حسن البناء اور ان کے بہنوئی کو سوار کرنے کے بعد لیثی ٹیلی فون پر آئے ہی تھے کہ انہوں نے فائر کی آواز سنی، ٹیلی فون چھوڑ کر وہ فوراً دریافت حال کے لیے باہر آئے تو دیکھا کہ ایسوسی ایشن کے عمارت کے سامنے ایک دراز قد، دبلا پتلا شخص جلباب اور سفید ٹوپی میں کھڑا ہے اور اس کے ہاتھ میں ریوالور ہے یہ دیکھ کر لیثی نے پکڑو! پکڑو! کا شور مچایا نوجوان نے ایک فائر ان پر بھی کیا جو خالی گیا پھر وہ لیثی کے پیچھے سڑک پر دوڑا اور دو اور فائر کیے وہ بھی خطا گئے اب جب اس کے پاس گولیاں ختم ہو گئیں تو وہ سامنے کی فٹ پاتھ کی طرف لپکا جہاں ایک اور شخص اس سے آ کر مل گیا

اور وہ دونوں ایک سیاہ موٹر میں بیٹھ کر شارع الملکہ (کوئنز روڈ) پر روانہ ہو گئے۔ اس اثناء میں اُستاد البناء ٹیکسی سے اُتر کر ایسوسی ایشن میں آ چکے تھے اور ان کی زبان پر ''مار ڈالا، مار ڈالا'' کے الفاظ تھے۔ اس وقت محمد لیثی واپس ایسوسی ایشن آئے اور انہوں نے دیکھا کہ ٹیلی فون کا رسیور اب تک اُٹھا ہوا ہے اب بات کرنے سے اسے معلوم ہوا کہ بات کرنے والا کیپٹن محمد جزار افسر سی آئی ڈی ہے جواب تک بات کا منتظر تھا۔ محمد لیثی ٹیلی فون پر چلائے کہ اُستاد البناء پر ایسوسی ایشن کے سامنے گولی چلائی گئی۔ جزار نے جواب میں پوچھا کہ: ''وہ مر گئے یا اب تک زندہ ہیں'' اس درمیان میں اُستاد البناء قریبی ہسپتال ''دار الاسعاف'' گئے۔ محمد لیثی بھی ان کے پیچھے وہاں گئے یہاں انہوں نے اُستاد البناء کو کلمہ پڑھتے پایا اور وہیں انہوں نے ایک گندمی رنگ کے نوجوان کو بھی دیکھا جو جلباب اور ترکی ٹوپی میں ملبوس تھا اور جس موٹر میں مجرم بھاگے تھے اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے موٹر کے نمبر لے لیے تھے جو ۹۹۷۹ ہیں۔ محکمہ ٹریفک میں تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ مذکورہ موٹر لیفٹیننٹ کرنل محمود عبد المجید کی ہے جو اس وقت خفیہ پولیس کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ کیپٹن جزار نے روپے، شراب، عورتوں اور آخر دھمکی کے ذریعے کوشش کی کہ گواہ کو موٹر کے نمبر بدلنے پر آمادہ کرے جیسا کہ کسی اخبار میں انہوں نے چھپوایا: ''جان رکھ! حسن البناء کا قاتل آزاد ہے اور وہ اسی طرح آزاد رہے گا جو شخص بھی اس کی راہ میں آئے گا اس کو وہ جان سے مار ڈالے گا یا اسے کوئی نقصان پہنچ جائے گا۔ تیرے بچے ہیں جن کو یتیم کرنا تجھ پر حرام ہے۔''

میجر پولیس کمانڈر کرنل واصف (سازشیوں کا سرغنہ) کی زبانی تحریر کرتا ہے کہ:

''زخمی شیخ کو جب کلینک لے جایا گیا اس وقت معمول کے مطابق نگران موجود تھا۔ وہاں ہر وقت ایک ڈاکٹر ڈیوٹی پر موجود ہوتا ہے یا پھر ہنگامی حالات میں اسے بلا لیا

جاتا ہے۔ جس وقت حسن البناء قصر العینی ہسپتال پہنچا وہ قریب المرگ تھا۔ دراصل وہ ہسپتال پہنچنے کے چند سیکنڈ بعد ہی مر گیا'' کرنل مزید کہتا ہے کہ: ''یا تو ڈاکٹر کو بلایا ہی نہیں گیا یا پھر اسے آنے سے روک دیا گیا تھا'' اور جب ایک پریس کانفرنس میں کرنل مذکور سے قاتل کا نام پوچھا گیا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا: ''میں قاتل کا نام جانتا ہوں لیکن اب وہ موجود نہیں کہ اس پر مقدمہ چلایا جائے، اسے شیخ کے قتل کے دوسرے روز ہی سویز کی جانے والی شاہراہ پر پشت سے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا کیونکہ ماتحت کو قتل کرنا آسان ہوتا ہے خاص طور پر جب کہ آپ اس کی ذاتی حفاظت کر رہے ہیں آپ اسے کسی دور فاصلے پر لے جائیں اور پشت سے گولی مار دیں۔''(۱۵)

آپ کی شہادت کے بعد قاہرہ کو آرمڈ کاروں اور ٹینکوں نے گھیرے میں لے لیا۔ آپ کے والد کو ہسپتال سے لاش گھر لانے کی اجازت اس شرط پر دی گئی کہ جنازے میں اہل خانہ کے علاوہ کسی اور کو شرکت کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ جنازہ اس حالت میں اُٹھا کہ بوڑھے باپ اور تین بیٹیوں نے جنازہ کو کندھا دیا۔ جنازہ گاہ (مسجد قیسون) کو آرمی نے مکمل طور پر کور کیا ہوا تھا، کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی جو لوگ پہلے سے موجود تھے انہیں زبردستی باہر نکال دیا گیا۔ احمد بن عبدالرحمٰن البناء نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ امام شافعی کے قبرستان میں مذکورہ چار افراد (والد اور تینوں بیٹیاں) امام شہید کو دفن کرنے کے بعد گھر واپس پلٹے۔ حکومت کی شقاوت ملاحظہ فرمائیے کہ ایک طرف تو جنازے میں کسی اور فرد کو شرکت کی اجازت نہیں دی گئی دوسری طرف دفنانے کے بعد یہ پابندی بھی لگا دی کہ شہید کے گھر والوں سے کوئی فرد تعزیت کے لیے بھی نہیں جا سکتا۔ وفد کے مکرم عبید پاشا واحد سیاسی لیڈر تھے جنہوں نے انتظامیہ کی مسلسل مخالفت اور دھمکیوں کے باوجود شیخ کے والد سے گھر جا کر تعزیت کی۔

''جس دن انہیں شہید کیا گیا وہ تاریخ کا تاریک ترین دن تھا۔ ان کے اُٹھ جانے سے انسانیت ایک ایسے انسان سے محروم ہو گئی جن جیسے دیدہ وروں کے لیے نرگس اپنی بے نوری پر ہزاروں سال رویا کرتی ہے۔''

مرشد عام حسن البناء کا قتل شاہ فاروق اور وزیر اعظم الہادی کا کوئی ذاتی فعل نہیں تھا بلکہ آپ کے قتل کے پیچھے باقاعدہ ایک سازش تھی جو حکومت برطانیہ کی نگرانی میں تیار کی گئی اور جسے ان تمام ممالک کی حمایت حاصل تھی جو در پردہ اسرائیل کے قیام میں یہودیوں کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ ہماری اس بات کی تصدیق حسن البناء اور مصر کی اس زمانے کی سیاست پر شائع ہونے والی کتب سے بخوبی ہو سکتی ہے۔ آپ کے وقت کے بعد جو تبدیلیاں مصری سیاست میں رونما ہوئیں ان میں قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ چند روز بعد ہی فلسطین کے بارے میں رہوڈس کے سمجھوتے پر دستخط ہوئے۔ جس کے تحت فلسطین سے مصری فوجیں واپس بلائی گئی تھیں۔ حسن البناء کی موجودگی میں حکومت مصر کو اس معاہدے پر دستخط کرنے کی جراًت نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسرے اسی سال اکتوبر میں انتخابات ہونے والے تھے اور یہ بات یقینی تھی کہ ان انتخابات میں اگر اخوان کو آزادانہ حصہ لینے کی اجازت دی جاتی تو اخوان ایک بہت بڑی قوت بن کر اُبھرتے۔ مشرقی وسطیٰ کی سیاست سے دلچسپی رکھنے والے متعدد مغربی تاریخ نویسوں نے اخوان کی کامیابی کی پیشین گوئیاں بھی کر دی تھیں۔

ایک اور واقعہ جس سے ہماری اس بات کو تقویت ملتی ہے جسے اخوان کے ایک فاضل رکن جو حسن البناء کی شہادت کے وقت پیرس میں مقیم تھے، بیان کرتے ہیں کہ:

> ''میں ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا کہ بڑی تعداد میں میرے سامنے بیٹھے ہوئے فرانسیسی دفعتاً اُٹھ کھڑے ہوئے اور ناچنے لگے۔ ان کے چہروں سے مسرت اور کامیابی کے آثار نمایاں تھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی بڑا دشمن مغلوب ہو گیا ہو یا کوئی نیا ملک فتح ہوا ہو۔ ایک لمحے میں ہوٹل کا اس طرح رقص و سرور کی محفل میں تبدیل ہو جانا حیرت انگیز بات تھی۔ آخر کار جب مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے منیجر سے دریافت کیا کہ معاملہ کیا ہے؟ اس اچانک خوشی کا سبب کیا ہے؟ اس نے میرے کان میں چپکے سے کہا کہ آج مصر کے لیڈر حسن البناء قتل کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح کے ایک واقعے کی طرف سیّد قطب نے بھی اشارہ کیا ہے جو ان کے امریکہ میں قیام کے دوران حسن البناء کی شہادت کی خبر سن کر پیش آیا تھا۔''

## حسن البناء کی شخصیت

حسن البناء شہید نہایت ہی پُرکشش اور جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے۔ ایک خاص قسم کی روحانیت (جو بہت کم لوگوں کے چہروں پر آتی ہے) آپ کے چہرے پر ٹپکتی تھی۔ آپ نے اپنا سرمایہ حیات، اپنی ساری توانائیاں اور اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور اپنا سب کچھ رضائے الٰہی کے حصول اور اسلام کی سربلندی کے لیے لگا دیا تھا۔

حافظہ اس قدر قوی کہ پورے عالم اسلام میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ طالبِ علمی کے زمانے میں عربی زبان کے اٹھارہ ہزار اشعار زبانی یاد تھے۔ نثر اور گرائمر اس کے علاوہ۔ اپنے خود نوشت روزنامچہ (مذاکرات حسن البناء) میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے ان دنوں فنون اور مختلف علوم کی کتابیں یاد کر لیں۔ لمحۃ الاعراب للحریری، الفیہ بن مالک، یاقوتیہ فی المصطلح، جوہر فی التوحید، رجبیۃ فی المیراث پوری کی پوری حفظ تھیں، متن المسلم فی المنطق کا کچھ حصہ قدوری کا بڑا حصہ، الفابتہ والتقریب لابی شجاع فی الشافعیہ، منظومۃ ابن عامر فی المالکیۃ کا ایک حصہ یاد تھا۔ اس کے علاوہ الشاطبیۃ بھی یاد کرنے کی کوشش کی۔ شروع کا کچھ حصہ یاد بھی کیا، تھوڑا بہت اب تک یاد ہے۔''(۱۶)

ایک دفعہ اگر آپ کسی سے مل لیتے تو اس کا چہرہ اور مقام ملاقات سالہا سال گزر جانے کے بعد بھی یاد رکھتے تھے۔ ہزاروں افراد کو ان کی شکلوں، ناموں اور کنیت، جائے پیدائش، ان کے مذہبی و سیاسی رجحانات، فرقوں اور معاشرتی عادات حتیٰ کہ لوگوں کے ادبی رُتبہ اور مقام تک سے واقف ہوتے تھے۔

ایک مغربی تاریخ نویس کے نزدیک:

> ''حسن البناء کی یادداشت پر مسیحا کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ان کی موت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صلیبی موت کی یاد دلاتی ہے۔''

آپ کے ایک ساتھی جو سفر و حضر میں آپ کے ساتھ رہتے تھے، فرماتے ہیں کہ:

''دوروں میں جب آپ جماعت کے رفقاء سے ملتے تو ایک ایک کو سلام کرتے اور نام لے کر ان کے بچوں کی خیریت دریافت کرتے ان کی تعلیم کی حالت پوچھتے بلکہ میں نے تو یہ بھی دیکھا کہ ان کے ساتھ تخلیہ میں ملتے اور ان کے جانوروں تک صورتِ حال دریافت کرتے اس معاملے میں ان کا حافظہ بے پناہ مضبوط تھا اور چھوٹی چھوٹی باتیں انہیں یاد رہتی تھیں۔''

اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل فواد الخطیب حسن البناء شہید کی قوتِ حافظہ کے بارے میں ایک ذاتی واقعہ تحریر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''میں حسن البناء کے منگل کے لیکچر میں دیگر زاروں افراد کی طرح شریک ہوا۔ میں حسن البناء کی فصاحت و بلاغت اور اسلام کے بارے میں وسیع علم کے بارے میں متاثر تھا، میرا خیال تھا کہ میں لیکچر میں شرکت کے لیے جایا کروں گا۔لیکن اگلے دن جب میں اپنے اسکول سے واپس آیا تو لیکچر کے متعلق سب کچھ بھول چکا تھا۔ چند ہفتوں کے بعد میں قاہرہ کی ایک مصروف ترین گلی میں سے گزر رہا تھا وہاں میں نے اخوانی لیڈر (شیخ) کو ایک دکان کے باہر دیکھا شیخ کی نگاہیں بھی مجھ پر پڑیں۔نو جوان فواد الخطیب (اسعدیہ اسکول کا طالب علم تھا) کا خیال تھا کہ اسے حسن البناء نے نہیں پہچانا ہوگا۔لیکن میں غلطی پر تھا شیخ نے خوش آمدید کہنے کے بعد پوچھا تم کیسے ہو؟ تمہارے والد کیسے ہیں؟ تمہاری تعلیم کا کیا حال ہے؟ میں حیران ہوگیا اور شیخ سے پوچھا کہ آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟ اور میرا نام یاد رکھا حتیٰ کہ میں نے تو اپنا تعارف بھی نہیں کرایا۔شیخ مسکرایا اور نصیحت کی کہ وہ اپنی پڑھائی پر توجہ رکھے۔'' (۱۷)

آپ ایک شعلہ بیان مقرر اور بہترین ادیب تھے۔آپ کی تحریر و تقریر اتنی پر اثر اور دل پذیر ہوتی کہ پڑھنے اور سننے والے کے دل میں اُتر جاتی اور اس کے یہ زبردست خواہش ہوتی کہ وہ اس عظیم المرتبت انسان

سے ضرور ملاقات کرے۔ شیخ کی شعلہ بیانی کا اندازہ اسی ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں شیخ نے ایک مذاکرات سے خطاب کیا۔ جس کا انتظام ورلڈ ایسوسی ایشن آف میڈیکل فیکلٹیز (W.A.M.F) نے کیا تھا۔ شیخ نے انتہائی خوشگوار ماحول میں خطاب کیا اور اپنی شعلہ بیانی سے میدان مار لیا۔ اس واقعہ کا ذکر ''ای جپشین گزیٹر'' جلد پنجم، ص ۱۲ پر بھی کیا گیا ہے۔

ٹائم میگزین کا نمائندہ مقیم مصر لکھتا ہے کہ:

''شیخ شعلہ بیان مقرر اور تجربہ کار سیاست دان تھا۔''

اخوان المسلمون کے دوسرے مرشد عام امام حسن الھضیبی اخوان المسلمون میں شمولیت سے پہلے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں نے شیخ کی کتنی تقریریں سنی ہوں گی ہر دفعہ میں یہ اُمید رکھتا کہ ان کی تقریر جلد ختم ہو جائے گی لیکن اب کی دفعہ بھی مجھے ڈر تھا کہ شیخ اپنی تقریر ختم کر دے گا...... ۱۰۰ منٹ گزر گئے۔ اس نے مسلمانوں کے دل اپنی ہتھیلی پر رکھے ہوئے تھے وہ جس طرح چاہتا انہیں چونکا دیتا تقریر ختم ہوگئی شیخ نے سامعین کو ان کے دل واپس کر دیئے...... لیکن میرا دل شیخ کے ہاتھ میں تھا۔'' (۱۸)

''جب حسن البناء لوگوں کے سامنے گفتگو یا تقریر کے لیے زبان کھولتے تو لوگوں کی نظریں آپ کے چہرے پر گڑ جاتیں اور ہر شخص گوش بر آور رہتا۔ آپ کی زبان سے الفاظ ہیرے موتی اور جواہرات کی طرح نکلتے اور لوگوں کے دلوں میں اُترتے چلے جاتے۔ تقریر کے دوران لوگ یوں ساکت وصامت رہتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں اور ان کے دل مقرر کی مٹھی میں بند ہوں اور جب آپ کی تقریر ختم ہوتی تو لوگوں کے دل واپس ان کے قبضے میں آجاتے اور وہ خوش اور مطمئن دلوں کے ساتھ گھروں کو چل دیتے مگر میرا حال سب سے مختلف ہوتا میں تقریر ختم ہونے کے بعد بھی اپنا دل عظیم خطیب کے پاس ہی چھوڑ کے چلا جاتا تھا۔''

رسوائے زمانہ برطانوی جاسوس میجر لکھتا ہے کہ:

''ایک بار مجھے اخوان المسلمون کے خود ساختہ مرشد عام (ذرا تعصب ملاحظہ فرمایئے) حسن البناء کو ایک مجلس میں سننے کا اتفاق ہوا۔ وہ ایک شعلہ نوا خطیب تھا، اس کی آواز کا جادو مجمع کو اپنے ساتھ بہائے لے جا رہا تھا وہ بار بار قرآن کی آیات کو اپنی تقریر میں استعمال کرتا جس کے سننے سے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی خطابت کے زیر اثر لوگ ایک روحانی کیفیت اور بالیدگی محسوس کر رہے ہیں۔ اس کے مخاطب غریب، غلام اور پسے ہوئے عوام تھے اور اس کی تقریر ان کے اندر اعتماد کی رُوح پھونک رہی تھی اگر حالات اس کے لیے ذرا بھی ساز گار ہوتے تو یہ جنونی مذہبی راہنما قاہرہ کا ایک مسلمہ لیڈر رہوتا۔''(۱۹)

مصر کے سابق صدر انور السادات اپنی خود نوشت ''تلاش خودی'' میں رقمطراز ہیں کہ:

''کچھ سپاہی اخوان المسلمون سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں عید میلاد النبی ﷺ کے موقع پر ایک سپاہی نے میرے کان میں کہا کہ ایک مذہبی رہنما جوانوں سے خطاب کرنا چاہتا ہے مجھے اس پر کچھ حیرت ہوئی تاہم میں نے اس کی اجازت دے دی۔ اس رات میں ڈیوٹی افسر تھا۔ جب وہ مذہبی رہنما تقریر کے لیے آئے تو وہ اخوان المسلمون کے رہنما شیخ حسن البناء تھے۔ میں نے انہیں خوش آمدید کہا اور تقریر کی دعوت دی۔ ان کا انتخاب مضامین بہت عمدہ تھا اور مذہب کے بارے میں ان کی فرم بہت گہری، انہوں نے اپنے مدعا کو بہت احسن طریقے سے ادا کیا وہ بلاشبہ اس موضوع پر تقریر کے لیے ایک مستند شخصیت کے مالک تھے۔ مزید برآں وہ ایک سچے اور مخلص مصری ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے حلیم الطبع اور مہذب انسان تھے۔ اخوان المسلمون کے بارے میں میں نے اب تک جو کچھ سنا تھا وہ بالکل مختلف تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ایک مذہبی جماعت ہے جو اسلامی اقدار کے فروغ

کے لیے کام کر رہی ہے لیکن اب مجھے پتہ چلا کہ اس شخص نے آخرت کے علاوہ اس دنیا کے بارے میں بھی بہت سی باتیں کی ہیں، اس سے بہت متاثر ہوا اور دل کی گہرائیوں سے ان کا مداح ہو گیا۔ میں نے انہیں تقریر پر مبارک باد دی اور پھر دیر تک ان سے باتیں کیں۔''(۲۰)

۱۹۴۶ء میں اخوان المسلمون نے ایک کتابچہ ''ہمیں عوام سے کیسے گفتگو کرنی چاہیے؟'' شائع کیا۔ اس کتابچہ میں حسن البناء اور ایک اجنبی کے درمیان مکالمہ دیا گیا ہے جسے پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حسن البناء شہید اخوان المسلمون کی دعوت کو عام کرنے کے لیے کیسا نفسیاتی طریقہ اختیار کرتے تھے۔ یہ مکالمہ ذیل میں دیا جا رہا ہے:

ایک اجنبی نے ہمارے لیڈر حسن البناء سے کہا:

''آپ کی دعوت اتنی دیر کارآمد ثابت نہیں ہوگی جتنی دیر آپ ہمارے بیمار کے زخم مندمل کرنے کے لیے ہسپتال تعمیر نہیں کرتے۔''

حسن البناء: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جسمانی طور پر صحت مند ہو جانے سے دوسرے مسائل حل ہو جائیں گے؟

اجنبی: نہیں آپ کو اسکول بھی کھولنے پڑیں گے تاکہ عوام کو تعلیم یافتہ بنایا جا سکے۔

حسن البناء: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم ایسا کریں گے تو ملک آزاد ہو جائے گا؟

اجنبی: نہیں آپ کو قرض دینے کے لیے بینک بھی قائم کرنے ہوں گے۔

حسن البناء: کیا اس سے ملک کی آزادی کو فائدہ پہنچے گا؟ اس کے علاوہ ملک کو اور کس چیز کی ضرورت ہے؟

پھر حسن البناء یوں گویا ہوئے:

''صرف ایک ہی راستہ ہے اللہ کے نبی کا راستہ، اسلام کی تبلیغ اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد، اس کے بعد ہماری دعوت کے حصول کے لیے جدوجہد کا مرحلہ آئے گا اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔''

سابق صدر مصر جنرل نجیب نے ۱۲ فروری ۱۹۵۳ء کو حسن البناء شہید کی چوتھی برسی پر قاہرہ ریڈیو سے

شہید کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا:

> ’’حسن البناء کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کی یاد کبھی پرانی نہیں ہوسکتی اور جن کے مراتب کو کبھی نہیں بھلایا جاسکتا کیونکہ مرحوم نے اپنی زندگی اپنے لیے نہیں گزاری بلکہ وہ قوم کے لیے جیئے اور انہوں نے اپنے ذاتی فائدے کے لیے کام نہیں کیا بلکہ فلاح عام ان کا مقصد رہا۔‘‘

حسن البناء نے (اللہ ان کی قبر کو نور سے بھرے) مصریوں کی زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح کی، تعلیم، معاشرت، معیشت، اخلاق، سیاست، زبان، ادب گویا کہ سب پر ان کا احسان ہے۔ پوری مصری قوم آج تک ان کے احسان تلے دبی ہوئی ہے۔ وہ جیسے عظیم مفکر تھے ویسے ہی داعی اسلام اور مجاہد تھے۔ ایسا جامع صفات، اسلام اور عربوں کا بے لوث خادم، پرعزم استقلال، خلوص اور صداقت کا پیکر اس سے پہلے نہ مصریوں کو نصیب ہوا تھا اور نہ بعد میں۔ تجدید احیائے دین کی کوششوں میں بلاشبہ آپ کا شمار امام احمد بن حنبلؒ، ابن تیمیہؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ، سیّد احمد شہیدؒ، محمد بن عبدالوہابؒ، سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور بدیع الزمانؒ نورسی جیسی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ یہ آپ ہی کی شخصیت تھی جس نے مصریوں کے گمراہ کن افکار ونظریات میں سچائی اور حقیقت کا رنگ بھرا اور مخالفین اسلام پر یہ ثابت کیا کہ اسلامی نظام قائم کر کے ایک کامیاب انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ تجدید احیائے کے سلسلہ میں آپ کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ’’یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ سیّد جمال الدین افغانی کے بعد عالم اسلام اور خصوصیت کے ساتھ مشرقِ وسطیٰ میں شیخ حسن البناء سے زیادہ طاقتور اور بلند آفریں شخصیت پیدا نہیں ہوئی۔ بعض حیثیتوں سے انہیں سیّد جمال الدین افغانی پر کھلی فوقیت حاصل تھی۔ سیّد جمال الدین افغانی کا اثر علمی وسیاسی حلقے میں محدود رہا اور انہوں نے کوئی ایجابی اور اسلامی تحریک نہیں چلائی لیکن حسن البناء نے عالم عربی کے ہر طبقہ پر اثر

ڈالا اور بیسویں صدی کی سب سے بڑی ہمہ گیر تحریک چلائی۔" (۲۱)

آپ کے اخلاق و کردار میں جلال خداوندی سمایا ہوا تھا۔ عشقِ الٰہی کی سربلندیوں نے آپ کے اندر بے مثال جرأت، صبر و استقامت پیدا کی ہوئی تھی۔ مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی (۱۸۹۷-۱۹۷۴ء) حسن البناء شیخ سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "جب میں ۱۹۴۶ء میں یورپ سے مصر لوٹا تو میں نے پہلی مرتبہ حسن البناء کو بچشم سر دیکھا۔ میں نے ان کی گفتگو سنی مجھے ان کے اندر صاف و شفاف رُوح نظر آئی بعد میں تعلقات خوب مستحکم ہو گئے اور مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ اس عظیم انسان کو اللہ تعالیٰ نے بڑی نادر خوبیاں، اعلیٰ خصائل اور کریمانہ صفات سے نواز رکھا ہے۔ ان کی نمایاں صفات یہ تھیں: گہرا اخلاص، عقلِ سلیم اور عزم قوی۔ ان تینوں خوبیوں کو ان کے مضبوط عقیدے اور محمدی ﷺ اخلاق نے مزین کر رکھا تھا۔ وہ بڑے بلند ہمت اور ایثار پیشہ انسان تھے۔ قربانی، ثابت قدمی، سادگی، تکشف اور مادّی منفعت سے گریز اور پاک شفاف سیرت سے بہرہ ور تھے۔ اور یہی وہ اوصاف تھے جن کی بناء پر وہ قیادت کے منصبِ عظیم پر فائز ہو گئے۔ میں حلیمہ میں ان کے مکان پر گیا گھر کا ساز و سامان بالکل سادہ اور گھر کی ہر چیز تکشف و قناعت کی غماز" (۲۲)

آپ درویش صفت اور قناعت پسند انسان تھے۔ سادہ لوح اس حد تک کہ جو میسّر آجاتا کھا لیتے، کھانے میں لیڈروں جیسا تکلف پسند نہیں کرتے تھے، غریب کارکنوں تک کے ہاں کھانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ایک نہایت ہی معمولی درجہ کے مکان میں رہائش رکھتے تھے۔ مال و دولت اور دنیاوی جاہ و جلال کبھی بھی آپ کی کمزوری نہ بنے۔ کوئی بڑے سے بڑا انسان بھی آپ کو اُصولوں کے بدلے خرید نہ سکا۔ یہی وہ خوبی تھی جس کی بناء پر آپ شرق اوسط اور خاص طور پر مصر کے دوسرے لیڈروں سے ممتاز تھے۔ جنگِ عظیم دوم کے دوران انگریزوں نے محسوس کیا کہ حسن البناء اور ان کی جماعت عوام میں مقبول ہوتے جا رہے ہیں آپ کو خاموش کرانے کے لیے پہلی قسط کے طور پر ایک ایجنٹ کی معرفت ایک ہزار پونڈ کی پیشکش کی گئی اور کہا گیا کہ

آئندہ طرزِ عمل دیکھ کر تجوریوں کے منہ کھول دیے جائیں گے۔ مصر کا کوئی اور لیڈر ہوتا تو اپنی اور اپنے خاندان کی دنیا بنا لیتا اسد درویش صفت انسان نے انگریزوں کے پیغامبر کو دھتکار دیا ممکن ہے کہ آپ کا یہ اقدام کسی کو قابلِ اعتراض نظر آئے لیکن آپ کے کردار کی اس بلندی نے آپ کو لیڈر شپ کے معراج تک پہنچا دیا اور آپ عوام و خواص میں اس حد تک مقبول ہو گئے کہ اخوان المسلمون کے مرشد عام کی مرضی معلوم کیے بغیر کسی نئے قانون کا اجراء حکومت کے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوتا۔ آپ کا اپنا کردار ہی نہیں بلکہ اخوانی لیڈروں اور ادنیٰ سے ادنیٰ کارکنوں کے کردار کو بطورِ مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ ناصر کے زمانہ میں ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۰ء تک اخوان ظلم کی چکی میں پستے رہے عورتیں، بوڑھے اور بچے تشدد کا نشانہ بنائے گئے لیکن آج بھی اخوان کے سر فخر سے بلند ہیں کہ کسی اخوانی کو آج تک بکاؤ مال قرار نہیں دیا جا سکا۔

## حسن البناء کا اصل کارنامہ

حسن البناء کا اصل کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے مصری سیاست کو گناہ کی آلودگیوں سے پاک کرنے کے لیے اپنا تن من دھن حتیٰ کہ اپنی ہر چیز قربان کر دی۔ قوم میں یہ تصوّر عام کیا کہ اسلام کا سیاسی نظام نہایت ہی اعلیٰ اور ارفع چیز ہے اور مصریوں کی تمام بیماریوں کا علاج اس میں موجود ہے۔ آپ پہلے مصری تھے جنھوں نے سیاست میں حصہ لے کر عالمگیر اسلامی بیداری کا راستہ ہموار کیا۔ آپ نے بیک وقت برطانوی امپریلسٹوں، نیشنلسٹوں، کمیونسٹوں اور یہودیوں کا للکارا اور اس وقت جذبۂ جہاد پیدا کیا جب عوام مایوسی اور نا اُمیدی کا شکار ہو چکے تھے۔ ان میں اسلامی اقدار بتدریج تباہ ہو رہی تھیں۔ وہ جدوجہد کے بجائے کسی معجزے کا انتظار کر رہے تھے۔ حسن البناء شہید نے معاشی میدان میں قوم کو سرمایہ دارانہ اور سوشلسٹ معیشت کے تباہ کُن اثرات اور نتائج سے آگاہ کیا اور ان سازشوں کا بھی ذکر کیا جو مغربی سرمایہ دار، برطانوی اور فرانسیسی حکومتیں مصر کی اقتصادیات کو تباہ کرنے کے لیے کر رہی تھیں۔ اس طرح آپ نے اخوان المسلمون کے جھنڈے تلے بے شمار صنعتی پراجیکٹ شروع کر کے شرکت و مضاربت کے اسلامی اُصولوں کی حقانیت سے عوام اور خواص کو متاثر کیا۔ اس وقت پورے ملک میں تعلیمی اداروں کا جال پھیلایا جب مغربی تہذیب کے دلدادہ ایک منظّم سازش

کے تحت تعلیم وثقافت کے نام پر نوجوانوں کے اخلاق تباہ کر رہے تھے۔ آپ نے اخوان المسلمون کے تعلیمی اداروں میں مصری نوجوانوں کی اخلاقی تربیت کر کے اسلام دشمنوں پر یہ ثابت کر دیا کہ کسی بھی ملک کے نظام تعلیم میں تبدیلی لا کر انقلاب کی صحیح اور درست سمت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

> ''حسن البناء سماجی اور سیاسی لیڈروں میں واحد شخصیت ہیں جنھوں نے نوجوانوں کے لیے فراغت کے لمحات بسر کرنے کے نہایت ہی کارآمد اور کامیاب منصوبے مہیا کیے۔''

اس بات کا کریڈٹ بھی حسن البناء کو جاتا ہے کہ انہوں نے تحریک اخوان المسلمون کو فرقہ وارانہ بحثوں، موشگافیوں اور پیچیدگیوں سے بالکل الگ تھلگ رکھا۔ مولانا مسعود عالم ندوی آپ کی شخصیت اور کارناموں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''شہید البناء کی شخصیت بھی عجیب وغریب ہے وہ نہ بڑے عالم تھے نہ ادیب و مفکر بالکل نوجوانی میں الاخوان المسلمون کی بنیاد ڈالی اور بیس برس کے بعد ۴۲ سال کی عمر میں شہادت پائی۔ لیکن اس دوران میں مصر کی دنیا بدل دی۔ جس سرزمین میں محمد عبدہ اور سیّد رشید رضا کی کوششیں عملی حیثیت سے تقریباً ناکام رہی ہوں، جہاں بیس تیس برس سے الحاد و دہریت کا زور تھا اسلام کی کوئی آواز نہیں تھی، اسلام کے نام لیوا اپنی پگڑیوں کی اصلاح وتحفظ میں لگے ہوئے تھے۔ اس سرزمین میں نوجوان کی مسیحا نفسی نے عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ آج مصری حکومت مرحوم البناء کی دعوت کو ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے مگر حق کی دعوت قوت کے زور سے ختم نہیں ہوا کرتی۔'' (۲۳)

فصل سوم

# ڈاکٹر اسمٰعیل راجی الفاروقی

دور جدید میں جن مسلمان دانشوروں نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کینیڈا اور یورپ میں مقیم مسلمانوں کی فکری اور ذہنی رہنمائی کی اور عالمی تحریک اسلامی کو دوام بخشا ان میں اتحاد عالم اسلامی کے داعی، ممتاز دانشور، فقہ، تاریخ اور مذاہب عالم کے تقابلی مطالعہ و تجزیہ کے ماہر ڈاکٹر اسمٰعیل راجی الفاروقی کا نام سرِفہرست ہے۔ آپ ۱۹۲۱ء میں فلسطین کے ایک شہر جافا (JAFA) کے ایک بااثر متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم علاقہ کے روایتی دینی مدارس سے حاصل کی۔ ثانوی تعلیم رملہ سے جبکہ اعلیٰ تعلیم امریکن یونیورسٹی بیروت سے حاصل کی۔ ۱۹۴۲ء میں وطن واپس آئے۔ اس کے بعد آپ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ آپ کے الفاظ میں:

> ''امریکن یونیورسٹی بیروت سے گریجویشن کرنے کے بعد میں عرب کوآپریٹو سوسائٹیز میں رجسٹرار کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ پھر ایڈمنسٹریٹو آفیسر اور اس کے بعد گلیلی کا گورنر بنا دیا گیا۔ جب جیش انقفاء (امدادی فوج Rescue Army) تشکیل دی گئی میں شمالی علاقوں میں فوج کے زیرنگرانی اس وقت تک ایڈمنسٹریٹو گورنر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتا رہا۔ جب تک وہ علاقہ مکمل دشمن کے قبضہ میں نہیں چلا گیا۔''

۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی نام نہاد ریاست وجود میں آتے ہی آپ کے خاندان کے تمام افراد کو صیہونی حکمرانوں نے زبردستی اردن بھیج دیا۔ اردن آکر کچھ عرصہ آپ پتھروں کی ٹھیکیداری کرتے رہے، کیونکہ آپ کا طبعی میلان ٹھیکیداری کی طرف نہیں تھا اس لیے سب کچھ چھوڑ کر ۱۹۴۹ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ چلے گئے۔ امریکہ میں آپ نے فلسفے میں ایم۔اے کیا اور مزید تعلیم کے لیے انڈیانا یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۵۲ء میں ''کانٹ'' کے فلسفہ پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔ جن دنوں آپ کانٹ کے فلسفہ پر کام

کر رہے تھے انہی دنوں آپ پر مغربی فلسفہ کی حیثیت آشکار ہوئی اور تب آپ کے نظریات میں تبدیلی آنا شروع ہوئی اور آپ نے ایک مسلم قوم پرست کا روپ دھار لیا۔ اس وقت قوم پرستی سے آپ کو جنون کی حد تک عشق تھا۔ آپ عرب نیشنلزم اور جمال عبدالناصر کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ عرب نیشنلزم کو آپ عالمِ اسلام کی ایک بنیادی ضرورت قرار دیتے تھے۔ نیشنلسٹ ہونے کے باوجود آپ کو قلبی اطمینان اور سکون نہیں تھا۔ آپ کے الفاظ میں:

> ''مغربی فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد مجھے اپنی علمی کم مائیگی کا احساس ہوا اور اسلامی تعلیمات سے دوری کا پتہ چلا پس میں پیچھے کی طرف پلٹا اور جامعہ الازہر میں داخلہ لے کر ازسرِ نو علم حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اب کی دفعہ میں زیادہ انہماک اور توجہ سے کام میں جٹ گیا۔ جیسا کہ تین سال کے اندر کوئی نئی ڈگری لینا ہو۔''

۱۹۵۹ء میں آپ فل برائٹ اسکالرشپ پر میکگل یونیورسٹی کینیڈا چلے گئے وہاں آپ نے (Judaed - Christianity) پر تحقیقی کام کیا۔ ۱۹۶۰ء میں علم حاصل کرنے کی لگن آپ کو دوبارہ جامعہ الازہر لے آئی۔ اسی سال آپ نے دوسری بار ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ جامعہ الازہر میں دوسری بار تعلیم کے دوران آپ عرب قومیت کے حصار سے نکل کر اسلامی نظریات کی طرف پلٹے۔ اس زمانے میں آپ کا تعارف بعض اخوانیوں سے ہوا جنہوں نے آپ کی سمت تبدیل کرنے میں کافی مدد کی۔ انہی اخوانیوں کی بدولت آپ کو حسن البناء شہید، سیّد قطب شہید اور مولانا مودودیؒ کی کتب کے مطالعہ کا موقع ملا۔

مولانا کی کتب کے مطالعہ کے بعد آپ کی رائے تھی کہ:

> ''ان کی فکر ایک صدی آگے کی فکر ہے۔''

۱۹۶۱ء میں آپ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے اور سینٹرل انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کراچی سے وابستہ ہو گئے۔

۱۹۶۲ء میں آپ پاکستان سے سائیراکوس یونیورسٹی کے شعبہ مذاہب سے وابستہ ہو گئے بعد ازاں صدر شعبہ بنائے گئے۔ یہاں آ کر آپ کی سرگرمیاں زیادہ تر تربیت نوعیت کی تھیں۔ آپ ایک طرف طلبہ کی

سیقی ضروریات میں ان کی رہنمائی کرتے دوسری طرف ان کی دینی تربیت بھی۔ انہی دنوں آپ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے مسلمان طلبہ کی سب سے بڑی اور منظم تنظیم مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (M.S.A) میں شامل ہوئے۔

آپ کے الفاظ میں:

> ''امریکہ میں تحریکِ اسلامی میں میرے رجحان نے میری نگاہ میں وسعت اور گہرائی پیدا کی یہ کہ میں امریکہ میں اسلام کے احیاء اور نشو ونما کے لیے کام کروں۔ چنانچہ میں نے مسلمان نوجوانوں کی اسلامی سرگرمیوں میں تربیت کے علاوہ اسلامی فکر میں گہرائی بھی پیدا کی۔''

یونیورسٹی میں قیام کے دوران مستقبل کی منصوبہ بندی کے علاوہ چھ برس تک مسلسل آپ اپنے پروگرام کو چلانے کے لیے مناسب افراد کی تلاش میں رہے۔ اس سلسلہ میں آپ کا رابطہ دنیا بھر کے مسلمان دانشوروں اور اسکالروں سے بھی رہا۔ انہی دنوں (۱۹۶۷ء) بیت المقدس پر صیہونیوں کے قبضہ کا سانحہ فاجعہ پیش آیا۔ اس واقعہ نے آپ کی راتوں کی نیند اُڑا دی۔ چنانچہ مسلسل غور و فکر کے بعد آپ نے اپنے کام کو مزید تیز کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ سائیرکوس یونیورسٹی کی ملازمت چھوڑ کر آپ فلاڈلفیا کی ٹمپل یونیورسٹی کے شعبہ مذاہب سے وابستہ ہو گئے اور پھر اپنی شہادت تک یہیں رہے۔

شہادت کے وقت مختلف ممالک کے ۳۵ طالب علم آپ کی رہنمائی میں کام کر رہے تھے۔ ٹمپل یونیورسٹی مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کا گڑھ تھا۔ یہاں آپ کو اپنی مرضی کے طالب علم ملنے لگے اس کے علاوہ آپ پنسلوانیا اسٹیٹ یونیورسٹی اور پنسلوانیا یونیورسٹی میں جو کہ ٹمپل یونیورسٹی سے تین سو بیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھیں، جمعہ کے روز نماز کے وقت چلے جاتے اور طلبہ سے ملاقاتیں کرتے۔ ان ملاقاتوں کے سبب آپ اپنے مقصد کے قریب پہنچ گئے۔ چنانچہ آپ کی کوششوں سے ''اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن'' ''ایسوسی ایشن آف مسلم سائنٹسٹ اینڈ انجینئرز'' قائم ہوئیں۔ یہ دونوں انجمنیں اب مضبوط بنیادوں پر کام کر رہی ہیں۔ آپ مسلم ممالک کی متعدد یونیورسٹیوں کے ایڈوائزر بھی تھے۔ ۱۹۷۸ء میں آپ کی سرگرمیوں کا رُخ تبلیغی سے زیادہ

علمی ہوگیا۔آپ کی خواہش تھی کہ اسلام کی علمی اور فکری شناخت بحال کرنے کے لیے تحقیقی کام کیا جائے آپ اکثر کہا کرتے تھے:

''دنیا پر نہ یہودی کی حکومت ہے، نہ عیسائی کی، نہ روس کی، نہ امریکہ کی اس پر ہمیشہ علم کی حکمرانی رہی ہے. جو قوم یا نسل علم کے میدان میں آگے بڑھ جاتی ہے وہی دنیا کی امامت اور قیادت سنبھال لیتی ہے۔ مسلمانوں کے پاس علوم کا سرمایہ آیا تو وہ دنیا کے حکمران بن گئے۔ یورپ میں احیاء العلوم کی تحریک چل نکلی تو عیسائی دنیا غالب ہوگئی۔ یہودیوں نے اس میدان میں پیش رفت کی تو جرمنی، فرانس، برطانیہ، کینیڈا اور روس وغیرہ میں وہ اقلیت میں ہونے کے باوجود غالب قوت بن گئے۔ جاپان نے اس کے ذریعہ اپنا لوہا منوایا اور آئندہ جو بھی علم میں آگے بڑھے گا وہی مستقبل کا فرماں روا ہوگا۔'' (۲۴)

فلاڈلفیا میں قیام کے دوران جس علمی اور تحقیقی کام کی منصوبہ بندی آپ نے کی تھی، عملی شکل دینے کا موقعہ ۱۹۸۰ء میں اس وقت ملا جب سوئٹزرلینڈ کے ایک شہر لوگانو (Lugano) میں دنیا بھر کی چالیس ممتاز علمی شخصیتیں اکٹھی ہوئیں اور ایک طویل تھکا دینے والے اجلاس کے بعد ایک علمی ادارے کے قیام کی منصوبہ بندی کی گئی۔ چنانچہ اگلے سال ورجینا میں ایک مکمل خود مختار علمی ادارے اور عالمی ادارہ افکار اسلامی (International Institute of Islamic thought) کی بنیاد رکھی گئی۔ ادارے کا دائرہ عمل کسی ایک ملک تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ مسلم دنیا تک اس کا دائرہ وسیع کیا گیا۔ ادارے کے قیام کا مقصد علمی بنیادوں پر اسلام کی شناخت کرانا تھا۔ چنانچہ دنیا بھر کے مسلمان اسکالرز اور دانشور ادارے کے مرکز میں آکر مذاکرات اور مطالعے کے ذریعے اپنی علمی پیاس بجھانے لگے۔ اس ادارے میں اقتصادیات، نفسیات، عمرانیات اور سیاسیات پر تحقیقی کام ہو رہا ہے یہ ادارہ ہر سال ایک سمپوزیم منعقد کراتا ہے۔ اس ادارے کے تحت ۱۹۸۴ء میں ملائیشیا میں ایک علمی کانفرنس منعقد ہوچکی ہے۔ یہ ادارہ ڈاکٹر راجی الفاروقی کی عظیم یادگار اور ورثہ ہے۔ اپنی شہادت سے پہلے آپ ''اسلامائزیشن آف نالج'' پر کام کر رہے تھے۔ اسلامائزیشن آف نالج پر ڈاکٹر فاروقی

سے پہلے محمد عبدہ اور سیّد احمد خان وغیرہ دانشور اگرچہ کام کر چکے تھے لیکن بوجوہ اس کے مثبت نتائج نہ نکل سکے۔ شیخ عبداللہ النصیف اور صالح جمجوم نے ڈاکٹر راجی الفاروقی کی شہادت سے قبل کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک عالمی تعلیمی کانفرنس منعقد کی تھی۔ اس کانفرنس میں راجی الفاروقی اور ابوسلیمان نے واضح انداز میں اسلامائزیشن آف نالج کا نظریہ پیش کیا تھا۔ اسلامائزیشن آف نالج کو عملی شکل دینے کے لیے جو بارہ نکاتی ورکنگ پلان آپ نے تیار کیا وہ کچھ یوں تھا:

- جدید علوم پر دسترس۔
- نظم تعلیم وتربیت کا جائزہ۔
- اسلامی علوم وفنون کے ورثے کی تدوین۔
- اسلامی ورثے کا تجزیہ۔
- اسلامی علوم کا تہذیب وتمدن سے رشتہ۔
- جدید تعلیم وتربیت کا تنقیدی جائزہ۔
- اسلامی ورثے اور علوم وفنون کا تنقیدی جائزہ۔
- اسلامی امہ کے اہم مسائل کی نشاندہی۔
- بنی نوع انسان کے مسائل کا جائزہ۔
- علوم کا تحقیقی تجزیہ اور اسے مختص کرنا۔
- جدید علوم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا۔
- اسلامی علوم کی شناخت۔

اس ورکنگ پلان کا مقصد ''عالمی ادارہ افکار اسلامی'' کے کام کو ٹھوس اور مثبت بنیادوں پر آگے بڑھانا تھا اور اس کے ذریعہ عالم اسلام کو ایک ایسی قیادت فراہم کرنا تھا جو حقیقی معنوں میں اسلامی امہ کے مسائل پر مکمل گرفت رکھنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ بدقسمتی سے اس منصوبے نے ٹمپل یونیورسٹی میں آپ کے کئی ایک حاسد پیدا کر دیے جو آپ کی حرکات وسکنات کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ٹمپل یونیورسٹی کے یہودی اساتذہ پیش پیش تھے۔ اکثر ٹیلی فون پر آپ کو دھمکیاں دی جاتیں۔ پہلے آپ کے بیٹے کو جو امریکن آرمی میں

ملازمت کرتا تھا نہایت پراسرار طریقہ سے قتل کیا گیا اور آپ کو ایک عرصہ تک اطلاع نہیں دی گئی اور پھر اچانک ۲۷ مئی ۱۹۸۶ء کی صبح دو بجے کرپینٹیس منٹ پر ایک مسلح کمانڈو نے آپ اور آپ کی اہلیہ کو شہید اور بیٹی کو زخمی کر دیا۔ قاتل جوزف ینگ وقوعہ کے آٹھ ماہ بعد گرفتار ہوا۔ بارہ افراد کی جیوری نے اکتالیس سالہ جوزف کو دو افراد کے قتل کا مجرم ٹھہرایا اور سزائے موت سنائی۔ فلاڈلفیا کی تاریخ میں بیس سال کے بعد کسی مجرم کو سزائے موت دی گئی۔ مجرم جوزف ینگ نے عدالت میں اقرار جرم کرتے ہوئے کہا کہ:

> ''میں رات گیارہ بجے سیاہ لباس پہن کر اور ایک لمبے پھل والا چاقو لے کر ڈاکٹر فاروقی کے گھر میں داخل ہوا۔ گھر کی تمام کھڑکیاں بند تھیں صرف باورچی خانہ کی کھڑکی کھلی تھی۔ جب میں اِدھر اُدھر گھر کا نقشہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو مجھے پیاس لگی میں نے فریج کھولا اس میں چیری (پھل) پڑی تھیں میں نے انہیں کھا کر اس کی گھٹلیاں فرش پر پھینک دیں (یہ گٹھلیاں پولیس کو وقوعہ سے ملی تھیں) میں تقریباً دو گھنٹے تک انتظار کرتا رہا کہ اہل خانہ جاگیں۔ میں جانتا تھا کہ ان کو سحری کھانے کے لیے پو پھٹنے سے پہلے اُٹھنا ہے اور میری کاروائی کا وہی مناسب وقت ہے۔ دو بجے شب مسز فاروقی اُٹھیں وہ جونہی باورچی خانے میں آئیں تو میں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دیوار کے ساتھ دھکیل دیا اور چاقو سے ان پر پے در پے وار کرنے لگا۔ مسز فاروقی کی چیخیں سن کر ان کی بیٹی آ گئی تو میں نے اسے بھی زخمی کر دیا اتنی دیر میں ڈاکٹر فاروقی آ گئے وہ جلدی سے ٹیلی فون کی میز کی طرف بڑھے انہوں نے ابھی ٹیلی فون پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ میں نے ان پر چاقو سے وار کر دیا وہ میری مزاحمت کرتے رہے لیکن میں چاقو سے وار کرتا رہا یہاں تک کہ وہ گر گئے۔'' (۲۵)

۳۰ مئی بروز جمعۃ المبارک شکاگو کے ایک ممتاز عالم دین احمد زکی نے آپ دونوں کی نماز جنازہ پڑھائیں۔ نماز جنازہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کینیڈا اور متعدد یورپی ممالک سے مسلمانوں نے بڑی تعداد (تقریباً چار ہزار) میں شرکت کی۔

## شخصیت

ڈاکٹر راجی الفاروقی ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ آپ کی گفتگو نہایت منطقی اور استدلال سے بھرپور ہوتی تھی۔ ایک دفعہ اگر کوئی انہیں مل لیتا تو ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ طلبہ میں آپ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ آپ کے شاگرد آپ کو ''پاپا'' اور آپ کی اہلیہ کو ''ماما'' کہہ کر پکارتے تھے۔ آپ جدید اور قدیم علوم خاص طور پر تقابلِ ادیان میں اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔ آپ مسلمانوں میں تحریک احیائے علوم کے قافلہ کے ایک نمایاں فرد تھے۔ آپ شیخ حسن البناء شہید، سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ اور سیّد قطب کے نظریات سے متاثر ہی نہیں بلکہ برملا اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ ۱۹۷۴ء میں مفتی اعظم فلسطین الحاج امین الحسینی کی وفات سے تحریک آزادی فلسطین کی قیادت میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا آپ نے اسے پُر کیا۔ مسئلہ فلسطین زندہ رکھنے میں آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ سابق اٹارنی جنرل پاکستان خالد اسحاق ایڈووکیٹ نے ڈاکٹر راجی الفاروقی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے بارے میں جو کچھ کہا شاید ان کی شخصیت کا اس سے بہتر تجزیہ نہ ہو سکے۔ ان کے الفاظ میں:

> ''فاروقی صاحب کو میں تقریباً ۲۲ سال سے جانتا ہوں ان سے پہلی ملاقات پاکستان میں ہوئی جب وہ اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں کام کرنے کے لیے پاکستان میں کچھ عرصہ تعینات رہے۔ یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ یہ کام انہوں نے زندگی کے آغاز سے شروع نہیں کیا تھا بلکہ وہ ایک ریسرچ اسکالر کی زندگی کے بہت سے مراحل طے کر کے آرکیٹکچر کے میدان میں خاصی کامیابی حاصل کرنے کے بعد بنے تھے انہوں نے دولت کا راستہ چھوڑا اور ایک اسلامی اسکالر کی مقابلتاً تنگ دستی کی زندگی کو اپنایا اور اس راہ پر گامزن رہے۔ یہاں تک کہ قاتل کے وار نے ان کو ان کے مالک سے ملا دیا۔ ان کا میرا ساتھ کئی مرحلوں پر ہوا اور دنیا میں بمشکل کوئی اسلامی کام کرنے والی انسٹی ٹیوشن ہوگی کہ جس میں فاروقی صاحب فعال حصہ نہ لیتے تھے۔ ان کے جوش اور ولولہ کے ساتھ ایک خاص خصوصیت کا ذکر

کرنا ضروری ہے اور اس کا تجربہ مجھے اسلامک کونسل آف یورپ کے لیے اسلامی دستور کی مسوّدہ سازی کے دور میں ہوا یوں تو اسلامی حقوق انسانی ابتدائی ڈرافٹ انہوں نے تیار کیا بعد میں جناب صلاح الدین صاحب مدیر تکبیر اور میں لندن پہنچے۔ ہم نے ایک متبادل ڈرافٹ تیار کیا۔ یہ مرحوم ڈاکٹر صاحب کی وسعت قلبی تھی کہ انہوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ اور بلا کسی حیل و حجت کے ہمارے ڈرافٹ کو اپنا لیا اور بہت ہی کھلے دل کے ساتھ ہماری بات مان لی۔ مجھے اس شخص کی عظمت کا اندازہ اس وقت ہوا کہ نہ صرف یہ ایک جوشیلا اور پُر خلوص انسان ہے بلکہ ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ ایک ذہنی وسعت قلب بھی رکھتا ہے۔ جس کی کوئی اور مثال مجھے اس دور میں کم نظر آتی ہے۔''

آپ کی شخصیت پر بہترین تبصرہ ان الفاظ میں کیا جاسکتا ہے:

''آپ صائب الرائے، حاضر دماغ، زیرک اور منصوبہ ساز شخصیت کے مالک تھے۔ آپ مسائل پر نہایت ٹھنڈے دل و دماغ سے گھنٹوں غور کرتے۔ کبھی بھی جذباتی انداز سے اپنی فکر کو آلودہ نہیں کیا۔ لیکن جب کسی مسئلہ پر غور وفکر کے بعد اسٹینڈ لیا تو پھر کبھی بھی اپنے موقف سے دستبردار نہیں ہوئے تاوقتیکہ مخالف نے علمی انداز سے آپ کو قائل نہ کرلیا ہو۔ آپ کے لیے اگر مردِ میدان (Bold in Combat) کی اصطلاح استعمال کی جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر راجی الفاروقی مسلمانوں کے علمی زوال کا اسلامی ممالک کی قیادت کو ذمّہ دار گردانتے تھے۔ آپ حکمرانوں کی خود غرضی، دولت کی ہوس، تنگ نظری، اسلامی نظریات سے فرار اور باہمی تفرقہ کے حوالہ سے اکثر اپنے مضامین میں نکتہ چینی کرتے تھے۔ آپ کے ایک قریبی دوست ڈائریکٹر آف ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز، عالمی ادارہ افکارِ اسلامی۔''

ڈاکٹر سیّد سعید کے الفاظ میں:

''مسٹر اینڈ مسز فاروقی کا ثانی ملنا بہت مشکل ہے۔ ان کے قتل نے نہ صرف یہ کہ شمالی امریکہ کے مسلمانوں میں بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں میں متحد اور متحرک رہنے کا

احساس پیدا کر دیا ہے۔ اس ادارے (عالمی ادارہ افکارِ اسلامی) کا پروگرام کے مطابق مستحکم اور متحرک ہونا اس احساس کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ یقینی طور پر نظام کو درست رکھنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ لیکن کام کو جاری رکھنے کے لیے سخت ارادہ بھی موجود ہے جو فاروقی دور کا ورثہ ہے۔"

ڈاکٹر فاروق آسمان علم و ادب کا ایک ایسا جگمگاتا ہوا ستارہ تھا جس کی یاد مدتوں رہے گی۔ آپ کی ذاتی لائبریری میں مختلف علوم پر پندرہ ہزار کتب تھیں جو پانچ سو سینتیس (۵۳۷) بکسوں میں بند تھیں۔ اب یہ کتب "عالمی ادارہ افکارِ اسلامی" کی ملکیت ہیں۔ آپ نے اپنی ساری زندگی اسلامی علوم کی تدریس اور تحقیق کے لیے وقف کی ہوئی تھی۔ خاص طور پر آخری دس برسوں میں تو گویا آپ علمی اور تحقیقی کاموں میں اس حد تک منہمک ہو گئے تھے کہ دن رات کا بھی ہوش نہیں تھا۔ آپ مسلمانوں کے لیے تعلیمی میدان میں مغرب سے ہٹ کر ایک نیا تجربہ کرنا چاہتے تھے۔ مغربی نظامِ تعلیم پر آپ کو اعتماد نہیں تھا۔ آپ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ مسلمانوں میں خرابی کی اصل جڑ مغربی طرز پر قائم یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم میں مضمر ہے۔

آپ کے الفاظ میں:

"یہ ادارے جن افراد کو ڈگریاں دے رہے ہیں وہ مغربی دانشوروں کی ہو بہو تصویر ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ نہ تو مغربی اور نہ ہی اسلامی اسکالر ہوتے ہیں جب ایک اسلامی اسکالر مغرب میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتا ہے تو وہ خالی الذہن ہوتا ہے، اسے اسلام کا نقطۂ نظر معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی نامکمل تربیت مغربی انداز سے ہوئی ہوتی ہے۔"(۲۶)

آپ مغربی نظامِ تعلیم میں جس طرح کی اصلاح چاہتے تھے وہ سیّد احمد خان اور مفتی محمد عبدہ کے تعلیمی پروگراموں سے بالکل مختلف تھی۔ آپ کے ذہن میں مسلمان نوجوانوں کے لیے جو تعلیمی خاکہ تھا وہ امام غزالیؒ کے احیائے علوم الدین میں دیے گئے پروگراموں سے ملتا جلتا ہے۔

آپ روایاتی دینی مدارس سے فارغ نوجوان پر اعتماد نہیں کرتے تھے کیونکہ دنیا میں کسی بھی جگہ روایتی

مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ جدید خطوط پر تربیت یافتہ نہیں۔ جبکہ دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ اسلامی فکر سے آشنا نہیں۔ آپ اسلامی علوم کی تجدید اور مغربی تربیتی نظام کی اسلامی نقطۂ نظر سے دوبارہ تشکیل چاہتے تھے۔ یہی وہ واحد مقصد تھا جس کے لیے شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال اور مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ اپنی زندگی میں کوشش کرتے رہے۔ اس واحد مقصد کے لیے حضرت علامہ اقبال نے مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو پنجاب آنے کی دعوت دی تھی۔ ڈاکٹر فاروقی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش مافوق الطبعیاتی اور روحانی ہے نہ کہ تاریخی اور سیاسی۔

ڈاکٹر فاروقی متعدد بین الاقوامی تنظیموں اور اداروں کے رکن تھے۔ یہ تنظیمیں اور ادارے یورپ اور امریکہ میں مستشرقین کا علمی میدان میں مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ متعدد علمی جرائد کے ایڈیٹر اور مشاورتی کمیٹیوں میں بھی شامل رہے۔ ان جرائد میں قابلِ ذکر ''جرنل آف دی ریلیجن اینڈ سائنس''، ''جرنل آف ساؤتھ ایشیاء اینڈ مڈل ایسٹ اسٹڈیز'' تھے۔ آپ نے مختلف موضوعات پر پچیس کتب بھی تحریر کیں۔ چند ایک معروف کتب کے نام ذیل میں دیے جا رہے ہیں:

Trilogue of Abrahamic Faiths, 1982
Atlas of Islamic Culture and Civilization.
Historical Atlas of Religions of the World 1974
Life of Muhammad (Peace be upon him) (Translation from
Arabic to English 1976)
Uruba and Religion 1962
Christian Ethics 1967
Great Religions
The Origin of Zionism and Judaism
Islamic Thought and Culture
Tawhid 1982
A Historical and systematic analysis of its Dominant Ideas 1967
Christian Mission and the Islamic Dawah 1982
Towards Islamic English (27)

## فصل چہارم

# جسٹس عبدالقادر عودہ

### حالاتِ زندگی

عبدالقادر عودہ ۱۹۰۷ء میں قارہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں کلیۃ الحقوق سے امتیازی حیثیت سے قانون کا امتحان پاس کیا اور لاء ڈپارٹمنٹ میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۴۲ء میں آپ اسماعیلیہ میں جج کی حیثیت سے تعینات تھے کہ آپ کو حسن البناء کی نشست پر پریذائڈنگ افسر مقرر کیا گیا۔ پریذائڈنگ افسر کی حیثیت سے آپ نے انگریزوں، سعدیوں اور وفد کو اپنے حلقہ میں گڑبڑ نہیں کرنے دی۔ انہی انتخابات کے موقع پر آپ پہلی دفعہ اخوانی کارکنوں کے اعلیٰ اخلاق اور اپنے مرشد عام سے محبت کی بناء پر متاثر ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں آپ نیشنل کورٹ کے جج تھے کہ حسن البناء کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، اسی سال آپ حسن الھضیبی کی دعوت پر اخوان المسلمون میں شامل ہوئے۔ سرکاری ملازم ہونے کی حیثیت سے آپ کی رکنیت خفیہ رکھی گئی۔ ۱۹۵۱ء میں مرشد عام حسن الھضیبی کے حکم پر آپ نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے آپ کو اخوان کے لیے وقف کر دیا۔ جلد ہی اخوان المسلمون کی گائیڈنس کونسل اور مشاورتی اسمبلی نے آپ کو اخوان المسلمون کا ڈپٹی لیڈر منتخب کیا، اخوان کے ڈپٹی لیڈر کی حیثیت سے آپ اخوان المسلمون کو انقلاب مصر ۱۹۵۲ء سے پہلے کے بحران اور پھر انقلاب کے بعد کے بحران سے نکالنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ انقلابی کونسل کی بدنیتی کے سبب آپ کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں اور بالآخر آپ کو اپنی جان کا نذرانہ دینا پڑا۔ جسٹس عبدالقادر عودہ کا شمار مغربی قانون اور اسلامی فقہ کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ آپ کی کتاب "التشریع الجنائی الاسلامی" ۱۹۵۱ء میں فواد اوّل انعام کی مستحق ٹھہرائی گئی۔ انعام دینے والی کمیٹی نے شرط یہ لگائی کہ اگر مصنف مذکورہ خاندانی ملوکیت کے بارے میں چند فقرے حذف کر دیں تو انہیں ایک ہزار مصری پونڈ کا انعام دے دیا جائے گا۔ عبدالقادر عودہ نے انکار کر دیا یوں انعام کے مستحق ٹھہرائے جانے کے باوجود بھی انعام حاصل نہ کر سکے۔ یہ کتاب آپ نے ۱۹۴۹ء میں تحریر کی تھی۔ آپ کی دیگر تصانیف میں چند ایک کتب جن کا سراغ لگ

سکا ہے درج ذیل ہیں:

- الاسلام و اوضاعنا القانونية
- الاسلام و اوضاعنا السالية
- المال والحكم فى الاسلام
- الاسلام و بين جهل انباله و عجز علمانه وغيره وغيره

دسمبر ۱۹۵۴ء کے سورج کو طلوع ہوئے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے تھے کہ مصر کی انقلابی حکومت کے خود ساختہ پیپلز ٹریبونل کے تین ارکان جمال سالم، حسین شافعی اور انور السادات کمال مہربانی اور شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جمال عبدالناصر حکومت کے باغی جسٹس عبدالقادر عودہ کو اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اگرچہ مقدمہ کی کاروائی مکمل ہو چکی تھی اس کے باوجود یہ صاحب عزیمت انسان نتائج سے بے فکر انقلابی کونسل کے گماشتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں گویا ہوا:

> ''کیا...... ایک جج کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ ایسی دنیا میں بے تعلق ہو کر رہ سکے، جہاں قانون ختم کر دیا گیا ہو اور جس کی لاٹھی اسی کی بھینس کا اُصول لاگو ہو۔ جہاں قانون، لوٹ کھسوٹ اور مظالم کے جواز کا آلہ کار بن کر رہ گیا ہو اور خوشامدی حکومت کے مناصب اور ہر طرح کے فوائد سے متمتع ہو سکتے ہوں اور جہاں نفاق کامیابی کا واحد ذریعہ خیال کیا جاتا ہو۔ اور اباحیت و بداخلاقی کو جاہ و منزلت کی اوّلین شرط سمجھا جاتا ہو۔''

> ''کیا ایک جج اس بات کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر سکتا ہے کہ اس کے ملک میں جاہلیت کی حکمرانی ہو۔ زیردست اپنا خون پسینہ ایک کر کے کمائیں اور زبردست گلچھرے اُڑائیں۔ کمزور کو اپنے رُوح اور جسم کا رابطہ قائم رکھنے کے لیے سوکھا نوالہ اور میلا چیتھڑا بھی میسّر نہ ہو اور طاقتور سونے اور چاندی سے دل بہلا رہا ہو اور اگر کمزور شکایت کرے تو قانون اس کے خلاف حرکت میں آجائے۔''

''پھر...... کیا ایک جج ٹھنڈے دل سے یہ بات برداشت کرسکتا ہے کہ ملک کے دستور میں تو یہ دفعہ درج ہو کہ مملکت کا دین اسلام ہے لیکن اس کی حکومت اور حکمران اسلام کی کھلم کھلا خلاف ورزیاں کریں اور خادمانِ اسلام کے خون کے پیاسے بن جائیں۔ ''تعاونوا علی البر و التقویٰ'' کی خواہش رکھنے والے نشانۂ ستم بنیں اور ''تعاونوا علی الاثم و العدوان'' کے مرتکبین کی سرپرستی ہو۔''

''تب کیا ایک جج ایسے حالات میں غیر جانب دار رہ سکتا ہے۔ جبکہ پورا ملک اخلاقی فضائل و محاسن سے عاری ہوتا جا رہا ہو۔ دیانت اور حسن اخلاق کا نام و نشان مٹ رہا ہو اور لوگ موجودہ لیڈروں کو اپنے لیے اُسوہ ''نمونہ'' قرار دینے لگے ہوں۔''

جسٹس عبدالقادر عودہ کے اس ایمان افروز بیان کے بعد ٹریبونل کی کاروائی تین دسمبر تک روک دی گئی اور پھر جمال سالم نے اگلے دن (۴ دسمبر ۱۹۵۴ء) صدر عدالت کی حیثیت سے بارہ قیدیوں کو سزائے موت اور نو کو مختلف قسم کی سزائیں سنائیں۔

ٹھیک چار روز بعد چشم فلک نے یہ دردناک نظارہ بھی دیکھا کہ عبدالقادر عودہ رقص کرتا ہوا تختہ دار کی طرف روانہ ہوا اور اللہ کی راہ میں شہادت پا کر حضرت خبیب ﷛ کے واقعہ شہادت کی یاد تازہ کر دی۔

تغیر پذیر مصر (Egypt in Transition) کا فاضل مصنف سامون جین لکھتا ہے کہ:

''یہ آٹھ دسمبر کا دن تھا آٹھ اور دس بجے کے درمیان ایک عظیم انقلابی تحریک کے چھ افراد سروں پر سرخ ٹوپیاں، ڈھیلی ڈھالی سادہ قمیصیں پہنے تختہ دار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یکے بعد دیگر تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔''(۲۸)

ڈپٹی لیڈر عبدالقادر نجیب کا دست راست اکڑ کے تختہ دار کی طرف جا رہا تھا۔ وہ بلند آواز سے قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے شرمندہ اخبار نویسوں پر نگاہ ڈالی اور فرمایا:

''میرا خون انقلاب کے لیے لعنت ثابت ہوگا۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے شہادت کی موت دی۔''

فاضل مصنف لکھتا ہے کہ:

''ان کے چہرے پر ایک خاص قسم کی روحانیت ٹپک رہی تھی جو بہت کم لوگوں کے چہروں پر دیکھنے میں آتی ہے۔''

تحریک اخوان المسلمون سے دلچسپی رکھنے والے ذہنوں میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عبدالقادر عودہ کو پھانسی کی سزا کیوں دی گئی؟ اور یہ کہ عبدالقادر عودہ کا قصور کیا تھا؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے ہمیں اس فردِ جرم کا جائزہ لینا ہوگا جو حکومت کی طرف سے ''ملزموں'' کو مہیا کی گئی تھی۔ اس کے مطابق:

''اخوان المسلمون کا روّیہ فوجی انقلاب کے بارے میں ہمیشہ سے منفی اور معاندانہ رہا ہے اور انہوں نے انقلابی تحریک کی شروع ہی سے مخالفت کی ہے، اسے ناکام بنانا چاہا ہے اور اس کے خلاف مسلسل پروپیگنڈہ کیا ہے۔ انہوں نے فوج اور پولیس کے اندر خفیہ تنظیمیں قائم کی ہیں اور حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لیے ملک گیر سازش تیار کی ہے، اس کے علاوہ اخوان کے قائدین نے انگریزوں سے خفیہ گٹھ جوڑ کیا ہے اور ان سے مل کر فوجی حکومت کے خلاف منصوبہ بنایا ہے۔ اس لیے حکومت نے اخوان کو خلافِ قانون قرار دیا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد انہیں دوبارہ کام کرنے کا موقعہ دیا گیا لیکن وہ اپنی سابقہ روش اور جوڑ توڑ سے باز نہ آئے حتیٰ کہ انہوں نے وزیر اعظم جمال عبدالناصر کے قتل کی سازش تیار کی۔ ان حالات میں یہ امر ناگزیر تھا کہ اخوان کا خاتمہ کر دیا جائے اور مصر کو رجعت پسند عناصر سے پاک کر دیا جائے۔''

اخوان المسلمون نے انقلاب مصر ۱۹۵۲ء کے لیے جو خدمات سرانجام دی تھیں وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ انقلاب مصر پر ایک دو نہیں سینکڑوں کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان کتب میں کسی نہ کسی شکل میں اخوان کی خدمات اور شمولیت کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔ انقلاب کے لیے اخوان المسلمون کی خدمات تاریخ مصر کا لازمی جزو بن چکی ہیں۔ جنہیں بددیانت سے بددیانت تاریخ نویس بھی خارج نہیں کر سکتا۔ جمال عبدالناصر اور اس کے حواری صرف یہ چاہتے تھے کہ اخوان انقلاب کی جدوجہد کے دوران کیے جانے والے وعدوں کی

یاد دہانی نہ کرائیں اور جو کچھ بھی وہ کریں یہ ان کی پیروی کرتے رہیں۔ اخوان المسلمون کی مرکزی قیادت انقلابی کونسل کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ چنانچہ ان کو راستے سے ہٹانے کے لیے جمال عبدالناصر پر قاتلانہ حملہ کا ڈرامہ رچایا گیا جہاں تک کہ عبدالقادر عودہ کا تعلق تھا انہوں نے ۱۹۵۱ء میں مرشد عام حسن الھضیبی کے حکم پر عدالت عالیہ کی ملازمت کو خیر باد کہہ کر سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ دیانت، قانون دانی اور خداداد صلاحیتوں کے سبب آپ کا شمار جلد ہی اخوان کے صفِ اوّل کے قائدین میں ہونے لگا۔ اس وقت مصر کے سیاسی حالات نہایت ابتر ہو چکے تھے۔ انگریزوں کے خلاف نفرت میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ پوری مصری قوم انگریزوں کو وطن سے نکالنے کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحدہ و منظم تھی۔ شاہ فاروق اور اس کے حمایتی انگریزوں کے وجود کو اپنے لیے نعمت غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔ ان حالات میں اخوان نے نہر زون کے علاقہ میں مقیم برطانوی فوج کے خلاف جہاد کا اعلان کیا اور غالباً جسٹس عبدالقادر عودہ کو ملازمت سے فارغ کرانے کا پس منظر بھی یہی تھا۔ اس سلسلہ میں اخوان نے پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف رضا کاروں کی بھرتی کے لیے کیمپ قائم کیے اور بہت جلد ہی تین سو رضا کاروں کا پہلا دستہ مصر کی باقاعدہ فوج کے ساتھ مل کر جہاد میں مصروف ہو گیا۔ جنگ فلسطین کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ اخوان کو فوج کے ساتھ یوں آزادانہ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ شیخ عبدالقادر عودہ رضا کاروں کو اسلحہ کی سپلائی کے نگران تھے، ان کا فوج کے نوجوان افسروں خاص طور پر جمال عبدالناصر سالم برادران عبدالحکیم عامر، زکریا محی الدین، خالد محی الدین اور انور السادات وغیرہ سے اکثر رابطہ رہتا تھا۔ جنرل نجیب، جمال عبدالناصر انور السادات شاہ فاروق وغیرہ سبھی اپنی یادداشتوں میں تسلیم کرتے ہیں کہ اخوان کی مدد کے بغیر جولائی ۵۲ء کا انقلاب کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا تھا۔ انقلاب کی منصوبہ بندی کرتے وقت یہ طے ہوا تھا کہ اگر نہر زون کے علاقہ میں مقیم برطانوی فوجی دستے یا فاروق کی سیاسی پولیس مزاحمت کریں یا کسی اور وجہ سے انقلاب کی کامیابی مشکوک نظر آئے یا کوئی ادارہ انقلاب کے راستے میں رکاوٹ بنے تو انقلابی کونسل کے ''جیالوں'' کو محفوظ مقامات تک پہنچانے، بیرونِ ملک فرار کرانے یا مقابلہ کی صورت میں اخوان رضا کار دستے مزاحمتی حصار قائم کریں گے۔ یہ نازک ذمّہ داری بھی جسٹس عبدالقادر عودہ کے سپرد کی گئی تھی۔ آپ اخوانی کمانڈوز کے سپریم کمانڈر تھے۔ جن کا کام ہر صورت

میں انقلاب کو کامیاب بنانا تھا۔ عبدالقادر عودہ شہید اخوان المسلمون میں شمولیت سے پہلے کوئی غیر معروف شخصیت نہیں تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ حربی میدان میں ان کے اصل جوہر تو اب کھل رہے تھے، نوجوان افسر عبدالقادر عودہ کی صلاحیتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان پر یہ بات انقلاب ہی کے دنوں میں عیاں ہوگئی تھی کہ انقلاب کے بعد اگر اخوان فوج سے مطمئن نہ ہوئے تو سخت مزاحمت ہوگی۔ اس سلسلہ میں انہیں دو جسٹسوں حسن الھضیبی اور عبدالقادر عودہ سے زیادہ خطرہ تھا۔ انقلاب کے بعد اخوان یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب تھے کہ فوج واپس بیرکوں میں چلی جائے اور معمول کی پارلیمانی زندگی شروع کی جائے۔ اس طرح ملک میں اسلامی نظام کی راہ ہموار ہوگی۔ لیکن ناصر اور اس کا سازشی ٹولہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اخوان، کونسل ہنی مون کا پہلا سال خیریت سے گزرا۔ انقلابی کونسل نے اخوان المسلمون کو مطمئن کرنے کے لیے سو ارکان پر مشتمل دستوریہ تشکیل دی جس میں اخوان المسلمون کے تین ارکان جسٹس عبدالقادر عودہ، اُستاذ صالح عشاوی اور محمد کمال خلیفہ شامل کیے گئے۔ عبدالقادر عودہ نے دستوری کمیٹی کے سامنے اسلامی دستور کی تشکیل کے لیے ٹھوس تجاویز اور بنیادی اُصول جن پر دستور کا ڈھانچہ ترتیب دینا تھا فراہم کیے اس کے علاوہ کمیٹی برائے ''حقوق اور آزادی'' کے رکن کی حیثیت سے خواتین کے سیاسی حقوق کے سلسلہ میں بعض غلط فہمیوں کو بھی دور کیا ہے۔ آپ نے اس کمیٹی کے ارکان کو تفصیل سے بتایا کہ اسلامی مملکت میں خواتین کے لیے کسی قسم کے سیاسی حقوق نہیں ہوتے۔ دستوری کمیٹی جس انداز میں کام کر رہی تھی اخوانی نمائندوں نے بہت جلد ہی محسوس کیا کہ انقلابی کونسل انہیں صرف ''لالی پوپ'' دے کر ٹرخا رہی ہے۔ ایسی طفل تسلیاں تیسری دنیا کے فوجی حکمران سیاست دانوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ہمیشہ سے دیتے رہے ہیں۔ حقیقت میں اندرونِ خانہ کچھ اور ہی منصوبہ بندی کی جارہی تھی۔ چنانچہ پہلے جنرل نجیب کو نہایت ہی گھٹیا طریقہ سے رخصت کیا گیا اور پھر اخوان پر ہاتھ ڈالا گیا۔

جسٹس عبدالقادر عودہ کا شمار مصر کے ان چیدہ چیدہ افراد میں سے ہوتا تھا جو بین الاقوامی قانون خاص طور پر فرانسیسی قانون میں مہارت رکھتے تھے۔ وکلاء، دانشوروں اور عدلیہ کے ججوں میں آپ کا ایک خاص مقام تھا۔ قانون کے تقابلی مقابلہ پر آپ کی کتاب ''التشریع الجنائی الاسلامی'' اہل علم سے خراجِ تحسین وصول

کر چکی تھی۔ عدلیہ کے جج فیصلہ کرتے وقت اس کتاب سے رہنمائی لیتے تھے اور اپنے فیصلوں میں اس کتاب کا بطورِ خاص حوالہ دیتے تھے۔ انقلابی کونسل کے ارکان میں جمال عبدالناصر اور سادات کے علاوہ بائیں بازو کے نظریات کے حامی کرنل یوسف منصور، کرنل صادق، کرنل عبدالمنعم امین، زکریا محی الدین وغیرہ عبدالقادر عودہ کی علمی شخصیت اور مصر کی بااثر سوسائٹی میں ان کے اثرات بخوبی جانتے تھے، انہیں معلوم تھا کہ عبدالقادر عودہ جیسی شخصیتوں کی اخوان میں موجودگی ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوگی۔ اسی سبب وہ اخوان سے خطرے کی بو سونگھ رہے تھے اور یہ خطرہ اتنی دیر ٹلتا ہوا نظر نہیں آتا تھا جتنی دیر اخوان کے مرکزی لیڈروں کو راستہ سے ہٹایا نہیں جاتا تھا۔ جنرل نجیب، عبدالقادر عودہ تعلقات بھی انقلابی کونسل کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ جنرل نجیب انقلاب مصر ۵۲ء کے ہیرو تھے، انقلاب کے بعد چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر مصر بھی وہی تھا۔ انقلابی کونسل نے اسے اعتماد میں لیے بغیر ۱۵ جنوری ۹۵۴ء کو اخوان پر پابندی لگادی جب نجیب نے احتجاج کیا تو کچھ عرصہ بعد (۲۳ فروری) اسے زبردستی فارغ کر دیا گیا۔ ان دو واقعات کا عبدالقادر عودہ کی شہادت سے گہرا تعلق ہے۔ انقلابی کونسل کے اس اقدام سے فوج اور عوام میں ناراضگی کی لہر دوڑ گئی۔ خالد محی الدین جیسے ناصر کے دست راست نے فوج میں بغاوت کرادی اور استعفیٰ کی دھمکی داغ دی۔ بالآخر انقلابی کونسل جھک گئی اور ۲۶ فروری کو نجیب کے استعفیٰ کی نامنظوری کا اعلان کر دیا۔ ۲۷ فروری کو اخوانی طلبہ نے جنرل نجیب کے حق میں جلوس نکالا۔ جلوس کے شرکاء انقلابی کونسل کے خلاف نعرے لگا رہے تھے اور جنرل نجیب سے ملاقات کے خواہاں تھے۔ خدیو اسماعیل پُل جلوس کے ایک حصہ کو پولیس نے آگے بڑھنے سے روکا اور گولی چلادی۔ جلوس کا ایک اور حصہ عبدالقادر عودہ کی قیادت میں قصر عابدین پہنچ گیا۔ جنرل نجیب نے قصر عابدین کی بالکونی پر کھڑے ہو کر جلوس سے خطاب کیا اچانک اس کی نظر عبدالقادر عودہ پر پڑی۔ جنرل نجیب نے انہیں بالکونی پر بلایا۔ عبدالقادر عودہ اس حالت میں بالکونی پر گئے کہ ان کے ہاتھ میں زخمی طلبہ کے خون سے بھرا ہوا رومال تھا، انہوں نے ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> ''آپ لوگوں نے اپنے جذبات کا اظہار کر دیا ہے اور اپنے مطالبات پیش کر دیے ہیں اب آپ لوگ اپنے گھروں کو چلے جائیں۔''

عمر تلمسانی کے الفاظ میں:

''یہ کہنا تھا کہ چند منٹوں کے اندر میدان عابدین یوں خالی ہو گیا کہ گویا وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ اس پر عبدالناصر نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ عبدالقادر کی مقبولیت اس کی حکومت کے لیے کسی بھی وقت خطرہ بن سکتی ہے۔''

چنانچہ اسی دن پولیس نے ۱۱۱۷ افراد کو گرفتار کر لیا ان میں عبدالقادر عودہ سمیت چوالیس دیگر اخوانی بھی شامل تھے۔ اس واقعہ کے بعد اخوان المسلمون اور انقلابی کونسل میں گہری ٹھن گئی۔ عبدالقادر عودہ جو اخوان المسلمون پر پابندی اور دیگر اختلافات ختم کرانے سے متعلق کونسل سے مذاکرات کر رہے تھے۔ اس سے ان مذاکرات کو بھی شدید دھچکا لگا۔ کونسل اگر جنرل نجیب کی برطرفی کا ڈرامہ نہ رچاتی تو اخوان کونسل مذاکرات یقیناً کامیاب ہوتے۔ اگرچہ عارضی طور پر اخوان پر پابندی ختم کر دی گئی اور عبدالقادر عودہ رہا کر دیے گئے لیکن آپس میں غلط فہمیاں دور نہ ہو سکیں۔ انقلابی کونسل نے نئی منصوبہ بندی کی۔ اس کے تحت بعض اخوانیوں سے ساز باز کر کے حسن الحضیبی کو مرشد عام کے عہدے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا گیا، مقصد صرف یہ تھا کہ اخوان المسلمون کی ہائی کمان میں اختلافات کو ہوا دے کر کارکنوں کے درمیان تصادم کرا دیا جائے۔ انقلابی کونسل اس میں بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ عبدالقادر عودہ، اُستاد محمد فراغلی، حامد ابوالنصر، عمر تلمسانی وغیرہ نے باغیوں کی ایک نہ چلنے دی۔ چنانچہ خفت مٹانے کے لیے کارکنوں کی گرفتاریاں شروع کر دی گئیں۔ مارچ ۱۹۵۴ء میں ان گرفتاریوں کی ابتداء ہوئی۔ جو جمال عبدالناصر کے پورے دورِ حکومت میں جاری رہیں۔ اکتوبر میں اخوان پر پابندی لگا کر رہی سہی کسر بھی پوری کر دی گئی۔ جب اس طرح بھی کام نہ چلا تو ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو ''صدر جمہوریہ'' پر قاتلانہ حملے کا ڈرامہ رچایا گیا، واقعات کے مطابق جمال عبدالناصر اسکندریہ میں ایک پبلک ریلی سے خطاب کر رہا تھا کہ یکے بعد دیگرے اس پر آٹھ فائر ہوئے، فائر کس نے کیے؟ آج تک نہ پتہ چل سکا لیکن پھندا اخوانیوں کے گلے میں پڑا۔ ناصر حملہ سے ''بدحواس'' ہونے کے بجائے پکارتا ہے: ''پکڑو پکڑو یہ کوئی اخوانی ہے'' تقریر کی طرح یہ فقرے بھی رٹے ہوئے تھے۔ حملے کے الزام میں پورے ملک میں ہزاروں اخوانیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان گرفتار شدگان میں جسٹس عبدالقادر عودہ بھی شامل تھے اس واقعہ کے تین روز بعد

حکومت کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ بہت جلد ہی پیپلز ٹریبونل جمال عبدالناصر پر حملہ کرنے والوں کے خلاف کاروائی کا آغاز کرے گا۔ ٹریبونل جمال سالم، حسین شافعی اور انور السادات پر مشتمل تھا۔ ٹریبونل نے ۹ نومبر ۱۹۵۴ء کو مقدمہ کی کاروائی کا آغاز کیا اور ایک ماہ سے بھی کم عرصہ میں ''ملزموں'' کو سزائیں سنائی گئیں۔(۲۹)

## فصل پنجم

# سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ سابق ریاست حیدر آباد کے ایک ایسے خاندان میں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے جس کی پشت پر روحانی قیادت کا ایک طویل شجرہ نسب تھا۔ مولانا کی اپنی اٹھان بہرحال ان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ تھی انہوں نے قرآنِ مجید کو اپنا واحد رہنما بنایا اور اپنی زندگی کو اسلام کی ابدی تعلیم کے مطابق ڈھالا وہ اوّل و آخر مسلمان تھے۔ ان کی شخصیت انسانوں کے خود ساختہ حصار میں مقید نہیں تھی۔

اس ابتدائی دور میں سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے سیاسی مسائل کا اسلام کی روشنی میں جائزہ لیا۔ اس دور کی ممتاز تصنیف ''الجہاد فی الاسلام'' ہے۔ جو امن و جنگ کے اسلامی قانون پر ایک شاہکار علمی کارنامہ ہے۔ جس کی دوسروں کے علاوہ خود علامہ اقبالؒ نے بھی تعریف کی ہے اور اس تحریر نے منفرد اسلامی مفکر کی حیثیت سے سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو مستند کر دیا۔ ۱۹۳۳ء میں انہوں نے ترجمان کی ادارت سنبھالی، جس کے توسط سے انہوں نے اپنے خیالات کو پھیلانا چاہا۔ ابتداء میں ان کی توجہ اسلام کے بنیادی اُصول اور افکار و اقدار کی تشریح پر مرکوز رہی۔ بعد ازاں انہوں نے اسلام اور مغربی افکار کے تصادم سے پیدا ہونے والے مسائل پر خصوصی توجہ دی۔ ایسے پیچیدہ مسائل سے نمٹنے کے لیے انہوں نے قرآن پر مبنی نیا اسلوب وضع کیا۔ ۱۹۴۱ء میں انہوں نے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی۔ جس کی ذریعے وہ اسلامی خطوط پر اسلامی معاشرے کی تشکیل نو سے متعلق اپنے افکار و تصوّرات کو ایک باقاعدہ تنظیم کی صورت دینا چاہتے تھے۔ (۳۰)

## سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تصانیف و خدمات

مولاناؒ کی شہرت اور وقار کا خاص محور ان کی تحریریں ہیں۔ انہیں ایک ایسا قلم ملا تھا جو ہمیشہ جرأت مند، بے باک اور طاقتور رہا۔ انہوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، اسلامی فلسفہ اور تاریخ پر کم و بیش ایک سو بیس کتابیں لکھی

ہیں اور کوئی ۵۲ سال کے عرصے میں ان کی یہ تمام تصانیف درجنوں زبانوں میں ترجمہ ہو کر مولاناؒ کے قلم کو اہل عالم سے روشناس کرا چکی ہیں۔ عالم و مصنف سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ کو ہمارے زمانے کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے مسلمان مصنف کا مرتبہ حاصل ہے۔ ان کی یادگار اور عظیم الشان تفسیر تفہیم القرآن، جس نے احکام آیات قرآنی کو دورِ جدید کے مسائل پر منطبق کیا۔ اس نے ہم عصر اسلامی طرزِ فکر پر برصغیر میں بھی اور باہر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ انتہائی قد آور صاحب علم و دانش تھے۔ اس عظمت و سربلندی پر اپنا حق انہوں نے عہد جدید کے سیاق و سباق میں اسلام کو سمجھانے کی گراں قدر خدمات سے ثابت کیا۔ ان کی یادگار تفہیم القرآن کے علاوہ جس کی تکمیل میں ان کی زندگی کے تیس سال صرف ہوئے، ان کی کتاب سیرت، ان کی عظیم ترین تصانیف میں سے ہیں اسلامی نشاۃ ثانیہ کی بین الاقوامی تحریک کو درپیش مسائل پر بھی ان کی تحریروں کا پورے عالم اسلام میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ (۳۱)

## جرأت و استقامت

پاکستان میں اسلامی نظامِ حیات کے نفاذ کے لیے ان کی مساعی نے انہیں یہاں برسرِ اقتدار آنے والی مختلف حکومتوں سے متصادم کیا۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے اواخر میں انہیں طویل عرصے کے لیے قید و بند کی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ لیکن یہ حوصلہ آزما حربے اور صعوبتیں ان کے عزم کو متزلزل نہ کر سکیں۔ جو کچھ وہ تبلیغ کر رہے تھے، اس پر ان کا اتفاق اور ثابت قدمی و بے باکی اور مقصد سے ان کی لگن کا شاذ و نادر ہی کوئی اور مقابلہ کر سکا ہے۔ انہوں نے پاکستان میں اسلام کو برپا کرنے کے لیے بہت سے دُکھ جھیلے اور ہر قسم کے مصائب برداشت کیے۔ ۱۹۵۳ء میں آپ کو قادیانی مسئلہ پر چلنے والی تحریک کے نتیجے میں پھانسی کی سزا بھی سنادی گئی جس کو بعد میں عوامی اور عالمی احتجاجی ردّعمل کی بناء پر تبدیل کرنا پڑا، غرضیکہ یہ تکالیف و مصائب سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ کو ان کے راستے سے نہ ہٹا سکے۔

## عالمی خدمات

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے تحریکِ اسلامی کو پوری ملتِ اسلامیہ کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنایا اور قبرص، اراکان، اریٹیریا، فلسطین، افغانستان اور کشمیر وغیرہ جیسے ملی مسائل کی اساس معلوم کر کے ان کا ایسا حل تجویز کیا جو اُمت کے مفاد میں ثابت ہوا۔ ان کی تحریریں ایشیاء، افریقہ، یورپ اور دوسری جگہ اسلامی تحریکوں کے لیے نہایت ولولہ انگیز ثابت ہوئیں۔ ان تحریروں نے اخوان المسلمون کے سربراہ حسن البناؒ کی شہادت کے بعد عرب ممالک میں اور کئی دوسرے ملکوں میں اسلامی تحریکوں کو سہارا دیا۔ بالآخر ۱۹۷۹ء میں دنیائے اسلام کی یہ عظیم شخصیت پوری دنیا کو اپنی تحریر، فکر و افکار سے منوّر کرنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوئی اور رب دو جہاں سے جا ملی۔

## سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے افکار و نظریات

امام العصر سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے فرمایا کہ:

> ''قرآن کی تعلیم اپنے پیروؤں میں حمایت حق کی ایسی ناقابل تسخیر رُوح پیدا کرنا چاہتی ہے جس سے ان کے اندر کسی حال میں بدی و شرارت کے آگے سر جھکانے اور ظلم و طغیان کے تسلّط کو قبول کرنے کی کمزوری پیدا نہ ہونے پائے قرآنی تعلیم کے مطابق انسان کی سب سے بڑی ذلت یہ ہے کہ وہ اپنے عیش و آرام یا مال و دولت یا اہل و عیال کی محبت میں مبتلا ہو کر حفاظت حق کی سختیوں سے ڈرنے لگے اور باطل کو طاقت ور دیکھ کر اس کی غلامی قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ یہ ضعف جو درحقیقت جسم و جان کا ضعف نہیں بلکہ قلب و ایمان کا ضعف ہے۔ جب کسی قوم میں پیدا ہوتا ہے تو اس کے اندر سے عزت و شرافت کے تمام احساسات خود بخود دور ہو جاتے ہیں اور اعلائے حق کی اعلیٰ خدمت کو انجام دینا تو درکنار وہ خود اپنے آپ کو بھی حق کے راستے پر قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔''

قرآن جو درحقیقت صحیفہ فطرت ہے فطرت کے اس راز کو پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے اسی بناء پر اس نے انسان کو صرف دو راہیں بتائی ہیں یا موت یا شرف، زندگی بے شرف کی تیسری راہ اس نے نہیں بتائی۔ چاہے اس کے بدنصیب پیروؤں نے اپنے ایمان کی کمزوری اور حوصلہ کی پستی سے خود اس کو اختیار کر لیا ہو۔ وہ تو اس زندگی کو ''ذلت و مسکنت'' قرار دیتا ہے۔ اللہ کے غضب سے تعبیر کرتا ہے۔ اسے ان قوموں کی خصوصیت بتاتا ہے جو اپنی بزدلی اور خشیت ماسوی اللہ کے باعث اپنے تئیں قہر الٰہی کا مستوجب بنالیتی ہیں اور اس کی زبان میں اس ذلیل زندگی کو اختیار کر لینا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے۔

قرآن نے ایسی زندگی اختیار کرنے والوں کو یہ وعید سنائی ہے کہ:

ترجمہ: ''جن لوگوں کی رُوحوں کو فرشتوں نے اس حال میں قبض کیا کہ وہ خود اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے تو انہوں نے ان سے پوچھا کہ تم یہ کس حال میں جی رہے تھے۔ انہوں نے کہا ہم زمین میں کمزور تھے۔ فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس جگہ کو چھوڑ کر نکل جاتے؟ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت بری جائے قرار ہے۔'' (۳۲)

قرآن نے سب معاملات میں تحمل و برداشت کی تعلیم دی ہے مگر ایسے کسی حملے کو برداشت کرنے کی تعلیم نہیں دی جو دینِ اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں پر اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظام مسلّط کرنے کے لیے کیا جائے۔ اس نے سختی کے ساتھ یہ حکم دیا ہے کہ جو یہ تمہارے انسانی حقوق چھیننے کی کوشش کرے تم پر ظلم و ستم ڈھائے۔ تمہاری جائز ملکیتوں سے تم کو بے دخل کرے۔ تم سے ایمان و ضمیر کی آزادی سلب کرے۔ تمہیں اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے روکے اور اس وجہ سے تمہارے درپے آزار ہو کہ تم اسلام کے پیروکار ہو تو اس کے مقابلے میں ہرگز کمزوری نہ دکھاؤ اور اپنی پوری طاقت اس کے اس ظلم کو دفع کرنے میں صرف کر دو۔ یہ حفاظت دین اور مدافعت دیار اسلام کا ایسا سخت حکم ہے کہ جب کوئی قوت اسلام کو مٹانے اور اسلامی نظام کو فنا کرنے کے لیے حملہ آور ہو تو تمام مسلمانوں پر فرض عین ہو جاتا ہے کہ سب کام چھوڑ کر اس کے مقابلے پر نکل آئیں اور جب تک اسلامی نظام اور اسلام کو اس خطرہ سے محفوظ نہ کر لیں اس وقت تک چین نہ لیں۔

## ظلم وتعدی کا جواب

بقول اکابر مفسرین، اسلام میں پہلی آیت جو قتال کے متعلق اُتری ہے وہ سورۂ حج کی یہ آیت ہے:

ترجمہ: ''جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے انہیں جنگ کی اجازت دے دی گئی کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے نکالے گئے ہیں صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے کہ صرف اللہ ہی ہمارا رب ہے۔'' (۴۳)

علامہ ابن جریر اور بعض دوسرے مفسرین جنگ کی پہلی آیت مندرجہ ذیل قرار دیتے ہیں جو سورۃ البقرہ کی ہے:

ترجمہ: ''اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر حد سے نہ بڑھو کہ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور ان کو مارو جہاں پاؤ اور ان کو نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے کیونکہ فتنہ قتل سے زیادہ بُری چیز ہے۔'' (۴۴)

ان آیات سے حسبِ ذیل احکامات نکلتے ہیں:

۱۔ جب مسلمانوں سے جنگ کی جائے اور ان پر ظلم وستم کیا جائے تو ان کے لیے مدافعت میں جنگ کرنا جائز ہے۔

۲۔ جو لوگ مسلمانوں کے گھر بار چھینیں، ان کے حقوق سلب کریں اور انہیں ان کی ملکیتوں سے بے دخل کریں ان کے ساتھ مسلمانوں کو جنگ کرنی چاہیے۔

۳۔ جب مسلمانوں پر ان کے مذہبی عقائد کے باعث تشدد کیا جائے اور انہیں محض اس لیے ستایا جائے کہ وہ مسلمان ہیں تو ان کے لیے اپنی مذہبی آزادی کی خاطر جنگ کرنا جائز ہے۔

۴۔ دشمن غلبہ کر کے جس سرزمین سے نکال دے یا مسلمانوں کے اقتدار کو وہاں سے مٹا دے، اسے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور جب کبھی مسلمانوں کو طاقت حاصل ہو تو انہیں ان تمام

مقامات سے دشمن کو نکال دینا چاہیے جہاں سے اس نے مسلمانوں کو نکالا ہے۔

## مظلوم مسلمانوں کی حمایت

مسلمانوں کی کوئی جماعت اپنی کمزوری اور بیچارگی کے باعث دشمنوں کے پنجہ میں گرفتار ہو جائے اور اس میں اتنی قوت نہ ہو کہ اپنے آپ کو چھڑا سکے۔ ایسی حالت میں دوسرے مسلمانوں پر جو آزاد ہوں اور جنگ کی قوت رکھتے ہوں یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے ان مظلوم بھائیوں کو اس ظلم سے نجات دلانے کے لیے جنگ کریں۔

قرآنِ کریم میں ارشاد ہوا ہے:

ترجمہ: ''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے جنگ نہیں کرتے جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کسی کو حامی اور اپنی طرف سے کسی کو مددگار بنا۔'' (۳۵)

جب تک کوئی شخص مسلمان ہے۔ خواہ وہ دنیا کے کسی کونے میں ہو، اس سے مسلمانوں کا تعلق نصرت و مددگاری کسی حال میں منقطع نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کے دین کو کوئی خطرہ ہو یا اس پر ظلم ہو اور وہ دینی رشتہ کا واسطہ دے کر مدد مانگے تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس کی مدد کو پہنچیں۔

## دفاع کی غرض وغایت

اس عنوان کے تحت مولانا نے فرمایا:

''اب دفاعی جنگ کی ان تمام صورتوں کے اندر ایک ہی مقصد کام کر رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین اور اپنے قومی وجود کو کسی حال میں بدی و شرارت سے مغلوب نہ ہونے دیں اور یہ بدی جس راہ سے بھی خروج کرے خواہ باہر سے خواہ

اندر سے اس کا سر کچلنے کے لیے ہر وقت مستعد رہیں۔ اللہ کو مسلمانوں سے جو خدمت لینی ہے اس کے لیے اوّلین ضرورت ان کا فتنوں سے محفوظ رہنا اور ان کی قومی وسیاسی طاقت کا مضبوط رہنا ہے اگر وہ خود اپنے آپ کو مٹنے سے نہ بچائیں اور اندرونی و بیرونی دشمنوں کی فتنہ پردازیوں سے غفلت برت کر اپنے تئیں ان اجتماعی امراض کا شکار ہو جانے دیں جنہوں نے اگلی ظالم قوموں کو ذلت و مسکنت اور غضب الٰہی میں مبتلا کیا تو ظاہر ہے کہ وہ صرف خود اپنے آپ کو ہی ہلاکت میں نہ ڈالیں گے بلکہ انسانیت کی اس خدمت عظیم کو بھی انجام دینے کے قابل نہ رہیں گے جس کے لیے وہ پیدا کیے گئے ہیں اور یہ ان کا صرف اپنے اوپر ہی نہیں بلکہ تمام عالم انسانی پر ظلم ہوگا۔ پھر اس کے لیے صرف اسی وقت تلوار اُٹھانے کی ہدایت نہیں کی گئی جب کہ بدی اپنا سر نکالے اور فتنہ پردازی شروع کرے بلکہ اس کے مقابلہ پر ہر وقت کمربستہ و مستعد رہنے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ اسے سر نکالنے کی جرأت ہی نہ ہو سکے اور اس پر حق کی ایسی ہیبت بیٹھی رہے کہ اس کا دف اندر ہی مر جائے۔

خود قرآن مجید میں مختلف مواقع پر جنگ کے مقصد اور اس کے مفید نتیجہ کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اس سے صاف طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کا اپنے قوانین باطلہ کی تنفیذ سے فتنہ فساد برپا نہ کرسکنا اور ان کا بدکاری وشرارت سے عاجز ہو جانا اور قانونِ الٰہی کے تحت نظام عدل کا پابند رہنا ان کا صغار (قانونِ الٰہی کی تنفیذ پر راضی رہنا) ہے۔ ”قاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنہ“ (۳۶) میں قتال کا مقصد یہ بتایا ہے کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ ”حتیٰ تضع الحرب او زارھا“ میں قتال کا مقصد یہ بتایا ہے کہ جنگ وفساد کا زور ٹوٹ جائے۔ ”عسیٰ اللّٰہ ان یکف باس الذین کفروا“ میں یہی مفہوم ان الفاظ میں واضح کیا کہ اللہ کافروں کی قوت جنگ و جدال کو توڑ دے۔ پس درحقیقت فتنہ کا باقی نہ رہنا۔ فساد کا مٹ جانا، باطل کے حامیوں کی قوت جنگ کا خاتمہ ہو جانا، کفر کی شیطانی طاقت کا اس حد تک ٹوٹ جانا کہ وہ دنیا کے امن وسکون کو برباد نہ کر سکے اور خلق خدا کی اخلاقی رُوحانی اور مادّی ترقی میں رُکاوٹیں نہ ڈال سکے۔ نیز کافروں کے خودساختہ

قوانین کا منسوخ ہو جانا اور ان کی جگہ اللہ کے اس قانون عدل کا بول بالا ہونا جو بنی نوع انسان کے درمیان ہر قسم کے شیطانی امتیازات کو مٹا کر صرف حق و باطل اور بدی و تقویٰ کا امتیاز قائم کرتا ہے اور ظالموں کے سوا ہر شخص کو امن و آزادی کی خوشخبری دیتا ہے۔ یہی کافروں کا ''صغار'' ہے۔ آیت قتال میں ''حتیٰ یعطو االجزیہ عن یدو ھم صاغرون'' سے مراد یہی صغار ہے۔

## اسلام کا مشن۔ اسلامی حکومت/ریاست

فی الواقع اسلام کا مشن اس دنیا میں ہے کیا؟ کیا وہ جباروں کی سواری کے لیے انسانوں کو سدھارنے آیا ہے تا کہ ہر جبار جب دنیا میں خدائی کرنے اُٹھے تو اسلام کے پیروؤں کو اپنا اطاعت گزار خادم پائے؟ کیا اس نے دنیا بھر کی حکومتوں اور سلطنتوں کے لیے پُر امن رعیت فراہم کرنے کا اجارہ لیا، ہر حکومت کو خواہ اس کا نظام کسی نوعیت کا ہو، اپنی مشینری چلانے کے لیے اسلام کے کارخانہ سے ہر قسم کے ڈھلے ڈھلائے پرزے حاصل ہو جایا کریں؟ کیا اس کا کام بس یہی ہے کہ چند عقائد اور چند اُصول اخلاق کی تعلیم دے کر آدمیوں میں اتنی لچک اور اتنی نرمی پیدا کر دے کہ وہ ہر نظام تمدن میں خواہ وہ کسی قسم کا تمدن ہو بآسانی کھپ سکیں؟ اگر معاملہ حقیقت میں یہی ہے تو اسلام بودھ مذہب اور سینٹ پال کی بنائی ہوئی مسیحیت سے کچھ بہت زیادہ مختلف چیز نہیں ہے اور اسکے بعد یہ سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے کہ ایسے مذہب کی کتاب میں قاتلو ھم جیسا خوفناک لفظ سرے سے آیا ہی کیوں؟ لیکن حقیقت یہ نہیں بلکہ اسلام خود اپنا ایک نظام زندگی رکھتا ہے جس میں عقائد، اخلاق اور عبادات کے ساتھ انفرادی طرزِ عمل اور اجتماعی زندگی کے تمام معاملات سے متعلق احکام و قوانین بھی ہیں اور اسلام کی دعوت اپنے اس پورے نظام کی طرف ہے اور اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کا اپنا نظام ہی برحق ہے اور اسی میں انسان کی فلاح ہے اور اس کے سوا ہر دوسرا نظام باطل ہے اس لیے یہ قطعی ناگزیر ہے کہ اسلام زمین میں اپنے نظام کو غالب اور دوسرے نظامات کو مغلوب کرنے کا بھی تقاضا کرے۔ ایک نظام زندگی کو حق اور صدق ہونے کی حیثیت سے پیش کرنا اور پھر عملاً اس کی اقامت کی دعوت نہ دینا سراسر ایک مہمل بات ہے اور اس سے بھی زیادہ مہمل بات یہ ہے کہ دوسرے نظاموں کو باطل بھی کہا جائیے اور پھر ان کے غلبے کو برداشت بھی

کیا جائے۔ مزید براں یہ بات بھی محال ہے کہ ایک نظام زندگی کی پیروی کسی دوسرے نظام زندگی کے ماتحت رہتے ہوئے کی جاسکے۔ اس لیے وہ صرف ایک فاطر العقل ہی ہوسکتا ہے جو ایک ہی وقت میں اپنے پیش کردہ نظام کی پیروی کا مطالبہ بھی کرے اور ساتھ ہی دوسرے نظامات کے اندر پُر امن وفادارانہ زندگی بسر کرنے کی تعلیم بھی دے۔

پس اسلام کا اپنے مخصوص نظام زندگی کی طرف دعوت دینا عین اپنی فطرت میں اس بات کو مستلزم ہے کہ وہ دوسرے نظامات کو ہٹا کر ان کی جگہ اپنے نظام کی اقامت کا مطالبہ کرے اور اس مقصد کے لیے اپنے پیروؤں کو جدوجہد کی ان تمام صورتوں کے اختیار کرنے کا حکم دے جن سے یہ مقصد حاصل ہوا کرتا ہے اور مدعیان اتباع کے ایمان وعدم ایمان کا نشان امتیاز اسی اُصول کو قرار دے کہ آیا وہ اس جدوجہد میں جان و مال کی بازی لگاتے ہیں یا باطل نظامات کے ماتحت جینے پر راضی رہتے ہیں؟ قرآن اور حدیث دونوں کو اُٹھا کر دیکھ لیجیے آپ کو صاف نظر آئے گا کہ اسلام کا اصل موقف یہی ہے۔

پھر جب حقیقت یہ ہے اور ہم اسلام کی حقیقت کو جان کر اس پر ایمان لائے ہیں تو یقیناً ہمارے وجود کو ہر غیر اسلامی حکومت کے لیے کھلا چیلنج ہونا ہی چاہیے۔ کوئی اس کو برداشت کرے یا نہ کرے، غیر مسلموں کے ساتھ تعاون وتعامل ہوسکے یا نہ ہوسکے۔ بہر حال اگر ہم اپنے ایمان میں صادق ہیں تو ہمارا کام یہی ہے کہ جہاں بھی خدا کا قانون شرعی نافذ نہیں ہے وہاں ہم اس کے نفاذ کے لیے جدوجہد کریں۔ ہمارا مسلمان ہونا اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے کہ جو لوگ خدا سے پھرے ہوئے ہیں وہ ہماری اس جدوجہد کو برداشت بھی کریں اور غیر مسلموں کے ساتھ تعاون وتعامل بھی ہمارے لیے کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس نظام زندگی پر ہم ایمان لائے ہیں اس کے قیام کی جدوجہد صرف اس لیے چھوڑ دیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ تعاون وتعامل اس صورت میں نہ ہوسکے گا۔ اسلام بے شک امن وسلامتی کا حامی ومؤید ہے مگر اس کی نگاہ میں حقیقی امن اور سلامتی وہی ہے جو حدود اللہ کی اقامت سے حاصل ہوتی ہے۔ جس کسی نے امن اور سلامتی کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ شیطانی نظاموں کے زیر سایہ اطمینان کے ساتھ سارے کاروبار چلتے رہیں اور مسلمان کی نکسیر تک نہ پھوٹے۔ اس نے اسلام کا نقطۂ نظر بالکل نہیں سمجھا۔ اسے اچھی طرح معلوم ہوجانا چاہیے کہ اسلام ایسے امن اور ایسی

سلامتی کا ہرگز حامی اور موید نہیں ہے۔ اسے دوسروں کا قائم کردہ امن نہیں بلکہ اپنا قائم کردہ امن مطلوب ہے اور اسی میں وہ انسان کی سلامتی دیکھتا ہے۔

رہا "لا اکراہ فی الدین"، تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلام اپنے عقائد زبردستی کسی سے نہیں منواتا کیونکہ یہ بزور منوانے کی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح وہ اپنی عبادات بھی جن کا لازمی تعلق اس کے عقائد سے ہے زبردستی کسی پر مسلّط نہیں کرتا کیونکہ ایمان صحیح کے بغیر یہ عبادات محض بے معنی ہیں۔ ان دونوں اُمور میں وہ ہر ایک کو آزادی دینے کے لیے تیار ہے۔ لیکن وہ اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ قوانین تمدن جن پر اسٹیٹ کا نظام قائم ہوتا ہے خدا کے سوا کسی اور کے بنائے ہوئے ہوں اور خدا کی زمین پر اس کے باغی اس کو نافذ کریں اور مسلمان ان کے تابع ہو کر رہیں۔ اس معاملہ میں بہرحال ایک فریق کو دوسرے رفیق کے "مذہب" میں مداخلت کرنی ہی پڑے گی اگر مسلمان "مذہب کفر" میں مداخلت نہ کریں گے تو کافر مذہب اسلام میں مداخلت کرکے رہیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی زندگی کے بہت بڑے حصے پر مذہب کفر جاری ہوگا۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ یہ مداخلت کفار کی طرف سے ہو اسلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ مسلمان آگے بڑھ کر نظام زندگی پر قبضہ کریں اور پھر جہاں تک مذہبی عقائد اور عبادات کا تعلق ہے غیر مسلموں کے ساتھ **لا اکراہ فی الدین** کے اُصول پر عمل کریں۔

**لا اکراہ فی الدین** اور **لکم دینکم ولی دین** وغیرہ آیات کا تعلق صرف اس امر سے ہی ہے کہ بلاشبہ ہم کسی غیر مسلم کو مجبور نہ کریں گے کہ وہ اپنا عقیدہ چھوڑ کر اسلام کا عقیدہ قبول کرے یا اپنی مذہبی عبادات کو ترک کر کے نماز روزہ کی پابندی اختیار کرلے لیکن ہم اس کا یہ حق کسی طرح تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ اخلاق، تعلیم، تمدّن، معاشرت، معیشت، قانون اور سیاست وغیرہ اجتماعی اُمور کے متعلق اپنے نظریات کو حاکمانہ قوت کے ساتھ بجبر ہم پر مسلّط کردے۔ دوسرے کو ان کے مسلک پر چلنے دینا بے شک رواداری ہے مگر یہ کوئی رواداری نہیں ہے کہ اپنے مسلک کے خلاف ہم اپنے اوپر دوسروں کے مسلک کا تسلّط برداشت کرلیں۔ ملک کی حکومت جس فلسفہ زندگی پر مبنی ہوگی لامحالہ تمام قوانین اور پوری انتظامی پالیسی اور سارا کاروبار معیشت اسی فلسفے کے نظریات پر چلے گا اور ایسی حکومت کے تحت رہتے ہوئے یہ کسی طرح ممکن ہی نہ ہوگا کہ ہم اپنی زندگی کا

نظام اپنے مذہب و مسلک کے اُصولوں پر چلا سکیں۔ ہم خواہ راضی ہوں یا نہ ہوں، بہر حال مذہب مخالف کے پیرو اپنے سیاسی غلبے کی بدولت اپنے نظریات کو زبردستی ہماری پوری زندگی میں نافذ کر کے چھوڑیں گے۔ اس معاملہ میں رواداری برتنے کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ زنا کو حلال سمجھتے ہوں اور لوگوں کو اس کی عام اجازت دیتے ہوں تو ان کی حکومت میں بے بس رعیت کی حیثیت سے رہتے ہوئے خود ہماری سوسائٹی میں زنا پھیلتی چلی جائے اور ہم اسے گوارا کریں۔ اگر وہ سود کو جائز سمجھتے ہوں اور خود ان کی حکومت سودی لین دین کرتی ہو تو ملک کا انتظام ان کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے ہمارا کوئی بڑے سے بڑا زاہد و متقی تک سود کے غبار سے نہ بچ سکے اور ہم ایک دیا سلائی اور روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہ خرید سکیں جب تک کہ اس قیمت میں سود کا ایک حصہ بالواسطہ ٹیکسوں کی شکل میں ہماری جیب سے نہ نکل جائے۔ اگر وہ دہریت والحاد کے نظریات پر اعتقاد رکھتے ہوں تو ملک کی عمومی تعلیم کا پورا نظام انہی نظریات اور اسی ذہنیت اور اسی ملحدانہ اخلاق پر تعمیر ہو جائے اور باشندگان ملک کے لیے ترقی و خوشحالی کے تمام دروازے اس ایک جہنم کے دروازے کے سوا بند ہو جائیں اور ہمارا کوئی بڑے سے بڑا خدا پرست بھی اپنی نسل کو اس الحاد اور ملحدانہ اخلاق کے اثرات سے نہ بچا سکے۔ اگر وہ خدا کے قوانین کو منسوخ کر کے خود قوانین بنائیں اور ملک کے نظام تمدّن اپنے خود ساختہ قوانین پر قائم کریں تو ہماری معاشی و معاشرتی اور تمدّنی زندگی کا ایک بڑا حصہ مجبوراً اس قانون کی پابندی سے آزاد ہو جائے جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں اور اس قانون پر چلنے لگے جس پر ہمارا ایمان نہیں ہے کوئی ہمیں بتائے کہ آخر یہ رواداری کی کون سی قسم ہے؟ لا اکراہ فی الدین کا یہ مطلب آخر عقل کی رو سے صحیح ہوسکتا ہے کہ دوسروں کی طرف سے دین میں جو اکراہ ہو اسے ہم برداشت کرلیں؟

## ریاست کی ضرورت

یہ ظاہر ہے کہ اجتماعی زندگی کے نظم کو قائم کرنے کے لیے بہر حال ایک قوت قاہرہ کی ضرورت ہے جسے ''اسٹیٹ'' یا ریاست کہتے ہیں۔ عملی زندگی کا تجربہ اور انسانی فطرت کا علم یہی بتاتا ہے کہ تمدّن کا قیام ایک قوت قاہرہ کا یقیناً محتاج ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ قوت جو اپنے قہر و غلبہ سے نظام تمدّن کو قائم رکھتی ہے بجائے

خود کسی نہ کسی نظریے اور کسی نہ کسی اجتماعی مسلک کی قائم ہوتی ہے۔ اسی نظریہ و مسلک کے مطابق وہ اپنے لیے ایک لائحہ عمل بناتی ہے۔ اس لائحہ عمل کو وہ قاہرانہ طاقت کے ساتھ اجتماعی زندگی میں نافذ کرتی ہے۔ اور تمدّنی شکل کے بننے اور بگڑنے میں اس قہر کی نوعیت اور اس لائحہ عمل کی اُصولی و تفصیلی صورت کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ صرف اجتماعی زندگی ہی نہیں، انفرادی زندگی بھی بڑی حد تک طوعاً و کرہاً اس سانچے میں ڈھل کر ہی رہتی ہے جسے اسٹیٹ اپنے قہر و تسلّط سے بنا دیتا ہے۔ جو لوگ کسی ریاست کے دائرے میں رہتے ہوں وہ چاہے اس کے بنیادی نظریے اور اس کے تفصیلی لائحہ عمل پر ایمان نہ رکھتے ہوں اور کسی طرح اس پر راضی نہ ہوں لیکن انہیں چار و ناچار اپنے عقیدہ و مسلک کے ۹۰ فیصدی حصہ سے دست بردار ہو کر ریاست کے عقیدہ و مسلک پر چلنا پڑتا ہے اور باقی ۱۰ فیصدی میں بھی ان کے عقیدہ و مسلک کی گرفت روز بروز ڈھیلی ہی ہوتی جاتی ہے۔

ریاست کی اس نوعیت کو ملحوظ رکھنے اور یہ سمجھ لینے کے بعد کہ اجتماعی زندگی کے لیے ریاست بہر حال ناگزیر ہے ایک صاحب فکر و نظر آدمی کے لیے اس حقیقت کا ادراک کچھ مشکل نہیں رہتا کہ جو گروہ آج کل کے محدود معنوں میں محض ایک مذہب کا معتقد نہ ہو بلکہ ایک ہمہ گیر نظام زندگی یعنی دین پر اعتقاد رکھتا ہو وہ اگر اپنے اعتقاد میں سچا ہے اور اپنے اعتقاد کے خلاف زندگی گزارنا نہیں چاہتا تو اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ آگے بڑھ کر خود اس قوت قاہرہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے جو نظم اجتماعی کی صورت گری کرتی ہے اور اپنے زور سے اس کو قائم رکھتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو دوسرے اس قوت پر قبضہ کریں گے اور پھر یہ گروہ مجبور ہو گا کہ اجتماعی و انفرادی زندگی کے کم از کم ۹۰ فیصدی اُمور میں اپنے دین کے بجائے ان کے دین پر چلے۔ متمدن زندگی میں یہ اکراہ لامحالہ ہم میں سے کسی ایک کو کرنا ہی پڑے گا۔ اگر ہم نہ کریں گے تو کفار کریں گے۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ کفار اس دائرے میں ہم پر اکراہ کریں اور ہمیں جہنم کی طرف گھسیٹ کر لے جائیں یہ زیادہ بہتر ہے کہ ہم ان پر اکراہ کریں اور انہیں اس مقام کے قریب لا کھڑا کریں جہاں اگر وہ چاہیں تو ان کو با آسانی جنت کا راستہ مل سکتا ہے۔

یہ اس معاملہ کا ایک پہلو ہے اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ زمین کا مالک اللہ ہے۔ اس کی زمین پر رہنے اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھانے اور اس کی ملکیت میں تصرف کرنے کا حق صرف اس کو پہنچتا ہے جو

اس کا مطیع فرمان ہو اور اس کے قانون فطری و شرعی کا اتباع کرے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ ظالم ہے، غاصب ہے، باغی ہے اس کی یہ نافرمانی صرف خلاف حق ہی نہیں بلکہ زمین کے انتظام میں فساد اور اہل زمین کے لیے فتنے کی موجب بھی ہے۔ لہٰذا حق تو یہ ہے کہ جو لوگ خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور اس کے قانون فطری و شرعی کی پیروی سے منحرف ہیں ان کو زمین میں جینے کا حق بھی نہ ہونا چاہیے۔ لیکن یہ اللہ کی بہت بڑی عنایت اور اس کا انتہائی حلم ہے کہ وہ ان کو نہ صرف جینے کی مہلت دیتا ہے بلکہ ان کو ان کے کفر، شرف اور دہریت اور الحاد پر اس حد تک قائم رہنے کا اختیار بھی دیتا ہے کہ جہاں تک ان کی بغاوت دوسرے بندگان خدا کے لیے فتنہ وفساد کی موجب نہ ہو سکے۔ البتہ وہ اس بات کو ہرگز جائز نہیں رکھتا کہ یہ لوگ اس کے قانون شرعی کو منسوخ کر کے اپنے خود ساختہ قوانین پر اس کی زمین کا نظم ونسق چلائیں اور اس کی زمین کو فساد سے بھر دیں۔ اس لیے وہ اپنے قانون شرعی پر ایمان لانے والوں کو حکم دیتا ہے کہ کفار کو دین حق پر ایمان لانے کے لیے تو مجبور نہ کرو، لیکن غلبہ کفر و کفار کے فتنے کو پوری طاقت سے مٹانے کو کوشش کرو یہاں تک کہ زمین کا انتظام عملاً میرے دین پر قائم ہو جائے اور جو میرے دین کو نہیں مانتے وہ اکابر نہیں بلکہ اصاغر بن کر رہیں۔

حتی یعطو ا الجزیة عن ید وھم صٰغرون

ترجمہ: ''(ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔'' (۳۷)

یعنی لڑائی کی غایت یہ نہیں ہے کہ وہ ایمان لے آئیں اور دین حق کے پیرو بن جائیں بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ ان کی خود مختاری و بالادستی ختم ہو جائے۔ وہ زمین میں حاکم اور صاحب امر بن کر نہ رہیں بلکہ زمین کے نظام زندگی کی باگیں اور فرمانروائی و امامت کے اختیارات متبعین دین حق کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ ان کے ماتحت، تابع اور مطیع بن کر رہیں اور چھوٹے بن کر رہنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں بڑے وہ نہ ہوں بلکہ وہ اہل ایمان ہوں جو خلافت الٰہی کا فرض انجام دے رہے ہیں۔

## عالمی رہنماؤں کے تاثرات (آراء)

اسلامی تحریکوں کے قائدین کے مولانا سیّد مودودیؒ، حسن البناءؒ اور سیّد قطبؒ کے بارے میں تاثرات

## ۱۔ شیخ مصطفیٰ مشہور (مرشد عام اخوان المسلمون) مصر

برّصغیر میں تحریکِ اسلامی کا آغاز مولانا سیّد مودودیؒ نے کیا۔ مصر میں اس کا احیاء سیّد حسن البناءؒ کے ہاتھوں ہوا۔ مولانا سیّد مودودیؒ نے اپنے لٹریچر اور تنظیمی خدمات کے ذریعے اس دور میں وہ کچھ کیا جو کوئی دوسرا نہ کر سکا۔ انہوں نے صرف وعظ اور ارشاد سے کام نہیں لیا بلکہ جہاد اور اخلاق و کردار کی تعمیر کا فرض بھی انجام دیا۔ ان کی کوششوں سے آج ہر جگہ مجاہدین سربکف ہیں۔ ہم تاریکیوں کو چھٹتے اور روشن صبح کو طلوع ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ فیصلہ اسلام اور مسلم اُمّہ کے حق میں ہو رہا ہے۔ افغانستان، کشمیر اور فلسطین میں بہنے والا اہل اسلام کا خون حق کی نوید بن گیا ہے۔

## ۲۔ گلبدین حکمت یار (امیر حزب اسلامی) افغانستان

تحریکِ اسلامی افغانستان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ تحریکِ اسلامی پاکستان اور مولانا سیّد مودودیؒ سے متاثر ہے (یہ انہی کے عطا کردہ نظریات تھے) یہ جذبہ اسلامی ہی تھا کہ ہم نے ایک سپر پاور کے خلاف ثابت قدمی سے جہاد کیا اور غالب رہے۔ ۱۰ سال پہلے دنیا جس سرخ روسی پرچم سے لرزہ براندام تھی آج اس کے پندرہ ٹکڑے ہو چکے ہیں۔

## ۳۔ ڈاکٹر محمد صیام (قائد انتفاضہ) فلسطین

مولانا سیّد مودودیؒ نے مسئلہ کشمیر کو جس طرح پیش کیا اور اس کا جو حل تجویز فرمایا تقریباً انہیں خیالات کا اظہار امام حسن البناءؒ نے مسئلہ فلسطین کے حوالے سے کیا۔ اُمت کے ان دونوں رہنماؤں کو اپنوں کے ہاتھوں شدید ابتلا و آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا سیّد مودودیؒ کسی ایک خطے یا علاقے کے نہیں پوری اُمت کے محسن ہیں۔

## ۴۔ نجم الدین اربکان (سابق وزیر اعظم) ترکی

مولانا سیّد مودودیؒ اس دور میں اس اعتبار سے بے مثال رہنما تھے کہ انہوں نے لاتعداد انسانوں کو بیدار کیا۔ مولانا سیّد مودودیؒ نے لوگوں کو جذبہ عمل دیا، شعور اور ادراک دیا۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے مغرب کے طلسم کو پاش پاش کر دیا اور باطل کے خلاف انفرادی و اجتماعی جدوجہد کی۔

## ۵۔ راشد الغنوشی (سیکریٹری حرکتہ النہضتہ) تیونس

مولانا سیّد مودودیؒ نے عہدِ حاضر میں سیکولرازم کے اُمنڈتے ہوئے طوفان کا منہ موڑ دیا اور اس کے جواب میں اسلام کو ایک قابلِ عمل نظام زندگی کے طور پر پیش کیا اور اس کے نتیجے میں اُمت عزت و توقیر کی راہ پر گامزن ہوئی۔

## ۶۔ شیخ یاسین عمر الامام (رہنما اخوان المسلمون) سوڈان

سوڈان کے عوام نے مولانا سیّد مودودیؒ کے پھیلائے ہوئے پیغام سے تحریک پائی اور اپنے ملک میں اسلامی نظام قائم کیا۔ یہ فکر مولانا سیّد مودودیؒ کا نتیجہ ہے یہ آج دنیا کے مختلف ممالک میں اسلامی تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں اور ہم دنیا میں چلنے والی اسلامی تحریکوں کے ساتھ مکمل یکجہتی کا اظہار کرتے ہیں۔

## ۷۔ عبدالرحمٰن الخلیفہ (اخوان المسلمون) اردن

جب مولانا سیّد مودودیؒ کا ذکر آتا ہے تو احساس اُبھرتا ہے کہ ایک زبردست اور عظیم انسان کا ذکر ہو رہا ہے۔ ان کی خدمات دل و نگاہ کو روشنی بخشتی ہیں۔ اخوان اور جماعت کی دعوت بنیادی طور پر ایک ہی ہے۔ مغربی تہذیب کے خلاف دونوں تحریکوں کی جدوجہد لازوال ہے۔ اس سے نسل نو کو فکر و عمل کی نئی جہت ملی۔

## ۸۔عبدالہادی اوانگ (نائب صدر اسلامی پارٹی) ملائشیا

دیگر خطوں کی طرح تحریک اسلامی ملائیشیا بھی مولانا کے لٹریچر سے کام لے رہی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ استعمار کے خلاف جدوجہد میں مولانا سیّد مودودیؒ کی فکر سے بے نیازی ممکن نہیں ہے۔خلافت کے بعد جو مہیب خلا پیدا ہو گیا تھا۔مولانا سیّد مودودیؒ اور ان کے ہم عصر اکابرین اُمت امام حسن البناءؒ اور سیّد قطبؒ نے اس کو پُر کیا اور اُمّتِ مسلمہ کو اُمید و یقین سے ہمکنار کیا۔

## ۹۔ ڈاکٹر اسمٰعیل لطفی،تھائی لینڈ

حقیقت یہ ہے کہ مولانا سیّد مودودیؒ،سیّد حسن البناءؒ،سیّد قطبؒ اور اب ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے تصنیف و تالیف کے میدان میں اس درجہ کام کر دیا ہے کہ ان کی تحریریں پڑھ کر بے اختیار نوجوان اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔مولانا سیّد مودودیؒ کی کتابوں کے عربی تراجم مبادی الاسلام،الجہاد فی الاسلام اور السیاست فی الاسلام عرب میں بہت مقبول ہیں۔

## ۱۰۔ڈاکٹر ممتاز احمد (پروفیسر ہیمپٹن یونیورسٹی) امریکہ

مولانا سیّد مودودیؒ اس دور میں اُمّتِ مسلمہ کے لیے Source of Inspiration بن گئے ہیں۔ ترکی،ایران،انڈونیشیا،ملائیشیا،الجزائر،اردن،تیونس،مصر،سوڈان،افغانستان اور وسط ایشیا تک ان کی فکر کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔خود مغرب کے نزدیک مسلمانوں میں ایوب خان،سوئیکارنو،اور جمال عبد الناصر جیسے افراد ماڈل تھے۔لیکن اب انہیں مولانا سیّد مودودیؒ،حسن البناءؒ،سیّد قطبؒ،علی شریعتی اور حکمت یار جیسے افراد کا سامنا ہے۔ان چند سالوں میں مغربی مفکرین کی تحریروں کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ وہ ''احیائے اسلام'' اور ''جنگجو'' اسلام کی واپسی کے عنوانات کے تحت مغرب کو ڈرا رہے ہیں۔(۳۸)

❁ آپ کے لیے ضروری تھا کہ آپ ہندوستان کے اندر اور وطنیت کے خلاف آواز بلند کریں۔

مسلمانوں کے درمیان قومیت کا نظریہ پھیل چکا تھا اور ان کو مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ

مل کر انگریزی سامراج کے خلاف جنگ کریں۔ علامہ مودودیؒ نے اس نظریے میں پوشیدہ خطرات کو دلائل کے ساتھ عوام کے سامنے رکھا اور واضح کر دیا کہ انگریزی سامراج اور ہندو قومیت دونوں ایک ہی چیز ہے، دونوں ہی اسلام کے دشمن اور مسلمانوں کی تباہی پر آمادہ ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ اس وقت جو یہ نعرہ لگایا جا رہا ہے کہ قومیں وطن سے ہیں اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بنا دیا جائے۔ انہوں نے اسلامی دلائل کی روشنی میں نظریہ قومیت کو باطل قرار دیا، اس کے نقصانات کو واضح کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ صرف کافر اقوام ہی اپنے وجود کے لیے ملک پر منحصر ہوتی ہیں جہاں تک اُمّتِ مسلمہ کا سوال ہے تو وہ عقیدۂ اسلام کی بنیاد پر قائم و باقی رہتی ہے۔ (۳۹)

❁ آپ کے لیے مغربی تہذیب کی خامیوں کو واضح کرنا بھی ضروری تھا۔

آپ نے مغربی نظریات کے کھوکھلے پن کو واضح کیا۔ انہوں نے نظریہ ڈارون پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ اس نے انسان کا رشتہ بندر سے جوڑ کر پوری انسانیت کو مسخ کر دیا ہے۔ اس کا یہ بھی نظریہ ہے کہ اس دنیا میں صرف طاقتور ہی باقی رہ سکتا ہے۔ (اس کا خیال ہے کہ یہ فطرت کا قانون ہے کہ اس دنیا میں وہی شخص زندہ رہنے کا مستحق ہے جو اپنی بقا کی ضرورت کو ثابت کر دے۔ اس ظالم دنیا میں کمزور خود بخود دفنا ہو جاتا ہے کیونکہ وہ ضعیف ہے بلکہ اس کا ختم ہو جانا ضروری بھی ہے اور جو یہاں باقی رہتا ہے وہ اس لیے باقی رہتا ہے کیونکہ وہ طاقتور ہے اور اسی وجہ سے اس کا زندہ رہنا بھی ضروری ہے ہم ذرا غور کریں کہ اگر کائنات اور نظامِ فطرت سے متعلق یہ تصوّر انسانوں کے ذہن و دماغ میں بیٹھ گیا تو پھر اس کا ردِّ عمل کیا ہوگا؟ پھر ایک انسان کا سلوک دوسرے انسان کے ساتھ کیسا ہوگا؟ کیا ہمدردی و خیر خواہی، اُخوّت و بھائی چارگی، محبت و شفقت، اُلفت و رحمت، ایثار و قربانی یا اس طرح کے دوسرے انسانی جذبات اس فلسفہ کو اپنانے کی صورت میں ہمارے انفرادی واجتماعی زندگی میں باقی رہیں گے؟ اس طرح زندگی میں عدل و انصاف، امانت و دیانت اور اخلاص و صداقت کا کیا حشر ہوگا؟

انہوں نے مارکس کے مادّی نظریے کو بھی بحث کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ:

''ہیگل نے دنیا کو میدانِ جنگ سے تعبیر کیا ہے، جب کہ ڈارون نے اس کائنات اور نظامِ فطرت

دونوں ہی کو میدانِ جنگ بتایا ہے۔ مارکس نے بھی اس تصوّر کی روشنی میں انسانی معاشرے کو بنیاد بنا کر اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس تصوّر کے مطابق انسان ہمیشہ باہمی جنگ و جدال، فتنہ وفساد یا کسی جھگڑے اور کشاکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اس کی فطرت اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی خاطر اپنے بھائیوں کے ساتھ جنگ کرنا لازم قرار دیتی ہے پھر انسان اپنے مفاد کی خاطر انسان کو مختلف طبقوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ پھر ان مختلف طبقوں کے درمیان ذاتی اغراض و انفرادی انانیت کی بنیاد پر ایک نہ ختم ہونے والی جنگ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ انانیت ومنفعت کی بنیاد پر ہونے والی طبقاتی جنگوں کے درمیان تاریخ انسانی کی ارتقاء مکمل ہوتی ہے۔ مختلف اقوام کے درمیان ہونے والی جنگ، ایک قوم وملت کے درمیان ہونے والی جنگ اور پھر ایک معاشرے کے مختلف افراد کے مابین ہونے والی جنگ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس تصوّر کے مطابق انسانوں کے درمیان تعلق محض ذاتی مفاد یا مادّی منفعت کی بنیاد پر ہی قائم رہ سکتا ہے اور یہ مفاد ہی وہ رشتہ ہے جو ان سرمایہ داروں کو جوڑے رکھتا ہے اور ان تمام افراد کے خلاف جنگ پر آمادہ کرتا ہے جو ان کے مفاد کے راستے میں رکاوٹ بنتے ہیں خواہ وہ ان کے اپنے ملک اور اپنے مذہب کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ ایک صحیح طریقہ ہے جسے کبھی جرم نہیں گردانا جا سکتا بلکہ ایسا نہ کرنا خلافِ فطرت تصوّر کیا جائے گا۔

مارکس کے متبعین کا خیال ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں پائی جانے والی مختلف دینی، قانونی و اخلاقی قدروں نے مادّی نظام کی تائید کی ہے بلکہ ان کا کہنا ہے کہ یہ تمام اُصول وقوانین مادّی نظام کی حمایت کے لیے ہی وضع کیے گئے ہیں اللہ۔ لہٰذا عقل کا تقاضا ہے کہ پیداوار تقسیم اور دیگر مادّی وسائل و ذرائع میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اسی اعتبار سے قانونی، دینی و اخلاقی اُصولوں میں بھی تبدیلی لائی جائے۔

کون شخص یہ کہنے کی جرأت کرے گا کہ جس شخص کا مارکس کے اس نظریے پر ایمان ہو وہ مذہبی تعلیمات، یا کسی شریعت یا کسی اخلاقی نظام کا بھی قائل ہوگا۔

❁ مغربی تہذیب سے فریب خوردہ افراد کے افکار کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔

علامہ مودودیؒ نے مادّی، اقتصادی، اجتماعی، سیاسی اور تہذیبی میدانوں میں مغربی تہذیب کے اُصول

ومبادی کا ذکر کرتے ہوئے ان مسائل کو حل کرنے میں ان کی ناکامی کو مدلل انداز میں واضح کیا اور یہ ثابت کیا کہ ان تمام میدانوں میں ہر اعتبار سے اسلام مغربی تہذیب سے کیوں کر بہتر ہے؟ رفتہ رفتہ انہوں نے مسلم نوجوانوں کے اندر دین سے لگاؤ اور اپنی ذات پر فخر کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ آپ نے مغربی علوم کے فوائد کو اخذ کرنے اور اس کے مضرات کو ترک کر دینے کا اُصول اپنایا۔

- آپ نے علماء کے جمود اور ان کے غلو کو ختم کرنے کی کوشش کی۔
- علامہ مودودیؒ پیدائشی داعی تھے۔ ابتدائی زندگی ہی سے انہوں نے دعوت وتبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ آپ نے اپنے علمی مقالوں کے ذریعے مخالفین کے گمراہ کن خیالات کی پُر زور تردید کی۔ ایک مکمل نظامِ حیات کی حیثیت سے اسلام کے مختلف گوشوں کو واضح کیا۔ آپ نے عوام کے درمیان زوردار تقریریں کیں۔ ان تقریروں میں آپ نے قومیت کے مضرات بتاتے ہوئے اس سے دور رہنے، اسلام کو مضبوطی سے پکڑنے اور اسلامی شعار کو اپنانے کی دعوت دی۔ اس طرح انہوں نے کتابیں لکھیں جن کے اندر جدید علمی انداز میں اسلامی فکر اور اسلامی نظام کی خوبیوں کو پیش کیا۔
- اخیر میں انہوں نے ایک منظّم اسلامی جماعت قائم کی اور ایک عرصے تک اس کی قیادت کی ذمہ داری کو سنبھالا۔ اس دعوتی مرحلے کے دوران آپ کو بھی ان تمام مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جو عام طور پر اس راہ میں پیش آتی ہیں۔ آپ کو قید و بند کی مشقت برداشت کرنی پڑی، حکومت کے ظالمانہ احکام کو سہنا پڑا، اسلامی فکر کے مخالفین کی جانب سے آپ کے خلاف افترا پردازی، الزام تراشی اور سازشوں کا طویل سلسلہ شروع ہوا۔ بعض نادان مسلمانوں نے بھی آپ پر بے بنیاد الزامات لگائے۔ آخر میں یہ کہہ کر آپ کے رفقاء کے عزائم کو پست کیا گیا کہ ان کوششوں کا کوئی نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں ہے۔ (۴۰)

## جماعتِ اسلامی کی تاسیس

جماعتِ اسلامی کے تاسیسی جلسے میں علامہ مودودیؒ نے اپنے رفقاء کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

''یہ تحریک میری زندگی کا مقصد ہے، میرا جینا اور مرنا اس تحریک کے لیے وقف

ہے۔ اگر اس راستے پر چلنے میں کسی کو کوئی تردد ہے تو میں اسے اختیار کروں گا اور اسی راستے میں اپنی جان دے دوں گا۔ اگر کسی میں آگے بڑھنے کی جرأت نہیں تو میں آگے بڑھوں گا اگر کوئی میرا ساتھ نہیں دے گا تو میں تن تنہا اس راہ پر چلوں گا اگر پوری دنیا ایک طرف ہو جائے اور میں تنہا رہ جاؤں پھر بھی مجھے اس کی مخالفت کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی۔"

علامہ مودودیؒ نے چند کلمات میں "آنے والا مرحلہ" کے عنوان سے جو بات اپنے رفقاء کے سامنے رکھی اس بات کو اس سے زیادہ بلیغ و مؤثر انداز میں بیان کرنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

- اس کا مطلب ہے کہ علامہ مودودیؒ ان تمام شر پسند عناصر سے بخوبی واقف تھے جو تحریک اور اس کے کارکنوں کی گھات میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مسلمان اور خاص طور پر ایسے مسلمان جو اپنے آپ کو اسلام کا کرتا دھرتا اور شریعت کے ٹھیکیدار سمجھتے ہوں ان کے درمیان دعوت کا کام کرنا کفار کے درمیان دعوتی کام انجام دینے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔
- آپ کو اپنے قریبی رشتہ داروں اور اپنے رفقاء کی نا اُمیدی کا پورا اندازہ تھا۔ بڑے بھائی ابوالخیر مودودیؒ کے الفاظ آپ کے کانوں میں گونج رہے تھے جب کہ انہوں نے آپ کو انجام اور راستے کی مشکلات سے ڈراتے ہوئے کہا تھا کہ اس طرح کے کاموں سے کسی فائدے کی اُمید نہیں ہے۔
- تحریک کے تمام مراحل سے آپ باخبر تھے کہ اس کی شروعات تو معمولی دعوت سے ہوگی مگر آگے چل کر مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑے گا اور کوئی بعید نہیں کہ عمر قید یا پھانسی کی سزا سنائی جائے۔
- آپ کے ذہن و دماغ میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ گئی تھی کہ ایک مسلمان کی زندگی یا موت اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابند ہے یہی وجہ تھی کہ آپ بالکل مطمئن تھے۔

## ہندوستان میں دعوتِ اسلامی کا آغاز

کسی مقام کے مخصوص سیاسی، اجتماعی و معاشرتی حالات وہاں کے طریقۂ دعوت پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ مکّہ کے اندر دعوت و تبلیغ کا طریقہ مدینہ کے طریقے سے یکسر مختلف تھا۔ دونوں جگہ کے

دعوت کی سرگرمیاں بھی ایک دوسرے سے مختلف تھیں اور ہر اسلامی دعوت وتحریک کے ساتھ یہی صورتِ حال پیش آتی ہے۔

ہندوستان ایک عظیم ملک ہے جہاں کروڑوں لوگ آباد ہیں۔ ایک زمانے میں یہ اسلامی مملکت بھی رہ چکا ہے جہاں شرعی احکام نافذ تھے۔ ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں کا اوّلین مقصد مسلمانوں کی شوکت وطاقت کو ختم کرنا اور ہندوؤں کو اُوپر اُٹھانا تھا اس نے اسلامی رُوح کو ختم کر کے مسلمانوں کو قومیت کے دھارے میں بند کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک قوم کی صورت اختیار کرلیں اور پھر ہندوستانی قوم کی صورت میں وہ انگریزی سامراج کا مقابلہ کریں۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر اس نے کانگریس پارٹی تشکیل دی۔ سامراجی قوتیں جہاں کہیں بھی ہیں وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ایک نہ ایک دن ان کو ان ممالک سے نکلنا پڑے گا چنانچہ سامراجی مفکرین اور لیڈروں نے ایسی پالیسیاں ترتیب دینے کی کوشش کی کہ مستقبل میں ان ممالک سے نکل جانے کے بعد بھی یہاں ان کی حکومت کا رعب اور ان کا زور قائم رہے۔

ہندوستان اور دیگر ممالک میں صرف اسلام ہی ان کے لیے چیلنج تھا۔ ہندو تو ایک بت پرست قوم تھی جس کے اندر مغربی فکر اور مغربی تہذیب وتمدن سے مقابلہ کرنے کی کوئی قوت نہ تھی۔ جہاں تک اسلام کا سوال ہے تو اس کا معاملہ بالکل مختلف ہے وہ صرف اپنی قوت وعظمت کی بناء پر ہی نہیں جانا جاتا بلکہ وہ تمام دیگر افکار ونظریات پر عقل ودلیل کی روشنی میں فوقیت رکھتا ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ جدید مغربی تہذیب کی خامیوں کے مقابلے میں صرف اسلام ہی ایک متبادل تہذیب پیش کرسکتا ہے۔

ہندوستان میں برطانوی سیاست کے اوّلین کامیابی کانگریس کا قیام تھا۔ اس نے ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر اقوام کو ''ہندیت'' اپنانے کی دعوت دی تاکہ تمام ہندوستانی ایک فکر کے پابند ہوں۔

امام مودودیؒ نے جان لیا کہ یہ نظریہ صرف ہندوؤں کے مفاد کا محافظ ہے اور ہندو اس میں کامیاب ہونے کی صورت میں اپنی حکومت میں مسلمانوں کو غلام بنالیں گے۔ آپ نے تمام مسلمانوں کو بیدار کیا، ان کو قومیت ووطنیت میں پوشیدہ خطرات سے آگاہ کیا جس کی طرف کانگریس ان کو بلا رہی تھی اور ٹھوس دلائل کے

ذریعہ ثابت کیا کہ کافر اقوام تو اپنے وجود بقا کے لیے ملک کی محتاج ہیں مگر اُمّتِ مسلمہ تو اپنے عقیدہ و مذہب کی بنیاد پر زندہ رہتی ہے۔ وہ تو علامہ اقبال کے اس شعر کی ترجمان ہوتی ہے ۔

قوم مذہب سے ہے ، مذہب جو نہیں کچھ بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

علامہ اقبال نے اس شعر کے اندر واضح الفاظ میں اُمّتِ مسلمہ کی تعریف کی ہے اور ان تمام لوگوں کی سخت مخالفت کی ہے جو وطن کی بنیاد پر اُمّتِ مسلمہ کے وجود کے قائل ہیں۔ انہوں نے تمام مسلمانوں کو اسلام کو اختیار کرنے کی دعوت دی کہ اسلام ہی مسلمانوں کے لیے قومیت کا سرچشمہ ہے۔ انہوں نے کانگریس کو ایک ہندو تنظیم سے تعبیر کیا جس کا مقصد مسلمانوں کو ختم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ علامہ اقبال کے اس موَقف پر کانگریسی حضرات بہت جز بز ہوئے اور انہوں نے علامہ اقبال کو مختلف طرح کے سب و شتم کا نشانہ بنایا۔

سب و شتم اور طعن و تشنیع کا حصہ امام مودودیؒ کے حق میں دوسروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی تھا۔ انہوں نے مخالفین کے اعتراضات کا قرآن وسنت کے ٹھوس دلائل کی روشنی میں پرزور جواب دیا تو ان پر کفرو گمراہی کا الزام لگایا گیا لیکن پھر بھی مثبت نتائج برآمد ہوئے کانگریسی مسلمانوں کا زور کم ہو گیا۔ اسلامی نظریے کے حامل علماء کا زور بڑھتا گیا۔ انہوں نے ''مسلم لیگ'' کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے لیے ایک مستقل ملک کا مطالبہ شروع کیا۔

بالعموم تمام مسلمانوں اور جماعتِ اسلامی کے ارکان نے سیاسی طور پر مسلم لیگ کا ساتھ دیا لیکن پھر مدراس میں ایک ایسا حادثہ رونما ہوا جس نے جماعتِ اسلامی کو اپنے روّیے پر نظرثانی کے لیے مجبور کر دیا۔ جماعتِ اسلامی کے قیام کے ایک سال بعد امام مودودیؒ نے مدراس میں اپنے رفقاء کی کانفرنس بلائی تا کہ اس پورے سال کی کارگزاریوں پر بحث ومباحثہ کیا جا سکے۔ اسی دوران ایک افسوسناک حادثہ پیش آ گیا۔

مسلم لیگ کے چند افراد لیگ کا جھنڈا لے کر باہر آ گئے، ان لوگوں نے چیخنا چلانا اور سب و شتم کرنا شروع کر دیا اس کے ساتھ انہوں نے سرکاری املاک کو لوٹنا اور عمارتوں کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ امیر جماعت نے اپنے رفقاء کو ان کی کسی طرح مدد کرنے سے روک دیا پولیس نے بھی ان کے خلاف سخت

اقدام کیے۔

امام مودودیؒ کی حکمت کے بدولت یہ صورتِ حال ختم ہوگئی لیکن آپ کو شدید فکر لاحق ہوئی۔ یہی لوگ ہندو اور برطانوی سامراج کے خلاف اسلامی جہاد کا جھنڈا بلند کرتے ہیں یہی لوگ ایک مقدس زمین کی صورت میں پاکستان کے قیام کا مطالبہ کر رہے ہیں تو کیا یہ لوگ مستقبل میں تحریکِ اسلامی کے محافظ اور نظامِ اسلامی کے امین ثابت ہوں گے اس کام کے لیے صرف جذبات کافی نہیں ہیں۔ صرف جذبات بعض صورتوں ہی میں مفید ثابت ہوتے ہیں ورنہ اکثر ان سے نقصان ہوتا ہے۔ ان نقصانات سے اسلامی اخلاق اور صحیح تربیت کے ذریعہ ہی محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ اس طرح کے حادثات نے تحریکِ اسلامی کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ صرف علمی میدان ہی میں مسلمانوں کی اصلاح و تربیت کی ضرورت نہیں بلکہ عملی میدان میں اسلامی خطوط پر ان کی تربیت کی کہیں زیادہ ضرورت ہے تاکہ صحیح معنی میں ایک مثالی قوم اُبھر کر سامنے آئے جو صحیح خطوط پر اسلامی معاشرے کی رہنمائی کرے۔

## تقسیمِ ہند

مسلمانوں کو ہندو اور انگریزوں دونوں کی ظالمانہ پالیسیوں کا نشانہ بننا پڑا۔ ان کی چالوں کی بناء پر مسلمانوں کا کافی جانی نقصان ہوا چنانچہ پھر مسلمانوں نے اپنے لیے ایک الگ مستقل ملک کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ہندوستان تقسیم ہوگیا۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کو نئے ملک کی جانب ہجرت کرنے کا حکم دے دیا۔ تقسیم سے متعلق مسائل پر یہاں گفتگو کرنے کا موقع نہیں ہے۔ کیا یہ تقسیم حکیمانہ و منصفانہ تھی؟ کیا برطانیہ نے مسلمانوں کے ساتھ انصاف کیا تھا؟ بہر حال ہندوستان کے ہر گوشے سے مسلمان اپنی سواریوں اور اپنے کندھوں پر اپنا سامان اُٹھائے پاکستان کے لیے عازمِ سفر ہوئے۔ عام مسلمان ہر حال میں اپنے بھائیوں کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے اور ہر تکلیف کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ جہاں تک رہنماؤں کا سوال ہے تو انہوں نے اپنے مفاد کی خاطر لوگوں کے جذبات و احساسات کا فائدہ اُٹھایا، انہوں نے سادہ لوح

عوام کو اپنی سرداری قائم رکھنے کے لیے استعمال کیا۔ (مسلمان کسی شکست خوردہ فوج کے مانند تھے جس کے صفوں میں انتشار تھا، زمین ان کا بستر اور کھلا آسمان ہی ان کا سایہ تھا اور آسمان بھی ان پر رحم نہیں کر رہا تھا۔) (۱۰) چاروں طرف سے ان کو موت کا ڈر لگا رہتا۔ ہندو، سکھ ہر چہار جانب سے ان کے لیے پیغامِ موت بن کر آ رہے تھے۔

بعض ہندوستانی مسلمانوں نے مجھ سے کہا:

''جس بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا قتلِ عام کیا جا رہا تھا ہمارا یہ خیال تھا کہ شاید ہندوستان میں کوئی مسلمان زندہ ہی نہیں رہے گا۔''

امام مودودیؒ اس سنگین صورتِ حال کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر مہاجرین کے لیے ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی۔ جماعتِ اسلامی کے ارکان نے کچھ فوجی کیمپ بھی تشکیل دیے جن کی نگرانی نہوں نے بذاتِ خود کی۔ جب بعض رفقاء نے آپ کو لاہور منتقل ہو جانے کا مشورہ دیا تو آپ نے وہاں اس وقت تک باقی رہنے پر اصرار کیا جب تک کہ امن فوج آ کر نگرانی کی ذمہ داری نہیں سنبھال لیتی۔

## پاکستان میں دعوتِ اسلامی

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان باقاعدہ ملک بن گیا، مسلمانوں نے سکون کی سانس لی، ان کو یکبارگی احساس ہوا کہ ان کے خواب شرمندہ تعبیر ہو گئے۔ اب وہ اسے ایسا اسلامی نمونہ بنا دیں گے جس کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا یا جس کے بارے میں امام مودودیؒ نے یہ الفاظ کہے تھے:

''اگر اس روئے زمین پر کوئی چھوٹا سا خطہ بھی ایسا ہو جس کا رقبہ صرف ایک میل ہی کیوں نہ ہو جہاں کے انسانوں پر اللہ کے حکم کے سوا اور کوئی حکم نافذ نہ ہو تو وہاں کی مٹی کا ایک ذرّہ میرے لیے پورے ہندوستان سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔''

ملک کے آزاد ہونے پر تمام لوگ خوشی منا رہے تھے۔ مسلمان تو کچھ زیادہ ہی خوش تھے کیونکہ ان کے

خوابوں کا اسلامی ملک پاکستان وجود میں آ گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ تمام انسانوں کے لیے عدل و انصاف، حق و صداقت، کرامت و عظمت، آزادی و حریت کے یکساں مواقع میسّر ہوں گے۔ مسلمانوں کے لیے اس ملک کی خدمت کسی عبادت سے کم نہ تھی۔ اس کا تحفظ کارِ خیر اور اس سے منہ موڑنا کسی گمراہی سے کم نہ تھا۔ اسلامی ملک پاکستان کے سلسلے میں صرف وہاں کے باشندوں کا ہی یہ خیال نہیں تھا بلکہ پوری دنیا کے مسلمان اس نئے اسلامی ملک کے تئیں اپنی ذمّہ داریوں کو محسوس کر رہے تھے اور وقت پڑنے پر وہ اپنی ذمّہ داریوں سے سبکدوش ہونے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ اسلامی ملک ایک فکری و عملی مملکت کا نام ہے جو ظاہری شکل و ہیئت پر زیادہ زور نہیں دیتا۔ اب علامہ مودودیؒ اور ان کے رفقاء کی ذمّہ داری (جنھوں نے اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ باطل قوتوں کے خلاف جنگ و کشمکش میں صرف کردی) اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ اسلامی ملک کے سائے میں سکون کی سانس لیتے اور ملک کے نظم و نسق کے لیے اسلامی قوانین بناتے۔ مارچ ۱۹۴۸ء کو امام مودودیؒ نے کراچی کے ایک خطاب عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

۱- پاکستان صرف اللہ کا ملک ہے اور پاکستانی حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ملک میں اسلامی نظام قائم کرے۔

۲- آج تک ملک کے اندر شریعتِ اسلامی کے خلاف قوانین نافذ ہوتے رہے لہٰذا اب ان قوانین کو ختم کرنا ناگزیر ہے اور یہ کسی طرح جائز نہیں کہ مستقبل میں کوئی ایسا قانون نافذ ہو جو اسلام کے مخالف ہو۔

۳- حکومتِ پاکستان شرعی حدود کے مطابق اپنے اقتدار کو محدود رکھے۔

لیکن حکومت نے ان افکار کے فروغ، شریعتِ اسلامی کے نفاذ اور اسلامی اُصولوں کے مطابق زندگی کا رُخ متعین کرنے میں تحریکِ اسلامی کے قائدین کے ساتھ تعاون نہیں کیا بلکہ مسلم لیگ نے اس کے برخلاف روّیہ اختیار کیا۔ پاکستان میں انسانی قوانین کے مطابق حکومت کا دستور بنایا گیا یہ تو درست نہیں ہے کہ پاکستان برائے نام تو ایک اسلامی ملک ہو لیکن عملاً وہ ایک اسلامی ملک نہ ہو۔ برسرِ اقتدار پارٹی نے اسلام پسندوں کے خلاف شدید جنگ شروع کردی ظاہر ہے اس نے امام مودودیؒ کو بھی نہیں بخشا اور پاکستان کو ایک

اسلامی ملک بنانے کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی۔ ان کے اوپر جھوٹا الزام لگایا گیا کہ انہوں نے جہادِ کشمیر کے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے. پھر ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو آپ کو چند رفقاء کے ہمراہ قید کر دیا گیا۔ (۴۲)

## لمحہ فکریہ

ایسے مسلمان جو اس روئے زمین پر حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے اندر کسی رتبے یا منصب کی خواہش نہیں ہوتی تو اکثر و بیشتر ان کا حکومت وقت کے ساتھ تصادم ہوتا ہے۔ ایک حاکم اپنی حکومت کے درمیان ایسے کسی فرد کو برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر شر پسند عناصر اس کے دل میں یہ بات اچھی طرح بٹھا دیتے ہیں کہ اس کا وجود اس کی کرسی اور اس کے عہدے کے لیے مستقل خطرہ ہے۔ جب کبھی وہ صادق مسلمان پورے خلوص کے ساتھ نصیحت کرنا چاہتا ہے یا کسی اچھے پروگرام کی وضاحت کرتا ہے تو حاکمِ وقت اسے بھی ایک سیاسی چال سمجھتا ہے کہ جب تک اسے حکومت نہیں ملتی وہ اس طرح کی باتیں کرتا ہے اور پھر حکومت ملنے کے بعد وہ اپنے مفاد کی خاطر ان نصیحتوں کو بھول جائے گا۔ پاکستان میں جماعتِ اسلامی مصر میں اخوان المسلمین، سوڈان میں تحریکِ اسلامی کو اسی طرح کے موقف کا سامنا کرنا پڑا اور ہر جگہ تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کو قید و بند اور جلا وطنی کی مشقتیں برداشت کرنی پڑیں۔

پاکستان اسلام کے نام پر ہندوستان سے الگ ہوا۔ جنگِ آزادی میں لاکھوں مسلمان شہید ہوئے اور اس کے بعد بھی مسلمان ہندوستان میں اجنبی بن کر رہ گئے۔ اسی طرح پاکستان میں بھی مسلمان اجنبی تھا بلکہ اس سے کہیں زیادہ اجنبی تھا۔ امام مودودیؒ جیل میں قید رہے یہاں تک کہ عدالتِ عالیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ نظر بندی کی مدت ۱۸ مہینے سے زیادہ نہیں ہو سکتی چنانچہ ۲۰ ماہ تک جیل میں رہنے کے بعد ۱۸ مئی ۱۹۵۰ء کو وہ رہا ہوئے۔

## قید و بند کی آزمائش

حکومت اپنے روّیے پر قائم رہی۔ قید و بند کی مشقتوں نے علامہ مودودیؒ کے عزم و حوصلے کو کمزور نہیں کیا اور آپ نے تحریکی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ وقتاً فوقتاً جماعتِ اسلامی پاکستان میں برابر اسلامی شریعت کے

نفاذ کا مطالبہ کرتی رہی۔ ردِ قادیانیت میں مولانا مودودیؒ نے جو کتابچہ تحریر کیا تھا، اس کی پاداش میں آپ کو اور آپ کے خاص رفقاء کو لاہور کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ ان پر امن کے لیے خطرہ بننے اور ملک کے اندر فتنہ و فساد برپا کرنے کا الزام لگایا گیا۔

آپ کو پھانسی کا حکم سنایا گیا۔ ملٹری کورٹ کے جج نے یہ حکم جاری کرتے ہوئے اس کی وضاحت کی:

"ہمارے پاس یہ حکم اوپر سے لکھ کر آیا ہے اور ہماری ذمہ داری بس اسے پڑھ کر سنانے کی تھی۔"

> پوری قوم سچے جذبے اور دلی محبت کے ساتھ حقیقی قائد کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی، جسے مخالفین سازش کر کے قتل کر دینا چاہتے تھے اسی کی خاطر اندرون و بیرونِ ملک اس حکم کے خلاف مظاہرے کیے گئے۔ امام مودودیؒ کو فوراً رہا کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ حکومت عوام کے مطالبوں کے آگے جھکنے پر مجبور ہوئی۔ ابتداء میں پھانسی کا حکم ملتوی کر دیا گیا اور پھر اسے عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا۔ بالآخر حکومت آپ کو پچیس مہینوں تک جیل میں رکھنے کے بعد رہا کرنے پر مجبور ہوگئی۔ علامہ مودودیؒ نے ظالم کے آگے رحم کی اپیل نہیں کی۔ حق تو غالب ہو کر رہتا ہے وہ ذلت و رسوائی کے لیے نہیں آیا۔ (۴۳)

## مولانا مودودیؒ مشکلات و مسائل کے نرغے میں

افراد کی طرح عوام بھی عروج و ترقی اور گمنامی و پستی کے مختلف مراحل سے گذرتی ہیں۔ اُمّتِ مسلمہ بھی مختلف علاقوں میں پستی و زبوں حالی سے گذر رہی ہے۔ برصغیر میں جب انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو اس نے وہاں سے اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ بغداد میں تاتاریوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کچھ اسی طرح کے مصائب سے ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد مسلمان بھی دوچار ہوئے۔

انگریزی سامراج نے خوف اور نا اُمیدی کی ایسی فضا مسلّط کر دی کہ کسی انسان کے اندر کوئی مفید کام کرنے کی ہمت باقی نہ رہ گئی۔ برطانوی سامراج نے ہندوستان میں ہندوؤں کو شہ دینا شروع کر دیا۔ مسلمان

کسی مخلص قائد کا انتظار کر رہے تھے۔ اس اثناء میں چند ایسی اسلامی شخصیات اُبھر کر سامنے آئیں جنہوں نے قومیت اور مہندوں کے ساتھ تعاون کا نعرہ دیا۔ بعض دوسرے قائد ایسے بھی سامنے آئے جنہوں نے مسلمانوں کے اتحاد اور ان کے لیے ایک الگ مستقل ملک کا مطالبہ کیا۔ ان تمام لوگوں نے سیاسی روشنی میں مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنا چاہا لیکن یہ لوگ عوام کے دلوں تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوئے اور دلوں میں عقیدے کے راستے کے ذریعہ ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ اس کے محرک مولانا مودودیؒ تھے، یہ وہی قائد تھے جس کا اُمت کو انتظار تھا۔

اُمت کسی غیر معمولی قائد کی قدر و منزلت کا اندازہ اس کی وفات کے بعد ہی لگاتی ہے۔ اُمت اسی وقت اس کے نظریات سے اتفاق کرتی ہے جب کہ وہ ان کے مفاد کا ضامن اور دلوں کا ترجمان ہو۔ لیکن مختلف عوامل اور قوموں کی تقدیر سے کھیلنے والے نام نہاد لیڈران عوام کو حقیقی قائد تک پہنچنے نہیں دیتے جو ان کا صحیح نمائندہ ہوتا ہے۔ ایسے غیر معمولی قائدین بالعموم اس صورتِ حال سے واقف ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں ہوتے ہیں اور اپنے اُصولوں پر جمے رہتے ہیں۔ ان کو اپنے رفقاء پر پورا بھروسہ ہوتا ہے۔ ایسا قائد جس کا تعلق کسی معروف شریف خاندان سے ہوتا ہے تو اسے اپنی منزل طے کرنے میں کوئی زیادہ پریشانی نہیں ہوتی لیکن اگر وہ قائد گوشہ گمنامی سے نکل کر اچانک قیادت کے صفِ اوّل میں پہنچ جاتا ہے تو اسے عوام اور اپنی قوم کی طرف سے ہی بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ظاہر ہے ''ابوالاعلیٰ مودودیؒ'' نے بہت پہلے ہی مرض کی تشخیص کر لی تھی اور اپنے لیے ایک لائحۂ عمل متعین کر لیا تھا اور اس متعین کردہ دعوت و تحریک کے راستے پر تقریباً اکیلے ہی چلتے رہے اور تن تنہا ہی اس راستے میں آنے والے عظیم چیلنجوں کا سامنا کیا۔

تحریکوں کے درمیان اختلافات کا پایا جانا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس کے کچھ بنیادی اسباب ہیں:

- جب کوئی شخص یہ محسوس کرنے لگے کہ وہ قیادت کی قدرت رکھتا ہے۔ قائد اور اس کے درمیان صلاحیتوں کا معمولی فرق ہے تو وہ ہر طرح کے اختلافی مسائل کو ہوا دینے اور تنظیم سے علیحدہ ہونے کی کوشش کرے گا یا تو تمام لوگ اس کی بات کو تسلیم کرتے ہوئے اسے قائد مان لیں اگر ایسا نہ ہوا تو وہ

جماعت سے علیحدہ ہو کر کسی دوسری جگہ اپنی قیادت کا سکہ جمانے کی کوشش کرے گا۔ یا پھر جماعت سے الگ ہونے کے بعد وہ دنیا کی بھیڑ میں گُم ہو جائے گا۔ وہ اپنے دوستوں کے درمیان تو بہت سخت ہوگا مگر دشمنوں سے مقابلے میں بزدلی کا مظاہرہ کرے گا۔

- جب جماعت کے اندر مختلف طرزِ فکر کے لوگ شامل ہوں گے تو ان کے درمیان کامل اتحاد پیدا ہونا مشکل ہے۔ جب کبھی کوئی مسئلہ درپیش ہوگا تو وہ دو یا دو سے زیادہ فریق میں تقسیم ہو جائیں گے اور اس صورت میں اختلافات کا پیدا ہونا فطری ہے۔ شوریٰ کے اندر مختلف رایوں کا پایا جانا کسی جماعت کے لیے نقصان دہ نہیں ہے بلکہ وہاں تو اخلاف رائے ہونا مفید ہے۔ لیکن جب کوئی معاملہ طے ہو جائے اور پھر اس کے نفاذ کے سلسلے میں اختلاف ہو تو یہ چیز کسی بھی تحریک کے لیے بہت زیادہ نقصان دہ ہے۔
- کسی مخصوص نظریے کی جانبداری اور انتہا پسندی کی صورت میں بھی اختلافات رونما ہوتے ہیں۔ کسی تحریک کی بقا و سلامتی اور اس کی قوت و طاقت کے لیے حکمت و اعتدال پسندی نہایت ناگزیر ہے اور جب کبھی یہ انتہا پسند حضرات کسی جماعت میں شامل ہوتے ہیں تو ان کا جماعت سے علیحدگی اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر ایسے لوگ تحریک کے لیے بہت زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔
- شدائد و مشکلات کا ہمیشہ قوت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی صورت میں بھی تفرقہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر تحریک کے اُصول سخت ہوں اور حریف زیادہ طاقتور ہو تو اس کمزور فریق کے اندر زیادہ دیر تک استقامت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی قدرت نہیں رہتی یا تو وہ داغِ مفارقت دے جائیں گے یا اپنی کمزوری کے لیے کوئی فلسفیانہ دلیل پیش کریں گے۔

مولانا مودودیؒ نے اس طرح کے تمام اختلافات وتفرقات کو غایت درجہ حکمت و دانش مندی کے ساتھ دور کرنے کی کوشش کی۔ بارہا مجلسِ شوریٰ کو جمع کیا، مخالفین کو پوری آزادی کے ساتھ دلائل پیش کرنے کا موقع دیا، اسی طرح ہر فریق کو موقع دیا، ان تمام اجتماعات کے بعد جماعتِ اسلامی اس نتیجے پر پہنچی کہ سیاست

دین کا ایک جزو ہے جسے تحریک سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقی تربیت کا بنیادی اُصول یہی ہے کہ دین کو سیاست سے الگ نہیں کیا جائے کیونکہ انہی تمام اجزاء سے مل کر اسلام تمام شعبہ ہائے زندگی پر محیط ایک مہمل نظامِ حیات بنتا ہے۔ اس وقت تقریباً ۱۵ ارکان نے اس فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ جماعت نے ان کے استعفیٰ کو قبول کر لیا پھر معاملات نے صحیح رُخ اختیار کر لیا۔

مولانا مودودیؒ اور تحریک جماعتِ اسلامی کے لیے تقریباً ایک سال پر مشتمل یہ آزمائشی دور سب سے زیادہ سنگین مرحلہ ثابت ہوا کیونکہ مخالفین کا سامنا کرنا تو آسان ہے لیکن اپنے تحریکی بھائیوں اور دوستوں سے مقابلہ نہایت ہی کٹھن کام ہے۔

لیکن ان کے استعفیٰ کو قبول کرنا جماعتِ اسلامی کے حق میں بہتر ثابت ہوا اس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب اسلامی تحریکات کو اس طرح کے فکری مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو وہ باہمی رضامندی اور اسلامی اُخوّت و محبت کی تذکیر کے ذریعہ ان کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ معاملات کو جذبات اور معذرتوں کے ذریعہ ختم کر دیا جاتا ہے جبکہ ہر فریق اپنی رائے پر مصر رہتا ہے کچھ دنوں کے بعد جب جذبات سرد پڑ جاتے ہیں تو ایک بار پھر وہی قدیم اختلافات اُبھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔ (۴۴)

اسلامی تحریکات اسی بنیادی اُصول کو اختیار کرتی ہیں لیکن تحریک کے اُصول و مبادی پر جماؤ اور اس کے اغراض و مقاصد سے گہرا لگاؤ ناگزیر ہے۔ علامہ مودودیؒ نے ۱۹۴۷ء کے بعد سے پاکستان کے اندر مختلف زمانوں میں برسرِ اقتدار آنے والی تمام غیر فوجی حکومتوں کا سامنا کیا۔ ان تمام حکومتوں نے پاکستان کو برائے نام اسلامی ملک بنانے کی کوشش کی جب کہ تمام تر احکام و قوانین اسلام کے خلاف نافذ کیے گئے۔

علامہ مودودیؒ نے جماعتِ اسلامی کے پلیٹ فارم سے ہو حکومت سے شریعتِ اسلامی کے نفاذ کا مطالبہ کیا انہوں نے اس بات کی پوری وضاحت کی کہ پاکستانی عوام اسلام کے لیے ہر طرح کی قربانی دے سکتے ہیں لیکن وہ کسی غیر اسلامی حکومت کو کسی قیمت پر قبول نہیں کریں گے۔ نتیجہ ظاہر تھا کہ جماعتِ اسلامی کے دیگر سرکردہ رہنماؤں کے ساتھ ۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو آپ کو بھی نظر بند کر دیا گیا اور نظر بندی کی یہ مدت ۲۸ مئی ۱۹۵۰ء تک جاری رہی۔

۱۹۵۰ء میں حکومت نے عوام کے مسلسل مطالبات سے مجبور ہو کر مجوزہ دستور کا خاکہ پیش کیا۔ ان تجاویز کے آئینے میں برسرِ اقتدار حکومت کی اصلیت کو دیکھا جا سکتا تھا۔ اس دستور کی تمام شقوں کا اسلامی اُصولوں سے صریح ٹکراؤ تھا۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو لاہور میں تقریر کرتے ہوئے علامہ مودودیؒ نے ان دستوری تجاویز پر سخت تنقید کی اور اس امر کی وضاحت کی کہ حکومت ڈکٹیٹر شپ کے لیے راستہ ہموار کر رہی ہے۔ جنوری ۱۹۵۱ء میں جماعت نے اُمت کے متعدد علماء کے ساتھ مل کر ایک اسلامی دستور وضع کر کے حکومت کو پیش کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مارچ ۱۹۵۳ء میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ علامہ مودودیؒ اور ان کے رفقاء کو بلا کوئی سبب بتائے گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء کو آپ کے لیے پھانسی کا فیصلہ سنایا گیا اور آخر آپ کو پھانسی کیوں نہ دی جاتی مذہب اسلام سے تعلق آپ کے خلاف سب سے بڑا ثبوت تھا۔

- آپ کا سب سے پہلا جرم یہ تھا کہ آپ ایک سچے مسلمان تھے۔ مشرق و مغرب کو موجودہ حکومتوں کے نزدیک سچے مسلمانوں کی کوئی عزت و وقعت نہیں۔ اسلام پسندوں اور اسلام کا دفاع کرنے والوں کے خلاف ہر قیمت پر جنگ کرنا ان کے بنیادی شرائط میں داخل ہے۔
- آپ کا دوسرا بڑا جرم یہ تھا کہ آپ اسلامی مفکر تھے۔ آپ کے اندر دلائل کی روشنی میں تمام افکار و نظریات پر اسلام کی عظمت ثابت کرنے کی صلاحیت تھی۔ آپ نے اُمت کے تمام طبقوں۔۔ جس میں مغربی تہذیب سے فریب خوردہ فرقہ بھی شامل تھا۔ کو اسلام کی دعوت دی۔ آپ نے ثابت کیا کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے جو زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔ یہی پوری دنیائے انسانیت کو حق وصداقت، عدل و انصاف اور امن و سلامتی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔
- آپ کا تیسرا بڑا جرم یہ تھا کہ آپ ایک سرگرم داعی تھے۔ ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اُٹھانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے، حالات خواہ کیسے ہی ہوں ظلم ہوتا دیکھ کر آپ خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ آپ کو جبر و اکراہ اور قید و بند کے ذریعہ ہی خاموش رکھا جا سکتا تھا۔ اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو پھر آخری راستہ پھانسی ہی بچتا ہے۔

اس فیصلے کے خلاف جگہ جگہ مظہرے کیے گئے، پوری دنیا سے اس ظالمانہ فیصلے کے خلاف ٹیلی گرام کا تانتا بندھ گیا۔ آخرکار عدالتِ عالیہ نے اس فیصلے کو باطل قرار دیا اور ۱۹۵۵ء میں علامہ مودودیؒ اور ان یک رفقاء کو رہا کر دیا گیا۔

حکومت عوام کے مطالبات کے آگے جھکنے پر مجبور ہوئی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو اس نے اسلامی دستور قائم کرنے کا اعلان کیا۔ پاکستان کے تمام اسلامی تنظیموں نے اس اعلان کا استقبال کیا۔ جماعتِ اسلامی کی مرکزی شوریٰ نے بھی بعض تبدیلیوں کے ساتھ اسے قبول کرلیا۔ اس طرح اسلامی دستور کی تیاری کے سلسلے میں تمام کوششیں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئیں۔ (۴۵)

## مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ بحیثیت قائد

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے تمام ہی عملی وفکری اقدامات میں ہمارے لیے عبرت ونصیحت پوشیدہ ہے۔ خاص طور سے قیادت کے باب میں تو آپ کا موقف آخری حدوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ دعوت وتحریک کی ترقی میں قائد کا نہایت اہم رول ہوتا ہے۔ قائد کی مثال کسی ٹرین یا بس کے ڈرائیور کی ہوتی ہے۔ جس طرح کسی گاڑی کو چلانے، اس کے کُل پرزوں کی حفاظت کرنے اور دیگر معاملات کی دیکھ بھال کرتے ہوئے گاڑی کو منزلِ مقصود تک پہنچانا ڈرائیور کی ذمّہ داری ہے اسی طرح تحریک کے تمام معاملات کی دیکھ بھال کی ذمّہ داری بھی قائد پر ہوتی ہے۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے کبھی منصب قیادت کی خواہش نہیں کی۔ آپ اپنے لیے ایک قائد سے زیادہ داعی ہونا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کہتے ہیں:

> ''میرا مقصد آپ لوگوں کی مدد سے ایک اسلامی جماعت کو تشکیل دینا تھا، الحمدللہ یہ مقصد پورا ہوگیا، میں صرف ایک داعی کی حیثیت سے کام کرنا چاہتا ہوں، میری تمام کوششوں کا مقصد اسی جماعت کی تشکیل تھی۔ اس کے قائم ہوجانے کے بعد آج میں اپنے آپ کو اس کا ایک کارکن سمجھتا ہوں، اب یہ تحریک کی ذمّہ داری ہے کہ وہ

امارت کے لیے کسی مناسب شخص کو منتخب کرے جو اس جماعت کا امیر ہوگا اور مستقبل میں اس جماعت کی تعمیر و ترقی اور تبلیغ و اشاعت کا مکمل پروگرام طے کرنا اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اس کی ذمہ داری ہوگی۔ کسی شخص کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ چونکہ میں نے اس تحریک کو قائم کیا اسے لیے میں اس کا امیر بننا چاہتا ہوں۔ میں کبھی اس چیز کا خواہش مند نہیں رہا اور نہ ہی اس نظریے کا قائل ہوں کہ ایک داعی کے لیے بالآخر قائد بننا ضروری ہوتا ہے۔''

اتنا ہی نہیں بلکہ آپ وقتاً فوقتاً اپنا استعفیٰ بھی پیش کرتے رہتے تھے تاکہ ان کے رفقاء ان کو اس ذمہ داری سے الگ کردیں اور اپنے لیے کسی نئے امیر کو منتخب کرلیں۔

کیا دیگر رہنماؤں کے یہاں اس نظریے کی مثال مل سکتی ہے۔ دوسرے لیڈران ہر قیمت پر پارٹی کے سربراہ بننے کی کوشش کرتے ہیں اس کی خاطر خواہ تحریک کے اغراض و مقاصد کا گلا ہی کیوں نہ گھونٹنا پڑے۔

نومبر ۱۹۷۲ء میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جماعت کے ارکان کے سامنے منصب امارت سے اپنی معذوری پیش کی اور ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ آپ نے عالمی تحریکات اسلامی کے صفحات پر جو نقوش چھوڑے تھے وہ آج بھی باقی ہیں۔

اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت کرے اور جوارِ رحمت میں جگہ دے اور مسلمانوں کو ان کے فکری و عملی ذخائر سے استفادہ کرنے کی توفیق دے۔ آمین

# فصل ششم

## سیّد قطب شہیدؒ

انقلابِ مصر ۱۹۵۲ء کے بعد جن اخوانی لیڈروں کی عظمت و کردار نے آسمان کی بلندیوں کو چھوا ان میں سیّد قطب کا نام امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ۱۹۰۶ء میں موشیہ کی ایک معزز شخصیت کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ واجداد صدیوں پہلے جزیرۃ العرب سے ہجرت کر کے مصر میں آباد ہوئے تھے۔ آپ کے والد حاجی ابراہیم قطب متوسط درجے کے زمیندار تھے جن کا زیادہ تر وقت عبادت اور ذکرِ الٰہی میں گزرتا تھا۔ آپ کی والدہ سیّدہ فاطمہ حسین اپنی دینداری اور علوم قرآنی سے طبعی رغبت کے سبب قطب خاندان میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ قرآن مجید سے آپ کی والدہ کی والہانہ محبت نے آپ کی شخصیت بنانے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ آپ پیدائشی ذہین اور قوتِ حافظہ کی بے پناہ خوبیاں رکھتے تھے۔ چنانچہ اوائل عمر ہی میں آپ نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گاؤں ہی کے ایک مدرسہ سے حاصل کی۔ ثانوی تعلیم کے لیے حلوان کے ''دارالعلوم تجہیزیہ'' میں داخلہ لیا۔ اسی زمانے میں آپ کے والدین بھی موشیہ سے حلوان منتقل ہو گئے۔ وہیں سے ۱۹۲۹ء میں آپ نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر آپ نے دارالعلوم (قاہرہ یونیورسٹی) میں داخلہ لیا۔ ۱۹۳۳ء میں قاہرہ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور اسی سال ایجوکیشن میں ڈپلومہ لے کر آپ دارالعلوم ہی میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ محکمۂ تعلیم نے آپ کی تقرری بحیثیت انسپکٹر مدارس کر دی۔ ۱۹۳۳ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک آپ ایک ماہر تعلیم، بلند پایہ انشاپرداز، شاعر، افسانہ نویس، ادیب، محقق اور تنقید نگار کی حیثیت سے مصر کے بلند پایہ علمی اور ادبی حلقوں میں مقام پیدا کر چکے تھے۔ اس زمانے میں آپ کی جو کتب شائع ہوئیں ان کو پڑھ کر آپ کی علمی اور ذہنی سطح کا ندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں آپ سرکاری وظیفہ پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ریاست ہائے متحدہ امریکہ چلے گئے۔ وہاں آپ ولسن ٹیچرز کالج واشنگٹن، ٹیچرز کالج گریلی کولوراڈو اور سٹان فورڈ یونیورسٹی جیسے

اداروں میں جدید نظام تعلیم کا مطالعہ کرتے رہے۔ امریکہ میں آپ کا قیام تقریباً اڑھائی برس رہا۔ امریکہ سے واپسی پر آپ نے برطانیہ، اٹلی، سوئزرلینڈ اور اسپین کا مطالعاتی دورہ بھی کیا آپ امریکہ میں ہی تھے کہ اخوان المسلمون کے مرشد عام حسن البناء کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ نے آپ کو اخوان المسلمون کے قریب کر دیا۔ ۱۹۵۱ء میں آپ وطن واپس آئے اور اخوان المسلمون میں شامل ہو گئے۔ اخوان المسلمون میں آپ کی شمولیت کے بارے میں متضاد روایات پائی جاتی ہیں۔ مولانا خلیل احمد حامدی آپ کے ایک شاگرد یوسف العظم کے حوالہ سے تحریر کرتے ہیں کہ:

''امریکہ سے واپس آتے ہی انہوں نے الاخوان المسلمون کی طرف توجہ دی ان کی دعوت کا مطالعہ کیا اور بالآخر ۱۹۴۵ء میں اخوان المسلمون سے وابستہ ہو گئے۔''

سیّد قطب کے بھائی پروفیسر محمد قطب نے مکہ معظّمہ میں سجاد حجازی کو انٹرویو ریکارڈ کراتے ہوئے سیّد قطب کی اخوان المسلمون میں شمولیت ۱۹۵۱ء بتائی ہے۔ ان کے الفاظ میں:

''۱۹۵۰ء میں میرے بڑے بھائی سیّد قطب شہید نے امریکہ میں تعلیم مکمل کی اور واپس آئے تو سب سے پہلے انہوں نے اخوان میں شمولیت اختیار کی۔''

خود سیّد موصوف کے اپنے الفاظ میں:

''۱۹۴۹ء میں حسن البناء کی شہادت پر امریکہ میں بے پناہ خوشیاں منائی گئیں۔ میں اس سے متاثر ہو کر اخوان میں شامل ہو گیا۔''

عبید اللہ فہد فلاحی کے نزدیک:

''سیّد قطب ۱۹۵۳ء کے اواخر میں اخوان المسلمون میں باضابطہ شامل ہوئے۔'' (۴۶)

دو سال بعد ۱۹۵۳ء میں آپ نے محکمہ تعلیم کی ملازمت چھوڑ دی اور خود کو اخوان المسلمون کے لیے وقف کر دیا۔ مجلس دعوتِ اسلامی نے دینی اور فکری محاذوں پر آپ کی خدمات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے روزنامہ ''المسلمون'' کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ المسلمون کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے ابھی آپ کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ اخوان المسلمون نے آپ کو شعبہ نشر و اشاعت کا سیکریٹری مقرر کر دیا۔ یہ نازک ذمّہ داریاں اس

وقت آپ کے کندھوں پر ڈالی گئیں جب اخوان اپنی تاریخ کے سنگین ترین بحران سے گزر رہے تھے۔ انقلابی کونسل اور اخوان میں چپقلش کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان حالات میں آپ المسلمون کے صفحات پر انقلابی کونسل کے آئندہ عزائم کے بارے میں بے لاگ تبصرہ اور تنقید کر کے عوام کو فوجی جنتا کے اصل کردار سے آگاہ کرتے رہے۔ المسلمون کے فائل گواہ ہے کہ آپ نے تنقید برائے تنقید یا کسی ذاتی وگروہی تعصب کو سامنے رکھ کر انقلابی کونسل کی کارکردگی میں کیڑے نکالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ انقلابی کونسل کے وعدوں، اس کی منفی سوچ اور فکر کا نہایت مثبت انداز میں پوسٹ مارٹم کیا۔ ''المسلمون'' میں جن خدشات کا اظہار آپ وقتاً فوقتاً کرتے رہتے تھے۔ آخر کار وہی ہوا کمیونسٹوں اور جنرل نجیب سے فارغ ہو کر نوجوان افسروں کا اگلا نشانہ اخوان بنے۔ چنانچہ جمال عبدالناصر پر قاتلانہ حملے کا ڈرامہ رچا کر اخوان المسلمون پر پابندی لگا دی گئی۔ بے شمار لیڈروں اور کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا ان میں آپ بھی شامل تھے۔ حالانکہ ایف آئی آر (FIR) میں آپ کا نام شامل نہیں تھا۔ آپ کا جرم صرف یہ تھا کہ آپ انقلابی کونسل پر تنقید کرتے تھے اور آپ کی کتب کے مطالعے سے نوجوانوں میں اسلامی رُوح بیدار ہو رہی تھی اور اس کے اثرات بہت جلد ہی مصری سوسائٹی پر ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ خطرناک بات ناصر جیسے ''غیر جانبدار اور لبرل حکمران'' کے لیے اور کیا ہو سکتی تھی۔ گرفتاری کے وقت آپ شدید بخار میں مبتلا تھے۔ اس پر مزید ستم یہ کہ آپ کو ہتھکڑیاں پہنا کر گھر سے جیل تک لایا گیا۔

مولانا خلیل احمد حامدی ہفت روزہ (الشہاب) کے حوالہ سے تحریر کرتے ہیں:

> ''فوجی افسر جب سیّد قطبؒ کو گرفتار کرنے کے لیے ان کے گھر میں داخل ہوئے تو سیّد قطبؒ اس وقت انتہائی شدید بخار میں مبتلا تھے انہیں اسی حالت میں پابندِ سلاسل کر لیا گیا اور پیدل جیل تک لے جایا گیا۔ راستے میں شدید کرب کی وجہ سے بے ہوش ہو کر اللہ اکبر والحمد کے نعرے جاری ہوتے۔ انہیں جب سجن حربی (فوجی جیل) میں داخل کیا گیا تو جیل کے دروازے پر ان کی ملاقات جیل کے کمانڈر حمزہ میسوقی اور خفیہ پولیس کے افسروں سے ہوئی جوں ہی سیّد قطبؒ نے

جیل کے اندر قدم رکھا تو جیل کے کارندے ان پر ٹوٹ پڑے اور پورے دو گھنٹے ان کو زود و کوب کرتے رہے۔ جیل کے اندر ان پر ایک سدھایا ہوا گرگ نما فوجی کتا بھی چھوڑا گیا جو ان کی ران منہ میں لے کر انہیں اِدھر اُدھر گھسیٹتا رہا۔ اس تمہیدی کاروائی کے بعد انہیں ایک کوٹھڑی میں لے جایا گیا اور ان سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا جو مسلسل سات گھنٹے تک جاری رہا۔ سیّد قطبؒ کی جسمانی طاقت اگرچہ جواب دے چکی تھی مگر قلبی حرارت اور اطمینان و صبر کی طاقت نے انہیں پتھر کی چٹان میں تبدیل کر دیا۔ ان پر گوناگوں اذیتوں کی بارش ہوتی رہی مگر وہ اللہ اکبر اللہ اکبر والحمد کے سرور جاودانی میں مستغرق رہے۔ رات کو جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ڈال دیے جاتے اور صبح کے وقت بلاناغہ انہیں پریڈ کروائی جاتی۔ ان مالا یطاق مشقتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ متعدد بیماریوں میں مبتلا ہو گئے۔ ۳ مئی ۱۹۵۵ء کو انہیں فوجی ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت موصوف امراض سینہ، قلبی ضعف، جوڑوں کے درد اور اسی نوعیت کی دوسری بیماریوں میں مبتلا تھے۔ جولائی ۱۹۵۵ء میں ایک خصوصی ٹریبونل کے ذریعہ آپ پر بغاوت اور تشدد کے مختلف الزامات کے تحت مقدمہ چلا کر پندرہ برس قید کا حکم سنایا گیا۔

ٹریبونل کے سامنے آپ نے بیان دیتے ہوئے کہا:

''اگر تمہیں میری ضرورت ہو تو میں اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر آیا ہوں'' جیل میں آپ کو مشورہ دیا گیا کہ اگر معافی مانگ لیں تو وزیر اعظم مقرر کر دیے جائیں گے لیکن اس مردِ مومن کو شیطانی ہوس اور رشوت بھی رام نہ کر سکی۔ ان کی جگہ کوئی اور کمزور دل اور ضمیر فروش ہوتا تو عبدالناصر کی پیشکش قبول کر کے اپنا مستقبل بنا لیتا لیکن سیّد قطبؒ کی غیرت نے اس ذلت اور رسوائی کو برداشت نہ کیا اور فرمایا:

''اگر ملک کے نظامِ تعلیم کو اسلامی نظریات کے مطابق ڈھالنے کی غیر مشروط آزادی

دی جائے تو میں حاضر ہوں، ورنہ نہیں"

جیل میں رہ کر آپ نے تالیف وتصانیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ کتب کے مسوّدے کسی نہ کسی طریقہ سے جیل سے باہر رفقاء کو پہنچ جاتے۔ وہ ان کی اشاعت کا بندوبست کرتے تھے۔ قرآنِ کریم کی مایۂ ناز تفسیر "فی ظلال القرآن" آپ نے جیل ہی میں مکمل کی۔

آخری کتاب جسے آپ نے جیل میں مکمل کیا "المعالم فی الطریق" ہے۔ جسے پڑھ کر حسن الھضیبی نے فرمایا تھا کہ:

"اس کتاب نے میری تمام اُمیدیں سیّد قطبؒ سے وابستہ کر دی ہیں۔ خدا اس کی حفاظت فرمائے۔ میں اسے پڑھ چکا ہوں اور اس کا مطالعہ دوسری بار بھی کر چکا ہوں بلاشبہ اب سیّد قطبؒ ہی دعوت کے لیے ہمارا مرکزِ آرزو ہیں۔ انشاء اللہ"

دس برس بعد آپ کو عراق کے صدر عبدالسلام عارف کی ذاتی سفارش پر اگست ۱۹۶۴ء میں رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے آپ کو عراقی وزارتِ تعلیم کی طرف سے ایک اعلیٰ منصب کی پیشکش کی گئی۔ سیّد قطب شہیدؒ نے اسی سلسلہ میں جیل میں عمر تلمسانی سے مشورہ کیا۔

عمر تلمسانی کے الفاظ میں:

"میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ پیشکش کو قبول کر لیں اور عراق چلے جائیں، انقلابیوں کے بُرے ارادے مجھے نظر آرہے تھے اور میں سیّد شہیدؒ کی زندگی کو خطرے میں دیکھ رہا تھا۔ میرے اس مشورہ کے باوجود سیّد قطبؒ نے فیصلہ کیا کہ اپنی رائے اور عالمانہ فکر کا دفاع کرنے کے لیے انہیں مصر میں ہی رہنا چاہیے۔" (۴۷)

لیکن رسوائے زمانہ سیکیورٹی پولیس اور سرکاری پارٹی سوشلسٹ یونین کے غنڈے مسلسل آپ کے تعاقب میں رہتے۔ ابھی آپ کو رہا ہوئے ایک سال ہی ہوا تھا کہ امریکی اور روسی حکومت کے اشارے پر دوبارہ گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتاری کی وجہ ایک مقالہ بتائی گئی جس میں سرمایہ داری، سوشلزم اور مارکسزم کی ناکامی کا ماتم کیا گیا تھا اور ان کے مقابلے میں اسلام کو ایک برتر اور قابلِ عمل قوت قرار دیا گیا تھا لیکن بتدریج

فردِ جرم میں اضافہ ہوتا گیا۔ تشدد، بم سازی، جمال عبدالناصر اور اہم شخصیات کا قتل وغیرہ الزامات لگائے گئے۔

ان الزامات میں کہاں تک صداقت تھی مصری حکومت کا ترجمان اخبار ''الیوم'' لکھتا ہے کہ:

> ''مصر کے سابق جنرل اٹارنی عبدالسلام نے اپنی تازہ تصنیف میں یہ واضح طور پر تحریر کیا ہے کہ سیّد قطبؒ کو جب گرفتار کیا گیا اور ان پر حکومت کا تختہ اُلٹنے کا الزام لگایا گیا تو ان کا مقدمہ جب اٹارنی جنرل کے پاس آیا اور اسے کہا گیا کہ سیّد قطبؒ کو موت کی سزا دلوائی جائے تو اس نے حکومت کو مطلع کیا کہ سیّد قطبؒ کے خلاف جو الزامات لگائے گئے ہیں اور ان کے لیے جو دلائل فراہم کیے گئے ہیں ان کے بل پر تو عدالت کے ذریعے انہیں معمولی سزا بھی نہیں دی جا سکتی کجا کہ انہیں موت کی سزا دی جائے۔ چنانچہ حکومت نے اٹارنی جنرل سے مقدمہ واپس لے کر اسپیشل کورٹ کے حوالے کر دیا جائے جس کا صدر کرنل وجودی تھا۔ اس کورٹ نے تحقیقات اور شہادتوں کا تکلف کیے بغیر انہیں پانچ منٹ کے اندر موت کی سزا سنادی۔''

مصری وکلاء میں کسی کی یہ جرأت نہیں تھی کہ اس ''باغی'' کے مقدمہ کی پیروی کے لیے اپنے آپ کو پیش کرے۔ سوڈان اور امریکہ کے وکلاء، فرانس کی بار ایسوسی ایشن کے صدر ولیم تھارپ، ہیگ کے مشہور وکیل جے ایم وینڈال نے سیّد قطبؒ اور ان کے ساتھیوں کے مقدمہ کی پیروی کے لیے درخواستیں دیں جو رد کر دی گئیں۔ سوڈان کے دو وکیل کسی نہ کسی طرح مقدمہ کی پیروی کے لیے قاہرہ پہنچ گئے۔ انہیں زبردستی قاہرہ سے نکال دیا گیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے نمائندے مسٹر آرچر نے مصر کا دورہ کر کے ان مظالم کے خلاف عالمی ضمیر اور رائے عامّہ کو جھنجھوڑا جو اخوانیوں پر جیلوں میں کیے جا رہے تھے۔ گرفتاری سے لے کر مقدمہ کی سماعت تک حکمرانوں نے تہذیب اور شائستگی کے تمام حدود پھلانگ کر جس طرح آپ کو تشدد اور تعذیب کا نشانہ بنایا اور جو وحشیانہ سلوک آپ کے ساتھ روا رکھا اس کے آگے جرمن نازیوں کے مظالم کی داستانیں ہیچ نظر آتی ہیں۔ مصر

کے سرکاری اخبار الیوم کے مطابق نامور مصنف سیّد قطبؒ کے ساتھ جیل میں عجیب و غریب سلوک روا رکھا گیا۔ جیل کے جلاد انہیں ایک بھاری بھر کم کرسی کے ساتھ رسی سے باندھ دیتے اور کئی روز یوں ہی بندھے رہتے اور سو بھی نہ سکتے تھے۔ اسی دوران جیل کے سپاہی ان کے چہرے پر لاتیں مارتے۔''

آپ کے جیل کے ایک ساتھی احمد رائف مصری لکھتے ہیں:

''گرفتاری کے بعد آج پہلی مرتبہ میں نے مجاہد کبیر و مصنف شہیر اور عالم ربانی خلد آشیانی سیّد قطبؒ کو دیکھا۔ وہ ہسپتال کے قریب آہستہ آہستہ قدموں سے چل رہے تھے۔ طمانیتِ قلب ان کی جبیں کشادہ سے نمایاں طور پر جھلک رہی تھی۔ آنکھوں کی چمک کیا تھی گویا نور کے پھوارے پھوٹ رہے تھے۔ پاؤں یوں کھینچ کھینچ کر زمین پر لگاتے تھے جیسے وہ بے سکت ہو چکے ہوں۔ پاؤں کا غیر معمولی موٹاپا جلاد کی چیرہ دستی کا نوحہ کر رہا تھا۔ وہ گاہے بگاہے ہم پر اپنی محبت آمیز نگاہیں ڈالتے اور نظروں میں ساتھیوں کو مزید عزیمت و استقامت کا درس دیتے۔''

مقدمہ کی کاروائی کے دوران سیّد قطبؒ نے یہ بات جانتے ہوئے کہ فیصلہ ان کے خلاف ہوگا، نہایت ہی مدلّل انداز سے خطاب کیا۔

احمد رائف مصری کے الفاظ میں:

''سیّد قطبؒ نے انتہائی کمزوری اور اعصابی ضعف کے باوجود کرنل وجودی کے سامنے کھل کر اظہار خیال کیا اور جو ان کے دل میں تھا اسے برملا زبان پر لے آئے۔ اس وقت مصری پریس کے بارے میں اگر ہلکے سے ہلکے لفظ بھی استعمال کریں تو یہ کہیں گے کہ وہ ہیچ میرزا اور کرائے کا ٹٹو پریس تھا۔ سیّد قطبؒ نے کرنل وجودی اور ضمیر فروش پریس کے سامنے اس وحشیانہ تعذیب کی داستانیں سنائیں جن کا نشانہ اخوان المسلمون کے ملزموں کو بنایا گیا تھا۔ کمرۂ عدالت میں سیّد قطبؒ کے بیانات کا ردّ عمل تمسخر انگیز قہقہوں اور تشفی آمیز نظروں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس ردّ

عمل میں جج بھی شامل تھا اور انٹیلی جنس کے جلاد اور چمچہ گیر اور کرائے کے نعرے باز حاضرین بھی۔ سیّد قطبؒ نے باوجود اس بات کے کہ وہ ان لوگوں کے عزائم اور اپنے انجام کو بخوبی جان چکے تھے، اپنی بات کہہ ڈالی اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان کی ذات پر جیل میں جو کچھ گزری اس کا انہوں نے اشارہ تک نہ کیا بلکہ دوسرے اخوانیوں پر جو مظالم توڑے گئے ان کی شکایت کی۔''

نام نہاد فوجی ٹریبونل نے مختصر ترین کاروائی کر کے ۱۹ اگست ۱۹۶۶ء کو دیگر دو اخوانی رہنماؤں یوسف حواش اور اسمٰعیل عبدالفتاح کے ہمراہ موت کی سزا سنائی۔ سزا کا سن کر سیّد زیرِ لب مسکرائے اور فرمایا:

''مجھے پہلے ہی اس بات کا علم تھا کہ اس مرتبہ جمال عبدالناصر کی حکومت میرے سر کی طالب ہے۔ مجھے نہ اس پر افسوس ہے اور نہ اپنی موت کا رنج بلکہ میں اس بات پر خوش ہوں کہ اپنے مقصد کے لیے جان دے رہا ہوں۔ بہرحال اس بات کا فیصلہ مستقبل کا مؤرّخ کر دے گا کہ اخوان راہِ راست پر تھے یا حکومت؟''

پھانسی کی رات حمزہ لبیونی نے حمیدہ قطب کو جو خود بھی جیل میں تھیں، بلایا اور پھانسی کے احکامات دکھا کر کہا کہ:

''سیّد قطبؒ اگر اس بات کا اقرار کریں کہ اخوان کا تعلق کہیں اور ہے پھر انہیں خرابی صحت کا بہانہ بنا کر رہا کر دیا جائے گا۔''

چنانچہ اس سلسلہ میں حمیدہ قطب کی سید قطب سے ملاقات کرائی گئی۔ حمیدہ نے اپنے اور حمزہ کے درمیان ہونے والی گفتگو سیّد قطبؒ کو سنائی۔ حمیدہ کے الفاظ میں:

''بھائی نے پوچھا کیا تم اس پر خوش ہو گی؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ وہ بولے نفع و نقصان لوگوں کے قبضہ قدرت میں نہیں ہے بلکہ عمریں اللہ کے ہاتھ میں ہیں یہ لوگ میری زندگی عمر گھٹانے یا بڑھانے کا فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ یہ سب اللہ کے اختیار میں ہے وہی تمام چیزوں پر محیط ہے۔''

پھانسی کے وقت کے تاثرات بیان کرتے ہوئے بی بی سی کا نمائندہ مقیم قاہرہ کہتا ہے کہ سیّد قطبؒ تختہ دار کی طرف اس طرح بڑھے جیسے کوئی دولہا اپنی دلہن کو لینے چلا ہو۔''

ان سزاؤں کے خلاف عالم اسلام میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ جمال عبدالناصر کے نام دنیا کے کونے کونے سے اسلام، انسانیت اور انصاف کے نام پر معافی کی اپیلیں کی گئیں۔ ہزاروں کی تعداد میں برقیے روانہ کیے گئے لیکن بزدل ناصر کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اچانک ۲۹ اگست کو دوپہر کے وقت قاہرہ ریڈیو نے اپنی نشریات روک کر اعلان کیا کہ:

''فرعونِ مصر کے حکم سے اخوان المسلمون کے تین رہنماؤں کو آج فجر کے وقت پھانسی دے دی گئی۔'' (۴۸)

## سیّد قطب شہیدؒ کے نظریات

ایک بلند پایہ انشاء پرداز، سیاسی مفکر اور ماہر عمرانیات کی حیثیت سے سیّد قطب شہیدؒ مصر کے علمی، ادبی اور سیاسی حلقوں میں اس اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز ہیں جہاں مصر جدید کا کوئی دوسرا ادیب اور مفکر نہ پہنچ سکا۔ آپ کی تحریریں گزشتہ نصف صدی سے عالم عرب کے تعلیم یافتہ حلقوں میں نہایت دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ عالمِ عرب کا کوئی قابلِ ذکر حلقہ ایسا نہیں جہاں ان کتب کے حوالہ سے آپ کی شخصیت اور فن کو خراجِ عقیدت پیش نہ کیا جاتا ہو۔ عالم عرب سے باہر بھارت، پاکستان، ایران، بنگلہ دیش، تیونس، ترکی، انڈونیشیا اور ملائیشیا وغیرہ ممالک میں آپ کا ایک وسیع حلقہ ارادت موجود ہے، یہاں آپ کی کتب کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ آپ کے نظریات کا جائزہ لینے سے پہلے یہ بات ذہن نشین رہے کہ جس زمانہ میں آپ نے لکھنا شروع کیا اس وقت جگہ جگہ مسلمان ممالک آزادی اور خودمختاری کے حصول کے لیے نوآبادیاتی نظام کے چنگل سے نکلنے کی کوششوں میں مصروف تھے اور یہ خطرہ تھا کہ جیسے ہی یہ ممالک آزادی کی دولت سے ہمکنار ہوں گے تحریکِ آزادی کے قوم پرست لیڈر نوآبادیاتی نظام کی تمام بُرائیوں کو جوں کا توں ہی برقرار رہنے دیں گے اور ہوا بھی یہی سیّد قطبؒ نے اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے بہت پہلے مغربی تہذیب اور مغرب کے فرسودہ سیاسی نظام پر

تنقید شروع کر دی تھی۔ لیکن آپ کے نظریات میں شدت اور تیزی دوسری جنگِ عظیم کے زمانہ میں آئی جب آپ نے ''العدالۃ الاجتماعیۃ'' تحریر کر کے عالم عرب کے سیاسی اور علمی حلقوں میں ہلچل مچادی۔

آپ کے الفاظ میں:

''اس (سیّد قطبؒ) نے پورے چالیس سال پڑھنے میں گزارے ہیں۔ اس پورے عرصہ میں اس کا اصل کارنامہ یہ رہا ہے کہ انسانی علوم کے اکثر شعبوں کا مطالعہ کرے اور یہ جانے کہ ان میں کیا باتیں مخصوص علم کا درجہ رکھتی ہیں اور کیا باتیں تہذیبی میلانات کی آئینہ دار ہیں؟ پھر اس نے خود اپنے عقیدہ تصوّرِ حیات کے ماخذ کا مطالعہ کیا تو اس زبردست خزانہ کے سامنے اسے جو کچھ اس نے اب تک پڑھا تھا ہیچ اور معمولی نظر آیا۔ ہونا بھی یہی چاہئے تھا مگر اس نے اپنی عمر کے چالیس سال جس کام میں صرف کیے اس پر اسے چنداں پریشانی نہیں کیونکہ اس نے جاہلیت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ اس میں کتنا بگاڑ، کتنی کج روی اور کتنی پستی ہے؟ اختلاف و انتشار اور پراگندہ خیالی کس حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ جاہلیت کو اپنے بارے میں کتنا مغالطہ ہے اور اس کے بلند و بانگ دعوے کتنے بے بنیاد ہیں اسے اپنے ذاتی مطالعہ کی بناء پر کامل یقین ہو گیا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے علم و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ان دونوں ماخذ اسلامی اور غیر اسلامی کو ایک ساتھ اختیار کرنا ناممکن ہے۔''

سیّد قطبؒ اسلام کی عالمگیریت اور ابدیت کو مانتے ہیں۔ آپ اسلام کو دین کامل اور اس کی اصل شکل میں جاری و ساری دیکھنے کے متمنی تھے۔ متعدد مقامات پر آپ نے عصبیت جاہلیہ اور مغربی تہذیب کے پھیلائے ہوئے فتنوں، اشتراکیت کے مسحور کُن نعروں، پاپائیت، رہبانیت، سرمایہ داری اور صیہونیت پر شدید تنقید کی اور کہیں بھی معذرت خواہانہ روّیہ اختیار نہیں کیا بلکہ خود آگے بڑھ حملے میں پہل کی۔

آپ کے نزدیک:

''دور جدید کے سیاسی اور عمرانی نظریات کا راستہ کسی نہ کسی شکل میں آمریت اور

استبدادیت کی طرف چلا جاتا ہے۔''

سیاسی فکر میں کجی کے مقابلہ میں روحانی فکر میں جی اور ٹیڑھ پن کے آگے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ اس نظریہ کے سبب آپ نے پاپائیت اور رہبانیت کو فاشزم اور نازی ازم سے بھی زیادہ خطرناک اور حیوانیت سے زیادہ بدتر قرار دیا۔

آپ کے الفاظ میں:

''روحانی اور ذہنی سامراجیت، سیاسی اور فوجی سامراجیت کے برعکس زیادہ گہری اور خطرناک شے ہے۔ ایسی سامراجیت کے خلاف ایک مقدس جنگ کا اعلان کرنا چاہیے جو اس دھوکہ دہی پر مبنی ہتھکنڈوں کو ناکام کرے۔'' (۴۹)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

''اب اگر کسی دور میں لوگ عبادت کے پہلو پر زیادہ زور دینے لگیں اور دین کو اجتماعی زندگی یا اجتماعی زندگی سے دین کو کاٹ کر علیحدہ کرنا چاہیں تو یہ اس دور کی آفت ہے نہ کہ اس دور کی کمزوری۔''

آپ کی فکر کے سرچشمے قرآن مجید اور سنتِ نبوی ﷺ سے پھوٹتے ہیں۔ آپ مسلمان مفکرین ابن رشد فارابی، الماوردی، بوعلی سینا اور نظام الملک طوسی وغیرہ کو اسلامی فکر کے نمائندے تسلیم نہیں کرتے۔ آپ ان کی فکر کو یونانی فکر کا چربہ قرار دیتے ہیں۔ آپ دورِ جدید کی روسی اور بھارتی ''پُر امن بقائے باہمی'' کے نظریئے کو بھی عصبیت جاہلیہ پر مبنی نظریہ قرار دیتے ہیں۔ اس نظریئے نے جتنا فساد دنیا میں پھیلایا اس سے کون واقف نہیں؟ روس نے ہنگری، چیکوسلواکیہ، پولینڈ اور افغانستان میں، بھارت نے اپنے ہمسایہ ممالک کے ساتھ اس نظریہ کی آڑ لے کر کیا کچھ نہیں کیا؟

سیّد قطبؒ کے الفاظ میں:

''اسلام کی یہ شان نہیں کہ وہ دنیا کے اندر قائم شدہ جاہلی تصوّرات کے ساتھ مصالحانہ روّیہ اختیار کرے یا جاہلی نظاموں اور جاہلی قوانین سے بقائے باہمی کے

اُصول پر معاملہ کرے یہ موقف اسلام نے اس روز بھی اختیار کیا تھا جس روز اس نے دنیا میں قدم رکھا تھا اور نہ آج یہ اس کا موقف ہوسکتا ہے اور نہ آئندہ کبھی یہ اُمید ہے کہ اس موقف کو وہ اپنائے گا۔ جاہلیت خواہ کسی دور سے تعلق رکھتی ہو وہ جاہلیت ہی ہے اور وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی بندگی سے انحراف اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظامِ زندگی سے بغاوت ہے۔''

''پُرامن بقائے باہمی'' کے نظریہ کے علاوہ سیّد قطبؒ سامراجیت اور مختلف ازموں اور اجنبی اصطلاحات کے ساتھ اسلام کی پیوندکاری کو اسلام کے مزاج اور وحدتِ انسانی کے منافی قرار دیتے ہیں۔ آپ کے الفاظ میں:

''اور یہ بات کہ اسلام سامراجی ہے اسلام کی رُوح اور اس کی تاریخ دونوں پر بڑی زیادتی ہے۔ یہ رائے ایک اجنبی اصطلاح کو زبردستی اسلام کے سر تھوپنے کے سوا اور کچھ نہیں یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اسلام اپنے عین مزاج کے اعتبار سے انسانی ہے کیونکہ وحدتِ انسانیت کا نظریہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کے یہاں موجود ہے اور اس اُصول کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر وہ ساری انسانیت کو برابر اور بھائی بنا کر اپنے پرچم تلے جمع کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح میں ان حضرات کے طرزِ تحریر کو بھی مناسب نہیں سمجھتا جو ''اسلامی سوشلزم'' یا اسلامی جمہوریت پر لکھتے ہیں یا اسی طرح اللہ سبحانہ کے بنائے ہوئے نظام اور انسانوں کے بنائے ہوئے نظاموں میں جوڑ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان انسانی نظاموں پر بشریت کی چھاپ ہے اور نقص و کمال، خطا و صواب، ضعف و قوت، اتباع و خواہش یا حق پرستی کے بارے میں انسان جن خصوصیات کا حامل ہے وہ ان نظاموں میں جھلکتی ہے. جبکہ الٰہی نظام ان خامیوں سے پاک ہے، یہ ایک مکمل اور جامع نظام ہے جس میں آگے پیچھے کسی کی طرف سے باطل کی آمیزش نہیں ہوسکتی۔''

آپ دورِ جدید کے تمام سیاسی، اقتصادی اور عمرانی نظریات کو خواہ ان کا تعلق اشتراکیت سے ہو یا سرمایہ دارانہ نظام سے جاہلیت سے ماخوذ قرار دیتے ہیں۔ آپ کے نزدیک سوشلزم ترکش نیشنلزم اور عرب نیشنلزم وغیرہ نظریات میں دورِ جدید کے نوجوانوں کے لیے کوئی کشش اب باقی نہیں رہی۔ یہ نظریات اپنی موت خود مرچکے ہیں اب صرف پرانے کھنڈرات کی طرح چند جاہ پرست اپنی ناکامی کا تاج سر پر سجائے ہوئے ان کی پرستش کرر ہے ہیں۔''

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ:

''اسلامی نظام غلامی کا نام نہیں ہے اور نہ جاگیرداری کا نام ہے۔ اسے ہم سرمایہ داری کی صف میں بھی کھڑا نہیں کر سکتے نہ اشتراکیت کے خانے میں رکھ سکتے ہیں، نہ وہ اشتمالیت سے میل کھاتا ہے۔ اسلامی نظام تو بس اسلامی نظام ہے اس کے ساتھ کسی اور تصوّر کی پیوندکاری صحیح نہیں ہے۔''(۵۰)

اس سلسلہ میں زمانے اور وقت کی قید بھی آپ کے نزدیک درست نہیں مادّی لحاظ سے کوئی تہذیب کتنی ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو آپ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ ایسی تہذیبوں کو بہروپیا پن قرار دیتے ہیں کیونکہ ان تہذیبوں نے انسانیت کی بھلائی کا نہیں تباہی کا سامان پیدا کیا ہے۔ ان کی اصل ایک ہے اور وہ ہے جاہلیت۔

آپ کے الفاظ میں:

''جاہلی معاشرہ مختلف بھیس بدلتا رہتا ہے۔ جو تمام کے تمام جاہلیت ہی سے ماخوذ ہوتے ہیں کبھی وہ ایک ایسے اجتماع کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے وجود کا سرے سے انکار کیا جاتا ہے اور انسانی تاریخ کی مادّی اور جدلی تعبیر کی جاتی ہے اور سائنٹیفک سوشلزم کو نظامِ زندگی کی حیثیت سے عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ کبھی وہ ایک ایسی جمعیت کے رنگ میں نمودار ہوتا ہے جو خدا کے وجود کی تو منکر نہیں ہوتی لیکن اس کی فرمان روائی اور اقتدار کو صرف آسمانوں تک محدود رکھتی ہے۔ رہی زمین

کی فرمان روائی تو اس سے خدا کو بے دخل رکھتی ہے۔نہ خدا کی شریعت کو نظامِ زندگی میں نافذ کرتی ہے اور نہ خدا کی تجویز کردہ اقدارِ حیات کو جسے خدا نے انسانی زندگی کے لیے ابدی اور غیر متغیر اقدار ٹھہرایا ہے، فرمان روائی کا منصب دیتی ہے۔ وہ لوگوں کو یہ تو اجازت دیتی ہے کہ وہ مسجدوں، کلیساؤں اور عبادت گاہوں کی چار دیواری کے اندر خدا کی پوجا پاٹ کر لیں لیکن یہ گوارہ نہیں کرتی کہ لوگ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے اندر بھی شریعتِ الٰہی کو حاکم بنائیں۔''

سیّد قطبؒ نے مغرب کے سیاسی افکار اور مسائل میں جن بنیادی کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے اور جس انداز میں ان کی مذمت کی ہے وہ ان کے سیاسی فلسفہ کا بنیادی پتھر ہے۔آپ نے قدیم سیاسی نظاموں اور دورِ جدید کی مسلم اور غیر مسلم حکومتوں کو عصبیت جاہلیہ کی یادگاریں قرار دیا ہے۔یہی وجہ تھی کہ جمال عبدالناصر اور ان کی انقلابی کونسل کے ارکان انہیں اپنے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔سیاسیات کے علاوہ آپ نے دورِ جدید کے معاشرتی اور عمرانی مسائل پر بحث کی ہے۔آپ مسلمان ممالک میں معاشرتی خرابیوں کی اصل بنیاد مغربی تہذیب کی بے جانقالی اور اس کے زیر سایہ قائم جابرانہ نظام کو قرار دیتے ہیں خواہ وہ کسی بھی شکل میں کیوں نہ ہو۔آپ نے یورپ کے تمام معاشرتی مسائل کی جڑ مغربی مفکرین کے اس غلط اندازِ فکر کو ٹھہرایا ہے۔جس کے تحت انہوں نے نام نہاد آزادی اور مساوات کا سہارا لے کر عورت کو گھروں سے نکال کر فیکٹریوں اور دفاتر میں بھیجا اور پھر ان سے ہر میدان میں برابری کا مطالبہ کرایا۔

سیّد قطبؒ اسلامی معاشرت کا اس سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جہاں تک دونوں صنفوں کا تعلق ہے اسلام نے عورت کو بحیثیت ایک صنف مساوی قرار دیا ہے اس نے ایک ایسی برتری کو روا رکھا ہے جس کی بناء پر فطری استعداد و استطاعت اور ذمّہ داری و مہارت ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا فی نفسہ جنسی اختلاف سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاں عورت کی فطری استعداد اور ذمّہ داری اور مہارت یکساں ہو وہاں دونوں کو مساوی مقام دیا گیا ہے۔فرق صرف وہاں اس حد

تک پیدا ہوتا ہے جہاں ان میں سے کوئی چیز کسی حد تک مختلف ہو۔ چنانچہ روحانی اور دینی اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔"

"مادّہ پرست مغرب نے عورت کو جو آزادی دی ہے اس کا چشمہ خالص اور پاک انسانی منبع سے نہیں پھوٹتا اور نہ ہی اس کی پشت پر بے لوث اور مخلصانہ محرکات رہے ہیں جو اسلام میں حریت و مساوات عطا کرنے کے باعث بنے ہیں نہ تو تاریخ کو بھولنا ہے اور نہ حقائق اور واقعات پر آج جو نظر فریب کے خول پڑ گئے ہیں ان سے دھوکہ کھانا ہے۔ اچھی طرح یاد رہے کہ مغرب نے عورت کو گھر سے اس لیے نکالا کہ وہ محنت مزدوری کر کے کسبِ معاش کرے۔ کیونکہ مکان پر مرد نے عورت کی کفالت اور پرورش سے انکار کر دیا تھا اِلّا یہ کہ وہ عورت سے اس کی عصمت وعفت کی شکل میں وصول کرے۔ ایسی صورت حال تھی جس کے باعث بے چاری عورت سبِ معاش کے لیے محنت کرنے پر مجبور ہوئی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جب عورت مجبور ہو کر محنت مزدوری کرنے کے لیے گھر سے باہر نکلی تو مادّہ پرست مغرب نے اس کی ضرورت مندی کو غنیمت شمار کیا اور جنس محبت کی فراوانی کو تخفیف اُجرت کا بہانہ بنالیا تاکہ متاجرین کم اُجرت والی عورتوں کو مزدور رکھ کر ان مزدوروں سے بے نیاز ہو جائیں جو اب سر اُٹھانے لگے تھے اور مناسب معاوضہ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اب اگر عورت نے وہاں مساوات کا مطالبہ کیا تاکہ پیٹ بھرنے اور زندگی گزارنے کا بندوبست ہو سکے۔ جب اسے یہ مساوات نہ مل سکی تو اس نے ووٹ دینے کا حق طلب کیا تاکہ اسے حق جتانے اور اپنے مطالبات منوانے کے لیے آواز اُٹھانے کے مواقع مل سکیں پھر اس نے پارلیمنٹ میں نمائندگی کا حق چاہا تاکہ وہ اس مساوات کو بجا ثابت کرنے اور اسے تسلیم کرانے کے لیے مثبت طور پر آواز بلند کر سکے۔ کیونکہ سماج میں جو قوانین نافذ ہوتے ہیں انہیں صرف مرد بناتے ہیں اسلام کی طرح وہاں اللہ کے دیے ہوئے نہیں ہیں جو اپنے بندوں میں مردوں اور عورتوں سب کے ساتھ عدل وانصاف برتتا ہے۔"

سیّد قطب شہیدؒ مغربی معاشرے میں خواتین کا ذکر کرنے کے بعد نہایت ہی خوبصورت انداز میں اشتراکی معاشرے میں عورت کے مقام اور نام نہاد حقوق کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں تاکہ مغربی تہذیب سے نفرت کرنے والے کہیں اشتراکی معاشرے کو خواتین کی جنت تصوّر نہ کریں۔

آپ کے الفاظ میں:

''اشتراکیت کے پاس مساوات مرد وزن کے سلسلہ میں بڑے بلند و بانگ دعویٰ ہیں حالانکہ اس کی مساوات صرف کام اور اُجرت تک محدود ہے۔ محنت اور اُجرت کی مساوات کے بعد عورت پوری طرح آزاد ہے اور اسے بھی مرد کی طرح اباحیت شعاری کی کھلی چھٹی ہے۔ اشتراکیت کی نظر میں اصل مسئلہ پیسے کا ہے اس کے ما وراء کچھ بھی نہیں۔ سارے انسانی محرکات اور تمام انسانی تصوّراتِ زندگی مختلف عناصر میں کھینچ کر بس اسی ایک عنصر کے اندر سما گئے ہیں، تہہ میں اُترے تو اس کا اصل سبب بھی یہی نظر آئے گا کہ مرد عورت کی کفالت سے بچنا چاہتا ہے۔ لہٰذا عورت مجبور ہے کہ اپنے گزارے کے لیے مرد ہی کی طرح اس کے حلقہ کار میں کام کرے۔ کمیونزم دراصل مادّہ پرست مغربی طرزِ فکر کا نقطۂ عروج ہے جو نیکی کے محرکات اور احسان کے دعاوی سے خالی اور انسانی زندگی میں روحانی تصوّرات سے عاری ہے۔''

''یہ ہیں وہ باتیں جن کو سامنے رکھے بغیر ہی ہماری نظریں اس جھوٹی چمک دمک سے دھوکہ کھا سکتی ہے کیونکہ اسلام نے آج سے چودہ سو برس پہلے عورت کو وہ حقوق دے رکھے ہیں جو مغربی تہذیب اسے آج تک نہیں دے سکی۔ نیز اس نے عورت کو بوقت ضرورت محنت مزدوری اور کسبِ معاش کا حق دے رکھا ہے لیکن ساتھ ہی اسلام نے اس کے لیے خاندان میں نگہداشت اور سرپرستی کا حق بھی بدستور باقی رکھا ہے۔''

مذکورہ بالا سطور میں میں نے سیّد قطب شہیدؒ کے نظریات اور ان کی فکر کا خلاصہ پیش کیا ہے جسے پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مغربی استعماری طاقتوں اور اشتراکی سامراج نے کس طرح مذہب سے نفرت کی آڑ لے کر معاشرے کے اجتماعی نظام کو تہہ وبالا کیا، ان کی اس تباہی و بربادی کے اثرات سے اعلیٰ حکام اور ماہرینِ عمرانیات تک چونک پڑے۔ یہی صورتِ حال سوویت یونین کی ہے یہاں اب کمیونزم کی تباہیاں اور بربادیاں حکمرانوں کو مکمل طور پر وہاں کا سیاسی اور سماجی نظام بدلنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ چنانچہ روس نے

گوربچوف کے دور میں سیاسی اور سماجی توڑ پھوڑ کا جو عمل شروع ہوا تھا وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ روسی ریاستیں اب سوویت یونین کے چنگل سے آزاد ہو چکی ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی نیست و نابود ہو چکی ہے۔ بورس یلسن کی قیادت میں روس میں جس نئے دور کا آغاز ہوا ہے اس کے بھی کوئی مثبت نتائج نہیں نکل رہے۔ پوری قوم سابقہ روسی قیادت اور اشتراکی نظام سے باغی اور سرکش ہو چکی ہے۔ دنیا پر حکومت کرنے کا خواب دیکھنے والے روسی اب اپنی قوم کو دو وقت کی روٹی بھی نہیں دے سکتے۔

چنانچہ روس اب مغربی یورپ اور امریکہ سے اپنی معیشت کو سہارا دینے کے لیے بھیک مانگنے پر مجبور ہے۔ اسی انجام کو اب ریاست ہائے متحدہ امریکہ پہنچنے والا ہے۔ لاس اینجلس کے نسلی فسادات (۱۹۹۱ء) آخر کس طرف اشارہ کررہے ہیں؟ آج امریکہ جس ''نیو ورلڈ آرڈر'' کا اشارہ دے رہا ہے حقیقت میں یہ سوویت یونین جیسے انجامِ بد سے بچنے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ یہ تباہی اس غلط سماجی نظام کا ورثہ ہے جس کی پرورش یہ معاشرے برسوں سے کررہیں ہیں۔ سیّد قطب شہیدؒ مسلمان ممالک کو مغربی اور اشتراکی تہذیب کی ان قباحتوں سے بچانا چاہتے تھے تاکہ ایک باوقار اور مخلص معاشرے کی تشکیل عمل میں آسکے۔ (۵۱)

فصل ہفتم

# شیخ احمد یاسین

تنظیم آزادی فلسطین اور یاسر عرفات تاریخ وتحریک فلسطین کے دو ایسے نام ہیں جو ہمیشہ ہی متنازعہ اور مشکوک رہے ہیں۔ یاسر عرفات جس نے ۱۹۵۵ء میں جمال عبدالناصر کے ''فدائین دستوں'' میں شمولیت اختیار کر کے اسرائیل کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کیا تھا بہت جلد ہی مصر کے ''سیاسی دباؤ'' سے الگ ہو کر آزاد حیثیت سے گوریلا کاروائیوں میں مصروف ہو گیا۔ ۱۹۶۴ء میں جیسے ہی ایک قوم پرست لیڈر احمد شقیری نے تنظیم آزادی فلسطین کے تنِ مردہ میں جان ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ یاسر عرفات، جارج بش، خلیل الوزیر، ابوایاز، نائفہ حواتمہ، بہجت ابو غاریبا اور ڈاکٹر عاصم سرتوی وغیرہ تنظیم آزادی فلسطین میں شامل ہو گئے۔ تنظیم آزادی فلسطین جس پر بائیں بازو کے قوم پرستوں، سوشلسٹوں اور ملحدوں کا قبضہ تھا، بہت جلد ہی گیارہ مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔ یاسر عرفات تنظیم ہی کے ایک دھڑے ''الفتح'' کا قائد بنا۔ الفتح اپنی اعتدال پسندی اور منظم گوریلا کاروائیوں کے سبب بہت جلد ہی فلسطین کے سیاسی اُفق پر چھا گئی۔ یوں نظر آتا تھا کہ اگر اسی جوش اور جذبے کے ساتھ الفتح نے اپنی گوریلا کاروائیاں جاری رکھیں تو بہت جلد ہی فلسطینی ایک آزاد اور خودمختار فلسطین کے مالک بن جائیں گے لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ تنظیم آزادی فلسطین کے قائدین اپنے اصل ہدف آزادی فلسطین کو چھوڑ کر مشرق وسطیٰ کی سیاست میں مداخلت کرنے لگے پہلے اردن کے شاہ حسین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی پھر لبنان کو میدانِ جنگ بنایا ابھی لبنان میں خانہ جنگی جاری تھی کہ فلسطینی مہاجرین کے صابر یہ اور شیتلا کیمپوں پر اسرائیل کے وحشیانہ قتلِ عام نے تنظیم آزادی فلسطین اور یاسر عرفات کو مشکل میں ڈال دیا۔ فلسطینی، تنظیم آزادی فلسطین کے شاندار ماضی کے حوالہ سے کسی فوری جوابی کاروائی کی توقع رکھتے تھے لیکن عرفات کی پراسرار خاموشی اور پھر ایک عرصہ گزر جانے کے بعد حملوں کی ''مذمت'' کسی اندرونی سمجھوتے کی چغلی کھا رہی تھی۔ تنظیم آزادی فلسطین کا یہ المیہ کتنا دردناک ہے کہ ۱۹۷۹ء کے کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کو فلسطینیوں کے حقوق

سے غداری قرار دینے والے اس کے قائدین اتنے سُست اور کاہل ہو گئے کہ انہیں گوریلا کاروائیوں سے نفرت ہو گئی اس کے لیڈر زیتون کی ڈالی پکڑے اسرائیل کو مذاکرات کی میز پر بلانے لگے اور فلسطینیوں کو یہ سبق پڑھانے لگے کہ ''اپنے روشن مستقبل کی خاطر ماضی کو بھول جاؤ اور اسرائیل سے معاہدۂ امن کرلو'' رہ سہی کسر یاسر عرفات کی عیسائی مشنری بیوی سوہا نے پوری کردی جس نے یاسر کے اندر کا انسان مردہ کردیا۔ تنظیم آزادی فلسطین کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر غزہ کے غیور فلسطینیوں نے جدوجہد آزادی کو ایک نئے رُخ پر ڈالنے کا فیصلہ کیا اور بہت تھوڑے ہی عرصہ کے اندران فلسطینیوں نے اس خلاء کو پُر کیا جو یاسر عرفات اور اس کے ساتھیوں کی مسلسل خاموشی اور ''امن'' کے لیے کوششوں کے سبب پیدا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ جمال عبدالناصر اکثر اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا تھا کہ ''میری نسل کو ایک عورت (زینب الغزالی) اور ایک مرد (عبدالفتاح اسماعیل) نے چھین لیا۔'' آج اسرائیلی حکمران پوری دنیا میں شور مچا رہے ہیں کہ ''ان کی نسل کا مستقبل غزہ کے مفلوج اسکول ٹیچر نے تاریک کردیا'' یہ اسکول ٹیچر حماس کے قائد شیخ احمد یاسین ہیں جو نہایت قلیل مدت میں صیہونیت کے دشمن نمبر ایک بن کر سامنے آئے اور جو کام تنظیم آزادی فلسطین سے ربع صدی میں نہ ہو سکا چھ برسوں میں کر دکھایا۔ اسرائیلی حکمرانوں کے لیے اب یاسر عرفات اتنا خطرہ نہیں جتنا غزہ کا یہ مفلوج بوڑھا۔(۵۲)

شیخ احمد یاسین ۱۹۳۶ء میں غزہ کے شمال میں عسقلان کے ایک گاؤں الجورہ کے ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ایک متوسط درجہ کے کاشتکار تھے ابھی آپ کی عمر بمشکل تین برس ہی ہوئی تھی کہ والد انتقال کر گئے۔ ابھی والد کی وفات کے صدمہ سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ حکومت کہ شہہ پا کر یہودیوں نے الجورہ پر قبضہ کرلیا۔ آپ خاندان کے دیگر افراد کے ہمراہ ہجرت کر کے غزہ کے نزدیک جرہ الشمس کی خیمہ بستی میں پناہ گزینوں کی حیثیت سے رہنے لگے۔ اسی خیمہ بستی کے ایک مدرسہ امام شافعیؒ سے آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی جبکہ اعلیٰ تعلیم کے لیے قاہرہ یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔ بچپن ہی سے آپ کو کٹھن اور مشکل کام کرنے کی عادت تھی۔ آپ اکثر اپنے ساتھیوں کے ساتھ سمندر کے کنارے چلے جاتے، وہاں ورزش کرتے اور مختلف کھیلوں میں حصہ لیتے، دوڑ لگانا، ہائیکنگ، کشتی لڑنا، نشانہ بازی اور جمناسٹک آپ کے پسندیدہ کھیل

تھے۔ایک موقعہ پر آپ کسی ساتھی کے سر پر ہاتھ رکھ کر چھلانگ لگانے کی مشق کر رہے تھے کہ توازن برقرار نہ رکھ سکے اور نیچے گر گئے اس سے ریڑھ کی ہڈی کے مہروں اور گردن پر چوٹ آئی ،مہرے اپنی جگہ سے ہٹ گئے جس سے گردن کا نچلا حصہ مفلوج ہو گیا یہ حادثہ آپ کے خاندان اور دوستوں کے لیے عظیم صدمہ سے کم نہیں تھا۔والدہ اور عزیز و اقارب آپ کو اعلیٰ تعلیم دلا کر فلسطینیوں کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے۔اس حادثے نے سب کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا چنانچہ آپ کو تعلیم ادھوری چھوڑ کر علاج پر توجہ دینا پڑی۔علاج کے دوران آپ نے مستقبل کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا اور مفلوج ہونے کے باوجود مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا۔چنانچہ اس کے بعد آپ نے کبھی بھی جسمانی معذوری کو زندگی کی دوڑ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔آپ ایک طرف اپنے ساتھیوں کی جسمانی تربیت میں رہنمائی کرنے کے لیے حسب سابق سمندر کے کنارے جاتے رہے اور دوسرے مختلف اساتذہ سے دینی تعلیم حاصل کرتے رہے۔پڑھائی مکمل کرنے کے بعد آپ جورہ الشمّس ہی کے ایک پرائمری اسکول میں معلّمی کے فرائض سرانجام دینے لگے۔فارغ اوقات میں نوجوانوں کی تربیت یا پھر تبلیغ دین کے لیے خیمہ بستیوں میں جاتے اور اپنی مرضی کے افراد تلاش کر کے انہیں ان خطرات سے آگاہ کرتے جو نئی نسل کو درپیش تھے۔تبلیغ دین کی بدولت آپ بہت جلد ہی خیمہ بستیوں کے ایک غیر متنازعہ لیڈر کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آئے۔مقبوضہ غزہ میں آپ کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ آپ کی حیثیت ایک مفتی اور قاضی کی ہو گئی۔فلسطینی نہ صرف یہ کہ سنجیدہ دینی مسائل میں رہنمائی کے لیے آپ کے پاس آتے بلکہ آپس کے جھگڑوں میں بھی آپ کو ثالث اور منصف مانتے۔۱۹۸۳ء میں تنظیم آزادی فلسطین کے مشکوک قومی کردار کو دیکھ کر آپ نے مساجد کو مراکز بنا کر درسِ قرآن کے حلقے منظم کرنا شروع کیے۔ان حلقوں کے قیام کا بنیادی مقصد یہودیوں کے خلاف جہاد کے لیے نوجوانوں کی نظریاتی اور عملی تربیت تھا۔اس سلسلہ میں غزہ کی خیمہ بستیوں میں متعدد تربیت کیمپ قائم کیے گئے۔۱۹۸۴ء میں کسی فلسطینی کی مخبری پر اسرائیلی پولیس نے ایک مسجد سے متصل کیمپ پر چھاپہ مارا اگرچہ وہاں سے کچھ بھی نہ ملا اس کے باوجود آپ کو دیگر نوجوانوں کے ہمراہ گرفتار کر لیا الزام یہ لگایا گیا تھا کہ شیخ اور ان کے نوجوان ساتھیوں نے تخریبی کاروائیوں کے لیے اسلحہ اور گولہ بارود جمع کیا ہوا تھا، آپ پر مقدمہ چلایا گیا اور اکتیس سال کی سزا سنا کر جیل بھیج دیا گیا، ابھی سزا بھگتتے

ہوئے بمشکل گیارہ ماہ ہی ہوئے تھے کہ تنظیم آزادی فلسطین اور اسرائیلی حکومت کے درمیان قیدیوں کا تبادلہ ہوا، آپ رہائی پانے والوں میں شامل تھے۔ رہائی کے بعد غزہ یونیورسٹی کی انتظامیہ اور اساتذہ نے آپ کو استقبالیہ دینے کا پروگرام بنایا۔ حکومت کو پتہ چلا تو یونیورسٹی انتظامیہ اور اساتذہ پر دباؤ ڈالا کہ ان کے ''باغی'' کو استقبالیہ نہ دیا جائے۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے حکومت کے شدید دباؤ اور بار بار کے انتباہ کے باوجود استقبالیہ دیا۔ شیخ احمد یاسین نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے اسلام کے فلسفہ جہاد اور فلسطینیوں کی ذمہ داری پر روشنی ڈالی۔ آپ کی تقریر مایوس فلسطینیوں کے لیے بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی۔ یونیورسٹی معاملات میں اسرائیلی حکومت کی مداخلت نے آپ کا قد کاٹھ اور بلند کر دیا۔ پہلے آپ مقبوضہ غزہ کے لیڈر تھے اب آپ کے نام کا ڈنکا دنیا بھر کے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بجنے لگا۔ رہائی کے بعد آپ نے نوجوانوں کو حکومت کے خلاف منظم کرنا شروع کیا۔ وقتاً فوقتاً آپ کی اپیل پر نوجوان حکومت کے خلاف احتجاجی مظاہرے کرتے اور فلسطین کی آزادی کے لیے نعرے لگاتے ان مظاہروں پر قابو پانے کے لیے اسرائیلی فوجی ربڑ کی گولیاں برساتے جبکہ مظاہرین ان فوجیوں پر پتھر پھینکتے۔ ۱۹۸۶ء میں جامعہ بیرزیت میں تحریکِ آزادی فلسطین کے دو کارکنوں ابوذہب اور جواد سلمہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ نے نوجوانوں کے جذبات میں شدت پیدا کر دی۔ دسمبر ۱۹۸۷ء میں ایک یہودی کسی مسلمان کے جھگڑے میں زخمی ہوا تو اس کی حمایت میں فوج نے مقطورہ میں چار نوجوانوں کو ایک ٹرک کے نیچے کچل ڈالا۔ اسی دن (۸ دسمبر) ان چار نوجوانوں کے جنازہ کے جلوس سے فارغ ہو کر شیخ احمد یاسین، ڈاکٹر ابراہیم، انجینئر عیسی العشیر، ڈاکٹر عبدالعزیز، عبدالفتح دوکہان، صالح شہادہ اور مغربی کنارے کے بعض دانشوروں خاص طور پر جیل حمامی کے ساتھ مل کر ''حماس'' کی بنیاد رکھی۔ ایک ہفتہ اس کے منشور اعلان کر لیا گیا غزہ کے ایک غیر آباد علاقہ (بیت المقدس) میں ''المجمع الاسلامی'' کے نام سے اس کا ہیڈ کوارٹر قائم کیا گیا۔ حماس کے قیام کا اعلان کرتے وقت اس کے تین بنیادی مقاصد طے کیے گئے اور یہ اعلان کیا گیا کہ جتنی دیر یہ مقاصد حاصل نہیں ہو جاتے اتنی دیر حماس کا کام جاری رہے گا۔ یہ مقاصد کچھ یوں تھے:

- مساجد کی تعمیر اور غیر آباد مساجد کی آباد کاری۔

- اسلامی اداروں، جامعات، زکوٰۃ کمیٹیوں اور سماجی بہبود کے اداروں کا قیام عمل میں لانا۔
- نوجوانوں کو جہاد کی عملی تربیت دینا (جدید ترین اسلحہ چلانے کی مشق کرانا) (۵۳)

حماس نے ان مذکورہ بالا مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک مرحلہ وار پروگرام کا آغاز کیا گزشتہ چھ سال کے اندر اندر تحریک اپنے تیسرے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ پہلے دو مراحل کو طے کرنے کے لیے اگرچہ حماس کے کارکنوں کا زبردست جانی نقصان ہوا لیکن اسرائیل کا نقصان بھی کچھ کم نہیں۔ آج تحریک حماس اور انتفاضہ (انقلابی لہر) اور اس کا معذور لیڈر شیخ احمد یاسین فلسطین میں ناقابلِ شکست قوت بن چکے ہیں۔ تنظیم آزادی فلسطین کے لیے شیخ اور حماس کی مرضی معلوم کیے بغیر کسی فیصلہ کُن نتیجہ پر پہنچنا ناممکن ہے۔ شیخ نے حماس کے مقاصد کے حصول کے لیے مرحلہ وار پروگرام شروع کیا ہوا ہے اس کے مطابق پہلے مرحلہ میں ان میں احتجاجی مظاہرے کرنا، مظاہروں کے دوران سڑکیں بلاک کرنا، ہڑتالیں کرنا، ٹائروں کو آگ لگا کر راستہ بند کرنا، صیہونی فوجیوں پر پتھر پھینکنا ان مظاہروں میں ہر عمر کے لوگ حصہ لیتے ہیں۔ اسرائیلی حکومت حماس کی اپیل پر کیے گئے مظاہروں سے اتنا تنگ آچکی ہے کہ اس کے فوجیوں میں بددلی اور مایوسی پھیلنا شروع ہو چکی ہے چنانچہ ایسی خبریں اکثر اخبارات کی زینت بنتی ہیں کہ اسرائیل کے فوجی مسلسل جنگ کی حالت سے تنگ آ کر اپنے آبائی وطن واپس چلے گئے۔ دوسرے مرحلہ میں مظاہروں کے دوران یا چھپ چھپا کر فوجیوں پر بوتلا اور مالونوف بم پھینکنا اور دست بدست لڑائی کی صورت میں چھریوں اور چاقوؤں سے حملہ کرنا، تیسرے مرحلہ میں فوجیوں کا اغواء، قتل اور فائرنگ، دستی بموں کا استعمال، فوجی گاڑیوں پر حملے، یہودیوں کی کھڑی فصلوں کو آگ لگانا، غزہ کی پٹی کے جنوبی حصے میں کنواں کھودنے والے یہودیوں کو گولی مارنا وغیرہ وغیرہ۔

۸ دسمبر ۱۹۸۸ء کو حماس کی پہلی سالگرہ منائی گئی اس موقع پر حماس نے بڑے پیمانے پر مظاہرے کیے اور یہودیوں کو مقابلے کے لیے للکارا چنانچہ ان مظاہروں کے فوراً ہی بعد جنوری ۱۹۸۹ء میں اسرائیلی فوج کے جنوبی ریجن کے کمانڈر میجر جنرل Haq Mordek Hay Yitz نے غزہ کی مقامی انتظامیہ کے آفیسروں کی موجودگی میں آپ کو اپنے دفتر بلا کر وارننگ دی کہ وہ مساجد کے اندر غزہ کے شہریوں کو اُکسانا بند کر دیں۔ احمد یاسین نے جنرل سے مطالبہ کیا کہ وہ تمام گرفتار شدگان کو رہا کریں، ٹیکس اکٹھا کرنا چھوڑ دیں اور فوجیوں کو

ہدایت کریں کہ وہ اشتعال انگیز کاروائیاں بند کریں۔ اس ملاقات کو ابھی چار ماہ ہی ہوئے تھے کہ آپ ایک دفعہ پھر گرفتار کر لیے گئے، گرفتاری کے بعد آپ کو نامعلوم مقام پر پہنچا دیا گیا۔ آپ کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو نہ تو ملاقات کی اجازت دی گئی اور نہ ہی یہ بتایا گیا کہ شیخ کس جیل میں بند ہیں؟ حماس نے ایک خاص وقت تک انتظار کیا جب سب تدبیریں ناکام ہوئیں تو مظاہرے شروع کر دیے۔ بین الاقوامی پریس اور الیکٹرونک میڈیا نے ان مظاہروں کی خبریں دیں تو اچانک ۱۹۸۹ء یعنی گرفتاری کے پانچ ماہ بعد حکومت نے آپ کے رشتہ داروں کی حاشمورت (Hashmoret) کے جیل خانے میں ملاقات کرائی۔ اسی دن حکومت نے عربی زبان میں شیخ کا پہلے سے ٹیپ کیا گیا ٹیلی وژن انٹرویو بھی نشر کیا۔ مقصد یہ تھا کہ دنیا کو یہ بتایا جائے کہ جیل میں شیخ بالکل ٹھیک ہیں ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو رہی۔ ایک سال کے بعد پھر ۱۹۹۰ء میں عدالت لے جاتے وقت آپ کے عزیزوں سے ملاقات کرائی گئی۔ آپ پر بیس مختلف الزامات کے تحت مقدمہ چلایا گیا، ان میں سب سے زیادہ سنگین الزام حماس کا ''غیر قانونی'' قیام اور اس کا لیڈر ہونا ہے۔ حکومت کے نزدیک ''حماس مقبوضہ علاقوں میں بنیاد پرست مسلمانوں کی دہشت گرد تنظیم ہے'' اقبالِ جرم کرانے کے لیے اسرائیلی حکام نے جیل میں آپ پر بے پناہ تشدد کیا۔

آپ کے الفاظ میں:

> ''گرفتاری کی پہلی رات دورانِ تفتیش میں نے ان تمام الزامات کو مسترد کر دیا جو انہوں نے مجھ پر لگائے تھے۔ انہوں نے میرے چہرے پر مجھے مارا، میری چھاتی کو کسی اوزار سے دبایا، میری گردن کے پٹھوں پر کودتے رہے جس سے مجھے شدید تکلیف ہوئی اس سے میری چھاتی نیلی پڑ گئی، مجھے مسلسل چار دن کرسی پر بیٹھنے پر مجبور کیا گیا اسی دوران میں متعدد مرتبہ زمین پر گرا تین سپاہی بار بار میری نگرانی کرتے رہے تا کہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ کہیں میں لحہ بھر کے لیے آرام تو نہیں کر رہا۔ میں بہت تھک جاتا تھا بیہوشی کی حالت میں کئی دفعہ کرسی سے نیچے گرا مسلسل بیٹھے رہنے سے میرے پاؤں سوج گئے۔ جیل کے ڈاکٹر نے حکام سے کہا

کہ اسے سونے دیں چنانچہ مجھے فرش پر سونے دیا گیا، اس سے میری چھاتی پر شدید زخم ہو گیا۔ میری نظر بندی کے نویں دن میری تیزی سے گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر مجھے رملہ کے جیل خانے بھیج دیا گیا، اس کے بعد انہوں نے مجھ سے ان باتوں کے بارے میں پوچھا جو وہ پہلے ہی جانتے تھے۔" (۵۴)

۵ فروری ۱۹۹۰ء میں بین الاقوامی دباؤ اور مسلسل احتجاجی مظاہروں سے تنگ آ کر آپ کے خلاف مقدمہ کی کاروائی کا آغاز ہوا۔ مقدمے کی کاروائی کے آغاز میں آپ کے وکیل عبدالمالک دانش نے فردِ جرم کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"میرا موکل کہتا ہے کہ اس کا فرض تھا کہ وہ حماس قائم کرتا اور غاصبوں سے جنگ لڑتا جو کچھ اس نے کیا اسے اس پر افسوس نہیں ہے۔"

وکیل نے کہا کہ:

"جنیوا کنونشن کے تحت شیخ احمد یاسین پر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا کیونکہ اسے جس علاقے سے گرفتار کیا گیا ہے وہ فوج کے قبضہ میں ہے اس لیے شیخ کو جنگی قیدی تصوّر کیا جائے۔"

مقدمے کی کاروائی نہایت مختصر رہی۔ آپ کو عمر قید کے علاوہ پندرہ سال قید بامشقت کی سزا سنا کر یوحنا جیل بھیج دیا گیا۔ جیل کے اندر اس قدر شدید تشدد کیا گیا کہ کوئی ایسی بڑی بیماری نہیں رہ گئی جو آپ پر حملہ آور نہ ہوئی ہو۔ اس وقت آپ گیارہ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ جن کی تفصیل یوں ہے: ۱- فالج، ۲- چہرے اور کھوپڑی کی الرجی، ۳- السر، ۴- ضعف معدہ، ۵- دائمی قبض، ۶- خونی بواسیر، ۷- انتڑیوں کا دمہ، ۸- پھیپھڑوں میں ورم، ۹- اگزیما، ۱۰- کانوں میں درد، ۱۱- آنکھ کا زخم جس کی وجہ سے بائیں آنکھ سے نظر آنا بند ہو چکا ہے۔

خود شیخ سے جب ان کی صحت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو وہ یوں گویا ہوئے:

"میری صحت موسم کی طرح متلون مزاج اور اچانک بدلنے والی ہے لمحہ بھر میں بہت

ابھی دوسرے لمحہ شدید درد اور تکلیف۔''

آپ کی بیوی جو جیل خانے میں آپ کے ساتھ رہ رہی ہے اس کے بقول:

''آپ کو فروری ۹۰ء میں جب دوسری دفعہ تفتیش کے لیے لایا گیا تو آپ پر بے پناہ تشدد کیا گیا، بیماری کی حالت میں حکومت نے ہسپتال بھیجنے سے انکار کر دیا۔ آپ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔''

ڈاکٹر رنتیسی تحریکِ حماس کے ایک معروف لیڈر تھے، آپ کچھ دیر جیل میں شیخ کے ساتھ بھی رہے۔ آپ کا شمار ان چار سو افراد میں ہوتا ہے جنہیں ۱۸ دسمبر ۹۲ء کو اسرائیلی حکومت نے زبردستی لبنان میں دھکیلا۔ جیل میں شیخ کی صحت کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا:

''سب سے پہلے تو میں جیل میں شیخ احمد یاسین کے ساتھ گزارے جانے والے دنوں کی روشنی میں ان کی صحت کے متعلق کچھ بتا دوں۔ شیخ اگرچہ فلسطینی تاریخ کی عظیم تحریک انتفاضہ کے بانی ہیں اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہ کر بھی اپنے روشن ضمیر و روشن ذہن سے تحریک کی قیادت کر رہے ہیں لیکن ان کی اپنی صحت کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے دونوں بازو اور دونوں ٹانگیں مکمل طور پر فالج زدہ ہیں۔ سینے کے پٹھے بھی مفلوج ہیں جس سے انہیں سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے اور سینے میں بلغم کی خاصی مقدار جم جاتی ہے جس کی وجہ سے انہیں ہر پندرہ منٹ کے بعد کھانسی کی ضرورت پڑتی ہے اگر سوئے ہوئے ہوں تب بھی اٹھ کر کھانسنا پڑتا ہے ورنہ سانس بگڑ سکتی ہے۔ بائیں آنکھ کی بینائی جیل ہی میں ختم ہو گئی ہے۔ شیخ احمد یاسین کوئی حرکت بھی نہیں کر سکتے قرآن کا صفحہ بھی خود نہیں پلٹ سکتے، آنکھ سے بہنے والا پانی نہیں پونچھ سکتے اور ناک تک بھی خود نہیں صاف کر سکتے اسی لیے انہیں ہر وقت کسی ساتھی کی ضرورت رہتی ہے تاکہ وہ کھانے پینے سے لے کر کروٹ بدلنے اور وضوء وغیرہ تک ان کی مدد کر سکے۔ شیخ احمد یاسین کو ان تمام بیماریوں کے باوجود

اللہ تعالیٰ نے ایک معجزہ ذہن عطا کیا ہے۔ جیل ہی میں انہوں نے پورا قرآن حفظ کرلیا ہے اور رات کے پچھلے پہر تک مسلسل قرآن کی تلاوت کرتے رہتے ہیں۔''

ڈاکٹر رنتیسی اپنی جیل کی یادداشتوں کا ذکر کرتے ہوئے مزید کہتے تھے کہ:

''جیل میں ہمیں روزانہ کوٹھڑی سے تین گھنٹے کے لیے تازہ ہوا روسورج کی روشنی میں نکالا جاتا ہے۔ ایک روز میں باہر لایا گیا تو باہر پورا صحن چیونٹیوں اور مکوڑوں سے بھرا پڑا تھا۔ باہر آتے ہی بیسیوں مکوڑے میرے جسم کو کاٹنے لگے میں ان سے خلاصی پانے کی کوشش کے ساتھ ہی شیخ کو بھی دیکھتا جاتا تھا مگر ان پر ایک بھی چیونٹا نہیں تھا میں نے تعجب کا اظہار کیا تو ہنستے ہوئے کہنے لگے: ''مکوڑے صرف صحت مند تگڑے جسم کو ہی کھاتے ہیں مجھے نوچ کر انہیں کیا لینا ہے۔'' میں نے سوچا اللہ نے مکوڑوں کو بھی حکم دے رکھا ہے کہ میرا یہ بندہ اسلامی تحریک کا قائد ہے اور خود کو کھجا بھی نہیں سکتا اسی لیے اسے تنگ نہیں کرنا۔''

شیخ احمد یاسین مئی ۱۹۸۹ء سے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کررہے ہیں۔ آپ متعدد مہلک بیماریوں کے شکار ہیں۔ آپ نے حماس کی شکل میں جو تحریکِ جہاد شروع کی تھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں شدت آگئی ہے۔ آپ کے معمولی اشارے پر فلسطینی نوجوان مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اسرائیلی حکام اس عجیب و غریب قیدی کی سحرزدہ شخصیت سے اتنے خوفزدہ ہیں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کریں۔ جیل کے اندر اور باہر آپ یکساں مقبول ہیں جیل میں آپ کے ساتھی قیدیوں کو جب رہائی کا حکم سنایا جاتا ہے تو وہ آپ کی رفاقت کو رہائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ آپ نوجوانوں سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۹۲ء میں آپ نے جیل سے ایک خط اپنے روحانی بیٹوں کے نام تحریر کیا جسے عربی اخبارات اور جرائد نے بہت بڑے پیمانے پر شائع کیا۔ خط کے مطالعہ کے بعد اہل علم وفن اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شیخ نوجوانوں سے کس قدر ٹوٹ کر محبت کرنے والے ہیں اور پھر اس خط میں نوجوانوں کے لیے اشاروں سے اشاروں میں جو پیغام ملتا ہے نوجوانوں نے تحریک میں شدت پیدا کر کے کس طرح اس پر عمل کیا۔ ذرا خط کے

مندرجات ملاحظہ فرمایئے!

- اللہ کو ہمیشہ یاد رکھو کیونکہ جو اللہ کو ہر حالت میں یاد رکھتے ہیں، شیطان سے دور رہتے ہیں۔
- اپنی جوانیوں کی حفاظت کرو، بڑھاپے سے پہلے تمہیں قرآن اور سائنس سے استفادہ کرنا چاہیے کہ وقت گزر رہا ہے۔
- میں آپ کو تقویٰ کی نصیحت کرتا ہوں کہ عمر بن الخطاب نے کہا تھا کہ: ''اللہ سے ڈرنا اور قرآن کی تعلیمات پر عمل کرنا اور قلیل چیزوں کو قبول کرنا اور آخرت کے لیے تیار رہنا یاد رکھو کہ تقویٰ تمام نیکیوں کی کنجی ہے۔''
- تمہیں لوگوں کو منجانب اللہ راغب کرنا ہے کیونکہ دعوت دینا انبیاء کا کام ہے اور انہیں قرآن اور سنت کی تعلیم دینا ہے کہ یہ محمد ﷺ کی سنت ہے۔ ہمارے نبی ﷺ نے کہا تھا کہ: ''اگر اللہ تمہیں کسی کی ہدایت کا ذریعہ بنائے تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا ان تمام چیزوں سے جنہیں سورج منور کرتا ہے۔''
- ان لوگوں کی پرواہ مت کریں جو اللہ کی راہ سے دور ہیں مگر ان کی جو اللہ کی راہ میں ہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ خیر بھی اللہ کی نعمت ہے۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو لذتِ دنیا سے دور رکھو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ صحیح راستہ اللہ کے لوگوں کا راستہ ہے لہٰذا انہی لوگوں میں سے ہونے کی کوشش کرنا ورنہ سب ضائع ہو جائے گا۔
- بیٹے! تمام بیٹو! تمہیں پتہ ہونا چاہیے کہ میں اللہ کی راہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور یہ جیل ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں اپنی رحمت کے سائے میں ملائے۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔

تمہارا شیخ احمد یاسین

کفار یونا جیل ۱۹/ اکتوبر ۱۹۹۲ء

ایک ہسپانوی اخبار نویس جس نے مقبوضہ غزہ کا دورہ کیا اور فلسطینیوں کے دلوں میں شیخ کی محبت دیکھ کر ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا:

''اپنے مقصد پر ایمان شیخ کی آنکھوں میں چمکتا ہے۔ مقبوضہ غزہ میں ان کے الفاظ مسلمانوں کے لیے حکم کا درجہ رکھتے ہیں وہ اسلام کا پرچم ہے اور اسرائیلیوں کے نزدیک ایک بھیانک اسلامی خواب۔''

اسرائیلی حکومت کا خیال تھا کہ شیخ احمد یاسین کو جیل کی کال کوٹھڑی میں بند کر کے تحریکِ آزادی فلسطین کو ختم کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے لیکن ''ایں خیال است و محال است و جنوں'' شیخ نے ایک طرف تحریکِ آزادی فلسطین کو سیکولر اور سوشلسٹ عناصر سے پاک کر کے اس کے لیے نظریاتی بنیادیں فراہم کیں دوسری طرف نوجوانوں کو کبھی بھی تنظیم آزادی فلسطین کے معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں دی اس کے باوجود حماس اور انتفاضہ کی سرگرمیوں کا سب سے زیادہ نقصان الفتح اور یاسر عرفات کو پہنچا ہے۔ ابھی حال ہی میں یاسر عرفات نے اسرائیلی وزیر اعظم رابین کے ساتھ جو معاہدہ کیا ہے حماس کے خوف سے اس پر عمل درآمد رکا ہوا ہے۔ مجاہدین حماس روزانہ اس معاہدے کے خلاف احتجاجی مظاہرے کر رہے ہیں۔ فلسطین کی اکثریت کا یاسر عرفات اور تنظیم آزادی فلسطین سے اعتماد اٹھ چکا ہے۔ شیخ نے تحریکِ آزادی فلسطین کے لیے اسلامی بنیادیں فراہم کر کے بچوں، بوڑھوں، نوجوانوں اور خواتین میں اس وقت جذبہ جہاد پیدا کیا جب بین الاقوامی باورچی خانہ میں فلسطینیوں کو سینڈوچ کرنے کے لیے کوئی چیز پکائی جا رہی تھی اور یہی آپ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ حال ہی میں شیخ احمد یاسین کو اسرائیلی حکومت نے میزائل سے نشانہ بنا کر شہید کر دیا۔ اس شہادت نے تحریک حماس میں مزید جوش و جذبہ پیدا کر دیا ہے۔

## فصل ہشتم

# ڈاکٹر نجم الدین اربکان

ترکی میں خلافتِ اسلامیہ کے خاتمے کے بعد اسلامیت اور مغربیت کے درمیان جس کشمکش کا آغاز ہوا تھا وہ اب اپنے عروج کو پہنچ چکی ہے۔ مصطفیٰ کمال اتاترک اور عصمت انونو کے پرستار ''چھ مقدس اُصولوں'' کے پردے میں لادینیت کے فروغ کے لیے جو حرکات وقتاً فوقتاً کرتے چلے آرہے ہیں ان کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ترکی میں بھی الجزائر اور تیونس کی طرح ''بنیاد پرستوں'' سے سخت مقابلہ ہوگا۔ اُستاد بدیع الزمان نورسی اور عدنان میندریس کے بعد نجم الدین اربکان واحد سیاسی لیڈر ہیں جو سیکولرسٹوں کے مقابلہ میں اب تک ڈٹے ہوئے ہیں اور جن پر دوست اور دشمن سب کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں، جنہیں اسلام کا نام لینے کے جرم میں بار بار جیل بھیجا جاتا ہے اور جن کی جماعت پر متعدد مرتبہ پابندی لگ چکی ہے۔

نجم الدین اربکان ۱۹۲۶ء میں شمالی ترکی کے ایک شہر اسنوپ (Sinop) کے ایک گاؤں کوزان (Kozan) کے ایک معزز اور باوقار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ترکی کی عدلیہ کے ایک اہم رکن تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کی دینی اور اخلاقی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ آپ کی شخصیت پر جو گہرا مذہبی رنگ نظر آرہا ہے وہ آپ کے والد محترم کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مقامی سیکنڈری اسکول سے جبکہ اعلیٰ تعلیم استنبول کی ٹیکنیکل یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ترکی کے ایک سابق وزیراعظم سلیمان ڈیمرل ٹیکنیکل یونیورسٹی استنبول میں آپ کے کلاس فیلو تھے۔ آپ اپنے ساتھیوں میں کٹر مذہبی کی حیثیت سے مشہور تھے۔ ۱۹۴۸ء میں آپ نے میکینکل انجینئرنگ میں بی ایس سی اور ۱۹۵۰ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی اور پھر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے مغربی جرمنی چلے گئے۔ ۱۹۵۳ء میں آپ نے یونیورسٹی آف آچن (AACHEN) سے میکینکل انجینئرنگ کے ایک شعبہ تھرموڈائنامکس میں پی ایچ ڈی کیا۔ جرمنی میں قیام کے دوران آپ نے جرمن زبان پر عبور حاصل کیا۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۷ء کے اوائل تک آپ مغربی جرمنی کی ایک موٹر ساز فیکٹری

میں چیف ریسرچ انجینئر کے طور پر کام کرتے رہے۔ اس موٹر ساز فیکٹری میں زیادہ تر سامان حرب (ٹینک اور ملٹری انجینئرنگ سے متعلق سامان) تیار ہوتا تھا۔ آپ جرمن انجینئروں کی اس خصوصی ٹیم میں شامل تھے جس نے جرمن لیپرڈ (Leopard) ٹینک کو جدید جنگی تقاضوں اور ضروریات کے مطابق ڈیزائن کیا تھا۔

۱۹۵۷ء میں آپ وطن واپس لوٹے اور گومز موٹرز (Gumus Motors) کے نام سے ایک کمپنی قائم کی۔ اس کمپنی نے ڈی ٹوز (Detuz) کے نام سے ایک موٹر ساز فیکٹری قائم کی جس نے نہایت ہی قلیل مدت میں پینسر موٹر (Pancer Motor) تیار کی۔ آپ کا منصوبہ تھا کہ ترکی کو ٹیکنالاجی کے میدان میں مغربی ممالک کی کاسہ گری سے نجات دلائی جائے۔ اس فیکٹری نے ڈیزل انجن سے چلنے والی اتنی کاریں تیار کیں کہ ترکی نے بیرونی ممالک سے کاریں منگوانا چھوڑ دیں۔ اس کے علاوہ زرعی شعبے کے لیے ایک پمپ بھی تیار کیا جبکہ اسی فیکٹری کے تیار کردہ ڈیزل انجنوں کی بیرونی ممالک میں بھی مانگ شروع ہوگئی ان تمام کاموں کی بدولت ترکی کو کثیر زرمبادلہ ملنے لگا لیکن ترکی کی بدقسمتی ملاحظہ فرمائے! فیکٹری کی برق رفتار پیداوار اور اعلیٰ کوالٹی نے اس کے کئی ایک حاسد پیدا کر دیے۔ خاص طور پر یہودیوں نے جن کی تجارت، صنعت اور انجینئرنگ کے شعبہ پر اجارہ داری تھی، گومز موٹرز کے خلاف سازشیں شروع کر دیں چنانچہ پہلے مرحلے پر مزدوروں سے ہڑتال کرائی گئی اور پھر ایک زبردست پروپیگنڈہ مُہم شروع کی گئی جس کے تحت کمپنی کے ذمّہ داران کو مزدور دشمن ثابت کر کے حکومت پر دباؤ ڈالا گیا کہ اس پر پابندی لگائی جائے۔ حکومت نے اس مُہم کے زیرِ اثر مزدوروں کی ہڑتال کو بہانہ بنا کر فیکٹری پر قبضہ کر لیا۔ آپ ۱۹۶۳ء تک اس کمپنی کے ڈائریکٹر رہے بعد میں حکومت کا روّیہ دیکھ کر اس سے الگ ہو گئے۔ ۱۹۶۴ء کا پورا سال آپ مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے رہے بالآخر ۱۹۶۵ء میں آپ اپنی مادرِ علمی استنبول یونیورسٹی کے شعبہ انجینئرنگ سے بحیثیت پروفیسر وابستہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد آپ اسی شعبہ کے چیئرمین بنا دیے گئے۔ ۱۹۶۶ء میں آپ یونین آف چیمبرز آف کامرس انڈسٹریز اینڈ ایکسچینج کے صنعتی شعبے کے سربراہ بنا دیے گئے۔ ۱۹۶۷ء میں جنرل سیکریٹری اور ۱۹۶۸ء میں بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل ہو گئے۔ اسی سال جسٹس پارٹی کی چار نہایت ہی اہم اور متحرک شخصیتوں عدنان حسن اکاسے، سلمان عارف، عامرہ حسین عباس اور حسام الدین نے آپ سے ملاقات کی اور ایک ایسی نظریاتی جماعت کی تشکیل

کے متعلق صلاح ومشورہ کیا جو اسلامی فکر اور نظریات کی بالادستی پر یقین رکھتی ہو۔ نجم الدین اربکان ان دنوں یونیورسٹی کی ملازمت چھوڑ کر اسٹیٹ پلاننگ ڈپارٹمنٹ کے چیئرمین کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وزیراعظم سلیمان ڈیمرل کو جیسے ہی ان چار افراد کی اربکان سے ملاقات کا پتہ چلا اس نے آپ کے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ سے برطرفی کے احکامات جاری کردیے۔ اربکان نے ان غیر قانونی اور بلاجواز احکامات کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ ڈیمرل نے پہلے پولیس اور پھر ناکام ہو کر فوج کے ذریعے آپ سے دفتر خالی کرایا۔ فوج نے اس ''جہاد'' میں ایک ٹینک استعمال کیا جس نے آپ کا دفتر زمین بوس کردیا۔ ۱۹۶۹ء میں ترکی میں عام انتخابات کا اعلان ہوا۔ آپ نے جسٹس پارٹی کو قونیہ کے حلقے سے ٹکٹ کے لیے درخواست دی جو مسترد کردی گئی۔ اس کے باوجود آپ نے اسی حلقہ سے آزاد اُمیدوار کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لیا اور اپنے مضبوط نظریاتی تشخص کے سبب ریکارڈ ووٹ لے کر کامیاب ہوئے۔ انتخابات کے فوراً بعد آپ نے سابقہ اور کچھ نئے ساتھیوں کے ساتھ مل کر بفرا (Bafra) میں ایک نظریاتی جماعت ''ملی نظام پارٹی'' کی بنیاد رکھی۔ ترکی کی یہ پہلی سیاسی جماعت تھی جو فوج کے سیاسی کردار اور کمیونزم کی آزادانہ مذمت کرتی تھی۔ آپ پارٹی کے پہلے صدر منتخب کیے گئے۔ ۱۹۷۱ء میں فوج نے سلیمان ڈیمرل حکومت کا تختہ اُلٹ کر اقتدار پر قبضہ کیا تو ملی نظام پارٹی پر پابندی لگادی گئی۔ ترازو کے پلڑے برابر رکھنے کے لیے کمیونسٹ پارٹی کو بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ ملی نظام پارٹی پر پابندی کی وجہ یہ بتائی گئی کہ یہ جماعت دستور کے سیکولر کردار کے خلاف تشکیل دی گئی ہے۔ (۵۶)

نجم الدین اربکان نے پارٹی پر بندش کو دستوری عدالت میں چیلنج کیا۔ دستوری عدالت نے پابندی برقرار رکھنے کے حق میں فیصلہ دیا۔ ۱۹۷۲ء میں مارشل لاء کے خاتمے پر آپ نے کروکٹ اوزال (ترگت اوزال کے بھائی) کے ساتھ مل کر ایک نئی سیاسی جماعت ''ملی سلامت پارٹی'' تشکیل دی۔ ۱۹۷۳ء کے انتخابات میں اس نو تشکیل شدہ جماعت نے پورے ملک میں اپنے اُمیدوار کھڑے کیے اور اڑتالیس نشستیں حاصل کیں۔ نجم الدین اربکان قونیہ کے حلقہ سے کامیاب ہوئے۔ آپ کو قومی اسمبلی میں ''ملی سلامت پارٹی'' کی طرف سے پارلیمانی لیڈر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۷۴ء میں ''ملی سلامت پارٹی'' نے پیپلز ری پبلکن پارٹی کے

اشتراک سے حکومت بنائی۔ بلند ایجوت وزیر اعظم اور آپ کو ڈپٹی وزیر اعظم بنایا گیا۔ ڈپٹی وزیر اعظم کی حیثیت سے آپ نے جو خدمات سرانجام دیں اگرچہ ان کی فہرست تمام طویل ہے تاہم ان میں سے چند ایک کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔ آپ کے دورِ وزارت میں ترکی اسلامی کانفرنس تنظیم کا رکن بنا، آپ نے قبرص کے مسئلہ پر خصوصی توجہ دی، ایک طویل عرصے کے بعد پہلی دفعہ آپ کی کوششوں سے ترک سڑک کے ذریعے حج پر جانے لگے۔ آئمہ مساجد کی تعداد میں آپ نے قابلِ قدر اضافہ کیا۔ ڈیمرل کے دورِ وزارت میں پورے ملک میں ۳۵ ہزار آئمہ مساجد تھے آپ نے ان کی تعداد ۶۰ ہزار تک کردی۔ دیہی علاقوں میں آپ نے سرکاری خرچ پر پانچ سو نئی مساجد تعمیر کرائیں اور ان پر ۵۰۰ ملین لیرا خرچ کیے۔ ۳۵۰ نئے دینی مدارس کھولے ان مدارس میں اخلاقی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ دینی مدارس سے تعلیم مکمل کرنے والوں کو عام کالجوں کے فارغ التحصیل طلبہ کے برابر قرار دیا گیا۔ ۱۹۷۵ء میں مخلوط حکومت ٹوٹی تو ''ملی سلامت پارٹی'' نے سلیمان ڈیمرل کے ساتھ مل کر وزارت تشکیل دی۔ کابینہ میں آپ کے ساتھ الپ ارسلان بھی شامل ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں عام انتخابات منعقد ہوئے۔ نوری جماعت کے عدم تعاون کے سبب آپ کی پارٹی صرف چوبیس نشستوں پر کامیاب ہوئی۔ اگرچہ سابقہ نشستوں کے مقابلہ میں یہ تعداد نصف تھی لیکن ان انتخابات میں ''ملی سلامت پارٹی'' کی انتخابی مُہم اور اپنے بل بوتے پر کامیابی کے قومی زندگی پر نہایت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

فنانشل ٹائمز لندن کے نامہ نگار کے مطابق:

> ''پروفیسر اربکان نے اپنے سیاسی اثر و رُسوخ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اسلامی تحریک کو اتنا زیادہ آگے بڑھا دیا ہے جس کی ترکی میں رائج الوقت قوانین کی رو سے گنجائش نہ تھی۔ فوج اور دانشوروں کے ایک گروپ کی نظر میں یہ ایک ایسا جرم ہے جو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس نظریہ کے حامل لوگوں کے بموجب نجم الدین اربکان خلافتِ اسلامیہ کا خاتمہ کرنے والے ترک جرنیل اور سیکولر بنیادوں پر جدید ترکی کے بانی کمال اتاترک کے کیے دھرے پر پانی پھیر دینا چاہتے ہیں اور ترکی کو بے دین ریاست کے بجائے اسلامی ریاست بنا دینے کے قابلِ اعتراض اور خطرناک

عزائم رکھتے ہیں۔''

۱۹۷۹ء میں ''ملی سلامت پارٹی'' کو ایک دفعہ پھر مخلوط وزارت میں شرکت کا موقع ملا۔ اب کی دفعہ تین جماعتوں ''ملی حرکت پارٹی''، ''جسٹس پارٹی'' اور ''ملی سلامت پارٹی'' نے مل کر وزارت تشکیل دی۔ مخلوط وزارت کا دورانیہ اگرچہ بہت مختصر ثابت ہوا لیکن کارکردگی کے لحاظ سے بہت بہتر۔ اس حکومت کی زیرِ نگرانی ۲۶ دینی کتب شائع ہوئیں جن کی مجموعی تعداد ۶ لاکھ ۶۰ ہزار تھی۔ ۲۰ ہزار قرآن مجید شائع ہوئے۔ صحیح بخاری (ترجمہ وحواشی) ۱۳ جلدوں میں شائع ہوئی ہر جلد ۲۰ سے ۲۵ ہزار کی تعداد میں۔ ریاض الصالحین تین جلدوں میں ۷۵ ہزار کی تعداد میں جبکہ سیرت پاک پر ایک لاکھ پچاس ہزار کتب شائع ہوئیں۔ آپ نے پہلی دفعہ سرکاری سطح پر اسرائیل کے ساتھ بائیکاٹ کی مُہم چلائی اور شریکِ اقتدار جماعتوں پر زور دیا کہ اسرائیل کے ساتھ تعلقات ختم کر کے اسلامی ممالک کے ساتھ تعلقات کو مزید بہتر بنایا جائے۔ ستمبر ۱۹۸۰ء میں جنرل کنعان ایورن نے بائیں بازوں کے انتہا پسندوں کی ناپسندیدہ سرگرمیوں سے فائدہ اُٹھا کر مخلوط حکومت کو برطرف کر کے مارشل لاء نافذ کر دیا اور تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگادی۔ آپ کو دیگر بائیس ساتھیوں کے ہمراہ گرفتار کر لیا گیا۔ کافی عرصہ بغیر مقدمہ چلائے فوجی قید خانے میں رکھا گیا۔ فروری ۱۹۸۱ء میں کی چھٹی کور کے مارشل لاء کمانڈر فرسٹ ملٹری کوٹ انقرہ میں مقدمہ کی کاروائی کا آغاز ہوا۔ آپ پر مختلف نوعیت کے آٹھ الزامات لگائے گئے جن میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ نجم الدین اربکان نے سیکولرازم کے اُصولوں کو توڑا اور اس غرض کے لیے ایک تنظیم بنائی کہ وہ سیکولرازم کی نفی کر کے ملکی قوانین کی بنیاد اسلامی اُصولوں کو بنائیں۔ پبلک پراسیکوٹر نے انچاس صفحات پر مشتمل فردِ جرم میں عدالت سے درخواست کی کہ:

> ''نجم الدین اربکان اور ان کے ساتھیوں کو زیادہ سے زیادہ سزا دی جائے کیونکہ دستور کی دفعہ اسیکشن ۱۶۳ کے تحت اسلامی حکومت کا مطالبہ جرم ہے۔ نجم الدین اربکان نے ۱۹۷۷ء میں حج کے موقع پر ترک حاجیوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اُبھارتے ہوئے پلے۔''

سورۃ الصف اور سورۃ الفتح کی چند آیات تلاوت کیں اور پھر کہا:

''اللہ نے اپنے رسول کو قرآن دے کر تمام باطل مذاہب اور تمام انسانی تقاضوں پر غالب کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ میرے عزیز بھائیوں! آپ اپنے ملک کا حال دیکھ رہے ہیں اس اضطراب کا کیا سبب ہے؟ پارٹیوں کو ایک طرف چھوڑیے اور دیکھیے کہ ہم قرآن پر عمل کر رہے ہیں؟ قرآن میں آیاتِ احکام بھی ہیں جو فرد، خاندان، تجارت، اخلاق، اجتماعی زندگی اور نظامِ حکومت سے متعلق ہیں اور ہم ان پر عمل کرتے تو کہہ سکتے تھے کہ ہم قرآن پر عمل کر رہے ہیں۔ کیا وہ لوگ جو ہمارے حاکم ہیں قرآن کو پیشِ نظر رکھتے ہیں؟ ترکی کا شہری قانون سوئٹزرلینڈ سے لیا گیا ہے، جنارتی ضابطہ جرمنی سے جبکہ تعزیری قوانین اٹلی سے لیے گئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ملک کے حکمران فرانس، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے قوانین کے ذریعے ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔ ہم اس طرح قرآن سے جدا ہو گئے ہیں، قرآن سے جدا ہوئے ہم کو پچاس سال ہو گئے ہیں، یہودیوں اور عیسائیوں نے ہم کو اسلامی زندگی سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ وہ کہتے ہیں کہ دین الگ ہے اور سیاست الگ، ان کو ملانا نہیں چاہئے۔ وہ کہتے ہیں کہ اقتصادی معاملات میں دین کو داخل نہ کرو۔ ہمارے دستور میں ہے کہ ہم اپنے بچوں کو دین کی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ یہ حقائق اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہمارے یہاں قرآن حاکم نہیں محکوم ہے۔''

اسپیشل پراسیکیوٹر کی ''فردِ جرم'' کا جواب دیتے ہوئے آپ نے ایک معرکۃ الآراء جوابی تقریر کی جس کا اقتباس ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ آپ نے کہا:

''قوم کو اسلام سے دور رکھنے کے لیے کئی ایک طریقے استعمال کیے گئے ہیں ان میں سے ایک سیکولرازم ہے۔ اس قسم کا سیکولرازم اسلام کی ضد ہے مثلاً یہ کہا گیا کہ اسلامی دانشوروں کو پھانسی دی جائے، اسلامی مدارس بند کیے جائیں، اسلامی اوقاف تباہ

کردیے جائیں، رسم الخط لاطینی کردیا جائے، جمعہ کی بجائے اتوار کی چھٹی کی جائے... دو سال بعد انتخابات ہو گئے اور ملی سلامت پارٹی انتخابات کے بعد حکومت بنائے گی۔ انشاء اللہ ترکی میں اسلامی قوانین رائج ہوں گے ہم کہتے ہیں کہ ہم ترکی پر انصاف سے حکومت کریں گے، ہم لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں، جن کے ووٹ ہمارے لیے ہیں جو ہماری حکومت کی مدد کریں گے۔"(۵۷)

فوجی عدالت میں دو سال تک آپ کا مقدمہ چلتا رہا۔ عدالت نے تمام مجرموں کو دو سے چار سال تک کی سزائیں سنائیں۔ آپ کو سب سے زیادہ یعنی چار سال کی سزا دی گئی۔ ان سزاؤں کے خلاف پوری دنیا میں احتجاج ہوا۔ اسلامک ہیومن رائٹس کمیشن کے صدر بن بیلا نے صدر کنعان ایورن کو ایک برقیہ دیا جس میں کہا گیا کہ "فوجی عدالت نے اربکان کو جو سزا دی ہے یہ انسانی بنیادی حقوق کی صریحاً خلاف ورزی ہے اس سے آپ کے ملک کا امیج داغ دار ہوا ہے۔ اربکان کی سزا ختم ہونی چاہئے" اسلام کونسل کے سیکریٹری جنرل سلیم عصام نے دنیا بھر کے مسلمانوں سے اپیل کی کہ "اربکان اور ان کے ساتھیوں سے اتحاد کے لیے احتجاج کریں، انہوں نے ترکی کی حکومت کے غیر جمہوری عمل کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ اربکان اور ان کے ساتھیوں کی عزت کی جاتی ہے۔" تحریکِ اسلامی پاکستان کے امیر میاں طفیل محمد نے بھی اربکان کی سزا کی مذمت کی۔ لندن میں مسلم سالیڈریٹی کمیٹی نے ترکی کے سفارت خانہ کے باہر زبردست مظاہرہ کیا اور ترکی کے سفیر کو ایک یادداشت پیش کی جس میں ان سزاؤں کو ظالمانہ قرار دیا گیا اور اربکان اور ان یک ساتھیوں کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔

نجم الدین اربکان اور ان کے ساتھیوں نے ان سزاؤں کے خلاف سپریم ملٹری کورٹ میں اپیل دائر کی۔ ملٹری کورٹ نے اس ریمارکس کے ساتھ کیس واپس ہائی کورٹ بھیج دیا کہ شہادتیں کافی نہیں ہیں نتیجتاً آپ ۱۹۸۵ء میں رہا کردیے گئے۔ حکومت نے اپنی خفگی مٹانے کے لیے کچھ عرصہ آپ کو گھر میں نظر بند رکھا پھر پابندی ختم کردی۔ پابندی ختم ہوتے ہی آپ نے ساتھیوں کے مشورے سے "رفاہ پارٹی" کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت تشکیل دی۔

پارٹی کے تاسیسی اجلاس میں آپ نے اس کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

''ہمارا مقصد ایک صالح اور محبِ وطن ترکی وجود میں لانا ہے۔ ۱۹۸۷ء میں ''رفاۃ پارٹی'' نے انتخابات میں حصہ لیا کیونکہ اس کے قیام کو ابھی بمشکل ایک سال ہی ہوا تھا اس لیے مطلوبہ ۱۰ فیصد ووٹ نہ مل سکے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''رفاۃ پارٹی'' اسمبلی میں نہ پہنچ سکی۔ چار سال بعد ۱۹۹۱ء میں پھر انتخابات ہوئے اس دفعہ پارٹی نے ۱۶ء۳۷ فیص یعنی ۵۳ نشستیں صاحل کیں اور تیسرے نمبر پر رہی۔ انتخابات کے بعد اربکان نے پارٹی ہیڈکوارٹر میں کارکنوں اور اراکینِ پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کا کہ:

''ان کی جماعت کا شاندار نتیجہ آتش فشاں پہاڑ کا پھٹنا ہے جبکہ مدرلینڈ پارٹی دھڑم سے نیچے گر گئی۔''

## حرفِ آخر

پروفیسر نجم الدین اربکان اور ان کی رفاۃ پارٹی ترکی میں اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے لیے جو جدوجہد کر رہے ہیں حکمرانوں کے لیے اب اسے کچلنا مشکل ہو چکا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ عوام کی اسلام اور اربکان سے گہری محبت ہے. ترکی کا دستور سیکولر ہے وہاں مذہب کی تبلیغ یا مذہب کے نام پر سیاسی جماعت بنانا اور مذہب کے نام پر ووٹ مانگنا جرم ہے۔ نجم الدین اربکان بار بار مختلف ناموں سے جماعتیں بنا کر اس جرم کا ارتکاب کرتے چلے آرہے ہیں۔ اُستاد بدیع الزمان نورسی کے بعد آپ پہلے فرد ہے جنہوں نے ملک پر چھائے ہوئے مذہبی اور سیاسی جمود کو توڑا۔ اسلامی دستور اور قانون کی آزادانہ بات کی۔ آپ پہلے فرد ہیں جنہوں نے 'بیک ٹو دی قرآن'' کا نعرہ لگایا اور آزادانہ اپنے حواریوں سے یہ بات کہی:

''اگر تم ترقی کرنا چاہتے ہو تو اپنی جڑوں کی طرف پلٹ جاؤ انہیں مت کاٹو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر غلامی اور ذلت کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

آپ ان معنوں میں ایک فلاسفر اور داعی نہیں ہیں جن معنوں میں سیّد مودودیؒ، بدیع الزمان نورسی،

حسن البناءؒ یا سیّد قطب شہیدؒ تھے اور نہ ہی ابتدا میں آپ کے ذہن میں ایسا کوئی نقشہ موجود تھا کہ باقاعدہ ایک نظریاتی تحریک بنا کر اسلامی انقلاب برپا کریں گے۔ یہ محض اتفاق ہے یا سلیمان ڈیمرل کی بے وقوفی کہ ایک معمولی سے واقعے کو بہانہ بنا کر آپ کو ملازمت سے نکال دیا اور اپنے مقابل لا کھڑا کیا اور پھر آپ کا نظریاتی کردار کھل کر سامنے آ گیا۔ اسلام سے آپ کو والہانہ لگاؤ اور محبت ہے۔ آپ کی یہ زبردست خواہش ہے کہ ترکی ایک دفعہ پھر خلافتِ اسلامیہ کا مرکز بنے۔ چنانچہ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۰ء تک آپ نے پورے ملک کا طوفانی دورہ کیا۔ اس دورے میں عوام نے جس طرح آپ کا استقبال کیا اور آپ کے جلسوں میں جو نعرے لگائے اس نے حکمرانوں کی نیندیں حرام کر دیں۔ چند ایک نعرے ملاحظہ ہوں:

- غیر اسلامی حکومت یقیناً تباہ ہوگی، اسلامی حکومت لازمی قائم ہوگی۔
- اسلامی قانون آئے گا اور ہمارے آنسو تھمیں گے۔
- ہمارا قانون اسلام ہے، ہمارا دستور قرآن ہے، ہمارا لیڈر اربکان ہے۔
- اب بت ٹوٹنے چاہئیں اور اسلام قائم ہونا چاہئے۔
- اسلامی قوم، اسلامی حکومت، ایک خلیفہ ایک حکومت۔
- ماریں مرجائیں گے، اسلامی شریعت لائیں گے۔
- ایک ہی لیڈر نبی پاک ﷺ۔
- ایران میں خمینی، ترکی میں اربکان۔
- ہمارا لیڈر سپاہی اربکان۔

آپ کو عالمِ اسلام کے مسلمانوں سے بے پناہ محبت ہے جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اتحادِ عالمِ اسلامی کے لیے آپ درجنوں کانفرنسوں اور درجنوں ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ آپ کا رابطہ عالمی تحریکِ اسلامی کے ممتاز لیڈروں سے ہے۔ مسلمان اقلیتوں پر دنیا میں کسی جگہ بھی مظالم ہوں آپ ان کی مدد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں افغانستان، بوسنیا، کشمیر اور برما وغیرہ میں مسلمان جن مشکلات کا شکار ہیں آپ ان کی حمایت میں اسلامی ممالک کے حکمرانوں کو بیدار کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہیں ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں خلیج کے مسئلے پر جو شدید

بحران پیدا ہوا تھا آپ نے الجزائر، ملائیشیا، فلسطین، سوڈان، تیونس اور یمن وغیرہ کے نمائندوں کے ساتھ مل کر اردن، عراق اور ایران کا دورہ کیا۔ جنگِ کویت سے پیدا ہونے والی صورتحال کا جائزہ لیا اور مسئلہ فلسطین کی پیش رفت سے آگاہی حاصل کی۔ ۱۹۹۲ء میں آپ نے عالمی تحریکِ اسلامی کے متعدد لیڈروں کے ساتھ مل کر بوسنیا ہرزیگوینا کا دورہ کیا اور سربیائی جارحیت کی مذمت کے علاوہ مظلوم بوسنیائی عوام کے لیے امداد کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا۔ افغانستان میں روسی فوجوں کی پسپائی کے بعد مختلف افغان گروپوں میں جس خون ریز جنگ کا آغاز ہوا، آپ جنگ بندی اور صلح کرانے میں پیش پیش تھے۔ ابھی حال ہی میں (مارچ ۱۹۹۳ء) مختلف افغان تنظیموں کے درمیان حکومتِ پاکستان، ایران، سعودی عرب اور قاضی حسین احمد اور جنرل حمید ل کی کوششوں سے جو معاہدہ ہوا ہے اسے کامیاب بنانے کے لیے عالمی تحریک اسلامی کے لیڈروں کے ایک وفد کابل گیا تھا۔ اس میں آپ کا نمائندہ بھی شامل تھا۔ آپ متعدد مرتبہ پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں۔ تحریکِ اسلامی پاکستان کو اپنی ہی جماعت تصوّر کرتے ہیں۔ ترکی میں جو پوزیشن رفاۃ پارٹی اختیار کر چکی ہے اور عوام میں آپ کا جو امیج بن چکا ہے اس کو مدّ نظر رکھتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اب حکومت کے لیے ''بنیاد پرستی'' کی آڑ لے کر بار بار آپ کو گرفتار کرنا اور آپ کی جماعت پر پابندی لگانا ناممکن ہوگا۔ آپ کی کوششوں سے اب اسلامی بنیادی پرستی کا دوسرا دور (یعنی دستور کے سیکولر کریکٹر میں بعض تبدیلیاں) شروع ہو چکا ہے۔ حکمرانوں کو اب اپنے روّیہ میں نرمی پیدا کرنا ہوگی۔ (۵۸)

## فصل نہم

# عالیجاہ ڈاکٹر علی عزت بیگووچ

یوگوسلاویہ کے ایک عیسائی جنرل درازامجووک نے اپنے ملک میں تحریکِ اسلامی کی سرگرمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''علاقہ کو اسلامی کینسر سے ہر حالت میں پاک کرنا ہے اور آخری مقامی مسلمان کو بھی عیسائیت قبول کرنی یا موت.....''

مسلمانوں کے بارے میں جنرل مجووک کے یہ الفاظ ابھی اس کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ متعصب سربیائی باشندوں نے اپنی ہی ایک جمہوریہ بوسنیا ہرزیگووینا کے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنا شروع کردی۔صدیوں اکٹھا رہنے والے عیسائی مسلمانوں کے خون کے اس طرح پیاسے ہوگئے جیسے یہ انسان نہ ہوں بلکہ وحشی درندوں کی کسی نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ ۱۹۸۹ء میں افغان مجاہدین کے ہاتھوں روس کی ذلت آمیز شکست اور اندرونِ ملک توڑ پھوڑ کا جو عمل شروع ہوا تھا اشتراکی دنیا کے لیے یہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔اس کے اثرات مشرقی یورپ کے دیگر ممالک کی طرح یوگوسلاویہ پر بھی پڑے۔چنانچہ ۱۹۹۰ء میں یوگوسلاویہ کے بھی حصے بخرے ہونے شروع ہوگئے۔ پہلے کروشیا اور سلوانیا الگ ہوئے پھر بوسنیا بھی الگ ہوگیا۔بوسنیا کا یہی وہ جرم تھا جسے آج تک سربیائی درندے معاف کرنے کو تیار نہیں۔سربیائی درندوں نے سابق یوگوسلاویہ کی حکومت کی آشیر باد پا کر جس وحشیانہ کارروائی کا آغاز کیا تھا اس کے نتائج نہایت ہی تباہ کن نکلے۔بستیوں کی بستیاں ویران ہو چکی ہیں۔لاکھوں افراد تہہ تیغ کیے جا چکے ہیں اور لاکھوں دنیا کے مختلف ممالک میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور جو ملک کے اندر ہیں ان کی زندگی تو سب سے بدتر ہے۔ان حالات میں جس مردمیدان نے سربیائی باشندوں کی ناجائز خواہشات کے آگے جھکنے کی بجائے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا وہ ہے ''ڈیموکریٹک ایکشن پارٹی'' کے قائد اور بوسنیا ہرزیگووینا کے منتخب صدر عالیجاہ علی عزت بیگووچ۔

عالیجاہ علی عزت بیگو وچ ۱۸ اگست ۱۹۲۵ء کو شمالی بوسنیا کے ایک چھوٹے سے قصبے بوسانسکی سامک (BOSANKISAMAC) میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان پورے علاقہ میں اپنی روایتی دین داری اور خاندانی شرافت کے سبب قابلِ احترام اور معزز شمار ہوتا تھا۔ ابھی آپ چھوٹے ہی تھے کہ والدین نقل مکانی کر کے سراجیوو چلے گئے۔ اس لیے آپ نے ابتدائی تعلیم سراجیوو ہی سے حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں آپ نے سیکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ کا امتحان پاس کیا۔ اسکول میں تعلیم کے دوران آپ اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ مل کر عوامی بہبود کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ کالج کے زمانہ میں آپ انہی طالب علموں کے ساتھ عالمی مسائل بالخصوص اسلامی ممالک کی سیاست اور شاندار تاریخی روایات پر گھنٹوں بحث کرتے اور مسلمانوں پر پوری دنیا میں جو پژمردگی چھائی ہوئی تھی اس سے آپ پریشان تھے۔ آپ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مسلمان اس ذلت آمیز زندگی سے کبھی نجات پائیں گے بھی یا نہیں؟ ابھی آپ بی اے کے طالب علم تھے کہ جامعہ الازہر کے فارغ التحصیل تین طالب علموں محمد خانجی، قاسم دوبروچا اور حسین جوزو نے آپ کو نوجوانوں کی ایک تنظیم ''ینگ مسلم موومنٹ'' میں شمولیت کی دعوت دی۔ یہ تینوں طالب علم اخوان المسلمون سے متاثر تھے۔ یہ تنظیم ۱۹۴۱ء میں محمد خانجی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر تشکیل دی تھی۔ اس کے قیام کا مقصد اسلامی عقیدے اور نظریات کو اس کی اصل رُوح کے ساتھ اپنی زندگیوں میں نافذ کرنا، مسلمانوں کو ان کے دینی، تاریخی اور ثقافتی نظریات کی طرف راغب کرنا اور عوام کی خدمت کے لیے دینی اور فلاحی ادارے قائم کرنا تھا۔ آپ نے تحریک کے مقاصد سے اتفاق کرتے ہوئے فوراً ہی شمولیت اختیار کر لی۔ جنگِ عظیم دوم کے خاتمہ پر مارشل ٹیٹو یوگوسلاویہ کا صدر بنایا گیا تو اس نے ''ینگ مسلم موومنٹ'' پر پابندی لگا دی۔ اس کے تمام مالیاتی ادارے اور اثاثہ جات منجمد کر دیے اور تحریک سے تعلق ثابت ہونے پر کارکنوں پر ظلم و تشدد شروع کر دیا۔ مارشل ٹیٹو نے یوگوسلاویہ پر پینتیس سال حکومت کی۔ ان پینتیس سالوں میں مجموعی طور پر ''ینگ مسلم موومنٹ'' اور دیگر تنظیموں سے تعلق رکھنے والے ساٹھ ہزار افراد شہید کر دیے گئے ''ینگ مسلم موومنٹ'' میں شمولیت سے آپ کی دینی اور سماجی سرگرمیاں ایک ضابطے اور نظم کی پابند ہو گئیں۔ اس زمانے کی تربیت نے مستقبل میں آپ کی شخصیت پر گہرے اثرات چھوڑے۔ آپ تحریک کے پروگرام کے مطابق نوجوانوں کو ساتھ لے کر تبلیغ کے لیے

ایک ایک گھر جاتے اور مسلمانوں کو ان کی دینی، تاریخی اور ثقافتی روایات کے حوالہ سے بیدار کرتے اور ان تک قرآن کا پیغام پہنچاتے۔ آپ کی یہ سرگرمیاں زیادہ دیر حکومت سے پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں آپ کو ٹیٹو دور میں پہلی دفعہ گرفتار کیا گیا۔ آپ تین سال تک یوگوسلاویہ کی مختلف جیلوں میں سختیاں اور تشدد برداشت کرتے رہے۔ ۱۹۴۹ء میں رہائی کے بعد آپ دوبارہ اپنی تعلیم کی طرف پلٹے اور سراجیوو سے زراعت میں ڈگری لی۔ پھر مزید دو سال کے مطالعہ کے بعد قانون کی ڈگری لی۔ ۱۹۵۱ء میں آپ جامعہ الازہر چلے گئے۔ ۱۹۵۲ء میں آپ جامعہ الازہر سے فارغ ہوئے۔ جامعہ الازہر میں قیام کے دوران آپ کا رابطہ اخوان المسلمون سے ہوا اور آپ اخوان کے تربیتی پروگراموں میں شرکت کرتے رہے۔ ۱۹۵۶ء میں آپ نے ایم اے پاس کیا اور ۱۹۶۳ء میں بار ایٹ لاء کی ڈگری لی۔ یوگوسلاویہ میں آپ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے چھ مختلف مضامین میں پی ایچ ڈی کیا۔ دورانِ تعلیم آپ قومی اور بین الاقوامی شہرت کے حامل اخبارات اور جرائد میں مضامین تحریر کرتے رہے۔ آپ کی بعض کہانیاں اور تنقیدی مضامین سراجیوو کے اسکولوں میں آج بھی شاملِ نصاب ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں آپ نے بچاس صفحوں پر مشتمل ایک ڈکلیئریشن میں مسلم اُمہ پر زور دیا کہ وہ اسلام کی نشاۃ الثانیہ کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ یہ کتابچہ عربی، انگریزی، فارسی اور ترکش زبانوں میں شائع ہوا. تیرہ سال بعد ۱۹۸۳ء میں اس ڈکلیئریشن کو بنیاد بنا کر حکومت نے آپ کو پندرہ ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا اور مقدمہ چلا کر مجموعی طور پر نوّے سال کی سزا سنائی۔ آپ کو سب سے زیادہ یعنی چودہ سال جسے ۱۹۸۴ء میں بارہ سال اور پھر ۱۹۸۹ء میں رہا کر دیا گیا۔ سرکار کی طرف سے آپ پر جو فردِ جرم عائد کی گئی اس کے مطابق آپ بوسنیا کو اسلامی جمہوریہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے سیّد قطبؒ اور عالمی تحریکِ اسلامی کے قائدین کا لٹریچر استعمال ہوتا ہے۔ آپ نوجوانوں میں اسلام کی تبلیغ کر کے انہیں بگاڑتے ہیں، مذہب کے نام پر اتحاد چاہتے ہیں۔ مذہبی قوانین روحانیت اور اسلامی ریاست کے نام پر اتحاد چاہتے ہیں۔ (۵۹)

مقدمہ کی کاروائی کے دوران آپ کو استغاثہ کے لگائے گئے الزامات کا جواب آخری بار دینے کے لیے کہا گیا۔ آپ نے اس سلسلے میں اراکینِ جیوری اور جج کو مخاطب کر کے ایک تقریر نما تاریخی بیان دیا۔ یہ بیان آج بھی اتنا ہی تازہ اور پر لطف ہے جتنا کہ ۱۹۸۳ء میں مقدمہ کی کاروائی کے دوران تھا۔ اس بیان نے

مولانا محمد علی جوہر کے ۱۹۲۴ء کے خالقدینا ہال والے (مقدمۂ بغاوت) بیان کی یاد تازہ کر دی۔ آپ کا یہ بیان ۱۹۸۷ء میں پہلی دفعہ ''میں مسلمان ہوں اور مسلمان رہوں گا'' کے عنوان سے دنیا بھر کے جرائد میں شائع ہوا۔

آپ نے فرمایا:

''میری آخری تقریر مختصر مگر جامع ہوگی۔ ابتداء ہی میں یہ کہنا چاہوں گا کہ مقدمہ کی اس طویل اور قیمتی کاروائی میں چار بنیادی باتیں نمایاں رہی ہیں جن کا اس مقدمہ سے تعلق ثابت نہیں ہوتا:

- ''دی اسلامک ڈکلیئریشن''، جو میں نے تحریر کیا تھا اس کا یوگوسلاویہ یا یوگوسلاویہ کے حالات سے کوئی تعلق یا واسطہ نہیں۔
- ملزموں میں صرف عمر بہمن واحد آدمی ہے جس نے اس کا مطالعہ کیا دوسرے ملزموں کا اس سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔
- ''دی اسلامک ڈکلیئریشن'' کی ایک کاپی کروٹس زبان میں یوگوسلاویہ میں پائی گئی وہ بھی میری ذاتی کاپی تھی جو میرے گھر میں ایک ڈیسک سے ملی تھی۔
- اگر بالفرض دیگر مجرموں نے ''اسلامک ڈکلیئریشن'' کا مطالعہ کیا بھی ہو تو یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ انہوں نے ایک گروپ تشکیل دیا ہوا تھا؟ ظاہر بات ہے کہ گروپ تشکیل دینے کے لیے درج ذیل شرائط کا پورا کیا جانا ضروری ہے:
- کنوینر ہونے کی حیثیت سے میرے علم میں یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ان مجرموں نے اس کا مطالعہ کیا ہے اور پھر یہ کہ ہم سب اس بات پر متفق ہوئے تھے۔ استغاثہ اس سلسلے میں کوئی ثبوت فراہم نہیں کر سکا۔
- عمر بہمن اور میں نے پہلے ایک سازش تیار کی کہ ''اسلامک ڈکلیئریشن'' کے مطالعہ کا مقصد گروپ کا ممبر بننا ہے۔ ایسی کوئی سازش کبھی بھی نہیں کی گئی۔ استغاثے کو ثابت کرنا چاہیئے تھا کہ ہم نے کب آپس میں ایسا کوئی معاہدہ کیا تھا۔ لازمی طور پر ایسی کوئی اجازت، مرضی، معاہدہ یا ایسی کوئی شعوری کوشش کہ ان میں سے کسی کا گروپ سے تعلق ہے جسے استغاثہ کسی بھی طرح ثابت نہیں کر سکا۔ استغاثہ کا غیر

ارادی طور پر یہ الزام دینا کہ ڈکلیئریشن کے مطالعہ کا مقصد گروپ ترتیب دینا ہے کسی بھی طرح قابلِ قبول نہیں ہے ......میں دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ پہلے تین نکات حقائق پر مبنی ہیں جب کہ چوتھا منطقی لحاظ سے درست ہے۔

استغاثہ میرے اور عمر بہمن کے رابطوں پر بہت زیادہ زور دیتا رہا ہے لیکن اس نے صرف ہمارے دس سالوں میں چار پانچ رابطوں کا ذکر کیا ہے۔ میں نے ہمیشہ عمر بہمن سے محبت کی ہے اور اس کی بہت زیادہ عزت کی ہے لیکن میں اس کے ساتھ کبھی بھی گروپ کی شکل میں کام نہ کر سکا۔ وہ ایک مکمل اور خالصتاً انجینئر ہے جب کہ میں وکیل ہوں۔ لیکن ہم دونوں اسلام سے خاص محبت محسوس کرتے ہیں اور اسلام کے لیے کام کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ دوسرے میدانوں میں م بالکل مختلف ہیں اور کسی چھوٹے کام کے لیے بھی رابطہ نہیں کرتے۔ جو کام اکٹھے کرنا چاہتے تھے وہ ایران کا سفر تھا۔ ہم اس میں بھی ناکام ہو گئے ......ہم نے طے کیا کہ الگ الگ سفر کریں گے...دیگر ''حقائق'' کے بارے میں کہنا چاہوں گا کہ:

''ملزموں اور گواہوں میں سے ایسے احمقانہ نظریہ کی کسی نے بھی تائید نہیں کی کہ ہم نسلی بنیادوں پر بوسنیا یا اسلامک ری پبلک آف بوسنیا قائم کرنا چاہتے ہیں یا بوسنیا کی اسلامائزیشن کرنا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر اس طرح کا نظریہ یا اس سے ملتا جلتا نظریہ کسی بھی جگہ نہیں پایا جاتا اور نہ ہی ایسی کوئی شہادت ملی ہے اور نہ ہی اس کا کوئی ماڈی وجود ملزموں کے تند و تیز بیانات سے ملتا ہے اسے خالصتاً اتفاقی حادثہ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ عدالت ایک ہزار صفحات پر مشتمل ملزموں کے تند و تیز بیانات خود ہی کاروائی سے حذف کر چکی ہے۔ جہاں تک سفرِ ایران کا تعلق ہے میں ایک بار پھر کہوں گا کہ اس سفر کی تیاری اور منصوبہ بندی کے دوران کبھی بھی یہ ذکر نہیں آیا کہ ایران میں یوگوسلاویہ کا ذکر ہو گا.......اور یہ بات تمام شرکاء میں پہلے ہی سے طے تھی۔ استغاثہ نے اسی عمل کا ذکر کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ کب، کہاں اور کس نے یوگوسلاویہ کے متعلق ایران میں کچھ کہا ہے......''

میں آپ کی توجہ اپنے وکیل ابن مسلم کے بیان کی طرف دلانا چاہوں گا کہ استغاثہ نے کہیں یہ الزام نہیں لگایا کہ یہ بات کب، کہاں اور کس نے کہی؟

میں یہاں ''دی اسلامک ڈکلیئریشن'' کی دو خصوصیات بیان کرنا چاہتا ہوں۔ استغاثہ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ میں مسجد میں جن باتوں کا اظہار کیا گیا ہے اس کا ڈکلیئریشن سے تعلق ہے.... استغاثہ نے اس سلسلہ میں حسن سنجک کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے اور اس طرح مسجد میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا وہ اسلامک ڈکلیئریشن کے نظریات تھے۔ اس بات کو بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات کہ حسن سنجک نے ڈکلیئریشن کا مطالعہ کیا بذاتِ خود متنازعہ بات ہے کیونکہ مسجد میں جو کچھ پڑھا گیا اس کا ڈکلیئریشن کے متن سے کوئی تعلق ہی ثابت نہیں ہوتا۔ استغاثہ اس بات کا جواب نہیں دے سکا کہ توفیق ویلیساوچ کو کس نے کب اور کہاں ''اسلامک ڈکلیئریشن'' کی کاپی دی۔ (یاد رہے کہ توفیق اس وقت ویانا میں تھے) عمر بہمن اور توفیق کے درمیان مکالمہ کا ذکر پہلی دفعہ عدالت میں کیا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہوا کہ توفیق کو پہلی دفعہ ۱۹۷۵ء میں ملا تھا...... جبکہ اس وقت ڈکلیئریشن تحریر کیا جا چکا تھا اور اس کا ۷۳-۱۹۷۲ء میں ترکی، انگریزی اور عربی میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ یہ کاپیاں استغاثہ کے بقول پولیس کو ۱۹۷۳ء میں تہہ خانے سے ملیں جبکہ بہمن لیبیا جانے سے پہلے تین چار سال سے یہاں رہ رہا تھا۔

استغاثہ نے ''اسلامک ڈکلیئریشن'' اور ''ینگ آرگنائزیشن'' کے پروگراموں کے درمیان تعلق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں کوئی شہادت یا ثبوت پیش نہیں کیا تھا اور نہ ہی تحریر کر سکتا تھا کیونکہ اس وقت میں جیل میں تھا...... ''اسلامک ڈکلیئریشن'' اور پروگرام کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔

میں اپنے ملک یوگوسلاویہ سے محبت کرتا ہوں۔ میں اس کے نام، نقشہ اور اس کی شکل سے محبت کرتا ہوں اور کیا اتھارٹی سے بھی؟ (حکمرانوں سے) میں کسی اتھارٹی سے محبت نہیں کرتا میں صرف ان کا احترام کرتا ہوں کیونکہ کہ میں نے اپنی تمام محبت آزادی کے لیے وقف کی ہوئی ہے۔ ''میں ہمیشہ سے مسلمان ہوں اور مسلمان رہوں گا'' میں محسوس کرتا ہوں کہ ایسی دنیا میں کوئی اسلام کے لیے جہاد کرتا ہو اور میں بھی ایسا ہی کروں گا اپنی زندگی کے خاتمہ تک کیونکہ میرے لیے اسلام سلامتی اور بھلائی کا دوسرا نام ہے۔''

مقدمہ بغاوت میں گرفتاری سے تین سال پہلے ۱۹۸۰ء میں آپ نے انتالیس ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک سیاسی جماعت ''ڈیموکریٹک ایکشن پارٹی'' تشکیل دی۔ جس کے مقاصد کا اعلان کرتے ہوئے کہا گیا کہ:

> ''یہ جماعت یوگوسلاویہ کے باشندوں کی جماعت ہے جو مسلمانوں کے حقوق کے لیے کام کریگی، مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے افراد بھی اگر پروگرام سے اتفاق کریں تو شمولیت اختیار کر سکتے ہیں۔''

آپ کو پارٹی کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ پہلے پارٹی کا نام ''یوگوسلاویہ مسلم پارٹی'' رکھا گیا تھا لیکن مسلم کے لفظ سے اشتراکیوں کو چڑ تھی اس لیے یہ نام بدلنا پڑا۔ ۱۹۹۰ء میں کروشیا اور سلوانیا کی یوگوسلاویہ سے علیحدگی کے بعد بوسنیا کی آزادی کا مطالبہ بھی کیا جانے لگا اور بتدریج یہ مطالبہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ ۱۹۹۱ء میں حکومت نے بوسنیا کی آزادی اور خود مختاری کا فیصلہ کرنے کے لیے یورپی برادری کی تجویز پر ریفرنڈم کا اعلان کیا۔ عوام کے تمام طبقات نے جن میں عیسائی بھی شامل تھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ یوگوسلاویہ کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا کہ آزاد اور خود مختار بوسنیا کا قیام؟ ریفرنڈم میں دیگر جماعتوں نے بھی حصہ لیا لیکن عوام کی بھاری اکثریت نے ''ڈیموکریٹک ایکشن پارٹی'' کا ساتھ دیا۔ اس طرح ۴ مارچ ۱۹۹۲ء کو بوسنیا کی یوگوسلاویہ سے علیحدگی اور آزاد مملکت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱۶ اپریل ۱۹۹۲ء کو اقوامِ متحدہ نے بوسنیا کو رکنیت دے دی۔ ۳۰ اپریل تک یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے ۲۷ ممالک بوسنیا کو تسلیم کر چکے تھے۔ آپ بوسنیا کے پہلے صدر منتخب کیے گئے۔ آپ ایک کتاب ''اسلام مشرق اور مغرب کے درمیان'' کے مصنف بھی ہیں۔ اس میں مغربی تہذیب کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے اور ان تباہ کاریوں کا ذکر کیا گیا ہے جو مغربی تہذیب کے پیروکاروں نے انجام دیں۔ سیّد قطب کے لٹریچر کے مطالعہ سے متاثر ہو کر تحریر کی گئی ہے۔ (۶۰)

بوسنیا میں جنگ پوری شدت کے ساتھ جاری ہے امریکہ اور یورپی برادری بوسنیا کو تین نسلی زبانوں میں تقسیم کر کے زبردستی کا حل مسلمانوں پر ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ اسی سلسلے میں لارڈ اوین اور سائرس وانس مشترکہ کوششیں کر رہے ہیں۔ عالیجاہ علی عزت بیگووچ کی نظریں اسلامی ممالک پر لگی ہوئی ہیں کہ وہ کب خوابِ

غفلت سے بیدار ہو کر اپنا تاریخی کردار ادا کریں گے؟ بوسنیا میں حالات اب اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ خدانہ کرے کسی بھی وقت کوئی بڑا حادثہ پیش آسکتا ہے۔ لیکن جو آدمی آخری وقت تک جہاد جاری رکھنے کی آرزو دل میں لیے ہوئے عزمِ صمیم کے ساتھ میدان میں ڈٹا ہوا ہے اور بار بار اپنے خدا کی طرف ہاتھ پھیلاتا ہے اور کہتا ہے کہ اے اللہ! تو ہمیں معاف کر دے۔ تو ہی ہماری مدد کرنے والا ہے، وہ ہے عالیجاہ علی عزت بیگو وچ۔ دو سال کی طویل اور تھکا دینے والی جنگ، نیشنل ڈپلومیسی کے مایوس کُن روّیے اور اقوامِ متحدہ کی منافقت کے باوجود اسے اُمید ہے کہ ضرور اللہ تبارک وتعالیٰ بوسنیا کے مظلوم اور بے بس مسلمانوں کی مدد کریں گے۔

# حواشی وحوالہ جات (باب پنجم)

(۱) افتخاراحمد، عالمی تحریکِ اسلامی کے عظیم قائدین، المیز ان پبلشرز، فیصل آباد، ۱۹۹۴ء، ص:۱۲۳

(۲) خلیل احمد حامدی، تحریکِ اسلامی کے عالمی اثرات، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص:۱۱۱

(۳) افتخاراحمد، اخوان المسلمون، المیز ان پبلشرز، فیصل آباد، ۱۹۹۰ء، ص:۱۵۲

(۴) ثروت صولت، ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، حصہ چہارم، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص:۱۳۵

(۵) خلیل احمد حامدی، اخوان المسلمون (تاریخ، دعوت، خدمات)، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۸۹ء، ص:۵۲

(۶) علامہ یوسف القرضاوی، اخوان المسلمون کا تربیتی نظام، ادارہ مطبوعات طلبہ، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص:۱۴۷

(۷) محمد حنیف، خطبات حسن البناء شہیدؒ، مکتبہ چراغ اسلام، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص:۶۳

(۸) افتخاراحمد، عالمی تحریکِ اسلامی کے عظیم قائدین، ص:۱۷

(۹) محمد حنیف، خطبات حسن البناء شہیدؒ، ص:۸۰

(۱۰) خلیل احمد حامدی، اخوان المسلمون (تاریخ، دعوت، خدمات)، ص:۲۷

(۱۱) ایضاً، ص:۹۵

(۱۲) افتخاراحمد، اخوان المسلمون، ص:۱۷۱

(۱۳) محمد حنیف، خطبات حسن البناء شہیدؒ، ص:۷۷

(۱۴) خلیل احمد حامدی، اخوان المسلمون (تاریخ، دعوت، خدمات)، ص:۸۳

(۱۵) ایضاً، ص:۹۸

(۱۶) محمد حنیف، خطبات حسن البناء شہیدؒ، ص:۱۰۳

(۱۷) افتخاراحمد، عالمی تحریکِ اسلامی کے عظیم قائدین، ص:۲۷

(۱۸) سلیل احمد حامدی، اخوان المسلمون (تاریخ، دعوت، خدمات)، ص:۹۱

(۱۹) ایضاً، ص:۴۳

(۲۰) انور السادات، تلاش خودی، مصر، ۱۹۶۰ء، ص:۳۵

(۲۱) ابوالحسن علی ندوی، تجدید احیائے اسلام، دارالندوہ، ۱۹۸۵ء، ص:۷۵

(۲۲) افتخار احمد، عالمی تحریکِ اسلامی کے عظیم قائدین، ص:۳۲

(۲۳) ایضاً، ص:۴۲

(۲۴) ثروت صولت، ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، حصہ چہارم، ص:۱۵۳

(۲۵) افتخار احمد، عالمی تحریکِ اسلامی کے عظیم قائدین، ص:۱۵۷

(۲۶) ایضاً، ص:۱۶۰

(۲۷) ایضاً، ص:۱۶۱

(۲۸) محمد شوقی ذکی، تحریک اخوان المسلمین، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص:۸۳

(۲۹) محمد شفیق ملک، عصر حاضر کی جہادی تحریکیں، نوید سحر پبلیکیشن، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص:۴۹

(۳۰) مریم جمیلہ، اسلام، ایک نظریہ ایک تحریک، سنت نگر لاہور، میٹرو پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص:۲۹۹

(۳۱) ایضاً، ص:۳۰۵

(۳۲) القرآن، (۴:۹۷)

(۳۳) ایضاً، (۲۲:۳۹-۴۰)

(۳۴) ایضاً، (۲ : ۱۹۰-۱۹۱)

(۳۵) ایضاً، (۴: ۷۵)

(۳۶) ایضاً، (۲: ۱۹۳)

(۳۷) ایضاً، (۹:۲۹)

(۳۸) محمد شفیق ملک، عصر حاضر کی جہادی تحریکیں، ص:۲۷

(۳۹) سیدابوالاعلیٰ مودودی، مسئلہ قومیت، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص:۲۵

(۴۰) سیّدابوالاعلیٰ مودودیؒ، اسلامی تہذیب اور اسکے اُصول ومبادی، اسلامک پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۹۵ء، ص:۷۷

(۴۱) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، المسلم پبلشرز اُردو بازار کراچی، ۱۹۹۴ء

(۴۲) سیّدمحمد سلیم، تاریخ نظریہ پاکستان، ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان، ۱۹۹۸ء، ص:۵۰

(۴۳) مریم جمیلہ، اسلام ایک نظریہ ایک تحریک، ص:۳۰۸

(۴۴) محمد شفیق ملک، عصر حاضر کی جہادی تحریکیں، ص:۱۲۰

(۴۵) ایضاً، ص:۱۲۵

(۴۶) خلیل احمد حامدی، اخوان المسلمون، تاریخ، دعوت جہاد، ص:۱۳۵

(۴۷) خلیل احمد حامدی، تحریک اسلامی کے عالمی اثرات، ص:۵۱

(۴۸) افتخار احمد، اخوان المسلمون، ص:۱۰۲

(۴۹) محمد شفیق ملک، عصر حاضر کی جہادی تحریکیں، ص:۵۳

(۵۰) افتخار احمد، عالمی تحریکِ اسلامی کے عظیم قائدین، ص:۹۸

(۵۱) ثروت صولت، ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ، حصہ چہارم، ص:۱۲۶

(۵۲) افتخار احمد، عالمی تحریکِ اسلامی کے عظیم قائدین، ص:۱۶۴

(۵۳) ایضاً، ص:۱۶۶

(۵۴) محمد شفیق ملک، عصر حاضر کی جہادی تحریکیں، ص:۴۲۲

(۵۵) افتخار احمد، عالمی تحریکِ اسلامی کے عظیم قائدین، ص:۱۷۲

(۵۶) عبیداللہ فہد فلاحی، جدید ترکی میں اسلامی بیداری، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص:۹۷

(۵۷) ایضاً، ص:۹۹

(۵۸) خلیل احمد حامدی، تحریک اسلامی کے عالمی اثرات، ص:۶۵

(۵۹) افتخار احمد، عالمی تحریکِ اسلامی کے عظیم قائدین، ص:۱۹۹

(۶۰) ایضاً، ص:۲۰۳

# ضمیمہ:۔تحریکات دیوبندوبریلوی اوران کے نامور قائدین کرام

## تحریک دیوبند

اترپردیش (بھارت) کے ایک مشہور اور دو ہزار سالہ قدیم قصبے دیو بند سے نسبت رکھنے والا۔ اکثر وبیشتر دیوبند میں واقع اسلامی دارالعلوم کے فارغ التحصیل علماء ان کے تلامذہ دیوبندی کہلاتے ہیں۔

دارالعلوم کی بنیاد 15 محرم 1883ھ/ 1867ء کو دیوبند کی ایک قدیم مسجد چھتا میں مشہور عالم دین مولانا محمد قاسم نانوتوی (1248ھ 1832ء۔۔۔۔1297ھ/1880ء) نے چند اہل فضل و تقویٰ بزرگوں کے تعاون اور مشورے سے رکھی تھی۔ جن میں مولانا فضل الرحمٰن عثمانی (علامہ شبیر احمد عثمانی کے والد)، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی اور حاجی عابد حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس درس گاہ کے پہلے مدرس ملا محمود دیوبندی، پہلے طالب علم مولانا محمود الحسن، پہلے صدر المدرسین مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور پہلے سرپرست مولانا محمد قاسم نانوتوی مقرر ہوئے۔

دارالعلوم کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے 1293ھ/ 1876ء میں رکھا۔ یہ درسگارہ درج ذیل مقاصد کے پیش نظر قائم کی گئی تھی۔ (1) آزادی ضمیر اور اعلائے کلمتہ الحق (2) مسلمانوں کو ایک جمہوری عوامی تنظیم میں پرونے کی جدوجہد کرنا (3) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مسلک کی حفاظت واشاعت (4) مسلم معاشرے سے خودغرضی اور استبداد کا خاتمہ (5) علوم دینی کا احیاء (6) علوم عقلیہ کی صحیح ترتیب (7) دین میں مہارت کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم کے تقاضے پورے کرنے والے علما تیار کرنا۔ درس گاہ کی مالی ضروریات کے سلسلے میں مولانا نانوتوی نے آٹھ اصول مقرر کیۓ جن کا مقصد یہ تھا کہ حکومت وقت اور امراء اغنیا کے تسلط سے درس گاہ آزاد رہے۔ دارالعلوم دیوبند کے نظم ونسق کے لئے ایک مجلس شوریٰ ہے۔ مجلس انتظامیہ ہے۔ ایک مہتمم (رئیس الجامعہ) ہے۔ شیخ الحدیث یا صدر

المدرسین کا منصب ممتاز اہل علم وتقویٰ کو ملتا ہے۔ یہاں علم صرف ونحو، ادب علم المعانی، منطق، فلسفہ، فقہ، اصول فقہ، حدیث، تفسیر، علم الفرائض، علم العقائد، علم الکلام، علم الطب، علم المناظرہ، علم ہیئت اور علم قرات و تجوید کے علاوہ فارسی زبان وادب اور ریاضی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ آٹھ سال کا نصاب ہے۔

اس درس گاہ میں دورہ حدیث کی بڑی شان اس میں دور دراز کے طالب علم مبادیات کی تکمیل کے بعد شریک ہوتے ہیں۔ تیرہویں صدی ہجری / انیسیوں صدی عیسوی کے دوران میں دہلی، لکھنؤ اور خیر آباد میں تین مختلف النوع دینی ادارے موجود تھے۔ دہلی کے ادارے تفسیر اور حدیث کی تعلیم پر زور دیتے تھے۔ لکھنؤ فقہ پر اور خیر آباد علم الکلام اور فلسفے کے لئے مخصوص تھا۔ دیوبند ان تینوں کے امتزاج کی نمائندگی کر رہا ہے۔ دیوبند میں بلاد اسلامیہ کے مختلف حصوں سے طلبہ آتے رہتے ہیں۔ درس گاہ میں پندرہ سو طلبا کے قیام کا بندوبست ہے۔ دارالعلوم کی عمارت ایک مسجد، ایک کتاب خانے اور حدیث، تفسیر اور فقہ وغیرہ کے متعدد درسی کمروں پر مشتمل ہے۔ دیوبند کے کتاب خانے کا شمار ہندوستان میں مخطوطات کے بڑے بڑے کتاب خانوں میں ہوتا ہے۔ اس میں ستر ہزار کتابیں موجود ہیں۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی تین واسطوں سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے شاگرد تھے۔ دیوبندی فقہی مذاہب میں سے امام ابو حنیفہؒ کے مقلد ہیں۔ قرآن وسنت پر سختی سے عمل پیرا ہونے کے علاوہ ان کا تصوف سے بھی گہرا تعلق ہے۔ اکثر علمائے دیوبند روحانی مسلک کے لحاظ سے حاجی امداد اللہ کے حلقہ ارادت میں شامل ہیں جو نقشبندی، چشتی، قادری اور سہروردی چاروں سلسلوں سے منسلک تھے۔ عقائد وعلم الکلام میں امام ابوالحسن اشعریؒ کے مقلد ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت وعظمت پر ایمان رکھتے ہیں۔ کثرت درود کو عین ثواب سمجھتے ہیں دین میں غلو اور انتہا پسندی کے بجائے اعتدال کے قائل اور عامتہ المسلمین کی تکفیر سے اجتناب واحتیاط لازم سمجھتے ہیں۔

دیوبند علمائے کرام نے تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ آزادی ہند کے لئے ریشمی رومال کی تحریک شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی نے منظم کی تھی تحریک خلافت میں بھی دیوبندیوں نے بڑا حصہ لیا۔

تحریک پاکستان کی جدوجہد میں دیوبندی دو حصوں میں منقسم تھے۔ ایک حصے نے قیام پاکستان کی مخالفت کی اور دوسرے حصے نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مفتی محمد شفیع وغیرہ نے مسلم لیگ کے مئوقف کی حمایت کی۔ قیام پاکستان کے بعد دیوبندی علماء کا علمی و روحانی مرکز بھارت میں رہ گیا، اس لئے پاکستان کے مختلف مقامات پر علمی مراکز قائم کئے گئے۔ جامعہ اشرفیہ لاہور، جامعہ مدینہ لاہور، مدرسہ عربی المدارس ملتان، دارالعلوم ٹنڈو اللہ یار خاں، دارالعلوم کھڈہ کراچی، دارالعلوم حقانیہ اکوڑخٹک پشاور کی درس گاہ ہیں دیوبندی مکتب فکر کی علمی یادگاروں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔(۱)

## اشرف علی تھانوی

(12 ربیع الاول 1280ء/ 19 مارچ 1863ء۔6 رجب 1362ھ/ 9 جولائی 1943ء)

اشرف علی بن عبدالحق فاروقی ممتاز عالم دین اور صوفی، ہندوستان میں تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) میں پیدا ہوئے۔ بعض روایات کے مطابق تاریخ پیدائش 5 ربیع الثانی ہے۔ بچپن ہی سے دینی علوم کی طرف مائل تھے۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی۔ حافظ حسین علی دہلوی سے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر تھانہ بھون آ کر مولانا فتح محمد سے عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ پھر پہنچ کر باقی نصاب کی تکمیل مولانا منفعت علی سے کی اور فارسی زبان میں پورا عبور حاصل کیا۔ 1295ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور 1301ھ / 1884 میں یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر کانپور کے مدرسہ فیض عالم میں تدریس کا کام شروع کیا۔ وہیں مدرسہ جامع العلوم قائم کیا۔ 1301ھ/ 1884 ہی میں حج بیت اللہ کیا۔ اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت کی۔ 1307ھ/ 1890ء میں دوبارہ حج کے لئے تشریف لے گئے اور کئی ماہ اپنے مرشد کی خدمت میں رہے۔ واپس لوٹنے کے چند سال بعد 1315ھ/ 1898ء میں عمر بھر کے لئے تھانہ بھون میں سکونت پذیر ہو گئے۔

اس گوشہ عافیت میں بھی طالبان ہدایت نے آپ کو تنہا نہ رہنے دیا۔ ہندوستان کے ہر گوشے سے لوگ پروانہ وار آتے اور اس چشمہ ہدایت سے فیض حاصل کرنے لگے۔ لوگوں کی آمد کا یہ عالم تھا کہ حکومت نے قصبہ تھانہ بھون کے لئے ایک مستقل ریلوے سٹیشن بنا دیا۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل آپ کو معدہ و جگر کی تکالیف نے عاجز کر رکھا تھا۔ آخری دنوں میں بھوک بالکل ختم ہوگئی اور اسی عالم میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ نے دو نکاح کئے تھے۔ جن سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ چنانچہ آپ کی تصانیف ہی آپ کا وہ قیمتی ورثہ سمجھی جاتی ہیں جس سے ہر مسلمان استفادہ کر رہا ہے۔

مولانا کو حکیم الامت اور مجدد الملت کے القابات سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کے علمی و دینی فیوض و برکات متنوع ہیں۔ وہ قرآن پاک کے مترجم ہیں، مجدد ہیں، مفسر ہیں، علوم و حکم کے شارح ہیں۔ اس کے شکوک و شبہات کے جواب دینے والے ہیں۔ وہ محدث تھے فقیہہ تھے، خطیب تھے اور شریعت و طریقت کے مجادلہ کا خاتمہ کرنے والے تھے وہ مصلح امت تھے۔ ان کی تصانیف میں خواص کے لئے ''تفسیر بیان القرآن'' اور ''شرح مثنوی مولانا روم'' اور عورتوں کے لئے ''بہشتی زیور'' ایسی گراں بہا ہیں جو اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے اردو کے اسلامی ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

مولانا کی تصانیف کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے۔ 1354ھ/ 1939ء میں ان کے ایک خادم مولوی عبد الحق فتح پوری نے ان کی تصانیف کی ایک فہرست شائع کی تھی۔ جو بڑی تقطیع کے 86 صفحات کو محیط ہے۔ تصانیف کی تعداد کے لحاظ سے وہ امام ابن جریر طبری، امام فخر الدین رازی، حافظ ابن جوزی اور حافظ جلال الدین سیوطی کے زمرے میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔

مولانا کی بیشتر کتب اردو زبان میں ہیں۔ البتہ تیرہ یا چودہ رسائل و کتب عربی اور تین فارسی زبان میں ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں ''سبق الغایات فی نسق'' انوار الوجود'' التجلی العظیم'' ''حواشی تفسیر بیان القرآن'' تصویر المقطعات'' التلخیصات العشر'' مائۃ دروس الخطب الماثورہ'' ''سبع سیارہ'' زیادات'' جامع الاثار'' ''تائید الحقیقہ'' خطبات الاحکام'' اور تین فارسی میں یہ ہیں۔ ''مثنوی زیر و بم'' ''تعلیقات فارسی''

''عقائد بانی کالج''۔ان میں سے نظم میں مولانا کی تصنیف صرف مثنوی ہے' جو طالب علمی کے زمانے میں لکھی۔

تجوید وقرآت ومتعلقات کے ضمن میں مولانا نے حسب ذیل تصانیف فرمائیں۔''جمال القرآن'' ''تجوید القرآن''''رفع الخلاف فی حکم الاوقاف''''زیادات علی کتب الروایات''''لمافی الروایات''''یاد گار حق القرآن''''متشابہات القرآن''''تراویح رمضان''''آداب القرآن''''وجود المثانی''''تنشیط الطبع فی اجراء السبع''

مولانا کا سب سے بڑا علمی کارنامہ قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔یہ تفسیر بارہ جلدوں میں اڑھائی سال میں مکمل ہوئی اور پہلی مرتبہ 1334ھ/1916ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔اضافے اور نظر ثانی کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن 1353ھ/ 1935ء میں تھانہ بھون سے شائع ہوا۔اس کے بعد سے اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہوتے رہے ہیں۔اس تفسیر کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ سلیس و بامحاورہ اور حتی الوسع تحت اللفظ ترجمہ ہے'اور نیچے آیت کی تفسیر، جس میں روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے۔فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح بھی کی گئی ہے۔لغات اور نحوی تراکیب کی تحقیق کی گئی ہے۔شبہات اور شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے۔صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کئے گے ہیں تمام کتب تفسیر کو سامنے رکھ کر ان میں سے کسی قوم کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ماخذوں میں غالبا سب سے زیادہ آلوسی بغدادیؒ کی تفسیر ''روح المعانی'' پر اعتماد کیا گیا ہے۔

عورتوں کی ضروریات کے لے اسلامی معلومات کا مکمل خزینہ ''بہشتی زیور'' کے نام سے دس جلدوں میں شائع ہوا ہے۔بعد میں گیارہویں جلد ''بہشتی گوہر'' کے نام سے مردوں کے لئے لکھی۔یہ کتاب کئی بار پاکستان اور ہندوستان میں طبع ہو چکی ہے اور اب بھی اس کی مانگ بہت ہے۔

مولانا کے فتاوے کا ایک مجموعہ بھی گیارہ جلدون میں شائع ہوا۔دیگر بے شمار کتب تفسیر، احادیث، منطق، کلام، عقائد اور تصوف پر ہیں۔مسلمانوں کی اصلاح وتربیت کے لئے بھی آپ نے بے شمار کتب

تحریر کیں۔ ان میں ''اصلاح الرسوم'' ''صفائی معاملات'' ''اصلاح امت'' اور ''حیات المسلمین'' اہم ہیں۔(۲)

## مفتی محمد شفیع

(20-21 شعبان/ 1314ء) دیو بند ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ خاندانی اعتبار سے عثمانی تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا محمد یاسین، چچا مولانا منظور احمد اور حافظ محمد عظیم سے حاصل کی۔ دارالعلوم دیو بند میں اکابر علماء علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا سید اصغر حسین سے استفادہ کیا اور علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ 1335ھ میں بیس سال کی عمر میں تمام علوم وفنون سے فارغ ہو کر دار العلوم دیو بند میں مدرس اور نائب مفتی کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ جلد ہی آپ دار الافتاء دیو بند کے نگران ہوئے۔

1362ھ تک یعنی 25/26 سال دارلعلوم دیو بند جیسے شہرہ آفاق دینی مرکز کے مفتی رہے۔ اس طویل مدت کے دوران آپ نے مختلف مسائل پر بڑے اہم فتاوے دیے جو لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور ان کا انتخاب کئی ضخیم جلدوں میں فتاوی دار العلوم دیو بند، عزیز الفتاوی اور دوسرے ناموں سے شائع ہو چکا ہے اور کچھ حصہ غیر مطبوعہ ہے۔

ابتداء میں باطنی تعلق شیخ الہند مولانا محمد حسنؒ سے قائم رہا۔ ان کی وفات کے بعد 1346ھ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ 1349ھ میں مجاز بیعت قرار پائے۔ مفتی محمد شفیع، مولانا اشرف علی تھانوی کے علمی، روحانی اور سیاسی جانشین تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں ایک عظیم دینی درس گاہ 'دارلعلوم' کی بنیاد رکھی۔ جہاں سے اب تک ہزاروں طالب علم کسب فیض حاصل کرنے کے بعد اندرون وبیرون ملک دینی اور علمی خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔

درس وتدریس اور خدمت افتاء کے علاوہ قرآن وحدیث، فقہی مسائل اور تصوف واصلاح کے اہم

موضوعات پر بے شمار علمی اور دینی تصانیف مرتب فرمائیں جن کی تعداد 200 سے زائد ہے۔ آپ کی تصانیف میں ''معارف القرآن'' کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ یہ تفسیر 8 جلدوں پر مشتمل ہے۔

حضرت مفتی صاحب نے تحریک پاکستان میں اور قیام پاکستان کے بعد بھی اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں۔ آپ نے تحریک قیام پاکستان میں اپنے شیخ' مولانا اشرف علی تھانوی کے ایماء پر حصول پاکستان کی تاریخی جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی کی معیت میں مسلم لیگ کی حمایت میں پورے ہندوستان کے دورے کیئے۔ مطالبہ پاکستان کی حمایت میں کانگرس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی حیثیت میں فتوی دیا' جس میں کانگرس میں شمولیت کو کفر کی حمایت قرار دیا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کی طلبی پر دیوبند سے کراچی منتقل ہوئے اور یہاں آکر ملک میں اسلامی دستور اور دینی تعلیم کے فروغ میں مصروف ہوگئے۔ قرار داد مقاصد کی ترتیب و تدوین اور اس کی منظوری میں آپ کا بڑا حصہ ہے۔ 1949ء میں اسلامی مشاورتی بورڈ کے رکن نامزد ہوئے جس کے صدر علامہ سید سلیمان ندویؒ تھے۔ علامہ سید ندویؒ اور شیخ اسلام شبیر احمد عثمانیؒ کے انتقال کے بعد اسلامی مشاورتی بورڈ کے صدر اور مرکزی جمعیت علمائے اسلام کی صدرات کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ 1950ء میں لاء کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔ 1951ء میں کراچی میں منعقدہ جید علماء کرام کے اجتماع میں 32 نکات پر مشتمل دستوری تجاویز کی ترتیب و تدوین میں نمایاں کردار ادا کیا۔ 1953ء کی تحریک ختم نبوت میں بھی عوام کے جذبات کی صحیح رہنمائی کی۔ غرض یکہ کہ دینی اور سیاسی محاذوں پر آپ کی خدمات قابل قدر رہیں۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے صاجزادے مولانا رفیع عثمانی صاحب دارالعلوم کراچی کے مفتی ہیں۔ دوسرے صاجزارے مولانا تقی عثمانی دارالعلوم میں تدریسی خدمات کے علاوہ دارالعلوم کے رسالہ ''البلاغ'' کے مدیر ہیں۔ اس کے علاوہ 1977ء میں قائم شدہ اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن رہے ان کا شمار اس دور کے ذہین علماء میں ہوتا ہے۔

## بریلوی تحریک

برعظیم پاکستان و بھارت میں اہلسنت کے ایک گروہ کی تحریک جو اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی سے منسوب ہے اور جس کا آغاز بریلی شہر سے ہوا۔ اس گروہ کو "حزب الاحناف" بھی کہا جاتا ہے۔ اعلیٰ حضرت بریلوی کے یہ پیروکار اگرچہ الگ فرقے کی حیثیت نہیں رکھتے۔ لیکن بعض مسائل میں دوسرے مسالک سے اختلاف کی بناء پر ان کا الگ تشخص قائم ہوگیا یہ اسلاف میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خیالات سے متفق ہیں اور محمد بن عبدالوہاب نجدی، شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسماعیل شہید کے بعض افکار کے خلاف ہیں۔ مسلک کے لحاظ سے یہ حنفی اور بنیادی طور پر وہابی اور دیوبندی مسلک کے ردعمل کے طور پر ایک تحریک کی صورت میں رونما ہوئے ہیں۔

بریلوی تحریک کا آغاز "جامعہ منظر الاسلام" بریلی سے ہوا۔ جس کی بنیاد اعلیٰ حضرت نے ڈالی تھی۔ بریلی کے بعد اس تحریک کا دوسرا بڑا مرکز مرادآباد تھا۔ جہاں 1328ھ / 1910ء میں شیخ محمد نعیم الدین مرادآبادی نے "دارالعلوم نعیمیہ" کے نام سے ایک دینی درسگاہ قائم کی۔

صحیح معنوں میں بریلوی تحریک کا آغاز 1339ھ / 1920 سے ہوتا ہے جب گاندھی جی نے تحریک ترک موالات کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کی داغ بیل ڈالی۔ اعلیٰ حضرت نے اس سے اختلاف کیا اور مسلمانوں کے اتحاد کے مضمرات سے آگاہ کیا۔ ان کے معتقدین نے "جماعت رضائے مصطفیٰ" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور اس کے بعد آل انڈیا سنی کانفرنس" نام سے دوسری تنظیم قائم کی گئی۔ جس کا دوسرا نام "جمہوریت اسلامیہ مرکزیہ" رکھا گیا۔

1359ھ / 1940ء میں قرارداد پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی بریلوی تحریک اپنے زوروں پر آگئی۔ چنانچہ 1366ھ / **1946**ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس کا چار روزہ اجلاس (27 تا 30 اپریل) بنارس میں منعقد ہوا۔ اس میں متفقہ طور پر مطالبہ پاکستان کی حمایت کی گئی۔

سیاسی محاذ سے قطع نظر بریلوی تحریک کا تشخص بطور مسلک بھی کیا جاتا ہے آزاد خیال، فطرت پسند

اور سائنٹیفک طرز فکر بریلوی حضرات کے نزدیک مردود ہے۔ خصوصاً وہ ندوۃ العلماءٔ دیوبند اور علی گڑھ جیسی تحریکوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہابی، نجدی اور دیوبندی ایک ہی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ انہیں اہل سنت سے نہیں گردانتے اور اکثر اوقات ان عقائد کے حامل افراد پر فتوی کفر بھی صادر کیا گیا ہے۔

برعظیم پاکستان و بھارت میں ان کی سینکڑوں درسگاہیں ہیں۔ جن میں سے اکثر اعلیٰ حضرت کے خلفاء کے ناموں سے منسوب ہیں۔ لاہور میں جامعہ نظامیہ رضویہ جامعہ نعیمیہ اور دار العلوم انجمن حزب الاحناف، کراچی میں دار العلوم امجدیہ اور جامعہ تبلیغیہ، ملتان میں مدرسہ انوار العلوم، فیصل آباد میں مدرسہ منظر الاسلام قابل ذکر ہیں۔

بریلوی عقائدے سے دیگر مسلمان اختلاف رکھتے ہیں۔ خصوصاً دیوبندی عقائد کی رو سے یہ بدعتیں ہیں اور قابل مذمت ہیں۔ جبکہ بریلوی حضرات کے نزدیک یہ ایمان کا جزو اور عین اسلام ہیں۔ عقائد میں بریلوی تقلید کے قائل ہیں اور ان کے نزیدیک عقائد صرف وہی ہوسکتے ہیں، جو قدیم مجتہدین نے وضع کئے تھے۔ غیر مجتہد پر تقلید واجب ہے۔ مجتہد امام کہلاتا ہے۔ ان کے نزدیک عقائد کے لحاظ سے حنفی ' شافعی' مالکی اور حنبلی مسالک ایک ہیں۔ ان میں صرف فروعی مسائل میں اختلاف سے ہے۔

بریلوی عقائد میں توحید سے مراد اللہ تعالیٰ کو ایک جاننا اور اس کے محبوب پیغمبر آخر الزمان آنحضورؐ صلعم کی عزت وعظمت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم بالذات ہے اس کے بتائے بغیر کسی کو ایک حرف کا علم بھی نہیں ہوسکتا۔ اس کا علم اس کی صفت ہے اور واجھ ہے۔ وہ ہر ترکیب زمان ومکان اور ہر عیب سے پاک ہے وہ ہر چیز کا ہمیشہ سے جاننے والا ہے۔ اس کا علم واجب اور قدیم ہے۔

انبیائے کرام رب کا آئینہ ہیں۔ آواز اور زبان ان کی وحی ہے اور کلام رب کا ہوتا ہے۔ عام انبیاء مرد اور بشر تھے۔ جن فرشتہ' عورت وغیرہ نبی نہیں ہوتے۔ نیز نبی ہمیشہ اعلیٰ خاندان سے عالی نسب ہوتا ہے اور نہایت عمدہ اخلاق کا مالک ہوتا ہے۔ نبی معصوم ہوتا ہے۔ اس سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ نبوت

آنحضورؐ آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد نبوت کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکتا ... اپنی عبادات اور اعمال سے نبوت کا درجہ نہیں پا سکتا۔

آنحضورؐ انسانوں میں سے بشر ظاہری تھے۔ مگر مظہر نور خدا تھے۔ اس لئے آپؐ کو بشر کہنا یا بھائی یا برابری کے لقب سے پکارنا حرام ہے۔ آپؐ بشر ظاہری تھے۔ اور یہ بشریت دوسروں سے مختلف تھی۔ آپؐ کے جسم مبارک کا سایہ تک نہ تھا۔ اور آپؐ کے پسینے سے خوشبو آتی تھی۔ آپؐ کو پانچ غیبوں کی جزئیات کا علم دیا گیا تھا۔

آپؐ کا علم ساری خلقت سے زیادہ ہے۔ آپؐ کو حقیقت روح اور متشابہات قرآن کا بھی علم عطا ہوا تھا۔ نیز آپؐ کو لوح محفوظ پر لکھے ہوئے تمام واقعات کا بھی علم تھا۔ آپؐ تمام مخلوق الٰہی میں بڑے عالم ہیں۔ آپؐ کے کسی وصف پاک کو ادنے چیزوں سے تشبیہہ دینا یا ان کے برابر بتانا صریح توہین ہے اور یہ کفر ہے۔ آنحضورؐ ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں۔ روز قیامت آپؐ شفاعت کریں گے۔ نیز اس دنیا میں بھی آپؐ مسلمانوں کی مدد کو پہنچتے ہیں۔ آپؐ سے مدد مانگنا اور یا رسول اللہ کا نعرہ لگانا جائز ہے۔

اولیائے کرام نور خدا سے دیکھتے ہیں۔ انہیں بالواسطہ انبیائے کرام سے کچھ علوم غیب ملتے ہیں۔ وہ درجے میں نبوت سے کم ہوتے ہیں۔ لیکن ان سے بھی معجزات اور کرامات کا ظہور ہوتا ہے۔ ان کی کرامات موت کے بعد بھی بدستور رہتی ہیں۔ وہ بھی حاضر و ناظر ہوتے ہیں اور ان سے بھی مدد مانگی جاتی ہے۔ اگرچہ حقیقی مدد خدا سے مانگی جاتی ہے لیکن اولیاء انہی کے مظہر ہیں اور مدد مانگتے ہوئے انہیں وسیلہ بنایا جاتا ہے۔

صوفیاء اور اولیاء امت کے ستون ہوتے ہیں۔ چالیس ابدال ہر وقت دنیا میں موجود ہوتے ہیں جو آفتوں کو ٹالتے رہتے ہیں۔ ان کے ذریعے خلق کی حیات روزی اور تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں۔

بدعت دو طرح کی ہوتی ہیں۔ بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ۔ بدعت حسنہ کی تین اقسام جائز، مستحب اور واجب ہیں۔ اسی طرح بدعت سیئہ کی دو اقسام ہیں۔ مکروہ اور حرام مثلاً فجر کی نماز کے بعد مصافحہ

کرنا اور عمدہ عمدہ کھانوں میں وسعت کرنا جائز ہے۔ مسافر خانوں اور مدرسوں کا بنانا مستحب ہے۔ علم نحو کا سیکھنا اور اصول فقہ کا جمع کرنا واجب ہے اور مسجدوں کو فخر یہ زینت دینا مکروہ اور جبر یہ مذہب اختیار کرنا حرام ہے۔

بریلویوں کے نزدیک جائز امور میں بلند آواز سے درود شریف پڑھنا یا ذکر کرنا اولیاء اللہ کے مزاروں پر حاضری دینا، نیاز دینا، ان سے مدد مانگنا، ایصال ثواب کرنا بدنی اور مالی عبادات دوسرے مسلمانوں کو بخشنا، فاتحہ، تیجہ، چالیسواں وغیرہ کرنا۔

میت کے لئے دعا کرنا، خواہ جنازہ سے پہلے ہو یا تدفین کے بعد ہو۔ جنازے کے آگے کلمہ طیبہ یا درود شریف پڑھنا' میت کے ساتھ بزرگان دین کے تبرکات غلاف کعبہ، شجرہ یا عہدنامہ رکھنا' تدفین کے بعد اذان دینا۔ پختہ قبر بنانا اولیاء اور مشائخ کے مزار بنانا' قبروں پر پھول چڑھانا اور چراغ جلانا۔

اولیاء اللہ کے نام پر جانور پالنا، عبد النبی یا عبد الرسول وغیرہ نام رکھنا، اچھے اچھے کھانوں پر ختم دلانا اور گیارہویں شریف وغیرہ کا ختم دلانا شامل ہیں۔

مستحب امور میں محفل میلاد منعقد کرنا' ولادت پاکؐ کی خوشی منانا' اس کے ذکر کے موقع پر خوشبو لگانا' گلاب چھڑکنا' شیرینی تقسیم کرنا' غرضیکہ خوشی کا اظہار کرنا' اور اولیاء اللہ کے ہاتھ پاؤں چومنا' ان کے تبرکات' لباس اور بال وغیرہ کو بوسہ دینا' اور ان کی تعظیم کرنا' مؤذن کے اشھد ان محمد الرسول اللہ کہنے پر سننے والوں کا دونوں انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگانا شامل ہیں۔

یہ عقائد صرف بریلوی تحریک ہی کی وجہ سے ظہور پذیر نہیں ہوئے بلکہ عامتہ الناس میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ بریلوی مکتب فکر نے اسے جلا بخشی اور تقویت عطا کی۔ (۴)

## احمد رضا خان، فاضل بریلوی

احمد (10 شوال 1272ھ/14 جون، 1856ء، 25 صفر 1340ھ/28 اکتوبر 1921ء)

رضا خاں بریلوی قادری بن مولانا نقی علی خان بن مولانا رضا علی خاں بن مولانا حافظ کاظم علی خاں بن مولانا شاہ محمد اعظم خاں، ہندوستان کے بہت بڑے عالم دین متبحر فاضل، بلند پایہ صوفی اور شاعر تھے۔ بریلی (اتر پردیش) کے محلّہ جسولی میں پیدا ہوئے۔ محمد نام رکھا گیا۔ تاریخی نام المختار (1272ھ) تجویز ہوا۔ دادا نے احمد رضا نام رکھا، جس میں خود مولانا نے عبدالمصطفٰے کا اضافہ کیا۔ ان کے معتقدین ''انہیں اعلیٰ حضرت اور ''فاضل بریلوی'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مولانا کا خاندان افغانستان کے قبلہ بڑہیچ سے تعلق رکھتا تھا، جو کئی پشتوں تک حکومت مغلیہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ مولانا محمد اعظم خاں امور سلطنت سے علیحدہ ہو کر بریلی تشریف لائے اور وہیں اقامت اختیار کی۔ مولانا شاہ رضا علی اپنے دور کے بے مثل عالم اور ولی کامل تھے۔ اسی مذہبی فضا اور پر تقدس ماحول میں اعلیٰ حضرت نے چار پانچ برس کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ ختم کرلیا۔ اردو فارسی کی کتابیں پڑھنے کے بعد میزان منشعب وغیرہ کی تعلیم جناب مرزا غلام قادر بیگ سے حاصل کی، پھر تمام دینیات کی تعلیم اپنے والد ماجد سے مکمل کی۔ 14 شعبان 1286ھ /19 نومبر 1869ء میں تمام علوم دینیہ وعقلیہ مثلاً اصول، کلام، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، منطق اور فلسفہ وغیرہ کی سند حاصل کر کے منصب افتاء پر فائز ہوئے۔

1295ھ/1877ء میں حضرت شاہ آل رسول مارہروی سے سلسلہ قادریہ میں بیعت ہوئے۔ دیگر سلاسل مثلاً چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ، علویہ وغیرہ میں دوسرے مشائخ سے اجازت حاصل کی۔ علاوہ ازیں انہوں نے شیخ احمد بن زینی، شیخ عبدالرحمٰن مکی، دحلان مکی، شیخ حسین بن صالح مکی اور شیخ ابوالحسن احمد النوری سے بھی استفادہ کیا۔ آپ نے بعض علوم میں معاصرین علماء سے اور بعض میں ذاتی مطالعے اور غور و فکر سے کمال پیدا کیا۔ خصوصاً علم ریاضی اور علم نجوم وہیئت میں ذاتی مطالعے سے دسترس حاصل کی۔

1296ھ/1878ء میں اعلیٰ حضرت اپنے والد ماجد کے ہمراہ پہلی بار حج بیت اللہ کیلئے تشریف لے گئے۔ قیام مکہ کے دوران میں شافعی عالم شیخ حسین بن صالح ان سے بے حد متاثر ہوئے اور حسین و تکریم کی۔ اعلیٰ حضرت نے ان کی کتاب ''الجوہرہ'' کی شرح صرف دو روز میں ''الطرۃ الرضیہ فی النیرہ

الوضیۃ'' کے نام سے لکھ دی۔ 1322ھ/1905ء میں دوبارہ زیارت حرمین شریفین کیلئے گئے۔ اس بار وہاں کے علماء کے لئے نوٹ کے ایک مسئلے کا حل ''کفیل الفقیہ'' کے نام سے تحریر فرمایا۔ اس کے علاوہ ایک اور تالیف ''الدولہ المکیہ'' بھی لکھی۔ اس میں مسئلہ غیب پر محققانہ بحث ہے۔ انہی تصانیف کی بنا پر بعض علمائے حرمین نے آپ کو ''مجدد امت'' لکھا ہے۔

اعلیٰ حضرت نے تمام عمر فتوی نویسی، فقہ، نعت گوئی اور علم ریاضی میں تصنیف و تالیف پر صرف کی۔ آپ کی عمر کے آخری دور میں سیاست نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ 1338ھ/ 1919ء میں تحریک خلافت کا آغاز ہوا۔ عین اسی وقت گاندھی جی نے مسلم ہندو اتحاد کا راگ الاپنا شروع کیا اور 1339ھ/ 1920ء میں تحریک ترک موالات کا آغاز کر دیا۔ یہ آپ ہی کی ذات گرامی تھی جس نے بروقت مسلمانوں کو ہندو چال سے آگاہ کیا اور اتحاد کے مضمرات سے آگاہ کیا۔ بعد کے حالات نے اس بات کا ثبوت مہیا کر دیا کہ ہندوستان میں ایک نہیں بلکہ دو قومیں بستی ہیں آپ کے معتقدین نے جماعت رضائے مصطفیٰ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ جس کے بعد آل انڈیا سنی کانفرنس کے نام سے دوسری تنظیم قائم کی گئی۔ اس کا دوسرا نام جمہوریت اسلامیہ مرکزیہ رکھا گیا۔ جماعت رضائے مصطفےٰ کے اراکین نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے دن رات کام کرنا شروع کیا۔ اس کے بانی مولانا نعیم الدین مراد آبادی تھے۔

اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی نے بریلی شریف میں ''جامعہ منظر الاسلام'' کی بناء ڈالی تھی۔ جہاں سے آپ کے خلفاء تربیت پا کر جاتے تھے۔ آپ کے خلفاء دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ صرف حرمین میں آپ کے خلفاء کی تعداد بتیس تھی۔ ان میں سید عبدالحی، شیخ حسین جمال مکی، سید اسماعیل خلیل مکی، سید مصطفےٰ خلیل مکی، ضیاء الدین احمد مدنی وغیرہ پاک ہند میں حامد رضا خان، سید محمد عبدالسلام، مولانا محمد ظفر الدین بہاری، محمد امجد علی اعظمی، سید نعیم الدین مراد آبادی، سید احمد اشرف گیلانی، محمد دیدار علی الوری، مولانا مفتی غلام جان ہزاروی، مولانا ابوالبرکات سید احمد قادری مولانا عبدالعلیم میرٹھی وغیرہ اہم ہیں۔

آپ کے تلامذہ میں مولانا حسن رضا خاں، مولانا حامد رضا خاں، مولانا محمد رضا خاں، مولانا سید

احمد اشرف کچھوچھوی، مولانا عبدالرشید عظیم آبادی، مولانا شاہ غلام محمد بہاری، مولانا ظفر الدین بہاری، مولوی امجد علی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اعلیٰ حضرت کے دو فرزند تھے۔ حامد رضا خاں اور مصطفیٰ ارضا خاں۔ آپ کا مزار بریلی شریف کے محلّہ سوداگران میں ''دارالعلوم منظر الاسلام'' کی شمالی سمت میں واقع ہے۔ جہاں ہر سال 24-25 صفر کو عرس منعقد ہوتا ہے۔

مولانا نے پچاس سے زائد علوم وفنون میں تقریباً ایک ہزار کتابیں لکھیں۔ ''تذکرہ علمائے ہند'' میں ان کی تصانیف کا تفصیلی ذکر ہے۔ ان میں سے ''فتاویٰ رضویہ'' بارہ ضخیم جلدوں میں ''کنزالایمان فی ترجمہ القرآن'' ''قرآن کریم کا سلیس اور رواں ترجمہ اور ''جدالختار'' علامہ ابن عابد بن شامی کی کتاب ''ردالمختار'' کا پانچ مبسوط جلدوں میں عربی حاشیہ نہایت اہم ہیں۔

اعلیٰ حضرت بچپن ہی سے تقوی، طہار، اتباء سنت، پاکیزہ اخلاق اور حسن سیرت کے اوصاف سے مزین ہو چکے تھے۔ صرف تیرہ چودہ برس کی عمر میں آپ جلیل الشان عالم عظیم المرتبت فاضل ہو چکے تھے۔ اور پھر چون برس تک مسلسل دینی اور علمی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کے سب کام حب الہی کے ماتحت تھے۔ نہ کسی کی تعریف کرتے نہ کسی کی ملامت کا خوف کھاتے۔ آپ کے خادم کا بیان ہے کہ اعلیٰ حضرت چوبیس گھنٹے میں صرف ڈیڑھ دو گھنٹے آرام فرماتے اور باقی تمام وقت تصنیف و کتب بینی اور دیگر خدمات دینیہ میں صرف فرماتے۔ علامہ اقبال آپ کے ہم عصر تھے اور آپ کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ ہندوستان کے دور آخر میں ان جیسا طباع اور ذہن فقیہ پیدا نہیں ہوا۔ ان کے فتاویٰ، ان کی ذہانت، فطانت، کمال فقاہت اور علوم دینیہ میں تبحر علمی کے شاہد عادل ہیں۔ ان کی طبیعت میں شدت زیادہ تھی۔ اگر یہ چیز درمیان میں نہ ہوتی تو مولانا احمد رضا خاں اپنے دور کے امام ابوحنیفہ ہوتے''۔

علوم دینیہ کے فاضل ہونے کے ساتھ شعر وسخن کا ذوق بھی رکھتے تھے لیکن ان کا ذوقِ سلیم حمد و ثناء

اور نعت ومنقبت کے علاوہ اور کسی صنف سخن کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ ان کے کلام میں عالمانہ وقار ہے۔ قرآن وحدیث کی ترجمان ہے۔ سوز وساز اور کیف وسرور ہے۔ آپ کے مشہور زمانہ سلام کی گونج پاک و ہند کے کسی بھی گوشے سے سنی جا سکتی ہے۔

مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام

شمع بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

ان کے بعض مخالفین کا یہ خیال ہے کہ احمد رضا خاں نے دین اسلام میں کسی نئے فرقے کی بنیاد ڈالی ہے۔ یہ بات کسی بھی طور حقیقت پر مبنی نہیں۔ انہوں نے صرف مسالک اربعہ کے تحفظ کی کوشش کی تھی۔ البتہ یہ درست ہے کہ علماء کی اس جماعت کو عرف عام میں رضا خاں بریلوی سے عقیدت کی بناء پر بریلوی کہا جاتا ہے اور دوسروں سے بعض مسائل میں اختلاف کی بناء پر ان کا الگ تشخص قائم ہو گیا ہے۔ انہوں نے تحفظ اقدار اسلامیہ کے لئے بریلی سے جو تحریک شروع کی۔ اسے بریلوی تحریک کا نام دیا گیا ہے۔

## علمی خدمات

فضلِ ربانی وفیضِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ پر عنایت کی خصوصی نگاہ ڈالی جس کے نتیجہ میں آپ نے کسی استاذ سے پڑھے بغیر محض خداداد بصیرت نورانی سے حسبِ ذیل علوم وفنون میں دسترس حاصل کی ہے اور ان کے شیخ وامام ہوئے۔

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔قرات | ۲۔تجوید | ۳۔تصوف |
| ۴۔سلوک | ۵۔علمِ الاخلاق | ۶۔اسماءالرجال |
| ۷۔تفسیر | ۸۔تواریخ | ۹۔لُغت |
| ۱۰۔ادب معہ جملہ فنون | ۱۱۔ارثماطیقی | ۱۲۔جبر ومقابلہ |
| ۱۳۔حساب ستینی | ۱۴۔لغارثمات (لوگارثم) | ۱۵۔علم التوقیت |

۱۶۔علم الاکر ۱۷۔ایجات ۱۸۔مثلث کردی

۱۹۔مثلث مسطح ۲۰۔ہیئت جدیدہ (انگریزی فلسفہ) ۲۱۔مربعات

۲۲۔منتہی علم جفر ۲۳۔علم زائچہ ۲۴۔علمِ فرائض

۲۵۔نظمِ عربی ۲۶۔نظم فارسی ۲۷۔نظم ہندی

۲۸۔انشاءنثر عربی ۲۹۔انشاءنثر فارسی ۳۰۔انشاءنثر ہندی

۳۱۔خطِ نسخ ۳۲۔خطِ نستعلیق ۳۳۔منتہی علمِ حساب

۳۴۔منتہی علم ہیئت ۳۵۔منتہی علمِ ہندسہ ۳۶۔منتہی علمِ تکسیر

۳۷۔علمِ رسم خط قرآن مجید (۵)

آپ نے شانِ رسالت فضائل ومناقب اور عقائد پر ۶۲ کتابیں تحریر فرمائیں حدیث اور اصول حدیث پر ۱۳ کتب، علمِ کلام اور مناظرہ پر ۳۵ کتب، فقہ اور اصولِ فقہ پر ۱۵۹ کتب اور متفرق باطل فرقوں کے رد میں ۴۰۰ سے زائد کتابیں لکھ کر شاتمانِ رسالت کی زبانوں کو بند کر دیا اور ہر سمت نعرہ رسالت سے گونج اُٹھی۔اس قدر تصانیف کے علمی سرمایہ کے علاوہ آپ کا فقہی شاہکار ''فتاویٰ رضویہ'' ہے جس کا پورا نام ''العطایه النبویه فی الفتاویٰ رضویه'' ہے جو تقریباً ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہے۔جن میں سے اب تک پانچ چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔تاریخ الفتاویٰ میں یہ مجموعہ امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے انتہا علوم وفنون سے نوازا تھا آپ کا سینہ جمیع علوم کا گنجینہ تھا۔آپ نے تقریباً ۵۰ علوم وفنون پر ایک ہزار سے زائد کتب ورسائل تصنیف فرمائے یوں تو آپ کے علمی کارناموں کی تفصیل بہت طویل ہے لیکن ان میں سب سے بڑا علمی کارنامہ ترجمہ قرآن مجید ہے۔ترجمہ کیا ہے قرآنِ حکیم کی اردو میں ترجمانی بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ آپ کا یہ ترجمہ الہامی ترجمہ ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا آپ کا ترجمہ ''کنزالایمان'' دیگر دستیاب ترجموں میں ایک منفرد شان اور اہمیت رکھتا ہے۔

## درس وتدریس

اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے جب بریلی شریف میں درسگاہ کی بنیاد رکھی اس وقت علاقے کے تمام مدارس جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی نذر ہو چکے تھے تشنگانِ علم کے لئے ضروری تھا کہ کوئی مشربِ تدریس نظر آئے چنانچہ آپ نے بریلی شریف میں علوم دینیمیہ کی عظیم درسگاہ ''مصباح التہذیب'' کو زینت بخشی جو آج بھی منظرِ اسلام کے نام سے قائم ہے جب آپ کے فضل وکمال کا شہرہ ہوا تو برصغیر پاک و ہند کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک سے طلباء اس گلستانِ علوم میں پہنچ کر اپنے دل وروح کو مہکانے لگے اور علوم وفنون کے پیکر بن کر اکناف واطراف میں علم سے دوسروں کو منور کرنے کیلئے پھیل گئے۔ آپ کے شاگردوں کی درست تعداد معلوم نہیں کی جاسکتی۔ (۶)

## امام احمد رضا خان کا دوقومی نظریہ اور سیاسی افکار

۲۰۔ ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات شروع ہوئی پہلی تحریک کا مقصد سلطنت عثمانیہ ترکی کی حفاظت اور امداد تھا جبکہ دوسری تحریک کا مقصد ہندوستان کی آزادی کے لئے بائیکاٹ کے ذریعے حکومت برطانیہ پر دباؤ ڈالنا بتایا گیا۔ مسٹر گاندھی کمال عیاری سے دونوں تحریکوں کا قائد اور امام بن گیا حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ قریب تھا کہ مسلمان اپنا ملی تشخص کھو کر ہندومت میں مدغم ہو جاتے، اس ماحول میں امام احمد رضا بریلوی نے المحجۃ الموتمنہ اور انفس الفکر ایسے رسائل لکھ کر دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنا دیا اور دلائل سے ثابت کیا کہ ہندو نہ تو مسلمانوں کے خیر خواہ ہے اور نہ ہی وہ مسلمانوں کا امام بن سکتا ہے، ان کی دوربین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ مسلمان انگریزوں کے چنگل سے رہا ہو کر ہندوؤں کے محکوم اور غلام بن کر رہ جائیں گے اس لئے مسلمانوں کو وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو دونوں سے گلوخلاصی کرائے۔ یہی وجہ دوقومی نظریہ تھا جس کی بنا پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا، امام احمد رضا بریلوی کے تلامذہ خلفاء اور تمام ہم

مسلک علماء و مشائخ نے نظریہ پاکستان کی حمایت کی اور ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس، بنارس کے اجلاس میں متفقہ طور پر قیام پاکستان کے حق میں قراردیں پاس کی گئیں اور اپیل کی گئی کہ اپنے اپنے علاقوں میں مسلم لیگ کے نمائندوں کو کامیاب کرایا جائے حقیقت ہے کہ اگر یہ حضرات حمایت نہ کرتے تو پاکستان کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا تھا۔

امام احمد رضا بریلوی کے سیاسی فکر کی بنیاد قرآن و حدیث پر تھی' ان کے نزدیک کسی بھی کافر سے محبت کی گنجائش نہیں ہے خواہ وہ ہندو ہو یا انگریز۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"قرآن عظیم نے بکثرت آتیوں میں تمام کفار سے موالات قطعاً حرام فرمائی، مجوس ہوں خواہ یہود نصاریٰ ہوں' خواہ ہنود اور سب سے بدتر مرتدان عنود۔

پٹنہ عظیم آباد کی ۱۳۱۸/۱۹۰۰ء میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں ارشاد فرمایا

"سب کلمہ گو حق پر ہیں خدا سب سے راضی ہے سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے، گورنمنٹ انگریزی کا معاملہ خدا کے معاملوں کا پورا نمونہ ہے، اس کے معاملے کو دیکھ کر خدا کی رضا و ناراضی کا حال کھل سکتا ہے۔۔۔۔۔ یہ کلمات اور ان کے امثال خرافات کو اہل ندوہ کی جو روداد ہے جو مقال ہے ایسی باتوں سے مالا مال ہے سب صریح وشدید نکال وعظیم وبال موجب غضب ذی الجلال ہیں۔

امام احمد رضا بریلوی سیاسی لیڈر نہ تھے بلکہ اسلامی مفکر و مدبر تھے وہ ہر مسئلے کو دینی اور اسلامی نکتہ نظر سے دیکھتے تھے۔ اور امت مسلمہ کے دین و ایمان اور جان و مال کی حفاظت کو اہم ترین مقصد قرار دیتے تھے۔ بیسویں صدی عیسوی کے دوسرے عشرے میں کئی تحریکیں اٹھیں اور طوفان کی طرح پورے ملک میں چھا گئیں بڑے بڑے سیاسی لیڈر یا تو ان تحریکوں کے بہاؤ میں بہہ گئے یا دم بخود تھے کہ کیا کہیں اور کیا کریں؟ ایسے ماحول میں امام احمد رضا بریلوی تن تنہا آندھیوں کی زد پر چراغ بکف نظر آتے ہیں۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی' حکومت برطانیہ نے بے شمار ہندوستانیوں کو اس وعدے پر فوج میں بھرتی کیا کہ فتح کے بعد ہندوستان آزاد کردیا جائے گا، مسٹر گاندھی نے بھی فوجی بھرتی کی بھرپور

حمایت کی، مسلمانوں کی عظیم سلطنت، ترکی کو اس جنگ میں شکست ہوئی، فتح کے بعد انگریز اپنے وعدے سے پھر گیا۔ اس موقع پر گاندھی نے ایک گہری چال چلی اور اعلان کیا کہ سلطان ترکی اسلام کا خلیفہ ہے اور اس کی خلافت کو ختم کرنا اسلام پر حملہ کرنے کے مترادف ہے۔ مسلمانوں میں شدید اشتعال پیدا ہو گیا اور تحریک خلافت چل نکلی۔ اس تحریک کا مقصد ایک طرف تو انگریز سے وعدہ خلافی کا انتقام لینا تھا اور دوسری طرف اظہار ہمدردی کے ذریعے مسلمانوں کو ہندوؤں کے قریب کرنا تھا کہ وہ ہندومت میں مدغم ہو کر رہ جائیں، پھر ترک موالات (بائیکاٹ) کا اعلان کیا گیا اور اپیل کی گئی کہ انگریزی ملازمت چھوڑ دو انگریز کی دی ہوئی جاگیریں واپس کر دو۔ مسلمانوں کے کالجوں کو ملنے والی گرانٹ واپس کر دو، غرض یہ کہ انگریزوں سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھو، پھر ایک قدم اور آگے بڑھایا کہ ہندوستان دارالحرب ہے اس لئے مسلمان یہاں ہجرت کر کے چلے جائیں، افسوسناک بات یہ تھی کہ گاندھی لیڈر تھا اور مسلمانوں کے راہنما دست بستہ اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ ہندوؤں کی خوشنودی کے لئے گائے کی قربانی کی ممانعت کے فتوے دیئے جا رہے تھے مسجدوں کے منبروں پر گاندھی کو بٹھا کر تقریریں کروائی جا رہی تھیں اور اس کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگی جا رہی تھیں، مختصر یہ کہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے پوری طرح راہ ہموار کی جا چکی تھی۔

ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا کسی کو اس سازش کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہیں تھی۔ ایسے ماحول میں امام احمد رضا بریلوی نے اپنے فتاویٰ کے ذریعہ کلمہ حق بلند کیا اور ہندو مسلم اتحاد کی سازش کے تار و پود بکھیر دیئے، انہوں نے بستر علالت سے ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء میں المحجة الموتمنة لکھ کر کرامت مسلمہ کو خوب غفلت سے جگایا اور قوم مسلم میں نئی روح پھونک دی۔

## وصال مبارک

اسرار شریعت و طریقت کا اجالا پھیلا کر ۲۵ صفر ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء بروز جمعہ عین اس وقت عبقری اسلام امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کی رُوح قفس عنصری سے پرواز کر گئی جب مؤذن اذان جمعہ میں کہہ رہا

تھا۔حَیَّ عَلَی الْفَلَاحْ ــــــــــــ رحمہ،الله تعالیٰ رحمةً واسکنه فی اعلیٰ علیین ونفعنا و جمیع السلمین بعلومه و معارفه (۷)

## مفتی احمد یار خان نعیمیؒ

آپ ۱۳۲۴ھ میں ضلع بدایوں کے ایک گاؤں اوجھیانی میں پیدا ہوئے۔ابتدائی دینی تعلیم اپنے والد مولانا یار محمد خان اور مولانا قدیر بخش (مدرسہ شمس العلوم بدایوں) سے حاصل کی۔بریلی جا کر مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی سے اکتساب فیض کیا۔کچھ عرصہ مدرسہ اسلامیہ مینڈھو (ضلع علی گڑھ) میں تعلیم حاصل کی۔پھر مراد آباد کے مدرسہ نعیمیہ میں داخلہ لیا۔مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی نے جوہر قابل کو پہچان لیا اور خود تعلیم دینے لگے۔بیس سال کی عمر میں درس نظامی کی تکمیل پر جامعہ نعیمیہ ہی میں مدرس کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔تدریسی فرائض کے علاوہ فتویٰ بھی جاری کرتے تھے۔تین سال تک کچھ چھہ شریف میں بھی قیام رہا۔مولانا سید ابوالبرکات احمد کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے اور بارہ تیرہ سال دارالعلوم خدام الصوفیہ اور دس برس انجمن خدام الرسول میں تدریس کے فرائض انجام دیئے۔مفتی صاحب نے تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کے لئے بھی کام کیا۔تفسیر نعیمی، نعیم الباری فی انشراح البخاری، مراۃ شرح مشکوۃ اردو (آٹھ جلدیں) نورالعرفان فی حاشیہ قرآن، جاء الحق (دوجلدیں)، علم المیراث، شان حبیب الرحمٰن من آیات القرآن، اسلامی زندگی، دیوان سالک مشہور کتابیں ہیں۔(۸)

## علمی خدمات

امام اہلِ سنت اعلیٰ حضرت فاضل بریلویؒ کے بعد مفتی احمد یار خان نعیمیؒ اہلِ سنت وَ الجماعت کا سرمایۂ افتخار اور قابلِ فخر اہلِ قلم ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے بعد مفتی صاحب

عظیم ترین مصنف ہیں تو اس میں قطعاً کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ اعلیٰ حضرت کے دینی لٹریچر کا انداز عالمانہ اور محققانہ ہے انہوں نے خصوصاً اہلِ علم' علماء' فضلاء کے ذہنوں کو متاثر کرنے کی خاطر اپنی تالیفات میں بلند تعلیمی معیار قائم رکھا۔ علماء اور اہلِ دانش طبقے کی بیداری کیلئے ضروری اور بنیادی دینی لٹریچر اعلیٰ حضرت کے قلم سے نکل چکا تھا۔ اب ضرورت تھی سادہ آسان اور براہ راست دل و ذہن پر اثر انداز ہونے والی تحریروں کی۔ چنانچہ اس میدان میں مفتی صاحبؒ کے عظیم قلم نے وہ جوہر دکھائے اور ایسے معرکے سر کئے جو تا بہ قیامت اہلِ اسلام کے لئے مشعل راہ بنے رہیں گے۔ قبلہ مفتی صاحب خود فرمایا کرتے تھے۔

''میں جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو یہ بات مدنظر رکھتا ہوں کہ میں بچوں' عورتوں اور دیہات کے کم پڑھے لکھے لوگوں سے مخاطب ہوں'' تفسیر لکھنے کی ابتداء کی تو اس وقت بھی ان کا مطمع نظر یہی تھا کہ ایسی آسان زبان اور سادہ انداز میں قرآن حکیم کی تفسیر لکھی جائے۔ جس سے قرآن حکیم کے مشکل مسائل بھی آسانی سے سمجھ میں آسکیں۔ ''تفسیر نعیمی'' کے دیباچے میں فرماتے ہیں بہت کوشش کی گئی ہے کہ زبان آسان اور مشکل مسائل بھی آسانی سے سمجھا دیئے جائیں اور یہ سادگی اور آسانی صرف ''تفسیر نعیمی'' ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ آپ کی تمام تصانیف کا یہی انداز ہے۔ مفتی انتہائی مشکل مضامین کو بے حد واضح اور عام فہم بنا دیتے ہیں وہ بلند علمی معیار اور فاضلانہ ومحققانہ سطح برقرار رکھنے کے بجائے اپنی تحریر وتقریر دونوں کو خاص وعام کے بے حد قریب لے آئے تھے ان کے مدِنظر یہ بات ہوتی تھی کہ کم پڑھا لکھا' انسان بھی ان کا بیان سمجھ سکے وہ تصوف اور معرفت کے اسرار ورموز کے گہرے مطالب کو بھی خواص کی اجارہ داری سے نکال کر عام آدمی کے لئے قابلِ سمجھ بنا دیتے ہیں اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

سورہ بقرہ کی آیت۔ ثم قست قلوبکم من بعد ذلک فھی کالحجارۃ او اشدقسوۃ. وان الحجارۃ لما یتفجر منہ الانھار.

ترجمہ: پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہوگئے تو وہ پتھروں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ کڑے اور پتھروں میں کچھ وہ ہیں جن سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں۔

مفتی صاحب مذکورہ آیت کی تفسیر صوفیانہ میں تحریر فرماتے ہیں۔تفسیر صوفیانہ:''ہر دل میں فطری طور سے خوفِ الٰہی اور شفقتِ خلق کے پانی موجود ہیں گناہ اور بے دینوں کی صحبت اس کو خشک کرنے والی دھوپ ہے، جب انسان گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔تو رفتہ رفتہ یہ دونوں پانی خشک ہو جاتے ہیں جس سے کہ اس کا دل خشک کنکر یا پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے''۔

مفتی صاحب مضمون کو واضح اور آسان پیرائے میں بیان کرنے کی خاطر روز مرہ زندگی سے بکثرت مثالیں منتخب کر لیتے تھے وہ اپنی تحریروں میں خاص و عام سے اتنے قریب ہو جاتے کہ ان کے اور قارئین کے درمیان کوئی حجاب یا دوری باقی نہ رہتی۔مفتی صاحب کی بصیرت نورانی نے اپنے مسلکی لٹریچر کی کمی کو بھی محسوس فرما لیا تھا کہ ہمارے ہاں تفسیر اور حدیث کے موضوعات پر بہت کم لکھا گیا ہے گزشتہ نصف صدی سے تفسیر قرآن کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت کے ترجمے اور صدر الافاضل کے تفسیر حواشی (خزائن العرفان) کو ہی کافی سمجھا گیا ہے مفتی صاحب فرمایا کرتے تھے'' کاش میں اعلیٰ حضرت کے پاس ہوتا تو ان سے عرض کرتا کہ قرآن حکیم کی تفسیر آپ کے قلم سے نکلنی چاہئے''۔(قبلہ مفتی صاحب ہی نے صدر الافاضل کو اصرار کر کے ''تفسیر خزائن العرفان'' لکھنے پر آمادہ کیا تھا صدر الافاضل دیگر مصروفیات کی وجہ سے مفصل تفسیر کا کام نہ کر سکے بالآخر مفتی صاحب نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور سرکار مدینہ ﷺ کے فیض روحانی کی بدولت اس عظیم کام کا بیڑا اٹھایا اور ''تفسیر نعیمی'' لکھنا شروع کی اور پہلے گیارہ پاروں پر اردو زبان میں گیارہ ضخیم مجلدات تحریر فرمائیں تفسیر نعیمی بے حد و حساب مقبول ہوئی کہ کروڑوں لوگوں کے واسطے قرآن فہمی کے در کھل گئے۔اسی سلسلے میں (قرآن فہمی) آپ نے ایک کتاب ''علم القرآن'' تالیف فرمائی۔

تفسیر نعیمی کے علاوہ آپ نے ترجمہ کنز الایمان پر مفصل حواشی تحریر فرمائے جو تفسیر ''نور العرفان'' کے نام سے اپنی سادگی اور سلامت کی بنا پر قبولیت کی انتہائی بلندیوں پر ہے۔

آپ نے صحیح بخاری پر عربی حاشیہ ''انشراح بخاری المعروف نعیم الباری'' کے نام سے لکھا جو زیر طبع ہے۔حدیث کی معروف کتاب ''مشکوۃ المصابیح'' کا ترجمہ اور مفصل شرح (اُردو) مراۃ المناجیح کے نام

سے آٹھ جلدوں میں مکمل کی۔ دیگر تصانیف میں ''علم المیراث'' ''جاء الحق'' ''شان حبیب الرحمٰن'' ''اسلامی زندگی'' ''رحمت خدا بوسیلہ اولیاء''۔ ''معلم تقریر'' ''مواعظ نعیمیہ'' سفرنامے حجاز و قبلتین (حج و زیارت) ''حضرت امیر معاویہ پر ایک نظر'' ''فتاویٰ نعیمیہ'' ''رسائل نعیمیہ'' کے علاوہ خطبات کا مجموعہ ''خطبات نعیمیہ'' شامل ہیں۔ مذکورہ تمام کتب دینی حلقوں میں بہت ذوق، شوق محبت اور عقیدت کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ مفتی صاحب کی تمام کتب کی اشاعت آپؒ کے عزیز نواسے صاحبزادہ افتخار احمد خان مفتی دلی شوق، لگن، محنت اور جذبے کے ساتھ کر رہے ہیں اور ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ مفتی صاحب کی کتب کو قارئین کے لئے بہتر سے بہتر معیار کے ساتھ پیش کیا جائے اور الحمدللہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہیں۔(۹)

## درس وتدریس

مفتی صاحب تحصیل علوم سے فارغ ہوکر مختلف مقامات پر درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ حضرت صدرالافاضل نے آپ کو''جامعہ نعیمیہ مرادآباد''میں تدریس کے فرائض سونپے اور آپ نے بھی خود کو ایک کامیاب مدرس ثابت کردیا مرادآباد میں دوران تدریس دھوراجی کاٹھیاواڑ کے مدرسہ مسکینیہ کے منتظمین کی جانب سے صدرالافاضل سے درخواست کی گئی کہ دھوراجی میں ایک جامع الصّفات اور بلند پایۂ عالمِ دین بھیجا جائے جو تدریس، فتویٰ اور خطبات تمام امور دینی کو احسن طریقے پر انجام دے سکے صدر الافاضل نے مفتی صاحبؒ کو دھوراجی جانے کی ہدایت فرمائی۔ مدرسہ مسکینیہ دھوراجی میں بظاہر کم عمر اور نوخیز دکھائی دینے والے مفتی صاحب نے مدرسہ کے منتظمین کو اپنے علمی کمالات اور فاضلانہ مباحث سے حیران وششدر کردیا تھا وہ لوگ کہہ رہے تھے صدرالافاضل نے ہمارے پاس''بحرالعلوم''بھیج دیا ہے کچھ عرصہ بعد مفتی صاحب تدریس کے لئے واپس جامعہ نعیمیہ مرادآباد تشریف لے آئے تھے مرادآباد سے آپ کو بھکھی شریف ضلع گجرات (پاکستان) سیّد جلال الدین شاہ صاحب کے دارالعلوم میں بھجوا دیا گیا یہاں

کوئی وابستگی پیدا نہ ہو سکی اور آپ لاہور تشریف لے آئے کہ وطن واپس چلے جائیں ان دنوں صاحبزادہ سید محمود شاہ صاحب (ابن پیر ولایت شاہ صاحبؒ) حزب الاحناف لاہور میں زیرِ تعلیم تھے۔ انہوں نے سیّد ابوالبرکات صاحب کی وساطت سے مفتی صاحب سے درخواست کی کہ آپ وطن واپس نہ جائیں بلکہ گجرات میں انجمن خدّام الصوفیہ کے دارالعلوم میں تدریسی فرائض سنبھال لیں وہاں ایک جید عالمِ دین کی ضرورت ہے اہلِ گجرات کی خوش نصیبی کہ مفتی صاحب رضامند ہو گئے اور پھر وہ گجرات گئے اور گجرات ان کا ہو کر رہ گیا۔ مذکورہ دارالعلوم میں آپ کوئی بارہ تیرہ برس مدرس رہے۔ گجرات ہی میں آپ مسجد غوثیہ (چوک پاکستان) میں سالوں بلا ناغہ درسِ قرآن مجید دیتے رہے اور کوئی انیس سال میں پہلی مرتبہ قرآن مجید کا درس مکمل ہوا' اور پھر دوبارہ شروع کیا گیا۔ آپ کا قائم کردہ ''دارالعلوم غوثیہ نعیمیہ'' بھی طویل عرصے سے گجرات میں علمِ دین کی روشنی پھیلا رہا ہے۔

## وفات

۳ رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ مطابق ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۱ء آپ چند دن ہسپتال میں بیمار رہنے کے بعد اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے عالم اسلام ایک بلند دینی شخصیت، ایک مایہ ناز اہل قلم سے محروم ہو گیا لیکن آپ کے روشن کئے ہوئے چراغ ہمیشہ اجالے بکھیرتے رہیں گے آپ کا عرس ہر سال ۲۴، ۲۵ اکتوبر کو آپ کے مزارِ مبارک واقع مفتی احمد یار خان روڈ چوک پاکستان گجرات میں پورے عقیدت و احترام اور حدودِ شریعت کے اندر رہتے ہوئے منعقد کیا جاتا ہے۔ (۱۰)

﴿تمّت باالخیر﴾

۱۔ شاھکار انسائیکلوپیڈیا۔ قاسم محمود۔ الفیصل پبلشرز۔ لاھور۔ ص ۔ ۹۴۹

۲۔ ایضاً ص۔۲۲۰

۳۔ ایضاً ص۔ ۱۴۲۶

۴۔ ایضاً ص۔ ۳۷۱

۵۔ کنزالایمان (تفسیر نورالایمان) امام احمد رضا خان بریلوی ومفتی احمد یار خان نعیمی۔ پیر بھائی کمپنی لاھور ۱۹۹۰ء ۔ ص۔۵

۶۔ معارف رضا (انٹرنیشنل ایڈیشن) پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد۔ ادارہ تحقیقات امام احمد رضا۔ کراچی۔ ۱۹۹۱ء۔ ص۔۴۳

۷۔ فتاوٰی رضویہ۔ امام احمد رضا خان بریلویؒ۔ رضا فاؤنڈیشن (جامعہ نظامیہ رضویہ)۔ لاھور ۱۹۲۱ء۔ ص۔۴۴

۸۔ کنزالایمان۔محولہ بالا ایضاً۔ ص۔۱۴

۹۔ ایضاً۔ ص۔۱۵

۱۰۔ کنزالایمان ۔محولہ بالا۔ایضاً ۔ ص۔۱۶

x

# خلاصۂ بحث

سب تعریفیں اور شکر اللہ ربّ العالمین کے لیے جس نے مجھے یہ توفیق بخشی کہ میں اپنے اس مقالے کو مکمل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ وَمَا تَوْفِيْقِىْ اِلاَّ بِاللّٰهِ۔ میں نے یہ مقالہ ایک ایسے عنوان پر لکھا ہے جس میں تاریخی اسلامی سے ایک پوری صدی کے حالات کا جائزہ لیا گیا ہے ان تحریکوں کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے جو کبھی اسلامی نظام کو برپا کرنے کے لیے، کہیں مسلمانوں کے حقوق کے لیے اور کہیں مسلمان ملکوں کی فکری اور نظری سرحدوں کی حفاظت کے لیے برپا ہوئیں۔

اس پورے مقالے میں جائزے اور تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے اور اسی مقصد کے لیے اس اہم موضوع کو منتخب کیا گیا تھا کہ آج کی دنیا میں مسلم اُمہ اور اسلامی تحاریک کے بارے میں علم کی کیا بنیادیں ہیں اور کیا غلط فہمیاں ہیں اور ایک عظیم مقصد کے لیے اُمّتِ مسلمہ اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہوئی۔ اسلامی نظام کو برپا کرنا دراصل دین دنیا کی بھلائی اور فلاح کے لیے ہے۔ اس سلسلے میں اُمّتِ مسلمہ کی ذمّہ داری کے حوالے سے ایک حدیث کا خلاصہ یہ ہے:

> ''طبرانی نے حضرت معاذ بن جبل سے یہ روایت نقل کی ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جب دین کا سیاسی نظام بگڑ جائے گا تو مسلمانوں پر ایسے حکمران ہوں گے جو غلط رُخ پر معاشرے کو لے جائیں گے۔ اگر ان کی بات مانی جائے تو لوگ گمراہ ہو جائیں گے اور اگر ان کی بات کوئی نہ مانے تو وہ اسے قتل کر دیں گے۔ اس پر لوگوں نے پوچھا کہ ایسے حالات میں آپ ﷺ ہمیں کیا ہدایت دیتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہیں وہی کچھ اس زمانے میں کرنا ہوگا جو حضرت عیسیٰؑ ابن مریم

کے ساتھیوں نے کیا۔ وہ آروں سے چیرے گئے، سولیوں پر لٹکائے گئے، لیکن انہوں نے باطل کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔ اللہ کی اطاعت میں مرجانا اس زندگی سے بہتر ہے جو اللہ کی نافرمانی میں بسر ہو۔"

اس ذمہ داری کے حوالے سے تحاریک اسلامی کا کردار معاشرے اور نظام دونوں کے لیے واضح طور پر بھرپور نظر آتا ہے۔ دنیا کے نقشے پر بیسویں صدی میں جو بڑی بڑی نمایاں تبدیلیاں رو بہ عمل آئیں ان کو ہم حالات و واقعات کے آئینے میں آج خود دیکھ رہے ہیں۔ اللہ کی مدد اور اعانت سے اس تحقیق و جستجو کے نتیجے میں تحاریک اسلامی کا کردار اور ان کے اثرات کو اگر مختصر طور پر ہم دیکھیں تو کچھ یوں نقشہ نظر آتا ہے۔ اس کا ذکر مجموعی طور پر ہم نے تحریکوں کے ناموں اور ان کی مختلف ادوار میں کارکردگی کے لحاظ سے کیا ہے۔ جملہ تحریکیں مسلم اُمہ کی نمائندہ ہیں۔ دنیا میں مسلم اُمت کے ساتھ جو سلوک غیر مسلموں نے کیا اس کی بہت بڑی مثال بیت المقدس پر اسرائیل کا قبضہ اور فلسطین سے فلسطینیوں کا انخلا ہے۔ جو ظلم و ستم اس سرزمین پر نہتے مسلمانوں پر ٹوٹا وہ تاریخ میں اسناد کے ساتھ رقم ہے۔ اس جائزے سے تحریکوں کے مقاصد اور ان کے ابتدائی حالات کے پس منظر میں مسلمانوں کے بیت المقدس پر قبضے کے خلاف بیشتر تحریکیں اُٹھیں اور آزادی فلسطین کے لیے پوری اُمت سراپا احتجاج بن گئی۔

مسلم اُمت کو جس چیز نے ہمیشہ فعال اور تیز رو بنائے رکھا وہ جہاد تھا۔ ان تحریکوں کی بدولت مسلمانوں نے دنیا کے اندر سے ظلم و ستم، شرک و کفر اور انسانی خدائی کا قلع قمع کیا اور انسانوں کو اوہام و خرافات کی زنجیروں سے نجات دی اور علم و تحقیق کے گلستان پیدا کئے، عدل و انصاف کی بہاریں برپا کیں۔ انسانوں کو رنگ و نسل اور تفاخر و تکاثر کے پیمانوں سے ناپنے کے بجائے ایمان و تقویٰ کے پیمانوں سے ناپنے کی طرح ڈالی۔ جہاد نے مسلمان نوجوانوں کو تن آسانی کے بجائے جفاکشی اور عیش کوشی کے بجائے پاک نفسی کے جوہر سے آراستہ کیا۔ ان کو اپنوں کے لیے نرم اور دشمنوں کے لیے سنگ خارا بنا دیا۔ مسلمانوں کی برق و رعد کے سامنے قیصر و کسریٰ بھی مات کھا گئے۔ بحر الکاہل سے لے کر بحر ظلمات تک اسلام کا سایہ رحمت پھیل گیا۔ ویانا کی دیواریں اور اندلس کی تاریک دنیائیں اس کی روشنی سے جگمگا اُٹھیں۔ الغرض جب تک مسلم اُمت کے اندر

رُوح جہاد کام کرتی رہی وہ خوددار اور پُرشکوہ رہے اور جونہی یہ رُوح رُخصت ہوئی ان کا شیرازہ بکھر گیا اور وہ منتشر بھیڑوں کے گلے بن گئے۔ علم تو ان کے ہاں سے رُخصت ہوا ہی تھا وہ آزادی واستقلال بھی کھو بیٹھے اور آج تک ماضی کی غلطیوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ یہ بات بھی مقالے کی ضرورت تھی کہ مقابل قوتوں یا باطل پرستوں کا کردار سامنے لایا جائے۔

استعماری طاقتیں مسلمانوں کی قوت کا حقیقی راز سمجھتی تھیں۔ انہوں نے مسلمانوں پر اپنا تسلّط پھیلانے کے بعد جہاد کا تصوّر مسلمان کے دل ودماغ سے کھرچنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کے ایک طبقے کو اس بات کا قائل کرنے میں کامیاب ہوگئیں کہ جہاد سے مراد صرف مدافعت ہے اور بہتر یہی ہے کہ اس لفظ کو اسلام کی ڈکشنری سے نکالا جائے اور کہا کہ بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے۔

اسلامی تحریکوں کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے صدیوں سے مردہ رُوح جہاد کو دوبارہ ملتِ اسلامیہ کے اندر زندہ کردیا۔ اب انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک اور ترکی سے لے کر موزمبیق تک جہاد کے نغمے گونج رہے ہیں اور یہی مغرب کو مخبوط الحواس کیے جا رہے ہیں مگر جس قدر اس لہر کے خلاف مغرب کے قائدین اور مغرب کے ذرائع ابلاغ پروپیگنڈہ کرتے ہیں، اسی قدر اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دورِ حاضر میں نظریہ جہاد کو اپنی اصل حقیقت کے ساتھ سب سے پہلے ہندوستان کے ایک ۲۳ سالہ نوجوان نے پیش کیا۔ جس کا نام سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ تھا اور وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے نمائندہ اخبار الجمیعت دہلی کا مدیر مسئول تھا۔ اس نوجوان نے اخبار کے صفحات پر ۲۴ قسطوں میں اسلام کے قانونِ جنگ پر مضمون لکھا۔ اس مضمون کو بعد میں جناب علامہ سیّد سلیمان ندوی نے الجہاد فی الاسلام کے نام سے شائع کیا۔ جہاد کے موضوع پر دورِ حاضر کی یہ پہلی کتاب ہے جو ہند کی سرزمین پر منصۂ ظہور پر آئی۔ اس کے بعد امام حسن البناء نے جہاد فی سبیل اللہ کے موضوع پر ایک کتابچہ تحریر کیا۔ یہ وہ دور تھا کہ مسلمانوں کے اہلِ علم ودانش جہاد کے بارے میں مسلسل صفائیاں اور معذرتیں پیش کر رہے تھے۔ یہ میدان میں دعوت جہاد کا آغاز تھا۔

## انتفاضہ فلسطین

جہاد افغانستان ہی کے دوران ۱۹۸۹ء میں فلسطین میں انتفاضہ کی تحریک برپا ہوگئی۔ اس کو جنم دینے والی فلسطین کی اسلامی تحریک تھی۔ غزہ کی اسلامی یونیورسٹی کے طلبہ جن کے کان جہاد افغانستان کی داستانیں سنتے رہتے تھے اور جن کے اساتذہ بھی خود جذبہ جہاد سے سرشار تھے۔ ''اسرائیل'' کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مسجدوں کو اپنا مرکز بنالیا اور پتھروں کو ہتھیار۔ اس تحریک میں ان فلسطینیوں نے بھی حصہ لیا جو ۱۹۶۷ء سے اسرائیل کی رعایا بنا دیے گئے تھے اور انہیں بھی اسرائیلی کہا جاتا تھا۔ انتفاضہ نے یہودیوں کے ہوش وحواس گم کردیے۔ اسرائیل نے انتفاضہ کو بیخ و بن سے اکھاڑنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی مگر ہر اسرائیلی ضرب اس میں مزید زندگی پیدا کرتی گئی۔ ۸ برسوں میں اس تحریک میں حصہ لینے والے ہزاروں نوجوان شہید ہوئے۔ ۲۵ ہزار مفلوج ہوگئے اور ۳۰ ہزار مختلف اوقات میں جیلوں میں ڈالے گئے۔

فلسطین کی تمام مساجد جہاد کے مراکز بن گئیں۔ لوگوں میں اسلام کی طرف غیر معمولی رجوع پیدا ہوگیا بلکہ پوری فلسطینی قوم میں باہمی تعاون و اُخوّت کی غیر معمولی رُوح اُبھر آئی۔ اندرون فلسطین کے لوگ یاسر عرفات کو بھول گئے اور ان کا اصل لیڈر احمد یاسین بن گیا اور یہ علامات واضح ہونے لگیں کہ اسرائیل کے لیے انتفاضہ سے نجات پانا آسان نہیں ہے۔ اسرائیل نے انتفاضہ کے تین سو سے زائد رہنما چن کر انہیں خانہ بدر کردیا اور وہ لوگ سخت سردی کے زمانے میں لبنان سے متصل علاقے مرج العامر میں پناہ گزین ہوگئے۔ مگر اس اقدام سے مزید آتش جہاد بھڑک اٹھی۔ نتیجے کے طور پر امریکہ اور یورپی طاقتوں نے مل کر یاسر عرفات اور تنظیم آزادی فلسطین کے چند لوگوں کو لے کر خفیہ طور پر ناروے میں مذاکرات شروع کیے جو آخر کار واشنگٹن میں ''غزہ اریحا'' کے نام سے فلسطین فروشی کے معاہدے پر منتج ہوئے۔ تحریک انتفاضہ اس وقت حماس میں ڈھل کر فلسطینی اُمنگوں کا مرکز بنی۔ یہاں تک کہ اس کے ایک بڑے لیڈر شیخ یاسین بھی شہید کردیے گئے۔

اسی طرح ہم نے اس مقالے میں مسلم اُمہ پر ہونے والے مظالم کا یورپ میں جب جائزہ لیا تو ہم دیکھتے ہیں کہ فروری ۱۹۹۲ء سے بوسنیا کی سرزمین بھی جہاد آشنا ہوچکی ہے۔ بوسنیا نے سابقہ یوگوسلاویہ کی دوسری جمہوریتوں کے نقش قدم پر اپنی آزادی کا اعلان کیا تو سرب جمہوریہ نے اسے تسلیم نہ کیا۔ بلکہ معدوم یوگو

سلاویہ کی وراثت کی دعویدار بن کر اس نے بوسنیا پر حملہ کر دیا۔ خود بوسنیا کے اندر رہنے والی سرب نسل کی آبادی نے سرب جمہوریہ سے تعاون کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سربوں نے بوسنیا کے ستر فیصد علاقے پر قبضہ کر لیا یا اس پر وحشیانہ حملے کیے۔ بوسنیا کے پاس نہ فوج تھی اور نہ اسلحہ۔ معدوم یوگوسلاویہ کی تمام فوج اور اسلحہ بلغراد میں تھا۔ بوسنوی مسلمان یکا یک شدید ظلم وستم کا شکار ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصے کے اندر تین لاکھ انسان شہید اور اتنے ہی نظر بندی کے کیمپوں میں محبوس ہو گئے۔ پچاس ہزار کے قریب بوسنوی عورتوں کی عزت پامال ہو گئی اور ہجرت کرنے والوں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ گئی۔ مسلمان حکمران بے حس بنے رہے۔ بوسنیا کے دفاع کا سارا بوجھ بوسنیا کی نوزائیدہ حکومت اور بوسنیا کے نوجوانوں پر آ پڑا۔ ان پر مزید ستم یہ ہوا کہ اقوام متحدہ کی طرف سے بوسنیا کو اسلحہ کی سپلائی پر پابندی لگا دی گئی۔ اس صورتِ حال نے بوسنوی نوجوانوں کے اندر جذبہ جہاد پیدا کیا۔ ان نوجوانوں کے اندر وہ گروہ خاص طور پر پیش پیش رہا جو عالم عرب کی یونیورسٹیوں میں پڑھتا رہا اور مولانا مودودیؒ، حسن البناؒ، سیّد قطبؒ کی دعوت سے متاثر ہوا۔ جب ان نوجوانوں نے بہت سے علاقے واپس لے لیے اور انہوں نے اپنے شہروں کا اس قدر جان توڑ دفاع کیا کہ بے پناہ گولہ باری کے باوجود بھی سربوں اور کروٹوں کو نئے علاقوں پر قبضہ کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ یہ بھی جہاد کی برکت تھی جس نے دنیا کو انگشت بدنداں کر دیا اور اس کی بدولت مجاہدین اسلام مغرب کی خوفناک سازشوں کو ناکام بناتے ہوئے بوسنیا کے حالات میں استحکام پیدا کرنے کا باعث بنے اور مسلمانوں میں اپنے حالات کا سامنا کرنے اور ظلم کا مقابلہ کرنے کا داعیہ پیدا ہوا۔

اسلامی تحاریک کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو ان تمام قوموں اور ملتوں کا تذکرہ ضرور آتا ہے جن کو ظلم و بربریت کے ساتھ آزادی کی نعمت سے محروم کر دیا گیا۔ یہاں کشمیر کا ذکر بھی آتا ہے اور یہ اسلامی تحریک کا خاصہ تھا کہ جس نے کشمیری قوم کو راکھ کا ڈھیر ہو جانے کے بعد انتہائی باہمت اور جانباز و سرفروش بنا دیا۔ بھارت ۴۵ برس تک اس قوم کی برین واشنگ کرتا رہا۔ اسے تن آسان، اخلاق باختہ اور اپنا خیمہ دار بنانے کے لیے اربوں روپے خرچ کیے۔ تعلیمی پروگراموں، معاشی منصوبوں، معاشرتی اصلاحات اور سیاسی ہارس ٹریڈنگ کے ذریعے قطعی طور پر بے ضمیر اور بے مقصد بنانے کے ہزاروں جتن کیے اور پھر ساتھ ہی دنیا بھر میں یہ ڈھنڈورا پیٹا کہ

کشمیر کا مسئلہ ختم ہو چکا ہے۔ آخر کار کشمیری قوم کے ان سپوتوں نے جن کی تربیت تحریکِ اسلامی نے کی تھی اپنے مسئلے طاق نسیاں سے نکال کر بین الاقوامی چوراہے پر رکھ دیا ہے۔ اس راستے میں انہیں ۷۰ ہزار سے زیادہ افراد کی قربانی دینی پڑی اور ابھی تک دیئے جا رہے ہیں۔ ان کی خواتین کی اجتماعی آبروریزی، خانہ سوزی اور نظر بندی کے واقعات تو شمار سے باہر ہو چکے ہیں۔ ان کی عبادت گاہیں تک محفوظ نہیں ہیں مگر جذبہ لحہ بہ لحہ بڑھتا جا رہا ہے۔ حزب المجاہدین اور تحریک حریت کشمیر کے پروانے آخری بازی لگا رہے ہیں اور اب بڑی طاقتیں پریشان ہیں کہ جہاد کی آگ کیسے فرو کی جائے۔ انہیں یاسر عرفات جیسے ملت فروش کی تلاش ہے۔

## شیشان میں اسلامی تحریک

اس کے علاوہ شیشان کی صورتِ حال اگر دیکھیں تو ۱۹۹۱ء میں جب شیشان اور روس کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی تو قفقاز کے اخبارات نے اس کشمکش کو ریچھ اور چیتے کی جنگ قرار دینا شروع کیا تھا۔ اس جنگ کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تو شیشان کے مرد و زن دیوانہ وار مقابلہ میں نکلے۔ ان کے لبوں پر کلمہ طیبہ، تکبیر کے نعرے اور ان کا قومی ترانہ تھا جو ان کے جذبہ حریت، دین سے وابستگی اور جذبہ جہاد کا مظہر تھا۔ تحاریک اسلامی کبھی بھی کسی مشن کے بغیر میدانِ عمل میں نہ رہیں۔ ان کا مشن اسلام کی حفاظت ہی رہا۔ شیشان میں اسلامی تحریک نے معرکہ آرا قربانیوں کی داستان رقم کی۔

شیشان کے بارے میں عالمی ذرائع ابلاغ کے ذریعے سے بہت سے حقائق دنیا کے سامنے آچکے ہیں۔ شیشان کے سخت جانوں نے ایسی زبردست مزاحمت دکھائی کہ جس کی مثال موجودہ دور میں نہیں ملتی۔ یہ ہاتھی اور چیونٹی کی لڑائی تھی۔ روسی جلد قبضے کا سوچ کر حملہ آور ہوئے تھے مگر جلد ہی ان کا نشہ ہرن ہو گیا۔ گھنٹوں میں ختم ہونے والا قصہ برسوں پر محیط ہو گیا۔ اصل کردار مجاہدوں اور نیم تربیت یافتہ سویلین کا رہا جو شیشان کے دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں میں جان توڑ کر لڑے۔ شیشانی قبائل افغانستان کی طرح جنگجو ہیں اور شیشان کے عوام نے بے پناہ قربانیاں پیش کی ہیں اور چیچنیا کی آزادی کا باعث بنے ہیں۔

دیگر اسلامی تحریکوں کا اگر ہم دنیا بھر میں جائزہ لیں تو ظلم کے خلاف ہی ہمیں ان کی کارکردگی امن کی

دعوت کے ساتھ نظر آتی ہے۔ جہاد کی ایک بھٹی تاجکستان میں بھی بھڑک اُٹھی اور بہت کم وقت میں تاجک مجاہدین نے روسی فوج اور تاجک کمیونسٹوں اور ان کے ازبک حامیوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو افغان مجاہدین نے سوویت یونین کے ساتھ کیا تھا۔ جنوبی فلپائن بھی عرصہ دراز سے مورو مجاہدین کے قدموں کی چاپ سن رہا ہے۔ وہاں منیلا کے متعصب عیسائی ان کو دبانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر سلامت ہاشم جیسے جری رہنما اپنی قوم کو مسلسل جہاد کے لیے تیار کر رہے ہیں۔

اراکان (جنوبی برما) میں بھی روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن اراکان کو برمی بدھوؤں اور کمیونسٹوں کے پنجہ استبداد سے نکالنے کے لیے جدوجہد کا آغاز کر چکی ہے۔

دور انحطاط میں سب سے بڑی بیماری جو اُمّتِ مسلمہ کے اندر پھیلی وہ قوم پرستی تھی۔ استعماری طاقتوں نے آ کر مزید اس کے اندر اضافہ کیا۔ ''قوم پرستی'' اس عقیدے اور تہذیب کو ملیامیٹ کر دینے والی بیماری ہے جس عقیدے اور تہذیب کو اللہ کے رسول ﷺ نے بڑی محنت سے عربوں کے اندر جاگزیں کیا اور پھر ان کے ذریعے عقیدۂ اسلام ہی کی اساس پر اُمت قائم کی جسے ''خیر امت'' کہا گیا۔ دورِ جاہلیت میں تو انسانی امتیازات زبان ونسل اور رنگ وعلاقہ ہی کی بنیاد پر قائم کیے جاتے تھے بلکہ ایک ہی زبان بولنے والے اور ایک ہی علاقے میں بسنے والے قبائل نسلی اختلافات کی بناء پر باہم دست و گریباں ہو گئے، قریش و بنوثقیف، اوس و خزرج اور بنوخزاعہ اور بنوبکر ایک ہی زبان ایک ہی علاقے اور ایک ہی تاریخ کے وارث تھے مگر باہم برسر پیکار تھے اور ایک دوسرے پر تفاخر و تفاضل ان کا شیوہ تھا اور پھر عرب قبائل اپنے آپ کو عجمی قبائل پر برتر سمجھتے تھے۔ اس قوم پرستی اور قبیلہ پرستی نے انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے۔ اور خونریزی، جنگ و جدل اور بے جا تعلّی کو جنم دے کر انسانی تہذیب وتمدّن کی ترقی رُوک دی تھی۔ آنحضور ﷺ نے اپنی ۲۳ سالہ جدوجہد میں اس بیماری کا قلع قمع کر دیا اور فخر وفضیلت کی بنیاد عقیدے کی پختگی اور تقویٰ وشرافت میں سبقت پر استوار کر دی۔ عربی وفارسی اور رومی وفارسی سب یکساں ہو گئے۔ نہ رنگ کا امتیاز باقی رہا اور نہ زبان کا۔ عربوں کے اندر بھی جلیل القدر ہستیاں اسلامی تہذیب کو چار چاند لگاتی رہیں اور عجمیوں کے اندر بھی ایسے آفتاب و ماہتاب اُٹھے جنہوں نے تفسیر وحدیث، فقہ وقانون، حکمت وفلسفہ اور علم وفن میں اُمّتِ مسلمہ کو پوری انسانیت پر بالا کر دیا۔

## اُمت واحدہ کی بحالی کی جدوجہد

ہم نے اس مقالے میں اُمت واحدہ کی جدوجہد کو سامنے رکھا ہے اور ان امراض کا جائزہ لیا ہے جن میں اُمت مبتلا ہوگئی تھی اور اسلامی تحاریک نے ان کے ان امراض سے انہیں نجات دلائی۔ قوم پرستی کی یہ جان لیوا بیماری مسلمانوں کو مضمحل کر چکی تھی۔ اس نے وسیع وعریض اُمت کے درمیان تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر بڑی بڑی دیواریں کھڑی کر دی تھیں اور ابھی تک یہ دیواریں قائم ہیں۔ تحریک اسلامی نے ملتِ اسلامیہ کے لیے جو خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان میں یہ خدمت سرِ فہرست ہے کہ اس نے ''اُمت واحدہ'' کے تصوّر خوابیدہ کو بیدار کیا ہے اور مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک اور ترکی سے لے کر صومالیہ تک بلکہ مدغاسکر و ماریشس تک بسنے والے مختلف رنگ ونسل کے مسلمانوں کو ایک اُمت ہونے کا احساس دلایا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ جہاں اسلامی عقیدہ بیدار ہوگیا ہے وہاں نسلی ولسانی تفرقے مٹ گئے ہیں اور جیسے جیسے تحریکوں کا کام پھیلتا جارہا ہے یہ تفرقے محو ہوتے جارہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تحریکوں کے قائدین سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور حسن البناؒ کسی مخصوص قوم یا ملک کے رہنما نہیں، بلکہ پوری ملت کے چشم وچراغ سمجھے جاتے ہیں۔ سیّد قطبؒ، بدیع الزمان نورسی، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی اور عزالدین قسام (اللہ ان سب پر اپنی رحمت نازل فرمائے) کے ساتھ عقیدت کا دائرہ پوری اسلامی دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ ان کی تحریریں اور کاوشیں کسی مخصوص علاقے اور مخصوص تمدّن کی پابند نہیں ہیں بلکہ پوری اُمت کے مسائل سے بحث کرتی ہیں۔ ان کی تحریریں دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور ہر جگہ نسل نو ان کو اپنے سینے سے لگاتی ہے۔ دورِ حاضر کے موجودہ قائدین بھی ایک ہی کارواں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں پاکستان، بنگلہ دیش، بھارت، کشمیر، ملائیشیا، اردن، مصر، لبنان، تیونس، الجزائر، ترکی، فلپائن، یورپ، افریقہ اور امریکہ میں رہنے والے یہ قائدین ایک ہی خاندان کا حصہ ہیں، جس کے اصل قائد محمد ﷺ ہیں جو اسی کارواں کا تسلسل ہیں جو عہد صحابہ اور عہد تابعین سے چلا آرہا ہے۔ جس کی قیادت اپنے اپنے دور میں آئمہ کرام، مجددین عظام اور مصلحین اُمت کرتے رہے ہیں۔ یہ کارواں قومیتوں سے پیدا ہونے والے امتیازات اور جاہلی تعصّبات کی دیواریں اور جغرافیائی حد بندیوں کو ختم کر کے اُمت کے ہر گروہ کو باہم پیوستہ کر رہا ہے اور اسے وہی حیثیت دینا چاہتا ہے جو حدیث میں بیان کی گئی

ہے کہ جسم کے ایک حصے کو تکلیف پہنچے تو دوسرا حصہ بھی تکلیف اور بے خوابی میں مبتلا ہو جائے۔ فلسطین کے مسلمانوں کی تکلیف ہو یا بوسنیا کے مسلمانوں کی آزمائشیں، کشمیریوں پر ٹوٹنے والا ظلم وستم ہو یا تاجکستان پر لہرانے والی شمشیر ستم، اراکانی مسلمانوں کے زخم ہوں یا کوسوو میں ہونے والے مظالم، فلپائن کے مسلمانوں کی لرزہ خیز داستان ہو یا چیچنیا پر روسی جارحیت ساری ملت اس میں حصہ دار ہے۔

کیا اسلامی تحریک کا یہ کارنامہ اس دور کا ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔ اس معجزے کی شب تاب شعاعیں دنیا نے جہاد افغانستان میں دیکھیں جس میں افغانیوں کے دوش بدوش دنیا کی اسلامی تحریکوں کے نوجوانوں نے بھی اپنا خون بہایا اور آخر کار سوویت یونین کا ''قصر پر شکوہ'' دیکھتے ہی دیکھتے زمین بوس ہو گیا۔

## روس کا خاتمہ

اسلامی تحریک ہی خون کی طرح اُمّتِ مسلمہ کی رگوں میں دوڑتی رہی ہے اور اس کے لازوال کارناموں کی تاریخ روس کے خاتمے کی شکل میں نظر آتی ہے۔ دورِ حاضر کی دنیا اور اس میں بسنے والے انسانوں نے مسلموں اور غیر مسلموں کالوں اور گوروں، عورتوں اور مردوں، بوڑھوں اور جوانوں اور دور ونزدیک کے سارے لوگوں نے افغانستان کے پہاڑوں میں ایک مرتبہ پھر فضائے بدر کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جب چند بے سروسامان افغان نوجوان جذبہ جہاد اور شوق شہادت سے سرشار ہو کر وقت کی سب سے بڑی جنگی وات، منضبط نظریہ اور ریاست اور وحشی سپر طاقت کے مقابلے پر ڈٹ گئے تو دیکھتے ہی دیکھتے تاریخ کے اوراق میں نہیں، زندہ واقعہ کی صورت میں ہماری آنکھوں کے سامنے وقت کی یہ وحشی سپر طاقت پاش پاش ہو گئی۔ اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ دنیا کے نقشے سے اس کا وجود مٹ گیا۔ اس کا فلسفہ دریا برد ہو گیا، بظاہر اس کی تاریخ بھی مٹ گئی۔ ماسکو کے ریڈ اسکوائر پر لاکھوں عوام نکل آئے اور انہوں نے اعلان کیا کہ کمیونزم ظلم اور جبر کا نظام ہے اور کمیونسٹ پارٹی جو بڑی معزز اور محترم پارٹی تھی، اس کے بارے میں اعلان ہوا کہ ظالموں اور مجرموں کی پارٹی ہے۔

اور پھر روس جس کی تاریخ یہ تھی وہ جہاں گیا وہاں سے کبھی واپس نہیں آیا، بلکہ اپنا نظریہ اور اپنی فوجیں

چھوڑ کر آیا ہے، وہ جب افغانستان سے اُلٹے پاؤں بھاگا اور ماسکو پہنچ کر اس نے سانس لی تو اسے پتہ چلا کہ وہ صرف افغانستان سے ہی نہیں لوٹا ہے، بلکہ وہ رومانیہ سے بھی لوٹ آیا ہے، ہنگری اور چیکوسلوا کیہ، مشرقی جرمنی، پولینڈ اور یوگوسلاویہ سمیت پورے مشرقی یورپ سے نکالا گیا ہے، دیوار برلن جو بڑی مقدس دیوار تھی، دیوار گریہ بن گئی ہے اور ''وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے''۔

افغان جنگ نے روسی معیشت پر بہت برا اثر ڈالا اور ۱۹۸۵ میں گورباچوف کے آنے کے بعد یہی وجہ تھی کہ اس نے افغانستان کو رستا ہوا زخم اور مہلک غلطی قرار دیا اور بالآخر جنیوا معاہدے کے ذریعے روس کو افغانستان سے ۱۹۸۹ میں اپنی فوجیں واپس بلانا پڑیں اور اسی کے اثرات کے نتیجے میں کمیونزم دنیا بھر سے اپنی تمام تر روایات کے ساتھ رُخصت ہوا۔

## اسلام کا احیاء اور انقلاب کے امکانات

سوویت یونین سے آزادی کے بعد وسط ایشیا کے ان علاقوں میں اہم تبدیلی تعلیم کے میدان میں آئی ہے۔ دینی تعلیم کی طرف رجحان بہت قوی ہے۔ آزادی کے بعد لوگوں نے مسجد اور مدرسوں کی طرف رجوع کیا ہے۔ ۱۹۸۵ میں وادی فرغانہ میں صرف تین مسجدیں تھیں لیکن اب یہاں ہزاروں مسجدیں بن گئیں ہیں۔ اذان دینے کی اجازت بھی مل گئی۔ اسلامی تحریکوں کے اس جائزے نے یہ بات ثابت کی ہے کہ سات عشروں کے اشتراکی جبر و تشدّد کے بعد وسط ایشیا میں اسلامی جمہوری قوتیں یکجا ہو کر اُبھر رہی ہیں۔ بیداری کی لہر نے پورے روس کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ مسجدوں میں نماز اور عبادت کے ساتھ ساتھ سیاسی مذاکرات ہونے لگے ہیں۔ سمرقند و بخارا کی شان وشوکت آہستہ آہستہ لوٹ رہی ہے۔ نوجوانوں کی نئی نسل آزادی وخودمختاری کے حصول کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر باقاعدہ اسلامی پروگرامات شروع ہو گئے ہیں۔ ازبکستان اور تاجکستان میں ہر جگہ اسلام ہی نظر آتا ہے۔ ازبکستان، ترکمانستان، کرغیزیہ اور تاجکستان وغیرہ میں اسلامی انقلاب کے امکانات روشن ہیں اور اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر و رُسوخ سے وہاں کی حکومتیں شدید پریشانی کا شکار ہیں۔ وسط ایشیا میں لوگ جس تیزی سے اسلام کی طرف جا رہے ہیں اس سے وہاں انقلاب کے امکانات

بہت روشن ہیں۔ وہاں کی عورت جب پردے کے متعلق درس سنتی ہے تو گھر جاتے ہی مکمل پردہ کر لیتی ہے۔ دراصل وہ لوگ بے خدا تہذیب سے بیزار ہو چکے ہیں وہاں کے مسلمانوں کے کردار نے غیر مسلموں کے دلوں پر بھی انمٹ نقوش چھوڑے ہیں اور اسلامی تحریک کے لوگوں نے بھی اور ان کی دعوت کی سچائی نے بھی مسلم و غیر مسلم کو بہت متاثر کیا ہے۔ اشتراکیت کی موت کے بعد اب روس اور وسط ایشیا میں کوئی غیر فطری اور متشددانہ نظریہ نہیں چل سکتا، لوگ اس سے بے زار ہو چکے ہیں۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا نظریہ ہے جو وہاں کے لوگوں کی پیاس بجھا سکتا ہے۔

## اُمّتِ مسلمہ کی بیداری

دورِ حاضر جن نمایاں علامات اور روشن بشارتوں کو اپنے دامن میں لے کر طلوع ہوا ہے ان میں بڑی عظیم بشارت یہ ہے کہ اسلام کے ساتھ جینے مرنے اور اس کے غلبے کی تمناؤں سے سرشار دل اس کے لیے فکر مند دماغ اور کوشاں افراد کی ایک قابل لحاظ تعداد عالم اسلام میں پیدا ہو گئی ہے۔ ملتِ اسلامیہ کے ہر گوشے میں نئی نسل استقبال اسلام کے لیے مستعد اور سرگرم نظر آ رہی ہے۔ رُوح خدا کی بندگی کی پیاس محسوس کر رہی ہے۔ قلوب عجز و نیاز میں ڈھل کر ربّ العالمین کی طرف جھک رہے ہیں۔ روّیوں میں دینداری اور جذبوں میں دینی غیرت نمایاں ہے۔ ملی شعور اور دینی اعتبار سے اجتماعیت کا تصوّر پختہ ہو گیا ہے۔ شوق شہادت، ولولہ جہاد اور قربانی کے لیے آمادگی جوش پر ہے۔

اسلام کے بارے میں وہ معذرت خواہانہ انداز ختم ہو گیا ہے جو پچھلی صدی کے وسط میں عام ہونا شروع ہوا اور اس صدی کے وسط تک اپنے عروج پر رہا۔ اسلام کے ساتھ نسبت و تعلق ظاہر کرنے میں احساس کمتری اب کسی کو نہیں ستاتا۔ لادینیت اور مغربی تہذیب و فکر کے سامنے سر جھکانے کی روش دم توڑ رہی ہے۔ اپنی تہذیبی روایات پر فخر کرنے والے اب سینکڑوں ہزاروں سے متجاوز ہو چکے ہیں۔ مجاہد کی جس اذان کے لیے صدیوں سے فضائیں ترستی تھیں وہ افغانستان سے بھی بلند ہو رہی ہے اور کشمیر سے بھی، فلسطین سے بھی اُبھر رہی ہے اور برما اور اریٹیریا سے بھی۔ سر پر کفن باندھے ہوئے شہادت کی جستجو میں نکلنے والے کرداروں کی

تلاش چشمِ فلک نے مایوس ہو کر چھوڑ دی تھی۔ آج ایسے ہزاروں کردار ہیں جن کے قدموں کو چھو کر خدا کی زمین بھی جھوم رہی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ نسوانیت حیا کی چادر سے باہر نکل جائے تو مہلک تہذیبی روایات کا ایسا جن بن جاتا ہے جسے دوبارہ بوتل میں بند کرنا اور اس کے اصل مقام پر لانا ممکن نہیں رہتا۔ لیکن مصر میں موسیقی اور اداکاری میں اُونچا نام رکھنے والی کئی فنکاراؤں کا اس دنیا سے تائب ہو کر اللہ کے دین اور قرآن کے سائے میں پناہ لینا، ترکی کی جامعات میں سخت لادینی پابندیوں کو توڑ کر طالبات کا سر ڈھانپ کر آنے کی تحریک چلانا، فرانس اور یورپ تک میں مسلمان خواتین کا باوقار شرعی لباس پہننے پر اصرار کرنا، دین سے بے زار اور مغرب کی دلدادہ عورتوں کی بے پردگی اور مغرب زدگی کا پسپائی اختیار کرنا یہ ثابت کر رہا ہے کہ اللہ کی ہدایت کے قریب آ جانے پر عورت اپنے گوہر نسوانیت کی بازیافت کی سعی کرنے لگے تو اس کا بگاڑ سے اصلاح کی طرف سفر لمحوں کی مسافت بن جاتا ہے۔

ترکی، الجزائر، بنگلہ دیش، اردن، مصر وغیرہ میں اسلام پسندی کے لیے زمین بہت سخت بنا دی گئی تھی۔ استعماری اور سامراجی غلاموں نے مسند حکمرانی کی قیمت کے طور پر اسلام سے محبت کرنے والوں کے لئے اتنی مشکلات کھڑی کیئے رکھیں کہ برس ہا برس تک اسلامی اقدار سے وابستگی سے بڑا جرم وہاں کوئی نہ تھا لیکن گزشتہ چند سالوں میں عوام کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ وہ لادینی قوتوں کے کھیل سے بے زار ہونے کا کھلا ثبوت انتخابات میں اسلام کا علم تھامنے والوں کی واضح حمایت کر کے دے رہے ہیں۔ اس کی ایک بہترین مثال ہم اس وقت موجودہ ترکی سے لے سکتے ہیں۔ ترکی کی قابلِ تقلید مثال یہ ہے کہ پورے ترکی میں آپ گھومیں، انگریزی میں کوئی سائن بورڈ خال ہی نظر آئے گا۔ پارلیمنٹ کی کاروائی سے لے کر خط و کتابت حتیٰ کہ یونیورسٹی اور پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں میں نصاب کو ترکی زبان میں ڈھال لیا گیا ہے۔ نجم الدین اربکان اور طیب اردگان انگریزی زبان سمجھنے کے باوجود اپنی گفتگو ترکی زبان میں کرتے ہیں۔

یہ عجیب منظر نامہ ہے کہ ترکی اسّی (۸۰) سال کے سیکولر دور کے بعد اسلام کی طرف مراجعت کر رہا ہے۔ اس کے وزیرِ اعظم اور کابینہ کے تمام ارکان کی بیگمات حجاب اور اسکارف کا اہتمام کرتی ہیں اور یورپی

یونین کے سربراہی اجلاس میں بھی اسکارف پہن کر ہی شرکت کرتی ہیں۔اس کے علاوہ مختلف دینی اداروں کے اپنے چینلز ہیں جن سے وہ نشریات کا اہتمام کرتے ہیں۔(۱)اس مقالے کے لکھنے کی جو اہم ترین وجہ تھی وہ تحاریک اسلامی کی تحقیق اور جائزہ تھا اور میں نے اس جائزے میں یہی دیکھنے اور ثابت کرنے کی انتہائی کوشش کی ہے کہ جب دنیا بھر کے یہودی صرف اسرائیل کے لیے اپنی ساری کوششوں کو صرف کر سکتے ہیں تو اُمتِ مسلمہ، جو پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور اس کی تعداد بھی مذہبی اعتبار سے دوسرے نمبر پر ہے، ان مسائل اور مشکلات کو کیوں نہ حل کرے جو جبر و بربریت کی شکل میں دنیا بھر کے مسلمانوں کو درپیش ہیں۔تحاریک اسلامی کا تحقیق و جائزہ کرتے ہوئے ان حقائق سے آنکھیں نہیں بند کی جاسکتیں۔

اسلامی تحاریک نے پوری مسلم سرزمین کی آزادی کو ہمیشہ اپنا اولین اور اہم ترین مقصد سمجھا ہے اور اس کا یہ فرض ہے کہ وہ خود کو دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے وقف سمجھے، اسے جہاں بھی مدد کی پکار پڑے وہ امداد کے لیے لپکے۔اس کی ایک بڑی مثال آج کا کشمیر ہے جہاں لاکھوں مسلمان اپنے حق سے محروم ہیں۔ ہندوؤں نے پوری ریاست کی اسلامی شناخت مسخ کرنے کے لیے لادینی تعلیمات، فحاشی اور عریانی پھیلانے کی سازش کی ہوئی ہے۔اگر تحاریک اسلامی اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کے لیے اپنی ذمّہ داری ادا کریں تو کشمیریوں کو حق خود ارادی مل سکتا ہے۔

آخر میں اس مقالے کو سمیٹتے ہوئے یہی عرض کرنا ہے کہ اسلامی عقیدے اور باہمی تعاون و بھائی چارے کا تقاضہ ہے کہ اسلامی تحریکیں ہی فعال ہو کر دنیا بھر کے انسانوں کو آزادی کی تحریکوں میں کامیاب کر سکتی ہیں جیسا کہ وہ ماضی میں اپنا شاندار کردار رکھتی ہیں۔تاریخ گواہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت صرف بنی اسرائیل کو فرعون، ہامان اور قارون کے ظلم و جبر سے نجات دلانے کے لیے تھی، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت پوری بشریت کو دنیا جہان کے ان تمام فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں سے نجات دلانے کے لیے آئی ہے جو دنیا میں بے جا تکبر کا شکار ہیں جو انسانوں کو ذلیل و رُسوا کرتے ہوئے خود کو ان کا رب سمجھ بیٹھے ہیں۔اسلامی تحریکوں کا یہی کردار اسی ذمّہ داری کو ادا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

اس پوری بحث سے جو ہم نے نتیجہ نکالا ہے وہ درج ذیل ہے۔

- تحاریک اسلامی ہر دور میں وقت کے تقاضوں اور اصلاح احوال کے لیے برپا ہوئیں۔
- ان تحاریک نے قوموں کے اندر احساس ذمّہ داری، جذبہ ایمان، اخلاق و کردار، انسانیت کے اُصول وضوابط کے مطابق پیدا کیے۔
- جہل کے اندھیروں کو دور کرنے کے لیے ہر دور میں تحاریک اسلامی نے اپنا کردار ادا کیا۔ جس کے لیے پوری تاریخ زندہ گواہی رکھتی ہے۔
- آج کی دنیا بیسویں صدی کی تحاریک کی کوششوں اور قربانیوں سے ترقی کی منازل کی جانب محو سفر ہے اور انشاءاللہ اسلام کی روشنی میں آئندہ بھی یہ سفر جاری رہے گا۔ تحاریک اسلامی نے دنیا کو اخلاقی بنیادوں پر سوچنے اور عمل کرنے کی طرف راغب کیا۔ یہ ایک بہت بڑا انقلابی عمل تھا۔

اس کے اثرات وثمرات آج کی دنیا انقلاب کے قدموں کی چاپ کی شکل میں سن رہی ہے اور آئندہ کی دنیا انشاءاللہ اس وقت کو ضرور دیکھے گی جب اللہ کے بندے بندوں کی بندگی سے نکل کر صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کی بندگی واطاعت کر سکیں گے۔ انشاءاللہ تعالیٰ

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دُعا ہے کہ میرے اس مقالے کی حقیر کوشش کو قبول فرما کر اُمّتِ مسلمہ کے لیے اور عالم انسانیت کے لیے نجات اور رہنمائی کا ذریعہ بنا دے۔ آمین

(ثُمَّ آمِین)

بڑا مبارک جہاد ہے یہ سحر کی اُمید رکھنا زندہ
نہ چین ظلمت کو لینے دینا شبوں کی نیندیں اُڑائے رکھنا

وَمَا عَلَیْنَا اِلاَّ الْبَلَاغُ الْمُبِیْن

# کتابیات


| نمبر شمار | مصنف | کتاب کا نام | پبلشر | اشاعت | سن |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱۔ | ابصار عالم، پروفیسر | تحریک احیائے اسلام | حرا پبلیکیشنز | لاہور | ۱۹۸۹ء |
| ۲۔ | ابن مبارک، عبداللہ | کتاب الجہاد | مکتبہ النور | بیروت | ۱۳۹۱ھ |
| ۳۔ | ابوداؤد سلیمان بن اشعث | سنن ابی داؤد۔ | مصطفیٰ البالی | مصر | ۱۹۵۲ء |
| ۴۔ | ابوالنصر محمد حامد | وادی نیل کا قافلہ سخت جاں (اردو ترجمہ) | حرا پبلی کیشنز | لاہور | ۱۹۹۰ء |
| ۵۔ | ابوالحسن علی ندوی | تجدید احیائے اسلام | دارالندوۃ | دہلی | ۱۹۸۵ء |
| ۶۔ | ابوالحسن علی ندوی | تاریخ دعوت وعزیمت | مجلس نشریات اسلام | کراچی | ۱۹۸۰ء |
| ۷۔ | ابومسلم | عصر حاضر اور اسلام | ادبستان | لاہور | ۱۹۷۱ء |
| ۸۔ | احمد رائف | روداد ابتلاء (اردو ترجمہ) | البدر پبلی کیشنز | لاہور | ۱۹۷۸ء |
| ۹۔ | ارسلان امیر شکیب | اسباب زوال امت | دعوہ اکیڈمی | اسلام آباد | ۱۹۹۷ء |
| ۱۰۔ | اسمائے عبداللہ | یوگوسلاویہ کا خاتمہ اور بوسنیا کے مسلمان | انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز | اسلام آباد | ۱۹۹۳ء |
| ۱۱۔ | اشرف محمد آغا | پاکستان کا اسلامی پس منظر | مقبول اکیڈمی | لاہور | ۱۹۸۳ء |
| ۱۲۔ | اصلاحی صدرالدین | فریضہ اقامت دین | اسلامک پبلیکیشنز | لاہور | ۱۹۷۸ء |
| ۱۳۔ | اقبال، محمد، علامہ | کلیات اقبال | المسلم پبلشرز اردو بازار | کراچی | ۱۹۹۴ء |
| ۱۴۔ | اقبال، جاوید | مسلمانوں کے سیاسی افکار و ادارے | نیو بک پیلس | لاہور | س ن۔ |
| ۱۵۔ | افتخار احمد | اخوان المسلمون | المیزان پبلشرز | فیصل آباد | ۱۹۹۰ء |
| ۱۶۔ | افتخار احمد | عالمی تحریک اسلامی کے عظیم قائدین | المیزان پبلشرز | فیصل آباد | ۱۹۹۴ء |

۱۷۔ اکبر آبادی، سعید — مسلمانوں کا عروج وزوال — ادارہ اسلامیات — لاہور — ۱۹۸۳ء

۱۸۔ الاعظمی محمد حسن — عظیم مصر — عالمی تنظیم اتحاد العالم الاسلامی — کراچی — ۱۹۸۱ء

۱۹۔ البوطی، محمد سعید — ترکی کا مرد مجاہد — اسلامک پبلیکیشنز — لاہور — ۱۹۷۰ء

۲۰۔ رمضان ڈاکٹر — (بدیع الزمان نورسی)

۲۱۔ البناء، حسن — حسن البنا شہید کی ڈائری — اسلامک پبلیکیشنز — لاہور — ۱۹۸۴ء

۲۲۔ السباعی ڈاکٹر مصطفیٰ — اسلامی تحریک کے درخشاں پہلو — اسلامک پبلیکیشنز — لاہور — ۱۹۸۵ء

۲۳۔ المتنبی شاعر — دیوان متنبی — لاہور پرنٹنگ پریس — لاہور — س ن

۲۴۔ الیاس مرزا محمد — انقلابات الجزائر — سنگ میل پبلیکیشنز — لاہور — ۱۹۹۴ء

۲۵۔ القرضاوی، یوسف، علامہ — اخوان المسلمون کا تربیتی نظام — ادارہ مطبوعات طلبہ — لاہور — ۲۰۰۲ء

۲۶۔ القرضاوی، یوسف، علامہ — تحریک اسلامی طریق وترجیحات — ادارہ معارف اسلامی — کراچی — س ن

۲۷۔ امیر الروایات — وقائع احمدی — لاہور پرنٹنگ پریس — لاہور — ۱۹۵۰ء

۲۸۔ انصاری محمد الیاس — سانحہ بوسنیا — البدر پبلی کیشنز — لاہور — ۱۹۹۳ء

۲۹۔ انور السادات — انور السادات کی آپ بیتی (اردو ترجمہ) — شاہکار بک فاؤنڈیشن — کراچی

۳۰۔ انور، محمد — یورپی تہذیب تباہی کے دہانے پر — مکتبہ ارسلان — کراچی — ۲۰۰۲ء

۳۱۔ بخاری، امام محمد ابوعبداللہ اسماعیل — بخاری شریف — مکتبہ رحمانیہ — لاہور — ۱۹۷۵ء

۳۲۔ بخاری، امام محمد ابوعبداللہ اسماعیل — صحیح بخاری — امجد اکیڈمی — لاہور — س ن

۳۳۔ برق، غلام جیلانی، ڈاکٹر — معجم البلدان (اُردو ترجمہ) — شیخ غلام علی اینڈ سنز — لاہور — س ن

۳۴۔ ثروت صولت — دنیا میں مسلم اقلیتیں۔ حصہ اوّل — ادارہ معارف اسلامی — کراچی — ۱۹۹۰ء

۳۵۔ ثروت صولت — دنیا میں مسلم اقلیتیں۔ حصہ دوم — ادارہ معارف اسلامی — کراچی — ۱۹۹۰ء

۳۶۔ ثروت صولت — ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ۔ حصہ اوّل — اسلامک پبلیکیشنز — لاہور — ۱۹۸۹ء

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| ۳۷۔ | ثروت صولت | ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ۔ حصہ دوم | اسلامک پبلیکیشنز | لاہور | ۱۹۸۹ء |
| ۳۸۔ | ثروت صولت | ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ۔ حصہ سوم | اسلامک پبلیکیشنز | لاہور | ۱۹۸۹ء |
| ۳۹۔ | ثروت صولت | ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ۔ حصہ چہارم | اسلامک پبلیکیشنز | لاہور | ۱۹۸۹ء |
| ۴۰۔ | جمیلہ مریم | اسلام ایک نظریہ ایک تحریک | میٹرو پرنٹر | لاہور | ۱۹۸۶ء |
| ۴۱۔ | جیلانی، آصف | وسط ایشیاء: نئی آزادی، نئے چیلنج | سنگ میل پبلیکیشنز | لاہور | ۱۹۹۶ء |
| ۴۲۔ | حامدی، خلیل احمد | اخوان المسلمون، تاریخ دعوت، خدمات | اسلامک پبلیکیشنز | لاہور | ۱۹۸۹ء |
| ۴۳۔ | حامدی، خلیل احمد | تحریک اسلامی کے عالمی اثرات | ادارہ معارف اسلامی | لاہور | ۱۹۹۰ء |
| ۴۴۔ | حامدی، خلیل احمد | بوسنیا (جغرافیہ، تاریخ، داستان جہاد) | ادارہ معارف اسلامی | لاہور | ۱۹۹۴ء |
| ۴۵۔ | حامدی، خلیل احمد | آفاق دعوت | ادارہ معارف اسلامی | لاہور | ۱۹۹۴ء |
| ۴۶۔ | حبیب الرحمان، محمد | اشاعت اسلام (دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا) | سبحانی اکیڈمی | لاہور | ۱۹۸۷ء |
| ۴۷۔ | حجازی، مصطفیٰ | المعجم الوجیز | المرکز العربی لثقافۃ والعلوم | بیروت، لبنان | ۱۹۸۰ء |
| ۴۸۔ | حسن ابراہیم حسن | تاریخ سیاسی اسلام | سازمان انتشارات | ایران | ۱۳۶ھ |
| ۴۹۔ | حمید اللہ، ڈاکٹر محمد | اسلامی ریاست | الفیصل پبلشرز | لاہور | ۱۹۹۲ء |
| ۵۰۔ | حنیف، محمد | خطبات حسن البناء شہیدؒ | مکتبہ چراغ اسلام | لاہور | ۱۹۸۹ء |
| ۵۱۔ | خالد، سلیم منصور | البدر | ادارہ مطبوعات طلبہ | لاہور | ۱۹۸۰ء |
| ۵۲۔ | خالد محمود، مولانا | عالمی نظام سیاست واقصاد اور افغانستان کی طالبان تحریک | گوشہ علم وتحقیق | کراچی | ۲۰۰۲ء |
| ۵۳۔ | خمینی، روح اللہ امام | اسلامی حکومت | اسلامک انٹرنیشنل | لاہور | ۱۹۸۵ء |
| ۵۴۔ | درشہوار، سیدہ ڈاکٹر | تحقیق کا طریقہ کار | شاہ عبداللطیف بھٹائی چیئر | کراچی | ۱۹۹۵ء |
| ۵۵۔ | دہلوی، شاہ ولی اللہ | حجۃ اللہ البالغہ | مطبع منیریہ | دہلی | ۱۳۵ھ |
| ۵۶۔ | دینان، موسیو | ابن رشد و فلسفہ ابن رشد | مکتبہ جامعہ عثمانیہ | حیدرآباد دکن | ۱۹۳۹ء |

| نمبر | مصنف | کتاب | ناشر | مقام | سن |
|---|---|---|---|---|---|
| ۵۷۔ | رزاق، ایم اے | پاکستان کا نظام حکومت اور سیاست | مکتبہ فریدی | کراچی | س ن |
| ۵۸۔ | رضوی، جمیل احمد، سید | لائبریری سائنس اور اصول تحقیق | مقتدرہ قومی زبان | اسلام آباد | ۱۹۹۴ء |
| ۵۹۔ | رضی، محمد سید، مجتہد | اسلام کا فکری نظام | الثقافتہ الاسلامیہ | کراچی | ۱۹۷۴ء |
| ۶۰۔ | رشید احمد، پروفیسر | مسلمانوں کے سیاسی افکار | ادارہ ثقافت اسلامیہ | لاہور | ۱۹۸۴ء |
| ۶۱۔ | شاہد، ایس ایم | مسلمانوں کے سیاسی افکار و ادارے | اُردو بازار | لاہور | ۱۹۸۹ء |
| ۶۲۔ | رفیق، محمد شیخ | تاریخ پاکستان | لاہور پرنٹنگ پریس | لاہور | ۱۹۷۰ء |
| ۶۳۔ | سبط حسن سید | انقلاب ایران | مکتبہ دانیال | کراچی | ۱۹۸۰ء |
| ۶۴۔ | سجاد، حافظ محمد | اسلامی تحریکات عہد جدید میں | علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی | اسلام آباد | ۲۰۰۱ء |
| ۶۵۔ | سرور، پروفیسر | افکار عبیداللہ سندھی | الحمود اکیڈمی | لاہور | ۱۹۶۷ء |
| ۶۶۔ | سلیم، سید محمد | تاریخ نظریہ پاکستان | ادارہ تعلیم و تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان | لاہور | س ن |
| ۶۷۔ | سلیم، سید محمد | سید ابوالاعلیٰ مودودی | فاران نشریات | لاہور | س ن |
| ۶۸۔ | سلیمانی، محمد احسان الحق | مسلمان یورپ میں | قومی کتب خانہ | لاہور | ۱۹۵۴ء |
| ۶۹۔ | سندھی، عبیداللہ، مولانا | شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک | سندھ ساگر اکیڈمی | لاہور | ۲۰۰۲ء |
| ۷۰۔ | شہید، اسماعیل، شاہ | مکاتیب شاہ اسماعیل شہید | | | س ن |
| ۷۱۔ | شہابی، فیض احمد | مسلم دنیا | معارف اسلامی | لاہور | ۱۹۹ء |
| ۷۲۔ | شہابی، فیض احمد | مشرقی یورپ میں مسلمانوں کا عروج و زوال | ادارہ معارف اسلامی | لاہور | ۱۹۸۷ء |
| ۷۳۔ | عبدالرشید | اسلامی ریاست و حکومت | طاہر سنز | کراچی | ۱۹۷۳ء |
| ۷۴۔ | عثمانی، قمر احمد | برصغیر میں دعوت دین کی تحریکیں | دعوۃ اکیڈمی | اسلام آباد | ۱۹۹۲ء |
| ۷۵۔ | عراقی، عبدالرشید | شاہ ولی اللہ محدث دہلوی | نور اسلام اکیڈمی | لاہور | ۱۹۹۹ء |
| ۷۶۔ | عزام، عبداللہ، ڈاکٹر | میدان پکارتے ہیں | ادارہ مطبوعات طلبہ | لاہور | ۱۹۹۱ء |
| ۷۷۔ | عقیل، معین الدین، ڈاکٹر | مسلمانوں کی جدوجہد آزادی | مکتبہ تعمیر انسانیت | لاہور | ۱۹۸۱ء |

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| ۷۸۔ | علی، حامد | اسلامی قوانین نظام مصطفیٰ کی طرف مثبت قدم | دی آئیڈیل پبلشرز | کراچی | ۱۹۷۹ء |
| ۷۹۔ | علی، مبارک، ڈاکٹر | تاریخ اور مذہبی تحریکیں | فکشن ہاؤس | لاہور | ۱۹۹۸ء |
| ۸۰۔ | غازی، حامد الانصاری | اسلام کا نظام حکومت | مکتبہ الحسن | لاہور | س۔ن |
| ۸۱۔ | غلام حسین، ڈاکٹر | تحقیق کا فن | پاکستان اسٹڈی سینٹر | سندھ | ۱۹۸ء |
| ۸۲۔ | صدیقی، حفظ الرحمٰن | قرارداد مقاصد سے اسلامی قانون تک | طاہر سنز | کراچی | ۱۹۸۱ء |
| ۸۳۔ | صدیقی، حیدر زمان | اسلام کا نظریہ جہاد | ادارہ ترجمان القرآن | لاہور | ۱۹۸۹ء |
| ۸۴۔ | صدیقی، | عدل اسلامی معاشرے کی | فیروز سنز | لاہور | ۱۹۹۲ء |
| ۸۵۔ | عرفان حسن | اجتماعی ذمہ داری | | | |
| ۸۶۔ | فاروق، محمد، مجاہد | پاکستان کی نظریاتی تاریخ | نیو بک پیلس | لاہور | س ن |
| ۸۷۔ | فرخ آبادی، محمد سلیمان | کربلا سے بالاکوٹ تک | مکتبہ تعمیر انسانیت | لاہور | س ن |
| ۸۸۔ | فلاحی، عبید اللہ فہد ڈاکٹر | جدید ترکی میں اسلامی بیداری | اسلامک پبلیکیشنز | لاہور | ۱۹۹۹ء |
| ۸۹۔ | کریم، ارشد، سید | پاکستان، معاشرت، سیاست اور حکومت | منی پبلیکیشنز | کراچی | ۱۹۸۹ء |
| ۹۰۔ | گاہندری، محمد اقبال سلیم | مقام جمال الدین افغانی | نفیس اکیڈمی | کراچی | ۱۹۴۵ء |
| ۹۱۔ | گوہر، رحمان، مولانا | اسلامی سیاست | المنار بک سینٹر | لاہور | ۱۹۸۷ء |
| ۹۲۔ | گیلانی، اسعد سید | سفرنامہ ایران | اسلامک انٹرنیشنل | لاہور | ۱۹۸۴ء |
| ۹۳۔ | گیلانی، اسعد سید | اسلامی تحریکیں | ادارہ ترجمان القرآن | لاہور | ۱۹۹۶ء |
| ۹۴۔ | گیلانی، اسعد سید | انقلاب ایران | اسلامک انٹرنیشنل | لاہور | ۱۹۸۲ء |
| ۹۵ | گیلانی، اسعد سید | رسول اکرم ﷺ کی حکمت انقلاب | ادارہ ترجمان القرآن | لاہور | ۱۹۸۱ء |

۹۶۔ گیلانی، اسعد سید — اسلامی طرزِ حیات — فیروز سنز — لاہور — ۱۹۸۹ء

۹۷۔ لیوس، برنارڈ — یورپ مسلمانوں کی نظر میں — سنگِ میل پبلیکیشنز — لاہور — ۲۰۰۱ء

۹۸۔ مصری، امین احمد ڈاکٹر — چند نامور مسلم شخصیات — المنار بک سینٹر — لاہور — ۱۹۹۱ء

۹۹۔ ملاٹھوی، مظفر حسین، پروفیسر — پاکستان کے تعاقب میں — طاہر سنز — کراچی — ۱۹۹۸ء

۱۰۰۔ محمد شوقی ذکی — تحریک اخوان المسلمین — مجلس نشریات اسلام — کراچی — ۱۹۹۹ء

۱۰۱۔ ملک، محمد شفیق — عصر حاضر کی جہادی تحریکیں — میٹرو پرنٹر — لاہور — ۱۹۹۸ء

۱۰۲۔ مسلم، امام، — صحیح مسلم۔ مطبع مجتبائی — القشیری بن الحجاج — دہلی — ۱۳۰۸ھ

۱۰۳۔ منیر، محمد — اسلام اور تہذیب حاضرہ — مکتبہ خلیل — لاہور — ۱۹۸۴ء

۱۰۴۔ مودودی، — قوموں کے عروج وزوال پر — ادارہ ترجمان القرآن — لاہور — ۱۹۹۲ء

۱۰۵۔ ابوالاعلیٰ سید

۱۰۶۔ علمی تحقیقات — مودودی، ابوالاعلیٰ سید — اسلامک پبلیکیشنز — لاہور — ۱۹۷۱ء

۱۰۷۔ کے اثرات — تجدید واحیائے دین

۱۰۸۔ مودودی، ابوالاعلیٰ سید — تفہیمات — اسلامک پبلیکیشنز — لاہور — ۱۹۷۰ء

۱۰۹۔ مودودی، ابوالاعلیٰ سید — دستور جماعت اسلامی پاکستان — اسلامک پبلیکیشنز — لاہور — ۱۹۵۰ء

۱۱۰۔ مودودی، ابوالاعلیٰ سید — مسئلہ قومیت — اسلامک پبلیکیشنز — لاہور — ۱۹۹۷ء

۱۱۱۔ مودودی، ابوالاعلیٰ سید — اسلامی ریاست — اسلامک پبلیکیشنز — لاہور — ۱۹۶۷ء

۱۱۲۔ مودودی، ابوالاعلیٰ سید — اسلام اور جاہلیت — اسلامک پبلیکیشنز — لاہور — ۱۹۷۳ء

۱۱۳۔ مودودی، ابوالاعلیٰ سید — الجہاد فی الاسلام — ادارہ ترجمان القرآن — لاہور — ۱۹۸۸ء

۱۱۴۔ مہر، غلام رسول، مولانا — سید احمد شہید — لاہور — ۱۹۷۵ء

۱۱۵۔ ندوی، ابوالحسن علی، سید — تاریخ دعوت وعزیمت — مجلس نشریات اسلام — کراچی — ۱۹۸۵ء

۱۱۶۔ ندوی، ابوالحسن علی، سید — مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش — مجلس نشریات اسلام — کراچی — ۱۹۸۰ء

۱۱۷۔ ندوی، ابوالحسن علی، سید — دریائے کابل سے دریائے یرموک تک — س ن

۱۱۸۔ ندوی، مسعود عالم، مولانا — محمد ابن عبدالوہاب — طارق اکیڈمی — لائل پور — ۱۹۷۵ء

۱۱۹۔ نور محمد، مولوی — مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے — فیروزسنز — لاہور — ۱۹۷۱ء

۱۲۰۔ یونس، سید محمد، ڈاکٹر — چیچنیا میں اسلام اور مسلمان — ایچ وائی پرنٹرز — لاہور — ۲۰۰۰ء

121. Iqbal ,Muhammad Sir. The construction of religious thoughts in Islam. Lahore.

122. Leiden, Bill ,E.J.Sanriya: The study of a renewalist movement in islam Vernadaky, George. A history of Russia.

۱۲۳۔ آئین، لاہور، ماہنامہ، اگست ۱۹۹۴ء

۱۲۴۔ ایشیاء، لاہور ہفت روزہ، ستمبر ۱۹۹۲ء

۱۲۵۔ جسارت میگزین، کراچی، نومبر ۱۹۹۵ء

۱۲۶۔ فرائیڈے اسپیشل کراچی، ہفت روزہ، نومبر ۱۹۸۹ء